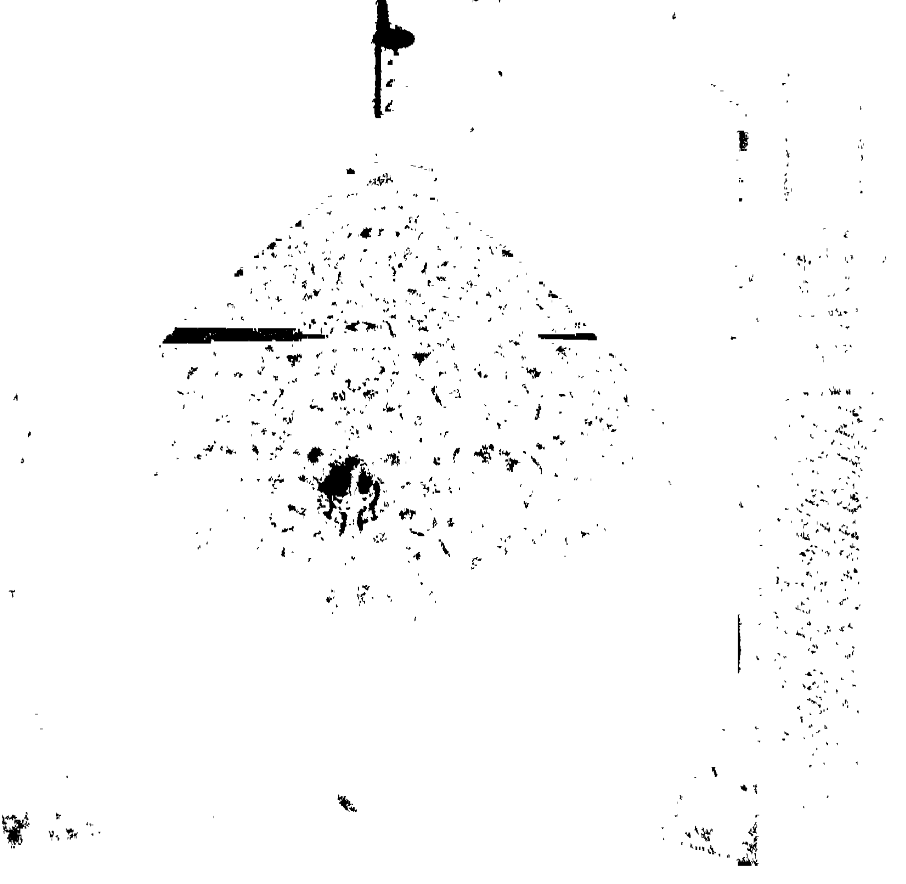
الرسالہ

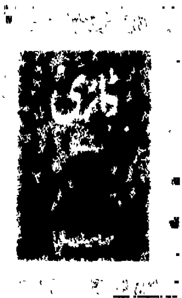
Al-Risala

January 1998 • No. 254 • Rs. 8

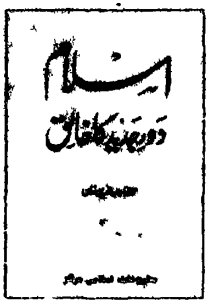
اس دنیا میں وہی آدمی اپنے رب کو جانتا ہے

جو اس سے پہلے اپنے نہیں کو دریافت کر چکا ہو





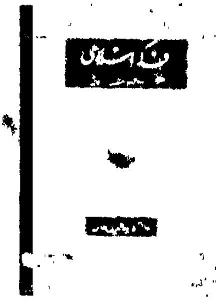
Size 22x14 5cm
400 pages



Size 22x14 5cm
112 pages



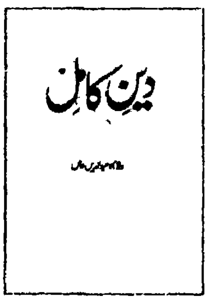
Size 22x14 5cm
144 pages



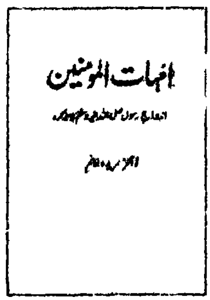
Size 22x14 5cm
340 pages



Size 22x14 5cm
152 pages



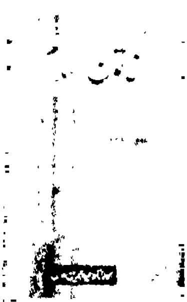
Size 22x14 5cm
368 pages



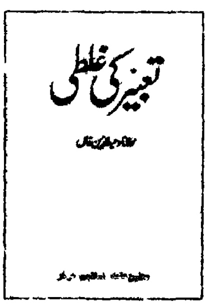
Size 22x14 5cm
56 pages



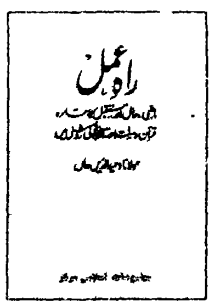
Size 22x14 5cm,
172 pages



Size 22x14 5cm,
288 pages



Size 22x14 5cm
344 pages



Size 22x14 5cm
152 pages



Size 22x14 5cm
128 pages

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near ava Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail. risala.islamic@ axcess.net.in

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

جنوری ۱۹۹۸، شمارہ ۲۵۴

فہرست صفحہ

روزہ کیا ہے

روزہ کے لیے اصل عربی لفظ صوم ہے۔ صوم کے معنی ہیں رکنا (abstinence) روزہ میں چونکہ آدمی کھانے پینے سے اور دوسری خواہشوں سے رک جاتا ہے، اس لیے اس کو صوم کا نام دیا گیا۔

اسلامی شریعت میں روزہ مسلسل ایک مہینہ تک کے لیے ہے۔ ہر سال قمری کیلنڈر کے اعتبار سے رمضان کے مہینہ میں یہ روزہ رکھا جاتا ہے۔ سال میں ایک مہینہ کا یہ روزہ ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو اس کو رکھنے کی طاقت رکھتا ہو۔

یہ روزہ رمضان کے مہینہ کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور مہینہ کی آخری تاریخ کو ختم ہوتا ہے۔ چونکہ اس کا انحصار چاند دیکھنے پر ہے، اس لیے وہ کبھی ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ دن کا۔

صبح کو روزہ شروع کرنے سے پہلے جو کھانا کھایا جاتا ہے اس کو سحری کہتے ہیں۔ اس سحری کا وقت صبح صادق (morning twilight) کے ظہور تک رہتا ہے۔ روزہ توڑنے کے لیے جو کھانا کھایا جاتا ہے اس کو افطار کہتے ہیں۔ اس کا وقت سورج ڈوبنے کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے۔ روزہ دار پر کھانے پینے وغیرہ کی جو پابندی ہے وہ صرف دن کے لیے ہے۔ رات کے وقت کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔

شام کو روزہ توڑتے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: خدایا، میں نے تیرے حکم سے روزہ رکھا اور تیری اجازت سے میں نے افطار کیا۔ یہ دعا روزہ کی روح کو بتاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کی مرضی کا پابند بنائے۔ یہ پابندی پوری زندگی میں مطلوب ہے۔ رمضان کے مہینہ کا روزہ اسی پابند زندگی کی ایک سالانہ علامتی مشق ہے۔

اسلام کے مطابق، موجودہ دنیا میں انسان کو امتحان (Test) کے لیے رکھا گیا ہے۔ اس کو جو آزادی ملی ہے وہ اسی لیے ہے کہ وہ اس کو خود اپنی مرضی سے خدا کے حکموں کی پابندی میں استعمال کرے۔ آزادی کے اس پابند استعمال کے لیے آدمی کو اپنی خواہشوں پر روک لگانا پڑتا ہے۔ اس کے لیے سلف کنٹرول کی استعداد درکار ہے۔ روزہ اسی سلف کنٹرول کی سالانہ تربیت ہے۔

سلامت کنڑول والی زندگی کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ روزہ یہی صبر کی صفت آدمی کے اندر پیدا کرتا ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں روزہ کو صبر کا مہینہ (شھر الصبر) کہا گیا ہے۔ دنیا میں اسلامی طرز کی زندگی گزارنے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ صبر ہے۔ اسی لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والوں کو خدا کے یہاں بے حساب اجر دیا جائے گا (39:10)

بے حساب اجر کی یہی خوش خبری حدیث میں روزہ کے لیے بھی بتائی گئی ہے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے نیک اعمال کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دیا جاتا ہے مگر روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا (بے حساب) بدلہ دوں گا (بخاری و مسلم)

بے حساب بدلہ کا استحقاق اصلاً صبر کے لیے ہے۔ صبر اسلام میں سب سے بڑی نیکی اور سب سے زیادہ قابل قدر صفت ہے۔ روزہ آدمی کو اسی صابرانہ زندگی کے لیے تیار کرتا ہے، اسی لیے روزہ پر بھی بے حساب انعام رکھ دیا گیا۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی شخص کے روزہ کا دن ہو تو وہ نہ کسی کو گالی دے اور نہ کسی سے جھگڑا کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو وہ اس سے کہہ دے کہ "میں ایک روزہ دار آدمی ہوں"۔

یہی وہ چیز ہے جس کو صبر یا پابندی کہا گیا ہے۔ یعنی اشتعال کا موقع پیش آئے تو اس پر مشتعل نہ ہونا۔ دوسروں کے منفی رویہ کے باوجود اپنے آپ کو مثبت رویہ پر قائم رکھنا۔ کوئی شخص زیادتی کرے تب بھی یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو جوابی زیادتی سے بچانا۔

روزہ ایک سالانہ تربیتی کورس ہے جو آدمی کو اسی ضبط نفس کے قابل بناتا ہے۔ جس آدمی کے اندر ضبط نفس آجائے اس کے اندر وہ طاقت آگئی جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو تھامے، جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو شریعت کی مقرر کی ہوئی اخلاقی حد پر باقی رکھے، اور صحیح اور مطلوب زندگی گزارے۔

روزہ میں کھانا اور پانی چھوڑنا علامتی طور پر غیر مطلوب چیزوں کو چھوڑنے کا سبق ہے۔ اسی لیے پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ جو آدمی جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور اپنا پینا چھوڑ دے۔

علامتی روزہ

رمضان کے مہینہ کا روزہ ایک اعتبار سے علامتی روزہ ہے۔ قرآن (البقرہ ۱۸۵) کے لفظوں میں وہ صوم یسر ہے نہ کہ صوم عسر۔ رمضان کے مہینہ میں جو روزہ رکھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ۳۰ دنوں تک کے لیے دن کے اوقات میں جسم کو کھانے اور پینے سے روک دیا جاتا ہے۔ کھانا اور پانی انسان کی ایک ضرورت ہے۔ اسی طرح انسان کی اور بھی اَن گنت ضرورتیں ہیں، محدود مدت کے لیے صرف ایک ضرورت پہ پابندی عائد کرنا گویا صوم یسر ہے۔ اسی طرح اگر تمام ضرورتوں پر پابندی لگادی جائے تو وہ صوم عسر کے معنی ہوگا۔

مگر انسان اپنے عجز کی بنا پر صوم عسر کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو صوم یسر کا حکم دیا۔ تاکہ وہ اپنی ایک ضرورت کے بارہ میں محدود پابندی کا تجربہ کرکے اپنے اندر اس احساس کو جگائے کہ رب العالمین اگر اسی طرح تمام ضرورتوں پر پابندی عائد کردے تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ آدمی کے اندر زیادہ سے زیادہ شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

اب صوم عُسر کا تصور کیجئے —— انسان کا نظام ہضم (میٹابلزم) اگر کام کرنے سے رک جائے۔ دل اگر خون کے دوران کو جاری نہ کرے۔ دماغ کا کمپیوٹر اگر اپنا کام بند کردے۔ طبیعت مدبرۂ بدن اگر اپنے عمل کو روک دے تو یہ سب صوم عسر ہوگا۔ اسی طرح جسم کے باہر سورج اگر روشنی اور حرارت ہماری طرف نہ بھیجے۔ اگر ہوا آکسیجن کی سپلائی نہ کرے۔ زمین اگر اپنی قوت کشش کو معطل کردے۔ اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جو گویا صوم عسر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر وہ پیش آجائیں تو انسان کی پوری زندگی تہہ وبالا ہوکر رہ جائے گی۔

یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس نے صوم عسر کا حکم نہ دے کر ہم کو صرف صوم یسر کا مکلف کیا۔ انسان اگر اس خدائی رحمت کا احساس کرکے اس پر سچا شکر ادا کرے تو اس کو نہ صرف صوم یسر کا اجر ملے گا بلکہ وہ صوم عسر کا عظیم تر ثواب بھی پائے گا۔ اسی لیے حدیث میں یہ بشارت آئی ہے کہ دوسرے تمام اعمال کا اجر دس گنا سے سات سو گنا تک دیا جاتا ہے۔ مگر صوم (روزہ) کا اجر لامحدود ہے، اور وہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو دیا جائے گا۔ یہ عظیم ثواب ان لوگوں کے لیے ہے جو جسمانی طور پر صوم یسر کا اہتمام کرنے کے ساتھ شعوری طور پر صوم عسر کا بھی تجربہ کرسکیں۔

تقریر رمضان

پچھلے کچھ سالوں سے ہمارے یہاں افطار پارٹی کا رواج بہت بڑھ گیا ہے۔ ہر سال رمضان میں سیکڑوں کی تعداد میں اس طرح کی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ ان افطار پارٹیوں میں لوگ جمع ہو کر کھاتے پیتے ہیں تفریحی باتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی افطار پارٹیوں پر فارسی شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے:

تن پروریٔ خلق فزوں شد زریاضت   جز گرمیٔ افطار ندارد رمضان ہیچ

آج کے پروگرام کا یہ انداز نہایت صحت مند ہے کہ افطار پارٹی کے ساتھ یہاں اس اسلامی عبادت کے موضوع پر تقریروں کا پروگرام رکھا گیا۔ یہ ایک مفید طریقہ ہے۔ اس کے لیے میں پروگرام کے منتظمین کو مبارک باد دیتا ہوں۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے اجتماعات زیادہ سے زیادہ کیے جائیں اور مختلف مواقع کو اسلام کے مثبت تعارف کے لیے استعمال کیا جائے۔

اب مجھے روزے کے بارے میں کچھ باتیں کرنا ہے۔ روزہ ایک سالانہ عبادت ہے جو رمضان کے مہینہ میں ادا کی جاتی ہے۔ اس کا آغاز رمضان کا نیا چاند دیکھ کر ہوتا ہے۔ جب شعبان کا مہینہ ختم ہوتا ہے اور رمضان کی پہلی شام آتی ہے تو تمام آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں تاکہ وہ ہلالِ رمضان کو دیکھ سکیں۔ روزہ کی عبادت اگر شمسی مہینہ کی بنیاد پر قائم کی جاتی تو ایسا نہ ہوتا۔ کیوں کہ شمسی مہینہ کو علم الحساب کے ذریعہ مقرر کیا جاتا ہے نہ کہ آسمان میں نیا چاند دیکھ کر۔

یہ گویا رمضان کے مہینہ کا پہلا سبق ہے۔ اسی طرح رمضان یہ پیغام دیتا ہے کہ تم زمین سے اپنی نظریں اٹھاؤ اور آسمان کی طرف دیکھو۔ تم نیچے کی طرف دیکھنے والے نہ بنو بلکہ اوپر کی طرف دیکھنے والے بنو۔ تم مخلوقات کی سطح سے بلند ہو کر خدا کی سطح پر جینا سیکھو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو فطرت کی زبان میں اس طرح کہا گیا ہے کہ سادہ زندگی اور اونچی سوچ:

Simple living and high thinking

اب میں روزہ کی حقیقت کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں کچھ باتیں کہوں گا۔

۱۔ قرآن میں جہاں روزہ کا حکم دیا گیا ہے وہاں ارشاد ہوا ہے کہ یہ حکم تم کو اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تاکہ تمہارے

اندر تقویٰ پیدا ہو۔ تقویٰ کے مختلف پہلو ہیں۔ اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ آدمی کے اندر روحانی صفات پیدا ہوں۔ وہ روحانی ترقی (spiritual development) کا درجہ حاصل کرے۔

روحانیت ایک فطری صفت ہے۔ وہ ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود رہتی ہے مگر موجودہ دنیا میں بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو فطرت کے اس عمل میں رکاوٹ (distraction) پیدا کرنے والی ہوں۔ انھیں میں سے ایک کھانا پینا بھی ہے۔ آدمی صبح سے شام تک مختلف صورتوں میں کچھ نہ کچھ کھاتا پیتا رہتا ہے۔ یہ کھانا پینا فطرت کے اس عمل کے راستہ میں ایک مستقل خلل اندازی ہے۔ چنانچہ ایک مہینہ کے لیے دن کے اوقات میں اس خلل اندازی پر روک لگا دی جاتی ہے تاکہ روحانی ارتقا کا عمل آدمی کے اندر بے روک ٹوک جاری ہو سکے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے زیادہ اچھی ہے (و لخلوف فم الصائم عند اللہ اطیب من ریح المسک) مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱

اس حدیث میں گویا خوشبو کا لفظ محض اپنے لفظی معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ علامتی معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کا ظاہری پہلو اگرچہ ناخوش گوار ہے اس کا اندرونی پہلو خوش گواریوں سے بھرا ہوا ہے۔ بھوک پیاس کا پُرمشقت تجربہ آدمی کے اندر اس کی روحانیت کو جگاتا ہے۔

انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ اس کے اندر مادیت بھی ہے اور روحانیت بھی۔ روحانیت کی ترقی ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ مادیت کے عنصر کو دبایا جائے۔ روزہ اسی قسم کی ایک تدبیر ہے۔ روزہ کا مقصد آدمی کو اس کے لیے تیار کرنا ہے کہ وہ اپنی روحانیت کا محافظ بن جائے۔ وہ اس مقصد کے لیے اپنی مادی ضرورتوں میں کمی کرے، خواہ کمی کرنے کا یہ عمل کھانے اور پینے جیسی ناگزیر انسانی ضروریات تک کیوں نہ پہنچ جائے۔

۲۔ حدیث میں روزہ کو شہر الصبر کہا گیا ہے۔ یعنی صبر کا مہینہ۔ اس سے روزہ کا ایک اور اہم پہلو معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ صبر وضبط ہے۔ صبر کیا ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ وہ بے قید زندگی کے مقابلہ میں پابند زندگی کا طریقہ اختیار کرے۔ اس اعتبار سے روزہ خود انضباطی (self-discipline) کی مشق ہے جو صالح زندگی گزارنے کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی روزہ رکھ کر جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑے (مشکوۃ المصابیح ۱/۶۲۳)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ میں کھانے پینے کا ترک ایک علامتی ترک ہے۔ یہ علامتی ترک اس بات کا سبق ہے کہ آدمی ہر قسم کے جھوٹ اور برائی کو چھوڑ دے۔ وہ اپنے معاملات میں اخلاقی پابندی کا طریقہ اختیار کرے۔

اس طرح روزہ انسان کو سماج کا ایک صالح ممبر بناتا ہے۔ وہ انسان کو اس مقصد کے لیے تربیت دیتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اعلیٰ کردار کے ساتھ زندگی گزارے اور پست کرداری کا طریقہ چھوڑ دے۔

۳۔ حدیث میں روزہ کے مہینہ کو شہر المواساۃ (ھو شھر المواساۃ) کہا گیا ہے۔ یعنی دوسروں کی ہمدردی کا مہینہ (مشکوۃ المصابیح ۱/۶۱۳)

اس پہلو کو دوسرے لفظوں میں انسانی خدمت کہا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے روزہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ روزہ دار کے اندر انسانیت کا درد پیدا کرے۔ وہ دنیا میں صرف اپنے لیے نہ جئے بلکہ دوسروں کے لیے جینا سیکھے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں انسان سے فرمائے گا کہ میں تمہارے پاس بھوکا آیا مگر تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ بندہ کہے گا کہ خدایا تو تو رب العالمین ہے تو کیسے بھوکا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آئے گا کہ میرا فلاں بندہ بھوک کی حالت میں تیرے پاس آیا تھا اگر تو اس کو کھلاتا تو مجھ کو تو اس کے پاس پاتا (صحیح البخاری، کتاب المرض)

انسان کے انسان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی ضروریات میں ان کے کام آئے۔ وہ سماج کے اندر اس طرح زندگی گزارے کہ دوسروں کی حاجتوں کو پورا کرنا بھی اس کی زندگی کے پروگرام کا ایک جزو بنا ہوا ہو۔ یہ انسانی صفت اس کے اندر ہو سکتی ہے جو دوسروں کی تکلیفوں کو اپنے سینے میں محسوس کرے۔ روزہ گویا یہی کیفیت پیدا کرنے کی ایک تربیت ہے۔ روزہ کے ذریعہ بھوک اور پیاس کے تجربہ کو انسان کا ذاتی تجربہ بنا دیا گیا۔ حاجت مند کے درد کو حاجت براری کرنے والے کے دل میں اتار دیا گیا تاکہ وہ انسانی خدمت کی راہ میں زیادہ سے زیادہ سرگرم ہو سکے۔

۴۔ رمضان کا ایک اور پہلو وہ ہے جس کا ذکر قرآن کی سورۃ نمبر ۹۷ میں آیا ہے۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر (شب قدر) میں اتارا۔ یعنی وہ رات جب کہ سال بھر کے متعلق

قضاوقدر کے محکم اور اٹل فیصلے زمین میں کام کرنے والے فرشتوں پر خدا کی طرف سے اتارے جاتے ہیں۔ یہ رات رمضان میں آتی ہے۔ چنانچہ رمضان کی آخری راتوں میں روزہ دار خصوصی طور پر عبادت کرتے ہیں تاکہ وہ اس رات کے فیوض کو پا سکیں۔ اس سورت (القدر) کا ترجمہ یہ ہے :

> ہم نے اس کو اتارا ہے شب قدر میں۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار
> مہینوں سے بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کی اجازت سے اترتے ہیں
> ہر حکم لے کر۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے، صبح نکلنے تک۔

اس سورۃ میں لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا کہ وہ ہزار مہینہ سے بہتر ہے۔ یہ مدت تقریباً ۸۴ سال بنتی ہے۔ یعنی وہ مدت جو کہ انسان کی اوسط عمر کی مدت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر شب قدر کی برکتوں کو پالے جو گویا روزے کی سعادتوں کا آخری نقطۂ عروج (culmination) ہے تو وہ تمام عمر کے لیے اصلاح یافتہ ہو جائے گا۔ اور اگر وہ شب قدر کی سعادتوں کو جزئی طور پر پائے تب بھی کم از کم سال بھر اس کی زندگی پر اس کے مبارک اثرات باقی رہیں گے۔ رمضان کے مہینہ کی اس اہم ترین رات کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ سلامتی ہی سلامتی ہے :

It is all peace till the rising of the dawn.

اس سے روزہ کا ایک اور اہم پہلو معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ روزہ کا مقصد آدمی کے اندر یہ صفت پیدا کرنا ہے کہ اس کی روح سراپا سلامتی بن جائے۔ وہ اپنے سماج کے اندر امن و سلامتی کے ساتھ رہنے لگے۔ سلامتی کی روح وہ ہے جو تکلیفوں میں بھی پرسکون رہے، مادی رغبتوں سے اوپر اٹھ جائے جو ناخوش گواریوں کے ماحول میں بھی خوش گوار جذبات کے ساتھ جینے لگے۔

جس انسان کے اندر سلامتی کی یہ صفت پیدا ہو جائے اس کا وجود پورے ماحول کے لیے سلامتی بن جاتا ہے۔ وہ سماج کا ایک ایسا پرامن شہری بن جاتا ہے جس سے دوسروں کو صرف امن و سلامتی ملے۔ حتی کہ دوسرے لوگ اگر اس کو ستائیں تب بھی وہ اپنی پرامن روش پر پوری طرح قائم رہے۔

ذائقہ ایمان

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا وبمحمد رسولا وبالاسلام دینا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کا مزہ چکھا اس شخص نے جو اللہ کی ربوبیت پر راضی ہوگیا۔ جو محمد کی رسالت پر راضی ہوگیا اور اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوگیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان و اسلام کا معاملہ کوئی خشک معاملہ نہیں ہے بلکہ ذائقہ کا معاملہ ہے۔ اگر آپ پھل کے چھلکے کو کھائیں تو آپ کو اس سے کوئی ذائقہ نہیں ملے گا۔ مگر جب آپ پھل کا مغز کھاتے ہیں تو آپ کو اس میں ایک ذائقہ ملتا ہے۔ یہی معاملہ ایمان کا ہے۔ ایمان کو بھی اگر حقیقی طور پر اختیار کیا جائے تو وہ آدمی کے لیے نہایت اعلیٰ ذائقہ کی چیز بن جائے گا۔

حدیث کے مطابق، ایمان کا یہ درجہ آدمی کو "رضامندی" کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ آدمی جب دل کی آمادگی کے ساتھ پوری طرح دین پر راضی ہو جائے تو دین اس کے لیے ذائقہ کی چیز بن جاتا ہے۔

ذائقہ ایک تقابلی لفظ ہے یعنی بدمزگی کے مقابل میں خوش مزگی۔ ایمان آدمی کے اندر یہ استعداد پیدا کرتا ہے کہ غیر دینی بات اس کو بدمزہ معلوم ہو اور وہ اس کو کراہت کے ساتھ چھوڑ دے۔ اس کے مقابلے میں دینی بات اس کو خوش مزہ محسوس ہو اور اس کو وہ پسندیدگی کے ساتھ اختیار کرلے۔

خدا کو اپنا رب بنانے کا مطلب خدا کو اپنا سب کچھ بنا لینا ہے۔ جب کوئی آدمی پورے معنوں میں خدا کو اپنا سب کچھ بناتا ہے تو بار بار اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کرنے کے نتیجے میں بظاہر وہ دنیوی نقصان سے دوچار ہو رہا ہے مگر وہ اس نقصان کو بخوشی برداشت کرتا ہے۔ کیوں کہ خدا سے تعلق ہی اس کے لیے لذیذ ترین تجربہ بن جاتا ہے۔ خواہ اس میں نقصان ہو یا فائدہ۔

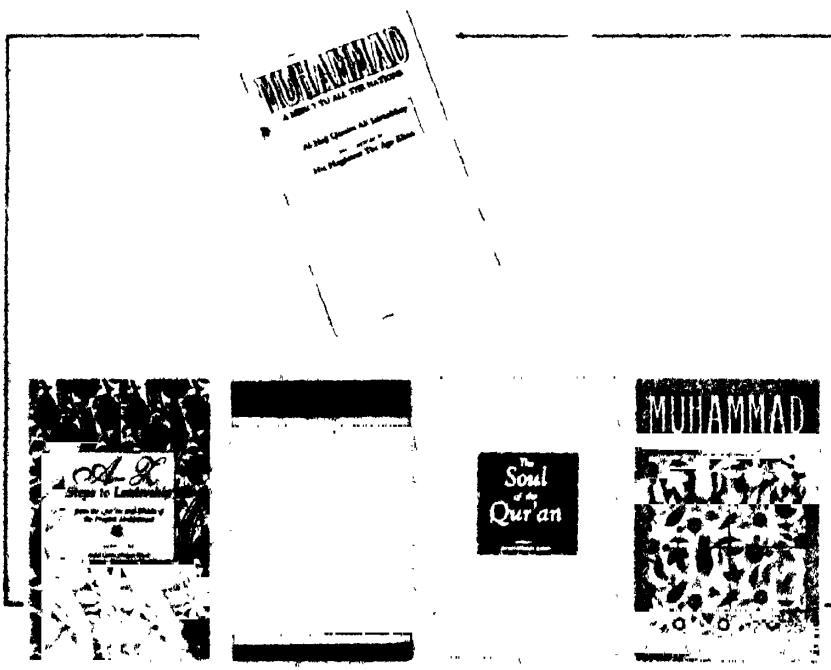
اسی طرح ایک مومن جب زندگی کے میدان میں داخل ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو اختیار کرنے میں دنیوی مصلحتیں مجروح ہو رہی ہیں۔ اس کے باوجود وہ طریقۂ نبوی پر قائم رہتا ہے۔ کیوں کہ ——— طریقۂ نبوی کو چھوڑنا اس کے لیے بدذائقہ چیز بن جاتی اور طریقۂ نبوی پر قائم ہونا ایک خوش ذائقہ چیز۔

یہی معاملہ وسیع تر معنوں میں پورے اسلام کا ہے۔ اسلام کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی پوری زندگی

اس طرح گزارتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں خدائی احکام کی پیروی کر رہا ہے۔ اندرونی خواہشوں کو زیر کرنے سے لے کر بیرونی کردار کو ربانی بنانے تک، ہر معاملے میں وہ حتی الامکان برابر [illegible] پوری زندگی کو خدا کے رنگ میں رنگ لے۔

اس قسم کی زندگی گزارنا کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ پورے معنوں میں ایک مجاہدانہ معاملہ ہے۔ مسلسل جدوجہد ہی کے ذریعہ آدمی اس پر قائم رہ سکتا ہے۔

اس طرح اسلامی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے دو راہیں آتی ہیں۔ ایک وہ جو اسلامی ہے، مگر اس میں طرح طرح کی مشکلات ہیں۔ دوسرے وہ جو اسلامی نہیں، مگر بظاہر اس میں آسانیاں ہی آسانیاں ہیں، مگر جو سچا مومن ہے وہ بلا جھجک اسلامی طریقے کو اختیار کر لیتا ہے اور غیر اسلامی طریقے کو ترک کر دیتا ہے۔ کیوں کہ اسلامی طریقہ ظاہری ناموافقت کے باوجود اس کے لیے خوش مزہ بن جاتا ہے اور غیر اسلامی طریقہ ظاہری موافقت کے باوجود اس کو سخت بدمزہ محسوس ہونے لگتا ہے۔



امتحان گاہ

ایک طالب علم جب امتحان ہال میں داخل ہوتا ہے تو وہاں وہ اپنے آپ کو ایک وسیع کمرہ میں پاتا ہے۔ اس کے لیے وہاں پہلے سے آرام دہ کرسی اور میز بچھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے چاروں طرف گملے ہوتے ہیں جن میں خوب صورت پھول بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں خادم بھی ہوتے ہیں جو اس کے اشارہ پر فوراً اس کی ضرورت پوری کریں۔ ہال کی کھڑکیاں چاروں طرف سرسبز وشاداب پارک کا منظر دکھا رہی ہوتی ہیں۔ وغیرہ۔

مگر طالب علم ان میں سے کسی چیز سے بھی لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ بظاہر خوشی اور لذت کے ماحول میں بھی وہ خوشی اور لذت سے محروم رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت طالب کے ذہن پر صرف ایک بات کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ میں امتحان گاہ میں ہوں۔ یہاں میں کسی بھی چیز کا مالک نہیں۔ یہاں جو کچھ ہے وہ کسی اور کا ہے۔ مجھ کو یہاں صرف اس لیے داخلہ ملا ہے کہ میں امتحان کے پرچے میں دیے ہوئے سوالات کو حل کر دوں۔ مزید یہ کہ میرے پاس صرف محدود وقت ہے۔ اس محدود وقت کا واحد استعمال یہ ہے کہ میں اس کو امتحان میں لگاؤں۔ اس کے سوا دوسری ہر مشغولیت میرے لیے وقت کا ضیاع ہے نہ کہ وقت کا استعمال۔

ٹھیک یہی معاملہ انسان کا موجودہ دنیا کی نسبت سے ہے۔ یہ دنیا ایک وسیع امتحان گاہ ہے۔ اس دنیا میں جو آدمی بھی آتا ہے وہ امتحان دینے کے لیے آتا ہے، اس بات کا امتحان کہ کسی انسان نے خدا کا سچا اعتراف کیا یا نہیں، انسان نے دوسرے لوگوں کے معاملہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کیا یا وہ اس میں کوتاہ ثابت ہوا۔

دنیا کی یہ امتحانی نوعیت اگر آدمی کے اوپر پوری طرح واضح ہو تو یہاں اس کا حال وہی ہو جائے گا جو کسی امتحان ہال میں طالب علم کا ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ وہ بے فکری کے ساتھ زندگی گزارے۔ وہ خوشیوں اور لذتوں میں گم ہو جائے۔ ایسے آدمی کے لیے دنیا ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی جگہ ہوگی نہ کہ راحتیں سمیٹنے کی جگہ۔

دینِ مساوات

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق ؓ کے زمانے میں کچھ صحابہ بطور سفیر ایران سپہ سالار رستم کے دربار میں گئے۔ ان میں سے ایک مغیرہ ابن شعبہ بھی تھے۔ حضرت مغیرہ جب وہاں پہنچے تو رستم کا دربار سجا ہوا تھا اور وہ ایک بلند تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت مغیرہ قریب جاکر تخت پر بیٹھ گئے، اس پر وہ لوگ غصہ ہو گئے اور حضرت مغیرہ کو تخت سے اتار دیا اور ان کی تذلیل کی۔

حضرت مغیرہ اس پر غصہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ مجھ کو بہت بے وقوف معلوم ہوتے ہو۔ ہم لوگ اس طرح انسانوں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک تمام انسان برابر ہیں۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ تم لوگوں نے اپنے بعض پر اپنے بعض کو رب بنالیا ہے۔ ان کی یہ تقریر سن کر دربار کے لوگوں نے کہا کہ خدا کی قسم اس عربی نے سچ کہا۔ اگر اس کو ہمارے غلام سن لیں تو وہ سب کے سب اس کی طرف کھنچ آئیں گے (حیاۃ الصحابہ ۳/۶۹۳ - ۶۹۲)

چنانچہ عملاً ایسا ہی پیش آیا۔ شہنشاہی نظام کے تحت ایران کے لاکھوں لوگ غلاموں جیسی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ لوگ جب اسلام سے متعارف ہوئے تو انھیں محسوس ہوا کہ اسلام ان کا انسانی درجہ بلند کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو گئے۔

اسلام کا دینِ مساوات ہونا بذاتِ خود اپنے اندر ایک دعوتی تاثیر رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام نظام انسانوں کو اونچے اور نیچے درجوں میں بانٹتے ہیں۔ اسلام واحد مذہبی نظام ہے جس میں تمام انسانوں کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق، بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے۔ انسان ظاہری فرق کے باوجود سب کے سب یکساں ہیں۔

اسلام کی اس خصوصیت نے قدیم زمانہ میں بھی بے شمار لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کیا اور موجودہ زمانہ میں بھی۔ اس کی ایک مثال ہندستان ہے۔ ہندستان میں تقریباً آدھی آبادی کو کمتر درجہ کا انسان بنادیا گیا تھا۔ یہاں جب اسلام کا پیغام پہنچا تو اس قسم کے لوگ کثیر تعداد میں اسلام کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اسلام ان کے انسانی درجے کو بلند کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ بڑی تعداد میں اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔

مشہور ہندو مفکر سوامی وویکانند نے اس معاملہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ : کیا وجہ ہے کہ ہندستان کے غریب لوگوں میں مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے۔ یہ کہنا ایک لغو بات ہے کہ یہ مذہبی تبدیلی تلوار کے ذریعہ ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ اسلام قبول کرکے انھیں زمینداروں اور مذہبی پیشواؤں کے جبر سے آزادی ملی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال کے زراعت پیشہ لوگوں میں مسلمان زیادہ ہیں ہندو کم۔

> Why amongst the poor of India so many are Mohammedans? It is nonsense to say, they were converted by the sword. It was to gain their liberty from the zemindars and from the priest, and as a consequence you find in Bengal there are more Mohammedans than Hindus amongst the cultivators. (Letters of Swami Vivekananda, 1986, p. 95)

اسلام کے نزدیک تمام بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے۔ انسان سب کے سب یکساں طور پر اس کی مخلوق ہیں۔ مساوات کا یہ نظریہ اتنی واضح صورت میں صرف اسلام میں پایا جاتا ہے۔ اس نے اسلام کو لوگوں کی نظر میں بے پناہ حد تک پرکشش بنا دیا ہے۔

ہر انسان پیدائشی طور پر یکساں قسم کے جذبات لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ کو اسی طرح ایک باعزت انسان سمجھتا ہے جس طرح کوئی دوسرا آدمی اپنے کو سمجھتا ہے۔ مگر جب وہ سماج میں آتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ سماج اس کو وہ درجہ نہیں دے رہا ہے جو فطرت کی طرف سے اسے ملا تھا۔ یہ تضاد بیشتر انسانوں کو اپنے ماحول سے غیر مطمئن بنا دیتا ہے۔ اس کا حل صرف اسلام ہے۔

دوسرے مذاہب میں توحید کا خالص تصور موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں انسانوں کی برابری کا تصور بھی اپنی کامل صورت میں پایا نہیں جاتا۔ اسلام کی یہ صفت اس کو دوسرے تمام مذہبوں اور نظاموں کے مقابلے میں امتیاز کی حد تک پرکشش بنا دیتی ہے۔ وہ اسلامی دعوت کو ناقابل تسخیر درجہ عطا کر دیتی ہے۔

حکمت دعوت

ولادیمیر اول (Vladimir) ۹۵۶ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۰۱۵ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ روس کا پہلا عیسائی بادشاہ ہے۔ وہ ابتداءً بت پرست تھا اس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس کے بعد اس نے روسی باشندوں کو عیسائی بنانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ تمام بت دریاؤں میں پھینک دیے گئے۔

گیارھویں صدی عیسوی کے ایک مسیحی راہب یعقوب (Jacob) نے اس سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بہت سبق آموز ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ شاہ روس ولادیمیر کا یقین اپنے آبائی مذہب (بت پرستی) سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے تحقیق کے لیے یہودی، عیسائی اور اسلامی علماء کو بلایا اور ہر ایک سے اس کے مذہب کے بارے میں مفصل گفتگو کی (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، تذکرہ ۱۹۸۴ ولادیمیر)

یعقوب کے بیان کے مطابق، یہودی علماء نے کہا کہ ہمارا خدا ہم سے ناراض ہے، اس لیے ہم کو نہیں معلوم کہ ہمارا مقام زمین میں ہے یا آسمان میں۔ ولادیمیر نے کہا کہ مجھے ایسے مذہب کی ضرورت نہیں۔

مسلم علماء کی زبان سے اسلام کی تعلیمات کو سن کر اس کو اسلام سے دل چسپی پیدا ہوئی حتی کہ وہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مگر اس نے کہا کہ میں شراب کا بہت زیادہ عادی ہوں۔ میں اور سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں مگر میں شراب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مسلم علماء نے کہا کہ ہمارے مذہب میں شراب حرام ہے۔ اس لیے اگر تم اسلام قبول کرتے ہو تو شراب بھی تم کو لازماً چھوڑنی پڑے گی۔ اس نے علماء سے بہت زیادہ کہا کہ شراب کے معاملے میں اسے رخصت دے دی جائے مگر علماء اس پر راضی نہیں ہوئے۔ چنانچہ بات ختم ہو گئی اور شاہ روس اسلام قبول کرنے سے باز رہا۔

اس کے بعد شاہ روس ولادیمیر نے عیسائی مذہب کے لوگوں سے گفتگو کی۔ عیسائی عالموں نے زیادہ حکمت اور دانش مندی کا ثبوت دیا۔ وہ اگرچہ اپنے مذہب اور عقائد کے معاملے میں بادشاہ کو زیادہ مطمئن نہ کر سکے تھے، مگر انھوں نے شراب کے معاملے میں بادشاہ کو رخصت دے دی۔ مسیحیت پر

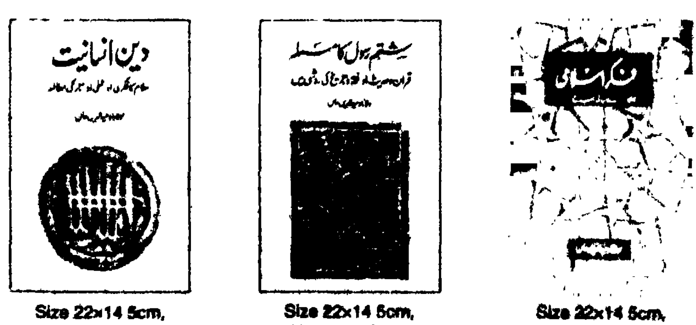
اصولی اعتبار سے مطمئن نہ ہونے کے باوجود عملی اعتبار سے اس نے اس کو پسند کر لیا۔ چنانچہ گفتگو کے آخر میں شاہ ولادیمیر نے مسیحی مذہب کو اختیار کر لیا۔ پروفیسر رابرٹس کے الفاظ میں: —— یہ واقعہ روس کی تاریخ اور کلچر میں ایک نقطۂ انقلاب بن گیا۔

It was a turning point in Russian history and culture.

قدیم زمانہ "الناس علی دین ملوکہم" کا زمانہ تھا۔ چنانچہ روس کے لوگوں نے اپنے بادشاہ کے مذہب یعنی مسیحیت کو اختیار کر لیا۔ بہت جلد پورے ملک میں مسیحیت پھیل گئی۔ روس کا علاقہ موحدین کے بجائے غیر موحدین کا علاقہ بن گیا۔

مذکورہ علماء نے جو بات کہی وہ فقہی مسئلے کے اعتبار سے درست تھی، مگر وہ دعوتی مسئلے کے اعتبار سے درست نہ تھی۔ فقہ کی کتاب میں اسلام کے مسائل صرف اپنی قانونی حیثیت میں بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل کی جو فہرست دی گئی ہے اس کو ویسے ہی کا ویسے ہی نافذ بھی کرنا ہے۔ عملی نفاذ میں تدریج کا اصول ہے نہ کہ فہرست بندی کا اصول۔

اسلام کے دور اول میں اسی تدریج کو استعمال کیا گیا۔ حتیٰ کہ مکی دور میں یہ حال تھا کہ ایمان لانے کے باوجود شراب پینے والے شراب پیتے تھے۔ یہی تدریجی حکمت بعد کے زمانوں میں بھی اختیار کی جائے گی۔ تدریجی حکمت کے بغیر دعوت کی توسیع ممکن نہیں۔



Size 22x14.5cm, 320 pages, Rs 60

Size 22x14.5cm, 192 pages, Rs 40

Size 22x14.5cm, 240 pages, Rs 50

مراد آباد کا سفر

جولائی ۱۹۹۵ میں مراد آباد سے جناب عبد الرحمٰن صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ مراد آباد کا سفر کریں۔ اور یہاں کچھ وقت ہم لوگوں کے ساتھ گزاریں۔ اس کے بعد بار بار ان کا خط اور ٹیلی فون آتا رہا۔ آخر کار مجھے راضی ہونا پڑا۔ چنانچہ ۹ مارچ ۱۹۹۶ کو دہلی سے مراد آباد کا سفر ہوا۔ یہ سفر بذریعہ کار طے ہوا۔ میرے ساتھ جناب عبد الرحمٰن صاحب اور جناب غلام مصطفےٰ رحیمی صاحب تھے۔ یہ مراد آباد کے لیے میرا چوتھا سفر تھا۔

مراد آباد کے لیے پہلا سفر ۱۹۷۸ میں ہوا تھا۔ اس سفر میں میرا قیام جناب شاکر وارث صاحب کے مکان پر تھا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ نومبر ۱۹۷۸ میں شائع ہو چکی ہے۔ مراد آباد کا دوسرا اور تیسرا سفر اس کے کئی سال بعد ہوا۔ دونوں بار میرا قیام جناب اقبال احمد صاحب (Tel. 23029) کے مکان پر تھا۔ چوتھا سفر موجودہ سفر ہے۔ اس بار میرا قیام جناب عبد الرحمٰن صاحب کے مکان پر رہا۔

ہماری کار دہلی کی سڑکوں پر گزرتی ہوئی آگے بڑھی تو ایک مقام پر وہ منظر دکھائی دیا جس کو ڈائناسار کہا جاتا ہے۔ نظریہ ارتقار کے مطابق قدیم زمانہ میں زمین پر بہت بڑے بڑے جانور پائے جاتے تھے جن کو ڈائناسار کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہاتھی نما جانور زمین کے اوپر ۶۵ ملین سال پہلے پائے جاتے تھے۔ بعد کو وہ معدوم ہو گئے۔

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو بتاتا ہے کہ زمین پر کس طرح روک تھام (check and balance) کا نظام قائم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ڈائناسار بلکہ تمام جانور لامحدود طور پر بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر قدرتی روک نہ ہو تو ہر پتنگا ہاتھی بن جائے اور ہر ہاتھی پہاڑ کی مانند نظر آنے لگے۔ حتیٰ کہ خود آدمی لمبا ہو کر تاڑ جیسا قد حاصل کر لے۔ یہ ایک عظیم قدرتی کنٹرول ہے جو ہر چیز کو ایک متعین حد کے اندر رکھتا ہے۔ اگر یہ کنٹرول باقی نہ رہے تو یہ زمین اس قابل ہی نہ رہے گی کہ وہاں انسان جیسی مخلوق آباد ہو اور اس کے اوپر تہذیب و تمدن کی تعمیر کرے۔

ڈائناسار جو قدیم زمانہ میں زمین پر گویا حکومت کر رہے تھے ایک وقت آیا کہ وہ اچانک ختم

ہو گئے، مثلاً عظیم الجثہ حیوان جیسی مخلوق کا بالکل ہی ناپید ہو جانا۔ یہ واقعہ کیسے ہوا۔ اس کا جواب ماہرین ارضیات کے پاس کچھ نہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ کریٹیشیس دور کے آخری زمانہ میں ڈائناسار ارضیاتی ریکارڈ سے مکمل طور پر سطح زمین سے غائب ہو گئے۔ اس اچانک خاتمہ (sudden extinction) کا سبب مکمل طور پر غیر واضح ہے۔ قیاسی طور پر کچھ اسباب بتائے جاتے ہیں مثلاً درجہ حرارت میں تبدیلی وغیرہ۔ لیکن علماء کے نزدیک یہ اطمینان بخش نہیں ہیں (III/556)

دہلی سے ہم لوگ جمعہ کی نماز کے بعد روانہ ہوئے تھے۔ دہلی کی مختلف مانوس سڑکوں سے گزرتے ہوئے آخر کار ہم اس شاہراہ پر پہنچے جو نیشنل ہائی وے نمبر ۲۴ کہی جاتی ہے۔ یہ سڑک سیدھی مرادآباد تک جا رہی تھی۔

راستہ میں ایک جگہ دو ہاتھی جھومتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ہاتھی عجیب و غریب جانور ہے۔ وہ صرف سواری یا سرکس کے لیے نہیں ہوتا۔ وہ مختلف قسم کی ضروری خدمت بھی انجام دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تربیت کے بعد ہاتھی کم و بیش ۳۰ قسم کی انسانی آوازوں کو سمجھتا ہے اور اس کے مطابق ان کی تعمیل کرتا ہے۔ ایک ہزار سال قبل مسیح سے ہاتھی کو جنگی ضرورتوں میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ایک مبصر کے الفاظ میں، یہ طاقت ور حیوان ایک چھوٹے قلعہ کو اپنی پیٹھ پر لاد کر ادھر سے ادھر لے جا سکتے ہیں:

These powerful beasts could carry a miniature
fort on their backs. (19/682)

راستہ میں دونوں صاحبان سے دینی اور ملی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے دعوت کی اہمیت کے بارہ میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ دعوت تو مسلمانوں کے اوپر فرض کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو شخص دعوتی کام کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو وہ کیا کرے۔ میں نے کہا کہ ایسا آدمی مدعو کے حق میں ہدایت کی دعا کرے۔ خدا اگر آپ کو اس حال میں نہ دیکھے کہ آپ مدعو پر محنت کر رہے ہیں تو کم سے کم یہ ہونا چاہیے کہ آپ اپنی تنہائیوں میں یہ سوچ کر تڑپ اٹھیں کہ میں دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری ادا نہ کر سکا۔ اور پھر بے تابانہ طور پر آپ کی زبان سے یہ الفاظ

Call of the wild



Experience the excitement that was
Sixty five million years ago
It's here.

تکلیف کھایا تو مجھے معاف فرما۔ اور اپنی طرف سے اس قوم کے لیے ہدایت کے دروازے کھول دے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اس طرح کی چیزوں میں آپ کو اپنے دل سے فتویٰ پوچھنا چاہیے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: استفت قلبک۔ انھوں نے کہا کہ دل سے فتویٰ پوچھنے کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کامن سنس (عقل عام) کو استعمال کرنا۔

ایک سوال یہ تھا کہ امت کے اختلافات کیسے ختم ہوں۔ میں نے کہا کہ اختلاف انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اور وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آپ کا کام اختلاف کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اختلاف کو برداشت کرنا ہے۔ اختلاف خود انسانی فطرت میں شامل ہے۔ آپ فطرت سے لڑ نہیں سکتے۔ آپ فطرت سے موافقت کر کے ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔

عبدالرحمٰن صاحب نے کہا کہ آپ کے بارے میں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے حج نہیں کیا۔ آپ دنیا بھر کے سفر کرتے رہتے ہیں، مگر ابھی تک آپ حج کے لیے کو نہیں گئے۔ میں نے کہا کہ یہ سراسر جھوٹی بات ہے۔ میں نے خدا کے فضل سے ۱۹۸۲ میں وہاں جا کر حج کا فرض ادا کیا ہے۔ اس کی روداد "حج کا سفر" کے عنوان کے تحت الرسالہ جولائی ۱۹۸۳ میں شائع ہو چکی ہے۔

اس کے بعد ۱۹۸۴ میں خدا کے فضل سے مجھے عمرہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس سفر کی روداد الرسالہ مئی ۱۹۸۴ میں دیکھی جا سکتی ہے (صفحہ ۲۲)

راستہ میں ایک نہر پڑی۔ ساتھی نے بتایا کہ یہی وہ ملیانہ کی نہر ہے جس میں لوگوں کو مار کر ان کی لاشیں ڈال دی گئی تھیں۔ میں نے دیکھا تو نہر کا پانی بدستور خاموشی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ ساری کائنات آج خاموش ہے، جب کہ یہی کائنات آخرت میں بول پڑے گی۔ وہ خدا کی عدالت میں ساری باتوں کی گواہی دے گی۔ اس دن وہ تمام باتیں کھل جائیں گی جو آج بظاہر چھپا ہوئی نظر آتی ہیں۔

راستہ میں ہم لوگ ایک جگہ پہنچے تو ایک اور سڑک نکل کر بائیں طرف جاتی ہوئی نظر آئی۔ ساتھی نے بتایا کہ یہ سڑک امروہہ کی طرف جا رہی ہے۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اکتوبر ۱۹۶۹ میں امروہہ کا سفر کیا تھا۔ اس کی روداد الجمعیۃ ویکلی (۲۱ نومبر ۱۹۶۹) میں چھپ چکی ہے۔ اس کا ایک جزء یہ تھا:

یہاں شہر کے باہر [illegible] میل پہلے ایک بزرگ سید حضرت [illegible] کا مزار ہے جو [illegible] کے ایک قبرستان میں واقع ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس علاقہ میں [illegible] لیکن بزرگ کی دعا کی وجہ سے وہ کسی کو کاٹتے نہیں۔ حتی کہ باہر سے کوئی زہریلا بچھو جیب میں رکھ کر لا کر ڈالا جاتا ہے تو وہ بھی نہیں کاٹتا۔ اس سلسلہ میں یہاں کے لوگوں نے کئی واقعات سنائے... درگاہ کو دیکھ کر جب میں لوٹ رہا تھا تو میرے دل میں خیال آیا کہ بچھوؤں کی کرامت بڑی عجیب ہے۔ کاش ہم نے ایسے بزرگ بھی پیدا کیے ہوتے جو ہماری اندرونی لڑائیوں کو ختم کر دیتے یا وہ اس ہولناک جارحیت کو بے اثر کر دیتے جو آج مخالفین کی طرف سے ملت کو مسلسل پیش آ رہی ہے (صفحہ ۱۱)

ایک جگہ سڑک کے کنارے ماروتی کچلی ہوئی پڑی تھی۔ اس کو دیکھ کر ہمارے ساتھی نے کہا کہ مسافروں کا کیا حال بنا ہوگا۔ ڈرائیور نے اس کو سن کر کہا: کوئی نہیں بچا ہوگا۔

اسی طرح راستہ میں کئی گاڑیاں کچلی ہوئی یا الٹی ہوئی نظر آئیں۔ یہ مشینی دور کے حادثات تھے۔ قدیم زمانہ میں بھی حادثات ہوتے تھے مگر مشینی کے زمانہ نے حادثات کی تعداد بہت بڑھا دی ہے۔ اس دنیا میں ترقی حادثات اور مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ مگر آخرت کی دنیا وہ دنیا ہوگی جہاں ہر قسم کی بے حساب ترقیاں ہوں گی۔ لیکن مسائل اور حادثات وہاں یکسر ختم کر دیے جائیں گے۔

دہلی سے ہم لوگ ۲ بجے روانہ ہوئے تھے۔ مسلسل سفر کرنے کے بعد ۵ بجے شام کو ہم لوگ "مرشد آباد" پہنچے۔ ہماری گاڑی سڑک کے کنارے بنے ہوئے ایک گیٹ کے سامنے ٹھہری ہوئی۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس آہنی گیٹ کے اندر کیا ہے۔ گیٹ کھلا اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے تو اچانک ایک وسیع اور خوب صورت دنیا ہمارے سامنے تھی۔

یہ ایک سرسبز و شاداب دنیا تھی جس کو گلاب اسٹوڈیو کہا جاتا ہے۔ اس کے احاطہ میں ایک خوب صورت مسجد بھی ہے۔ یہاں ہم نے عصر کی نماز ادا کی۔ اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر یہ خواہش چھپی ہوئی ہے کہ وہ اپنے لیے ایک "گارڈن ہاؤس" بنائے۔ چنانچہ جس شخص کو بھی موقع ملتا ہے وہ فوراً اپنے لیے اس قسم کا ایک مکان تعمیر کرتا ہے جو درخت

اور تھوڑی دیر تک کے لیے سمندر میاں کھڑا ہوتا ہے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی اس کی کشش ختم ہو جاتی ہے اور پھر معلوم ہوتا ہے کہ فطرت میں چھپی ہوئی تمنا در اصل آخرت کی حیات ابدی کے لیے ہے نہ کہ موجودہ ناقص دنیا کے لیے۔

"گلاب اسٹوڈیو" کے اونچے گیٹ پر اردو، ہندی، انگریزی میں لکھا ہوا تھا: محبت خدا ہے، خدا ہے محبت۔ میں نے کہا کہ محبت خدا نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ خدا محبت کو پسند کرتا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ بن کر رہیں۔

مرشد آباد" چپ شاہ میاں" کے نام پر تعمیر کیا گیا ہے۔ پانچ سال پہلے ان کا انتقال مراد آباد میں ہوگیا۔ موت سے پہلے ساڑھے بارہ سال تک مسلسل وہ چپ رہے۔ اس زمانہ میں وہ صرف لکھ کر جواب دیتے تھے، اس لیے چپ شاہ میاں کہے جانے لگے۔ گلاب اسٹوڈیو (مرشد آباد) کے ڈائرکٹر محمد نبی صاحب سے میں نے پوچھا کہ مذکورہ بزرگ چپ کیوں رہتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا: تپسیا کے لیے۔

اسلام میں زیادہ بولنا پسندیدہ نہیں۔ مگر تپسیا یا عبادت کے لیے چپ رہنا اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔ قرآن میں حضرت مریم کے بارہ میں ہے کہ مسیح کی پیدائش کے بعد وہ وقتی طور پر خاموش ہوگئی تھیں (مریم ۲۶) اس سے مفسرین نے یہ لیا ہے کہ یہودی شریعت میں چپ کا روزہ تھا۔ اس کے لیے بائبل کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے: اے بنی آدم خداوند کے حضور خاموش رہو کیوں کہ وہ اپنے مقدس مسکن سے اٹھا ہے (زکریاہ ۲: ۱۳)

یہ استدلال زیادہ طاقت ور نہیں۔ تاہم اگر یہودی شریعت میں چپ روزہ رہا ہو تو یقینی طور پر وہ محدود وقت کے لیے تھا۔ سالہا سال تک متواتر چپ رہنا یہ الہامی شریعتوں کے مزاج کے مطابق نہیں۔ البتہ ہندو روایات میں یہ قدیم زمانہ سے آج تک پایا جاتا ہے۔ اور مسلم صوفیوں نے یقینی طور پر اس کو ہندو روایات سے لیا ہے نہ کہ قرآن وسنت سے۔

ساڑھے چھ بجے شام کو ہم لوگ مراد آباد پہنچے۔ مغرب کی نماز مراد آباد میں پڑھی گئی۔ یہاں میرا قیام لاجپت نگر کے علاقہ میں عبد الرحمٰن صاحب کے مکان پر تھا۔ وہ یہاں ایک بینک میں منیجر ہیں۔

میرے میزبان نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ کیا کھائیں گے۔ میں نے کہا میں معمولی کھانا چاہتا ہوں کہ سادہ زندگی اور اونچی سوچ:

Simple living, high thinking

کھانے کے معاملہ میں میرا کوئی شوق نہیں۔ اور دعوتی کھانے تو مجھے بیزاری کی حد تک ناپسند ہیں۔ جو کھانا سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ مل جائے وہی میرا سب سے زیادہ پسندیدہ کھانا ہے۔

عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں علماء اور دین دار لوگ بھی سادہ کھانے کی سنت کو بالکل بھول گئے ہیں۔ لوگوں کے سفرناموں میں اکثر پر تکلف کھانے اور شاندار ناشتے کا ذکر ہوتا ہے۔ ایسی دعوتوں سے محظوظ ہونا تو درکنار مجھے کاغذ کے صفحہ پر بھی اس کو پڑھتے ہوئے شرم آتی ہے۔

ایک دینی ماہنامہ میں ایک عالم کی صاحبزادی کی شادی کی تقریب اور ضیافت کا تفصیلی تذکرہ پڑھا۔ مذکورہ عالم کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی اس روداد کا ایک حصہ یہ تھا:

"نقوی صاحب کے تعلق سے شادی کی اس پر بہار محفل میں احباب نے بڑے بڑے ادبی نکتے پیش کیے۔ ایک صاحب نے انہیں کھانے کی میز پر دوستوں کے ساتھ چہچہاتے ہوئے دیکھ کر علامہ اقبال کے اس شعر میں تصحیف کر ڈالی:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چوں مرغ آید تبسم بر لب اوست

(مرد مومن کی پہچان یہ ہے کہ اس کے سامنے بھنا ہوا مرغ پیش کیا جائے تو مارے خوشی کے اس کا چہرہ دمک اٹھے) ایک دوست نے ٹوکا کہ اقبال نے "مرغ" نہیں "مرگ" کہا ہے تو اراکانِ بزم نے کہا کہ بے چارے مرغ کی مرگ ہی کے صدقے میں نقوی صاحب کو چہچہانے کا موقع ملا ہے۔ زندہ مرغ کی کیا وہ چونچ سے مشق آزمائی کرتے (البلاغ، دسمبر ۱۹۹۵، صفحہ ۵۴)

مرادآباد یوپی کا ایک صنعتی شہر ہے۔ وہ رام گنگا کے کنارے واقع ہے۔ مرادآباد کو مغل حاکم رستم خاں نے ۱۶۲۵ء میں بسایا تھا۔ شہر کے شمال کا قدیم قلعہ اور جامع مسجد رستم خاں کی تعمیری یادگار کے طور پر ابھی تک باقی ہیں۔

شہری زندگی کو ایک طریق زندگی (way of life) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلام میں اجتماعیت اور منظم زندگی کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ مومنانہ زندگی شہر ہی میں

[illegible] صرف شہر میں گزاری جا سکتی ہے :

..the good Muslim life could be properly lived only in a town. (3/642)

[illegible] وجہ ہے کہ مسلمان جب دنیا میں پھیلے تو انھوں نے جگہ جگہ بستیاں اور شہر تعمیر کیے۔ اب بھی زیادہ تر شہروں ہی میں مسلمانوں کا ارتکاز پایا جاتا ہے۔

۹ مارچ کی شام کو عبد الرحمٰن صاحب کے مکان پر کئی آدمی آگئے۔ اس طرح مجلس کے انداز میں دیر تک اسلامی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ یہ مجلس رات کو دیر تک جاری رہی۔

ہم لوگ گفتگو میں مشغول تھے۔ اچانک باہر سے پٹاخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ بنگلور میں ہونے والے کرکٹ میچ کے کوارٹر فائنل میں انڈیا اور پاکستان کا مقابلہ تھا، اس میں انڈیا جیت گیا۔ چنانچہ لڑکے پٹاخہ چھوڑ کر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔

۱۲ مارچ کو ایک خصوصی ہوائی جہاز پاکستانی کھلاڑیوں کو لے کر بنگلور سے لاہور پہنچا۔ تاہم وہ خود اپنے ملک کے ایرپورٹ پر اتر نہ سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوارٹر فائنل (quarter-final) میں شکست کی خبر سن کر پاکستانی نوجوان بڑی تعداد میں لاہور ایرپورٹ پر اکٹھا ہو گئے۔ وہ سخت غصہ میں تھے اور اپنے ساتھ گندے انڈے لائے تھے تاکہ پاکستانی ٹیم کے ممبروں پر اسے پھینک کر ان کا استقبال کریں۔

اس ماحول کو دیکھ کر ذمہ داروں نے پاکستانی ٹیم کا جہاز فضا ہی سے واپس کر کے اسے کراچی بھیج دیا۔ اس کے بعد پاکستانی نوجوانوں نے ایرپورٹ پر ہنگامہ کیا۔ انھوں نے پاکستانی ٹیم کے لیڈر وسیم اکرم کا پتلا جلایا۔ لاہور میں وسیم اکرم کے مکان پر پہنچ کر اس پر پتھر پھینکے اور توڑ پھوڑ کی۔ بعد کو مسٹر وسیم اکرم نے بتایا کہ انھیں ٹیلی فون پر موت کی دھمکی مل رہی ہے۔

اس کے بعد ۱۳ مارچ کو دوسرا واقعہ ہوا۔ اس بار کلکتہ میں ولس ورلڈ کپ (Wills World Cup) کے سیمی فائنل مقابلہ میں انڈیا کی کرکٹ ٹیم کو سری لنکا کی کرکٹ ٹیم نے ہرا دیا۔ اس پر ایڈن گارڈن کے اسٹیڈیم میں ہندستانی تماشائیوں نے زبردست ہنگامہ کیا۔ سارا اسٹیڈیم اچانک توڑ پھوڑ کا منظر پیش کرنے لگا۔ اخباری رپورٹ کے مطابق، دونوں ملکوں میں کئی لوگوں نے اپنے ٹی وی سیٹ توڑ ڈالے اور پھر خودکشی کر لی۔

میچ کی ہار جیت صرف ٹیموں کی ہار جیت ہے وہ ملکوں کی ہار جیت نہیں مگر [illegible]
میں عملاً اس طرح ایسا صحافتی حلقوں میں بھی اس کو انتہائی غیر ضروری طور پر ملکوں کی ہار جیت بنا دیا گیا
ہے۔ ہندستان کی کرکٹ ٹیم بنگلور کے کوارٹر فائنل میں جیت گئی تو اس کی خبر اخبارات [illegible]
میں چھپی کہ ہندستان نے پاکستان کو ذلت آمیز شکست دی۔ اس کے بعد کلکتہ کے سیمی فائنل
میں جو واقعہ ہوا تو ٹائمس آف انڈیا (۱۴ مارچ ۱۹۹۶) نے صفحہ اول کی پہلی سرخی اس طرح لگائی
— سری لنکا نے انڈیا کو کچل دیا:

Sri Lankans crush India

ایک مبصر کے الفاظ میں، یہ اسپورٹنگ سلوک (sporting behaviour) نہیں ہے بلکہ فسادی سلوک (riotous behaviour) کا مظاہرہ ہے۔

بنگلور میں ہندستان اور پاکستان کے درمیان جو میچ ہوا اس موقع پر پاکستان کے اخبارات میں اس قسم کی رپورٹیں چھپیں۔ گویا یہ دو ٹیموں کا کھیل نہیں ہے بلکہ دو ملکوں کی زندگی اور موت کی جنگ ہے۔ مثلاً پاکستانی روزنامہ نوائے وقت (۹ مارچ ۱۹۹۶) کے صفحہ اول کی ایک رپورٹ کی سرخی یہ تھی: پاکستان آج بھارت سے ٹکرائے گا۔ اسی بات کو روزنامہ قومی آواز (۱۱ مارچ ۱۹۹۶) کے ایک مضمون میں ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا تھا: کھیل کے میدان پر قوموں کی جنگ۔ اس قسم کی سنسنی خیز رپورٹنگ ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ یہ دونوں ہی ملکوں میں رائج ہے اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ بنگلور کی شکست نے پاکستان کا مذکورہ حال کیا، اور اس کے بعد کلکتہ کی شکست نے ہندستان کا۔

کھیل کی اسپرٹ یہ ہے کہ لوگ آپس میں مقابلہ کریں۔ مگر اس کے بعد وہ ہار جیت سے اوپر اٹھ کر آپس میں ایک دوسرے کے دوست بنے رہیں۔ مگر آج عملاً اس کے برعکس پیش آرہا ہے۔ کھیل کا میچ دو دشمنوں کے درمیان جنگ کے ہم معنی بن گیا ہے۔

مراد آباد سے ایک روزنامہ آئینہ عالم نکلتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۰ مارچ میں یہ خبر تھی کہ تھانہ کوتوالی کے تحت منڈی چوک میں رات کو ہندستانی ٹیم کے ذریعہ پاکستانی ٹیم کو شکست دینے پر کرکٹ شائقین نے نعرے بازی کی جس پر پولس نے لاٹھی چارج کر دیا۔ اس میں تقریباً چھ افراد

[illegible] شہر میں جیت کی خوشی میں پٹاخے چھوڑے گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ نوجوان نعرے بلند کرتے ہوئے جلوس کی شکل میں دوسرے فرقے کے علاقے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس پر پولس نے لاٹھی چارج کیا۔

ایک اردو ہفت روزہ کا شمارہ ۱۴ مارچ ۱۹۹۶ دیکھا۔ اس کے صفحہ اول پر ایک خبر تھی۔ اس کی سرخی لال رنگ میں اس طرح چھپی ہوئی تھی: فرقہ وارانہ فسادات کی سازش۔

میں نے جناب عبدالرحمٰن مراد آبادی (۶۰ سال) سے کہا کہ اس سرخی پر تبصرہ کیجئے۔ انھوں نے کہا: جب سازش کا پتہ لگ گیا تو فوراً اس کو ناکام کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ سازش سازش کا شور مچانے سے کیا فائدہ۔

عبدالرحمٰن صاحب مراد آباد کے ایک بینک میں منیجر ہیں۔ ان کا یہ تبصرہ فطرت کا تبصرہ تھا۔ مصلح اگر سنجیدہ ہے تو یقیناً وہ یہی کرے گا کہ سازش کا علم ہونے کے بعد وہ اس کو ناکام کرنے کی تدبیر کرے گا۔ جب وہ اپنی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اس کو ناکام کر چکا ہوگا تو اس وقت وہ دنیا کو بتائے گا کہ دیکھو، یہ ہے سازش کو ختم کرنے کا طریقہ۔

مراد آباد کے ایک صاحب نے بتایا کہ یہاں کے ایک تعلیم یافتہ نے امریکہ کا سفر کیا۔ واپسی کے بعد میں نے پوچھا کہ امریکہ اور ہندستان میں آپ نے کیا فرق دیکھا۔ انھوں نے کہا: وہاں خدا کا گناہ ہے، یہاں بندوں کا گناہ۔ وہاں کے لوگ خدا کے حکم کو توڑتے ہیں، مگر وہ انسان کو نہیں ستاتے۔ یہاں کے لوگ خدا کے حکم کو تو مانتے ہیں، مگر وہ انسان کو ستانے سے باز نہیں آتے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ منافقت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ منافقت نام ہے ڈبل کریڈٹ لینے کا۔ مثلاً آپ جہاد کی باتیں کریں مگر عملی طور پر جہاد میں شریک نہ ہوں۔ زبان سے اپنے آپ کو جہاد پسند بتائیں اور عملاً اپنے آپ کو اور اپنے بیٹوں کو جہاد کے میدان سے دور رکھیں۔

غلام مصطفےٰ رحیمی (۶۲ سال) نے بتایا کہ میں الرسالہ کے اس نظریہ سے مکمل طور پر متفق ہوں کہ فرقہ وارانہ فسادات کا قابل عمل حل صرف ایک ہے، اور وہ صبر اور حکمت ہے۔ اس

سلسلہ میں انھوں نے اپنے کئی واقعات بتائے۔ مثلاً ایک بار ایسا ہوا کہ یہاں کی ایک مسجد میں کسی شرپسند آدمی نے خنزیر کا گوشت ڈال دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان صبح کو دیکھ کر بھڑک اٹھیں گے اور پھر انھیں فساد کرنے اور لوٹ مار کرنے کا موقع مل جائے گا۔ رحیمی صاحب نے خاموشی کے ساتھ گوشت کو اٹھا کر دور گڑھے میں ڈال دیا اور مسجد کو پانی سے دھو دیا۔ اس طرح سازش کرنے والوں کی سازش پہلے ہی مرحلہ میں ناکام ہو گئی۔ انھیں ڈی ایس پی کی طرف سے ایک سرٹیفکٹ دیا گیا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

Phone : 3066

Ashok Misra

Deputy S. P.

MORADABAD-244001

I feel great pleasure to certify that Shri Ghulam Mustafa Rahimi s/O mohalla Peerzada, Thana Katghar, Moradabad showed his great adventure at Eid Ghah on 13.8.1980, when the rash mob was indulged in brickbatting the police, Police Officers and Civil Officers. The courage of the aforesaid gentleman saved many officers from brickbats and injuries. Primarily he tried to check the mob from doing so. When he found himself unable to control the mob, he, at the cost of his life, tried for the safe guard of the officers. I highly appreciate his adventurous efforts.

We must be proud of such selfless, non political and non-communal brave citizen of clear heart and mind.

I wish him every success in his life.

Ashok Mishra
(Deputy S.P.)

(अशोक कुमार मिश्र)
क्षेत्राधिकारी नगर
मुरादाबाद

ایک صاحب نے کہا کہ آپ جس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں اس کو ہندستان کے کتنے مسلمان مانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ سارے ہی مسلمان مانتے ہیں۔ غالباً کوئی ایک بھی ایسا مسلمان نہیں جو میری بات کو نہ مانتا ہو۔

ان کو اچنبھا ہوا۔ میں نے کہا کہ اس میں اچنبھا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کہتا ہوں وہ عین فطرت کی بات ہے، پھر کون ہے جو فطرت کو رد کر سکے۔ میں صبر و تحمل کی بات کرتا ہوں۔

صبر و تحمل تو اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ناگزیر ہے۔ گھر سنبھالنے کے لیے، دوکان چلانے کے لیے، کوئی بھی ادارہ چلانے کے لیے صبر و تحمل لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی کامیابی ممکن ہی نہیں۔ پھر کون ہے جو اس کو رد کر سکے۔

مرادآباد کی ایک سڑک پر چلتے ہوئے ایک چھوٹے سے پارک پر ایک تختی لگی ہوئی نظر آئی۔ اس پر لکھا تھا: جگر ایکشن کمیٹی۔ اس کو دیکھ کر یاد آیا کہ مشہور شاعر جگر اسی مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ ابتداءً وہ عینک بیچتے تھے۔ پھر ایک ذاتی حادثہ نے انھیں شاعر بنا دیا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں دیکھ رہا تھا کہ اس میں جگر کے بارہ میں کچھ ہے۔ اس میں جگر کا نام تو نہیں تھا، البتہ وہاں "جہاد" کا لفظ نظر پڑا۔ جہاد کی تشریح میں اس کا پہلا جملہ یہ تھا کہ جہاد ایک مذہبی ذمہ داری ہے جو مسلمانوں پر اس لیے عائد کی گئی ہے کہ وہ جنگ کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کریں:

Jihad, religious duty imposed on Muslims to spread Islam by waging war. (V/558)

جہاد کا یہ تصور اسلام کو ایک جنونی مذہب ثابت کرتا ہے، مگر اس کے ذمہ دار مستشرقین نہیں ہیں بلکہ موجودہ زمانہ کے وہ نام نہاد اسلامی مفکرین ہیں جنھوں نے اسلام کی جنگی تفسیر کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم نوجوان ساری دنیا میں لڑنے بھڑنے لگے اور اس طرح دوسروں کو اسلام کی غلط تصویر کشی کا موقع مل گیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں ظلم کو برداشت کرنا گناہ ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو اپنی بات کے لیے ہمیشہ آیت اور حدیث نقل کرتا ہوں۔ آپ بتائیے کہ قرآن و حدیث میں کہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ ظلم کو برداشت کرنا گناہ ہے۔ وہ کوئی آیت یا حدیث پیش نہ کر سکے۔ تاہم ان کی بحث جاری رہی۔ آخر میں میں نے کہا کہ یہ بات اگر آپ اسلام کے حوالے سے فرما رہے ہیں تو اس کی کوئی دلیل آپ کے پاس نہیں۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ اسلام کا لفظ نہ بولیں بلکہ خود اپنی بات کے طور پر اسے بیان کریں۔

[illegible] میرا قیام ایک ہوٹل میں تھا [illegible]

[illegible] والے بہت کم ہیں۔ یہاں صاف ستھرے مکانات ہیں۔ چوڑی سڑکیں [illegible]

ہے۔ نقصان کا تناسب بھی بہت کم ہے۔ اس کے برعکس حال ان علاقوں کا ہے جہاں [illegible]

مسلمان آباد ہیں۔ یہاں خستہ مکانات، تنگ راستے، ہر طرف کوڑا اور گندگی [illegible] بدبو پھیلی ہوئی۔ کچھ مسلمان جن کے پاس زیادہ دولت آگئی ہے، انھوں نے باہر کے علاقوں میں اچھے مکانات بنا لیے ہیں۔ مگر عام مسلمانوں کا حال وہی ہے جو بیان ہوا۔

اس صورت حال کا سب سے زیادہ دردناک پہلو یہ ہے کہ اس طرح کے ماحول میں رہنا ہمیشہ فکر و خیال میں سطحیت پیدا کرتا ہے۔ بدقسمتی سے یہی حال مرادآباد کے ان علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کا ہے اور اسی طرح دوسرے شہروں، مثلاً پرانی دہلی میں رہنے والے مسلمانوں کا۔

مرادآباد میں اگست ۱۹۸۰ میں فساد ہوا تھا جس میں مسلمانوں کا شدید نقصان ہوا۔ تاہم اس سے مسلمانوں میں عمل کا نیا جذبہ بھی بیدار ہوا۔ اس کی کئی مثالیں یہاں سننے اور دیکھنے کو ملیں۔ ایک مثال یہ ہے کہ یہاں کے ایک تاجر حاجی ابوالحسن صاحب ۱۹۸۳ میں اپنے گھر کے کچھ بچوں کو مقامی ولسونیا اسکول میں داخل کرنا چاہتے تھے، مگر ان کو وہاں داخلہ نہیں ملا۔ حاجی ابوالحسن صاحب اس سے بددل نہیں ہوئے۔ بلکہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ایک اسکول کھولیں گے۔ چنانچہ انھوں نے ذاتی کوشش سے ۱۹۸۳ میں ایک نیا اسکول قائم کیا جس کا نام ماڈرن پبلک اسکول ہے۔ اِس وقت وہ معیار کے اعتبار سے نمبر ایک اسکول سمجھا جاتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ اس سے مسلمانوں کو کیا فائدہ، جب کہ اس میں ۵۰ فی صد طلبہ غیر مسلم ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس میں مسلمانوں کو رعایتی داخلہ دیا جانا چاہیے۔ میں نے کہا کہ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں رعایت کا مطلب خودکشی ہے۔ آپ کو اپنے بچوں کو مقابلہ کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ رعایت محض ایک خیالی لفظ ہے، عملی زندگی میں اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔

... مراد آباد میں جو پیسہ والے مسلمان ہیں۔ ان سے اگر پوچھا جائے کہ تم اتنا پیسہ ... کیوں کماتے ہو۔ تو اس کا جواب ہوتا ہے: اس لیے کہ بچے آرام سے رہیں۔

میں نے کہا کہ بچوں کے آرام کے لیے جو لوگ دولت اور جائداد اکٹھا کریں وہ خود اپنی اولاد کے بارے میں کوئی عقل مندی نہیں کر رہے ہیں۔ تجربہ یہ ہے کہ بے محنت کے ملی ہوئی دولت آدمی کے اخلاق کو بگاڑتی ہے۔ وہ اس کے اندر سطحیت، حتی کہ آوارگی پیدا کر دیتی ہے۔ بچوں کے ساتھ سب سے پہلی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کو اعلیٰ تعلیم دلائی جائے، اور اس کے بعد دوسری ضرورت یہ ہے کہ ان کو محنت کے راستہ پر ڈالا جائے۔

میں نے یہاں کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے پوچھا کہ مراد آباد کے مسلمان اگلے الکشن (اپریل ۱۹۹۶) میں کس کو ووٹ دیں گے۔ انھوں نے جواب دیا: مراد آباد کے مسلمان اس کو ووٹ دیتے ہیں جو مسلمانوں کا گن گاتے ہیں۔

یہ جواب موجودہ مسلمانوں کی نفسیاتی کمزوری کو بتاتا ہے۔ وہ نصیحت کی بات، داخلی کوتاہیوں کی اصلاح کی بات کو ناپسند کرتے ہیں۔ البتہ جو شخص بڑے بڑے الفاظ بول کر انھیں ہوائی توقعات کا سبز باغ دکھائے اس کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔
یہ ٹھیک وہی نفسیات ہے جس میں یہود اپنے دور زوال میں مبتلا ہوئے۔ وہ ان افراد کو پسند کرنے لگے جو انھیں جھوٹی امید دلائیں (یرمیاہ ۳۰ : ۳۱) اور فرضی طور پر اچھی باتیں سنائیں۔ مسلمان اپنی اسی نفسیات کی بنا پر لمبی مدت سے سطحی لیڈروں کے استحصال کا شکار بنے ہوئے ہیں۔

مراد آباد میں ہزاروں چیزیں بنتی ہیں۔ یہ زیادہ تر گفٹ آئٹم ہوتے ہیں جو براس (پیتل) کے ذریعہ تیار کیے جاتے ہیں۔ براس خود کوئی مستقل دھات نہیں ہے۔ وہ دراصل مرکب دھات (alloy) ہے جو کاپر اور زنک کو ملانے سے تیار ہوتا ہے۔

مرکب دھات بنانے کا طریقہ قدیم زمانہ سے رائج ہے۔ مثلاً کاپر اور زنک کو ملا کر براس بنانے کا طریقہ حضرت مسیح سے ہزار سال پہلے موجود تھا۔ یہ تاریخ کا ایک حیرت انگیز سوال ہے کہ

دنیا میں دھاتوں کو ملا کر ایک نئی زیادہ کارآمد دھات بنانے کا طریقہ انسان نے کیسے جانا۔ اس موضوع کی تحقیق کرنے والے عام طور پر اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ کسی اتفاقی حادثہ (accidental mixing) کے نتیجہ میں اس کی دریافت ہوئی۔ یا دھاتی معدنیات کو صاف کرنے کے دوران غیر ارادی طور پر مل جانے والے مخلوط (unintentionally smelted mixture) کے ذریعہ انسان کے علم میں آئی۔ مگر یہ انتہائی انوکھا قیاس ہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ یہ ابتدائی علم پیغمبروں کے ذریعہ انسان کو دیا گیا۔

عبدالرحمن صاحب مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں۔ ان کے کمرہ کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی نظر آئیں۔ کچھ کتابیں دیکھیں۔ ان میں سے ایک کتاب حسب ذیل تھی:

100 Great Books, by John Canning, Souvenir Press Ltd., London, 1974.

۴۰۰ صفحہ کی یہ کتاب دہلی کی روپا کمپنی (پٹودی ہاؤس روڈ، دریا گنج) نے ۱۹۸۴ میں شائع کی ہے۔ اس کتاب میں جن عالمی کتابوں کا تذکرہ ہے ان میں سے ایک قرآن ہے۔ یہ باب ان الفاظ پر ختم ہوا ہے ——— یہ شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ قرآن، جس کو مسلمان افضل کتاب سمجھتے ہیں، وہ آج بھی انھیں اصل الفاظ پر مشتمل ہے جو صدیوں پہلے محمد نے خدائے واحد کے پیغمبر کی حیثیت سے ادا کیا تھا:

There is no reason to doubt that in the "Excellent Book," as the Moslems call the Koran, we have the actual words that Mohammed used, when, all those many centuries ago, he uttered his pronouncements as the Messenger or Apostle of Allah, the One Most High God. (p. 83)

جناب عبدالرحمن صاحب کے صاحبزادے نشاط الرحمن (۱۲ سال) نے کہا کہ آپ یہ بتائیے آپ الرسالہ لکھتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ بچوں کے لیے بھی کوئی اس طرح کی کتاب نکالنا چاہیے جب کہ الرسالہ بڑوں کے لیے ہے۔ اگر آپ کچھ لکھیں بچوں کے لیے تو اس کا ٹائٹل رکھیے گا — بچپن۔

میں نے کہا کہ ایک کام میں نے کیا، اب دوسرا کام آپ کریں گے۔ اگر سب کام میں ہی

ہو سکتا ہے کہ آپ بے کرنے کے لیے بے تاب رہے گا۔

جناب عبد الرحمٰن صاحب کی بڑی صاحبزادی جامعۃ الصالحات (رام پور) میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ وہ الرسالہ کی مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ ۲۵ سال سے الرسالہ نکال رہے ہیں اور ہر مہینہ نئے نئے مضامین اس میں چھاپتے ہیں۔ آخر آپ اتنے زمانے سے نئے نئے مضامین کیسے لکھتے ہیں۔

میں نے کہا کہ دنیا میں ہر کام خدا کی مدد سے ہوتا ہے۔ انسان کے پاس اپنی کوئی طاقت نہیں۔ الرسالہ کے تمام مضامین دعا کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آپ خدا سے دعا کیجئے، آپ بھی ایسا ہی پرچہ نکالنے لگیں گی۔

۱۰ مارچ کی صبح کو سوا پانچ بجے مسجدوں سے اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدائیں آنے لگیں۔ لاؤڈ اسپیکر کی آواز پوری فضا میں گونج اٹھی۔ اذان کی آواز سن کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میں نے کہا کہ تقسیم (۱۹۴۷) مسلمانوں کے لیے ایک قومی خودکشی تھی۔ مگر یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے اس ہمالیائی حماقت کے باوجود مسلمانوں کو اس ملک میں زندگی کے تمام مواقع فراوانی کے ساتھ دوبارہ عطا کر دیے۔

ملکی تقسیم کے اس دردناک پہلو کا اعتراف خود اس کے لیڈروں نے کیا تھا۔ مسٹر محمد علی جناح نے ٹھیک آج ہی کی تاریخ (۱۰ مارچ ۱۹۴۱) کو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کی تھی۔ اس میں انھوں نے کہا:

مسلم اقلیت کے صوبوں میں رہنے والے مسلمان خود دار اور بلند حوصلہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں رہنے والے بھائیوں کی نجات و آزادی کی خاطر ہم ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لیے تیار ہیں (حوالہ، نوائے وقت لاہور، ۲۴ فروری ۱۹۹۶)

عبد الرحمٰن صاحب اور میں وضو کر کے گھر سے نکلے۔ چلتے ہوئے ہم "ایک رات والی مسجد" میں پہنچے۔ یہاں ہم نے فجر کی نماز پڑھی۔ ہم دونوں اس وقت چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ سوا چھ بجے امام صاحب حجرے سے نکل کر آئے اور مصلے پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے کسی قدر تحکمانہ انداز میں کہا: چادر ہٹا دیجئے، اسمیٹ کر رکھ دیجئے۔ ہم نے فوراً اس کی تعمیل کی۔

گویا ہندستان آج بھی سیاسی غلام ہے۔ جب کہ ہندستان کو آزاد ہوئے نصف صدی ہونے کو ہے اور وہ ایک آزاد ملک بن چکا ہے۔

اسی طرح ہندستان ٹائمس (۱۰ مارچ) میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری جناب [illegible] کا ایک انٹرویو تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ نرسمہا راؤ کو یہ مہارت حاصل ہے کہ وہ اقتدار میں کس طرح قائم رہیں:

Narasimha Rao has the technical know-how to stay in power.

میں نے کہا کہ یہی ہمارے ملک کا سیاسی المیہ ہے۔ ہمارے ملک کے لیڈروں کو صرف اس فن کا ماہر بننے سے دلچسپی ہے کہ وہ کس طرح الکشن جیتیں اور پھر کس طرح اپنے سیاسی اقتدار کو باقی رکھیں۔ ان کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں کہ ملک ترقی کی طرف جائے۔ ملک کے عوام کی معاشی اور سماجی حالت بہتر ہو۔ آج کا اصل مسئلہ اس سیاسی مزاج کو بدلنا ہے نہ کہ اس پارٹی یا اُس پارٹی کے ہاتھ میں اقتدار دینا۔

مرادآباد کے جس مکان میں میں ٹھہرا تھا، اس کے گراؤنڈ فلور پر ایک صاحب رہتے ہیں۔ اس سفر میں پہلی بار ان سے واقفیت ہوئی:

M.A.I. Faizi, Faizi Lodge, B-600 Lajpat Nagar
Moradabad-244001 (Tel. 0591-315402, 315403)

۱۰ مارچ کی صبح کو مسٹر فیضی اپنے بزرگ والد مولانا عبدالرزاق صاحب کو لے کر آئے۔ موصوف ۱۹۱۱ میں خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۷ سے وہ مرادآباد میں اپنے صاحبزادہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس سے پہلے میں ان کو نہیں جانتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے آپ سے ملنے کی بہت خواہش تھی۔ آج اللہ کے فضل سے اس کا موقع مل گیا۔

مولانا عبدالرزاق صاحب نے موجودہ زمانہ کے تمام علماء اور مفکرین کو پڑھا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے وہ خصوصی مداح ہیں اور ان سے اتفاق رکھتے ہیں۔ میرے بارہ میں بار بار وہ کہتے رہے کہ "آپ ان کے شاگرد تھے۔ مگر خدا نے آپ کو ان سے بھی آگے بڑھا دیا۔ گرو گڑ رہ گئے، چیلا شکر ہو گئے۔"

ان سے میں نے کہا کہ اپنی زندگی کا کوئی تجربہ بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ "ہم کو صرف معیاری آدمی پسند ہے، غیر معیاری آدمی سے ہم ہاتھ بھی نہیں ملاتے"۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ ان کو مجھ سے پوری واقفیت تھی۔ وہ میری تمام تحریریں پڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کے مخالفین بہت ہیں۔ مگر خدا آپ کے ساتھ ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے یہ شعر پڑھا :

دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است

ایک صاحب نے پوچھا کہ یہاں رواج ہے کہ جب کسی غیر مسلم کا جنازہ گزرتا ہے تو مسلمان اس کو دیکھ کر کہتے ہیں : فی النار وبئس القرار۔ اس کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔

میں نے کہا کہ ایسا کہنا سخت گناہ ہے۔ کیوں کہ یہ خدا کے کام کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ آخرت کا انجام تمام تر خدا کے اختیار میں ہے، اور خدا نے ہمیں یہ منصب نہیں دیا ہے کہ ہم یہاں اس کے فیصلہ کا اعلان کریں۔

پھر میں نے کہا کہ تمام باتوں کو جانچنے کے لیے صرف ایک ہی صحیح کسوٹی ہے۔ اور وہ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کی کسوٹی ہے۔ جب بھی کسی بات کا شرعی حکم معلوم کرنا ہو تو رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے زمانہ کو دیکھئے۔ اگر وہاں اس کی مثال موجود ہے تو وہ درست ہے، ورنہ وہ سراسر گمراہی ہے۔

۱۹۸۰ کے تلخ تجربہ نے مراد آباد کے مسلمانوں کو بالکل بدل دیا ہے۔ اب وہ بھڑکنے والی باتوں کو نظر انداز کرنا سیکھ گئے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۴ مارچ ۱۹۹۶ کو ہولی کا دن تھا۔ ہندو حسب معمول رنگ کی ہولی کھیل رہے تھے۔ اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو بھیانک فساد بننے کے لیے کافی تھا۔ مگر نظر انداز کرنے کی پالیسی نے اس کو پہلے ہی مرحلہ میں ڈیفیوز کر دیا۔

برتن بازار (مراد آباد) میں عطر کی ایک دکان ہے جس کا نام نشاط پرفیومری ہے۔ وہ ۱۹۱۵ میں قائم ہوئی۔ اس کے موجودہ مالک جناب منصور احمد صاحب ہیں۔ ۱۰ مارچ کو میں نے خود جا کر یہ دکان دیکھی۔ ہولی کے دن ایسا ہوا کہ رنگ سے بھری ہوئی ایک پوری بالٹی ایک ہندو نوجوان نے پھینکی جس سے دکان کا فرش اور تمام چیزیں رنگین ہو گئیں۔ دکان پر بیٹھا ہوا نوجوان

کا رکن موجود مسلمان بھی پوری طرح بھیگ گیا۔

مالک مکان اس وقت دکان پر موجود نہیں تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ آئے تو وہ غصہ نہیں ہوئے۔ بلکہ تحقیق کی۔ معلوم ہوا کہ مذکورہ ہندو کا مقصد مسلم دکان میں رنگ پھینکنا نہیں تھا بلکہ وہ ایک اور شخص کے اوپر پھینک رہا تھا۔ وہ شخص بیٹھ گیا۔ اس طرح پوری بالٹی کا رنگ مسلم دکان میں آگیا جو قریب ہی بالکل سامنے کھلی ہوئی موجود تھی۔ مسلم دکان دار نے فوراً اپنی دکان بند کردی اور اس کے بعد رنگ کی صفائی کرادی۔

میں نے کہا کہ فرقہ وارانہ فساد کو روکنے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر نہیں جو اس معاملہ میں مفید ہو سکتی ہو۔

مرادآباد کے ایک پولیس افسر نے بتایا کہ یہاں کے لوگوں میں اب بہت بدلاؤ آیا ہے۔ پہلے یہ تھا کہ کوئی جھگڑے کی بات ہوتی تو دونوں کمیونٹی کے لوگ خود ہی ایک دوسرے سے الجھ جاتے تھے۔ اس سے فساد ہوتا تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ کوئی جھگڑے کی بات ہوتی ہے تو دونوں طرف کے لوگ فوراً پولیس کو خبر کرتے ہیں۔ پولس والے موقع پر پہنچتے ہیں تو ہر کمیونٹی خود بتاتی ہے کہ دیکھو فلاں آدمی گڑبڑ کر رہا ہے، اس کو پکڑ لو۔ اس طرح پولیس کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ چند لوگوں کو پکڑ کر تنبیہ کردی جاتی ہے، بات وہیں کی وہیں ختم ہو جاتی ہے فساد تک پہنچنے کی نوبت نہیں آتی۔

امر اجالا اس علاقہ کا سب سے بڑا ہندی روزنامہ ہے۔ ۱۰ مارچ کو اس کے ایک نوجوان نمائندہ انٹرویو کے لیے آئے۔ میں نے نام پوچھا تو انھوں نے اپنا نام وجے عالم بتایا۔ اس نام سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ اس طرح کا نام انھوں نے جان بوجھ کر رکھا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں ایک حلقہ ہے جس کا کہنا ہے کہ دیش میں ساری گڑبڑ ہندو ناموں اور مسلم ناموں کی وجہ سے ہے۔ اگر نام ایسے رکھے جائیں جس میں آدمی کی مذہبی شناخت چھپ جائے تو سماجی جھگڑے بھی ختم ہو جائیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ بہت سے ہندو ہیں جنھوں نے اپنا نام اس طرح رکھا ہے۔ یہ انٹرویو ۱۱ مارچ کے اخبار میں شائع ہوا۔ اس کو یہاں اگلے صفحہ پر نقل کیا جارہا ہے۔

इस्लामिक सेंटर के राष्ट्रीय अध्यक्ष मौलाना वहीद उद्दीन खान से बातचीत

दंगों के लिए अवसरवादी नेता जिम्मेदार

अमर उजाला ब्यूरो

मुरादाबाद, २० मार्च। इस्लामिक सेन्टर के राष्ट्री अध्यक्ष मौलाना वहीद उद्दीन खान ने कहा है कि साम्प्रदायिक दंगों से आर्थिक व जन हानि होने के साथ सामाजिक ढांचा भी टूटता है। दंगों की इस प्रवृत्ति को बढ़ावा देने के लिए उन्होंने अवसरवादी नेताओं को उत्तरदायी ठहराया है।

श्री खान ने कहा कि नकारात्मक सोच को खत्म करके सकारात्मक सोच की दिशा में समाज के बहाव को चलाने की आवश्यकता है। साम्प्रदायिकता की समस्या से निपटने के लिए आरोप लगाने की राजनीति को छोड़कर समस्या के समाधान खोजने की तरफ अग्रसर होना होगा। मीडिया की भूमिका की चर्चा करते हुए उन्होंने कहा कि अधिकांश समाचार पत्र साम्प्रदायिक सद्भाव के लिए कार्य करने वाली संस्थाओं के कार्यों को उतना महत्व नहीं देते जितना कि दिया जाना चाहिए।

यहां लाजपतनगर में इस्लामिक सेन्टर के कार्यकर्ता अबदुल रहमान के निवास पर एक विशेष बातचीत में मौलाना खान ने बताया कि वह पिछले तीस वर्षों से मुस्लिम समाज के बीच सही सोच के प्रचार प्रसार में जुटे हैं; इसके लिए वह तीन भाषाओं हिन्दी, उर्दू व अंग्रेजी में मासिक पत्र अलरिसाला का प्रकाशन कर रहे हैं जिसमें समाज के ज्वलन्त मुद्दों पर अपनी सोच रखते हुए विभाजनकारी ताकतों का पर्दाफाश करते रहे हैं। उन्होंने बताया कि इस्लामिक सेन्टर का उद्देश्य नकारात्मक सोच को खत्म करके सकारात्मक विचार को स्थापित करना है। उनके अनुसार जुलूस निकालने व बड़ी-बड़ी सभाएं करने में इस्लामिक सेन्टर का विश्वास नहीं है, क्योंकि इन तरीकों से धूम-धड़ाका तो किया जा सकता है लेकिन लोगों की सोच को नहीं बदला जा सकता।

उन्होंने दूसरे सम्प्रदाय के लोगों का अहंकार जगाने को दंगों का मुख्य कारण बताया। उन्होंने ६ दिसम्बर ९२ को अयोध्या में बाबरी मस्जिद को ढहाने की घटना को १९४७ के बाद दूसरी सबसे बड़ी घटना बताते हुए कहा कि इस घटना पर इस्लामिक सन्टर ने उस समय जो सोच रखी थी, उसे आज देश में अमल किया गया है। इस सोच में कहा गया था कि मुसलमान एक मस्जिद को भुला दे और हिन्दू एक के बाद दूसरी मस्जिदों को भुला दे, तभी देश का भला संभव है।

मौलाना वहीद उद्दीन खान ने कहा कि बाबरी मस्जिद को 'मिस्टर हिन्दू' ने नहीं बल्कि 'मिस्टर इगो' ने तोड़ा और मिस्टर हिन्दू को मिस्टर इगो बनाने वाले मुसलमानो के निकम्मे लीडर थे। उन्होंने कहा कि मुस्लिम नेताओं की स्वार्थ परक नीति से शिक्षा के प्रसार को गति नहीं मिल सकी है। अपने सगठन इस्लामिक सेन्टर के ढांचे के बारे में चर्चा करते हुए उन्होने बताया कि वह महात्मा गांधी की लोक सेवक सघ की अवधारणा के आधार पर लोकाचार सागठनिक ढाचे में विश्वास रखते हैं। इसलिए सगठन की गतिविधिया बड़े-बड़े आयोजनों के बजाय नुक्कड़ सभाओं व सम्पर्क गोष्ठियों के जरिए देश व देश के बाहर चलाई जाती हैं।

देश और धर्म के बीच अन्तर करते हुए उन्होंने कहा कि धर्म के लिए उदारता व सहिष्णुता की नीति अपनायी जानी चाहिए, लेकिन देशहित के साथ कोई समझौता नहीं किया जा सकता। देशहित सभी धर्मों व सम्प्रदायों से ऊपर है। 'अल-रिसाला' के मुख्य सम्पादक एव इस्लामिक सेन्टर के राष्ट्रीय अध्यक्ष ने विचार व्यक्त किये कि देश में आजादी के बाद शिक्षा का प्रसार नहीं हुआ। भारतीय सविधान में दस वर्षों में सबको हाईस्कूल तक की शिक्षा प्रदान करने का संकल्प लिया गया था, लेकिन यह कार्य आज भी पूरा नहीं हुआ है।

मौलाना वहीद उद्दीन खान ने महानगर में अपने प्रवास के दौरान पत्रकारों के अलावा इस्लामिक सेन्टर के सदस्यों, महिलाओं व बुद्धिजीवियों को भी अलग-अलग संबोधित किया तथा उनके सवालों का उत्तर दिया।

انٹرویو کے بعد غیر رسمی گفتگو میں انھوں نے بتایا کہ ۹۲-۱۹۹۱ میں کمیونل فیلنگ کا زور تھا، اب کاسٹ ازم کا زور ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہندوؤں میں کاسٹ ازم جتنا بڑھا ہے اس نسبت سے ان میں کمیونل فیلنگ گھٹ گئی ہے۔

یہاں کے دوران قیام میں کچھ اخبارات دیکھے۔ ہندی اخبار امراجالا (۹ مارچ ۱۹۹۶) کے درمیانی صفحہ پر مسٹر سریندر موہن کا مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا: بھرشٹاچار کو چناؤ مدا بنانا ہی چاہیے۔

اس کو دیکھ کر میں نے کہا کہ یہ ایک بے شعوری کی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک میں بھرشٹاچار کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ مگر بھرشٹاچار بذات خود کوئی انتخابی اشو نہیں۔ یہ تو صرف حکمرانوں کے خلاف چیخ و پکار ہے۔ چناؤ مدا صرف کوئی مثبت پروگرام ہو سکتا ہے۔ یعنی وہ پروگرام جس میں یہ یقین کیا جا سکے کہ بھرشٹاچار کو ختم کرنے کا اس میں حل موجود ہے۔ بھرشٹاچار کو چناؤ مدا بنانا بھرشٹاچار کا ایکسپلائٹیشن ہے۔ آج اصل مسئلہ متبادل سیاسی نظام کا ہے نہ کہ موجودہ نظام کے خلاف چیخ پکار کر کے لوگوں کی بھیڑ اکٹھا کرنا۔

۱۰ مارچ کی شام کو طویلہ اسٹریٹ گیا اور وہاں کی مسجد میں مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی۔ یہاں جناب اقبال احمد صاحب (Tel 23029) کے مکان پر اجتماع ہوا۔ مغرب اور عشاء کے درمیان یہاں ایک تقریر ہوئی۔ عشاء کے بعد دوبارہ نشست ہوئی۔ یہ نشست سوال و جواب کے لیے تھی۔ پروگرام مجموعی طور پر کئی گھنٹے تک جاری رہا۔

۱۱ مارچ ۱۹۹۶ کی صبح کو مراد آباد سے دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔ راستہ میں عبرت آموز مناظر دکھائی دیے۔ مثلاً ایک جگہ ٹرک الٹا ہوا پڑا تھا۔ آج کل شہر کے باہر جس سڑک پر نکلیے جگہ جگہ ٹرک الٹے ہوئے یا ٹکرا کر ٹوٹے ہوئے دکھائی دیں گے۔ میں نے کئی ٹرک والوں سے پوچھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ مگر کوئی ایک وجہ سامنے نہ آسکی۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ میں آزادی نے ہر آدمی کو غیر محتاط بنا دیا ہے۔ غالباً یہ غیر محتاط انداز میں گاڑی کو دوڑانے کا نتیجہ ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ خدا کے وجود کو ماننے کے لیے عقلی دلیل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ

آپ راستہ چلتے ہوئے سڑک کے کنارے ایک شاندار بلڈنگ دیکھتے ہیں جو فرنیچر اور دوسری تمام ضروریات کے ساتھ آراستہ ہے۔ اس بلڈنگ کے بارہ میں آپ کبھی یہ شبہہ نہیں کر سکتے کہ اس کو آرکیٹکٹ نے تیار کرایا ہے۔ یہاں آپ کے لیے انتخاب بلڈنگ مع انجینیر اور بلڈنگ بغیر انجینیر میں نہیں ہے بلکہ اصل انتخاب بلڈنگ مع انجینیر اور غیر موجود بلڈنگ میں ہے۔ چونکہ آپ غیر موجود بلڈنگ کا چوائس نہیں لے سکتے، اس لیے آپ مجبور ہیں کہ بلڈنگ مع انجینیر کا چوائس لیں۔

ٹھیک یہی معاملہ خدا کا ہے۔ بلڈنگ ہی کی مانند آپ اپنے کو اور ایک عظیم کائنات کو دیکھ رہے ہیں۔

The c[illegible] is not between universe with God and universe with[illegible] God The real choice is between universe with God or no u[illegible] at all

[illegible] کائنات کو [illegible] نہیں کر سکتے، اس لیے آپ مجبور ہیں کہ خدا کو مانیں۔ جس طرح آپ
[illegible] کی وجہ سے اس کے انجینیر کو ماننے پر مجبور ہیں۔

[illegible] نے کہا کہ میرے پاس الرسالہ کیسٹ کا سیٹ ہے۔ میں ان کو بہت سے
[illegible] سن کر پسند کرتے ہیں اور اتفاق کرتے ہیں۔ مگر ان میں حرکت
[illegible] ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر بے حسی آتی جا رہی ہے۔ آخر جس چیز
[illegible] اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔

[illegible] اعتراف سب سے اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ انسانیت کی بلندی یہ ہے
[illegible] صحیح سمجھے اس کو عملی طور پر اپنی زندگی میں اختیار کر لے۔ کسی انسان کے
[illegible] سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔

[illegible] ۱۹۹۰) میں ایک مضمون کھیل کے بارے میں تھا۔ اس کا عنوان تھا:
[illegible] سی۔ اس کو دیکھ کر میں نے کہا کہ یہ صرف کھیل کے میدان کی بات نہیں ہے۔
[illegible] میں کامیابی کا راز صرف ایک ہے، اور وہ صحیح تدبیر ہے۔ غلط تدبیر اس
[illegible] ناکام ہوتی ہے اور صحیح تدبیر ہمیشہ کامیاب۔

[illegible] شمسی برادری (پنجابی برادری) کا ایک ماہنامہ نکلتا ہے۔ اس کا نام شمسی آواز

ہم سایہ کے شمارہ مارچ ۱۹۹۶ میں ایک مضمون دستور مراد آباد [illegible] جس میں لکھا ہے کہ مراد آباد میں شمسی برادری کے بہت سے ادارے ہیں۔ مگر کسی میں بھی عہدوں کا جھگڑا نہیں ہوتا۔

حیرت کی بات ہے کہ یہاں جو فلاحی یا رفاہی ادارے ہیں، ان میں سے کسی میں بھی عہدے کی لڑائی نہیں۔ یہاں ایک مثالی مسافر خانہ ہے۔ مگر مسافر خانہ کے سو سال پورے ہونے تک صرف تین ناظم رہے۔ اسی طرح مدرسہ امدادیہ میں نصف صدی تک ایک ہی ناظم رہے [illegible] شمسی آواز نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ یہاں کبھی عہدوں کی لڑائی نہیں ہوئی۔

چھوٹی برادریوں میں اکثر اس قسم کی صفات پائی جاتی ہیں۔ مگر وسیع تر امت میں یہ ماحول موجود نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ برادریاں اپنی روایات پر چل رہی ہیں۔ ان کی روایات ٹوٹنے کی نوبت نہیں آتی۔ مگر امت میں نام نہاد لیڈروں نے جھوٹی اچھل کود مچا کر تمام روایات توڑ ڈالیں۔ روایت شکنی ایک ناقابلِ معافی جرم ہے۔ وہ عقل کے خلاف بھی ہے اور اسلام کے خلاف بھی۔ جیسا کہ معلوم ہے۔ نام نہاد انقلابی تحریکیں سب کی سب ملت کی سطح پر اٹھیں، اس قسم کی کوئی بھی تحریک برادریوں کی سطح پر نہیں اٹھی۔ یہی وجہ ہے کہ ملت میں روایتیں ٹوٹ گئیں، جب کہ برادریوں کی روایتیں نہیں ٹوٹیں۔

ڈاکٹر ظہور الحسن شارب مراد آباد میں ۹ جنوری ۱۹۱۴ کو پیدا ہوئے۔ حال میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ اپنی قسم کے انوکھے آدمی تھے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے وہ مراد آباد میں وکالت کرتے تھے۔ اپنے دفتر میں انھوں نے ایک ساتھ دو تصویریں لگا رکھی تھیں۔ ایک جواہر لال نہرو کی، اور دوسری محمد علی جناح کی۔

اس زمانہ میں دونوں لیڈروں میں زبردست اختلاف تھا۔ دونوں بالکل دو انتہا پر نظر آتے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے دفتر کو بیک وقت دونوں کی تصویروں سے کیوں سجایا۔ ان کے بعض جاننے والوں کا خیال ہے کہ ان کا نظریہ غالباً یہ تھا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر باکمال ہیں۔ اور کمال کی صفت خواہ کسی میں بھی ہو وہ بہر حال قابل اعتراف ہوتی ہے۔

مراد آباد میں ایک صاحب ہیں جو حافظِ قرآن ہیں اور ایک کالج کے پرنسپل بھی ہیں۔ وہ گرم مزاج ہیں، وہ اپنی گرم مزاجی کا سبب اللہ کے کلام کو سینے میں محفوظ رکھنا بتاتے ہیں۔ میری

اپنی رائے ہے کہ اللہ کے کلام سے گرم مزاجی اور بدمزاجی نہیں آسکتی۔ اس کو تو رحمت و عافیت کا سبب بننا چاہیے۔ صحیح پوزیشن سے آگاہ کرنے کی زحمت کریں۔

میرے ایک دوست کو آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ آج کے مسلمانوں کو سمجھانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی زندگی کی مثالیں دیتے ہیں۔ مگر آج کے انسان اور ان انسانوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ تو پھر کس طرح آج کا انسان وہ سب کیسے کر سکتا ہے۔ میری وضاحت اس بارے میں یہ تھی کہ بے شک آج کے انسان اور مسلمانوں کی ڈگری صحابہ کی ڈگری سے کم ہے۔ مگر اللہ کا پیغام جو حضور لے کر آئے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے قابل عمل ہے، اس لیے صحابہ کی مثال مناسب اور ضروری ہے۔ علمی وضاحت فرمایئے۔

مولوی حضرات اور مدرسہ سے وابستہ حضرات کھانے میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، یہ بات عام طور سے کہی بھی جاتی ہے اور عموماً مشاہدہ میں بھی آتی ہے۔ کیا حضور کی زندگی میں کوئی ایسا بھی پہلو ہے جس میں خوب سے خوب تر کھانے اور بہت کھانے کی طرف اشارہ ہو۔

مذہب کے ساتھ ساتھ قوموں کی تاریخ کا مطالعہ بھی آپ کا بہت وسیع ہے۔ ایک سچائی جاننا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی شاہ جہاں نے تاج محل بنانے والے کاریگروں کے ہاتھ کٹوا دیے تھے۔ یقین نہیں ہوتا کیوں کہ یہ لوگ مذہبی لوگ تھے۔

ہندستان میں عام طریقہ سے businessmen دو لیجر کا استعمال کرتے ہیں۔ ایک نمبر ا ہوتا ہے، دوسرا نمبر ۲۔ مسلمان بھی اس کام میں پیچھے نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام اسلامی رو سے ٹھیک نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہندستانی Tax System اور مسلمانوں کی ذمہ داری کی وضاحت اسلامی نقطۂ نظر سے کیجیے۔

میرے ایک ہندو دوست کا سوال ہے کہ اگر کسی مسلمان کا بیٹا اسلام پر یقین نہیں رکھتا ہے تو کیا اس کو گھر اور جائداد سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ اُن کا ماننا ہے کہ اکثر مسلمان ایسا ہی کرتے ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اس کی گنجائش نہیں کہ کسی کو اس کے واجبی حق سے محروم کر دیا جائے۔ برائے مہربانی مسئلہ کو واضح کیجیے۔

گوشت کے "حلال اور جھٹکا" کی اسلامی وضاحت کیجیے۔

کوئی حکمت اور نصیحت کی بات بتائیے کہ کس طرح ان لوگوں سے تال میل بنائے رکھا جائے جن کا intellectual level واقعی کم ہے اور دفتر میں وہ باس کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بینک میں میں بہت محنت اور لگن سے کام کرتا ہوں۔ مگر اندر سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجھے بینک میں دل چسپی نہیں ہے۔ کوئی ایسا کام جس سے علم کا حصول اور علم کا فروغ وابستہ ہو کرنے کا من کرتا ہے۔ اس تعلق سے حکمت و نصیحت کی بات بتائیے۔

اپریل ۱۹۹۶ کے الرسالہ میں ایک مضمون میں آپ نے کچھ مسائل کو "انتظار کے خانہ میں ڈالنے" کا مشورہ دیا ہے۔ یہ یقیناً ایک زبردست حکمت ہے۔ میری کلکٹری کی ٹریننگ شاید اسی حکمت پر عمل کرنے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

رازِ حیات ایک نایاب کتاب ہے۔ وہ واقعی تحفہ کے لائق ہے۔ مگر اردو میں ہونے کی وجہ سے اس کا دائرہ بہت مختصر ہے۔ جلد از جلد ہندی اور انگریزی میں ترجمہ کرانے کی زحمت کیجئے۔

دہلی کی ایک سڑک کے کنارے ایک بہت بڑے حیوان کا ڈھانچہ کھڑا ہوا ہے۔ یہ ڈائناسار (dinosaur) ہے۔ زمینی طبقات میں ایسی ہڈیاں یا ڈھانچے پائے گئے ہیں جن سے ماہرین نے یہ سمجھا ہے کہ تقریباً ۱۵۰ ملین سال پہلے زمین پر ہاتھی سے بھی زیادہ بڑے جانور چلتے پھرتے تھے۔ ان کی لمبائی تقریباً سو فٹ تک ہوتی تھی۔ دنیا کے تمام عجائب خانوں میں اس کے نمونے برائے نمائش رکھے گئے ہیں۔

مراد آباد کا ہفت روزہ اخبار خبردار جدید (۲۱ تا ۲۸ جون ۱۹۹۶) میں شائع شدہ ایک رپورٹ نظر سے گزری۔ جس کا عنوان یہ تھا: مراد آباد میں مسلم تعلیمی اداروں کا زوال۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ مراد آباد میں چند تعلیمی ادارے ہیں مگر وہ بھی اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ ہیوٹ مسلم انٹر کالج لڑکوں کے لیے اور عبد السلام مسلم گرلز کالج لڑکیوں کے لیے ۱۹۴۷ سے پہلے قائم ہوئے۔ ان اداروں کے بانیوں نے انھیں جہاں چھوڑا تھا آج بھی وہ وہیں ہیں۔ آج تک یہ اس لیے قائم ہیں کہ صوبائی حکومت انھیں پوری پوری رقمی گرانٹ دیتی ہے۔ ان کالجوں میں ڈگری کلاسز کا بھی اضافہ نہ کیا جا سکا۔ چنانچہ طلبا کو مزید تعلیم کے لیے دوسرے اداروں میں جانا پڑتا ہے۔ عبد السلام مسلم گرلز انٹر کالج میں کامرس اور سائنس کے مضامین کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔

یہ صرف مراد آباد کی بات نہیں بلکہ تقریباً ہر جگہ یہی حال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں کچھ اسکول کالج تو کھلے اور کئی یونیورسٹیاں بھی بنائی گئیں مگر تعلیمی شعور پیدا کرنے کی کوئی ہم چلائی نہ کی گئی۔ تعلیمی اداروں کا قیام جتنا ضروری ہے، اتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اندر تعلیم کی اہمیت کا شعور پیدا کیا جائے۔ قریبی سالوں میں مسلم نوجوان نسبتاً زیادہ بڑی تعداد میں تعلیمی اداروں میں داخلے لے رہے ہیں مگر وہ بھی کسی تعلیمی شعور کے تحت نہیں ہے بلکہ معاشی دباؤ کے تحت ہے۔ اس لیے اس سے بھی زیادہ فائدہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

۱۱ مارچ کو دہلی واپس آتے ہوئے بیشتر راستہ طے ہو چکا تھا کہ اچانک زور کی آواز کے ساتھ گاڑی کھڑی ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ اس کا ایک ٹایر پھٹ گیا۔ بظاہر اب گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ لیکن ڈرائیور اطمینان کے ساتھ اترا۔ اس کو معلوم تھا کہ گاڑی کے پچھلے حصہ میں ایک اسٹپنی (stepney) موجود ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً گاڑی کا ایک پہیہ نکالا اور اس کی جگہ دوسرا پہیہ (اسٹپنی) لگا دی۔ اب گاڑی دوبارہ اپنی رفتار کے ساتھ آگے کے لیے روانہ ہو گئی۔

میں نے سوچا کہ یہ صرف ایک گاڑی کا معاملہ نہیں ہے، یہی پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ زندگی کی دوڑ میں کسی بھی مرحلہ میں ایسا ہو سکتا ہے کہ سابقہ انتظام میں کوئی نقص پیدا ہو جائے اور اچانک زندگی کا سفر رک جائے۔ اس امکانی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے پاس ایک متبادل انتظام ہر وقت موجود ہو۔ اسی بات کو حالی نے اس طرح نظم کیا ہے:

سفینہ بنا رکھیں طوفان سے پہلے

۱۱ مارچ ۱۹۹۶ کو گیارہ بجے میں دہلی واپس آ گیا۔

۱ ہندی روزنامہ جے دن جی ٹائمس کے لیئے چیف رپورٹر مسٹر کمار کل اندان کے ساتھیوں نے ۲ فروری ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کر پچھلے پچاس سال میں انڈیا نے کیا حاصل کیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ آزادی کے بعد مطلوب ہندستان نہ بننے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ صحیح نقطۂ آغاز سے کام شروع نہیں کیا گیا۔ صحیح نقطۂ آغاز تعلیم تھا۔ مگر ہمارے لیڈروں نے اسٹیٹ اکانومی (سوشلزم) سے آغاز کیا جس کو بجا طور پر راج گوپال اچاری نے لائسنس پرمٹ راج کہا تھا۔

۲ ہندی میگزین نیا یگ چک کے اڈیٹر ر مودشری و استو نے ۲۱ فروری ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے تعلیم میں پیچھے ہونے کا تعلق ان کے مذہب سے نہیں ہے۔ چونکہ دیش پچھڑا ہوا ہے اس لئے مسلمان بھی پچھڑے ہوئے ہیں۔

۳ ۱۳ فروری ۱۹۹۷ کو آرگنائزر فورم کی طرف سے کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ شری آنند شنکر پانڈے کی کتاب (مسلمان پچھڑے کیوں ہیں) کے اجرا کے لئے کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تفصیلی تقریر میں بتایا کہ مسلمان پچھڑے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ترقی کر رہے ہیں۔ تقریر میں واقعات و حقائق کی روشنی میں یہ بھی بتایا گیا کہ مسلمان ملک کی مین اسٹریم میں شامل نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بھی اسی طرح مین اسٹریم میں شامل ہیں جس طرح ہندو شامل ہیں۔

۴ آریہ سماج کے دفتر (جنتر منتر روڈ، نئی دہلی) میں ۲۷ فروری ۱۹۹۷ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ یہ میٹنگ چندر شیکھر آزاد (پیدائش ۱۹۰۶) کی یاد میں ہوئی۔ صدر اسلامی مرکز

نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انھوں نے بتایا کہ چندر شیکھر آزاد ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ہندستان کی علامت ہیں۔ آج ہمیں نئے قسم کے نوجوان درکار ہیں، وہ نوجوان جو دیش میں نیشنل کیریکٹر لانے کی کوشش کریں۔

۵ سورج کنڈ (ہریانہ) میں سوادھیائے مومنٹ کی طرف سے ۲۷-۲۹ جنوری ۱۹۹۷ کو ایک میٹنگ ہوئی جس میں مختلف مقامات کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ہندستان میں تعمیر نو کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں تقریباً وہی باتیں کہی گئیں جو اس سے پہلے پائنیر ۲۶ جنوری ۱۹۹۷ میں چھپ چکی ہیں۔ ایک پائنٹ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا کہ ہندو مذہب کا فلسفہ مانزم (وحدت الوجود) کے اصول پر قائم ہے جبکہ اسلام کا مذہبی تصور مانوتھیزم (توحید) پر مبنی ہے۔ اس معاملہ کی تفصیل کے ساتھ واضح کیا گیا

۶ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے شعبہ سوشل سائنس کی طرف سے یونیورسٹی کے کانفرنس روم میں ۲۶ مارچ ۱۹۹۷ کو ایک میٹنگ ہوئی جس کا موضوع شریعت اسلامی میں نظام وطلاق کا مسئلہ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور اس موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینا شرعی قانون کا غلط استعمال ہے، وہ شریعت کا مقرر طریقہ نہیں۔

۷ ۳۰ مارچ کو امریکہ کے تین پروفیسر مرکز میں آئے۔ ان کے نام یہ ہیں: رابرٹ جی ورسنگ، جوزف ای شارٹس برگ، ہاورڈ بی شافر۔ یہ لوگ کشمیر اسٹڈی گروپ (امریکہ) کی طرف سے ہندستان آئے تھے۔ انھوں نے کشمیر کا مسئلہ اور ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ پر تفصیلی انٹرویو لیا۔ دونوں موضوعات کے بارے میں مفصل جوابات دئے گئے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کشمیر کے معاملہ میں دونوں ملکوں کو شملہ اگریمنٹ (۱۹۷۲) کے تحت عمل کرنا چاہئے۔ ہندستان اور پاکستان دونوں اس معاہدہ کے پابند ہیں جس پر دونوں ملکوں کے وزیر اعظم نے دستخط کئے تھے۔

۸ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۸ اپریل ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر براڈکاسٹ کی گئی۔ اس کا موضوع تھا: عید اضحیٰ سنت ابراہیمی کی روشنی میں۔ اس تقریر میں بتایا گیا کہ عید اضحیٰ کے موقع پر جانوروں کی قربانی ایک علامتی قربانی ہے۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ اس مشن میں اپنے آپ کو وقف کیا جائے جس میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اپنے آپ کو وقف کیا تھا۔

۹ ہفتے آنزرور کی سب اڈیٹر مسز رادھا پٹیل نے ۸ اپریل ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان کی مسلم کمیونٹی کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ آپ کو چاہئے کہ اسلام اور مسلمان میں فرق کریں۔ اور مسلمانوں کو اسلام سے جانچیں نہ کہ اسلام کو مسلمانوں سے۔

۱۰ کیتھولک بشپس آف انڈیا کی طرف سے انڈین سوشل انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) میں ایک تین روزہ سیمنار پیس اینڈ ریلیجن کے موضوع پر اس کی دعوت پر ۲۴ فروری ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز نے افتتاحی ایڈریس دیا۔ آدھ گھنٹہ کی تقریر انگریزی میں تھی۔ اس میں خصوصیت سے یہ بتایا گیا کہ اسلام کی تعلیمات مکمل طور پر امن اور سلامتی کے اصول پر مبنی ہیں۔

۱۱ اخبار اسٹیٹسمین کے نمائندہ ضیاء السلام نے ۸ مئی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اسلام کے ازدواجی قانون سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ پولیگمی کا تقابل آپ لوگ مونوگمی سے کرتے ہیں اس لئے کنفیوزن پیدا ہوتا ہے۔ آپ کو پولیگمی کا تقابل سکسول انارکی سے کرنا چاہئے کیونکہ یہ اجازت اس وقت کے لئے ہے جب کہ عورتیں سرپلس ہوگئی ہوں۔ ایسے حالات میں مغرب نے سکسول انارکی کا انتخاب کر رکھا ہے۔ جب کہ اسلام نے جائز حدود میں پولیگمی کے طریقہ کار کا انتخاب کیا ہے۔

۱۲ گرو گل گوتم نگر (نئی دہلی) میں ۱۹ اپریل ۱۹۹۷ کو آل انڈیا نشہ بندی کونسل ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور شراب بندی کی حمایت میں ایک تقریر کی۔ انھوں نے بتایا شراب اُم الخبائث ہے۔ وہ دوسری اکثر برائیوں کی جڑ ہے۔

جن ستہ کے نمائندہ مسٹر صفدر رضوی نے ۱۲ اپریل ۱۹۹۷ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملک کی موجودہ صورت حال سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ حالات میں ہندستان میں صرف مخلوط حکومت ہی بن سکتی ہے۔ ایسی حالت میں سیاسی پارٹیوں کو چاہئے کہ نظریاتی انتہا پسندی کا طریقہ چھوڑ دیں اور وسیع تر ملکی مفاد کی خاطر ملی جلی حکومت بنانے پر راضی ہو جائیں جیسا کہ ملیشیا میں اور دوسرے ملکوں میں عرصہ سے کامیابی کے ساتھ ہو رہا ہے۔

۱ فار ایسٹرن اکنامک ریویو (ہانگ کانگ) کے اسسٹنٹ ایڈیٹر (اے بی گھوش) نے ۲ مئی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ۵۰ سالہ ہندو مسلم تعلقات کے بارہ میں تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان کے مسلمان کسی خارجی سازش کا شکار نہیں ہوئے ہیں بلکہ خود اپنی نااہل قیادت کی غلط رہنمائی کا شکار ہوئے۔ گفتگو کے بعد انھیں ہندستانی مسلمان (انگریزی) کی ایک کاپی دی گئی۔

۱ این ڈی اے نیوز ایجنسی کے نمائندہ مسٹر نسیم نقوی نے حج کے موقع پر منیٰ میں ہونے والے حادثہ (۱۶ اپریل ۱۹۹۷) کے بارے میں تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس سلسلہ میں ضروری تفصیلات بتائی گئیں۔ یہ کہا گیا کہ اس حادثہ کا سبب سعودی حکومت کا ناقص انتظام نہیں تھا۔ اس کی تمام تر وجہ حاجیوں کی عدم تربیت تھی۔ اس سلسلہ میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ حج ہاؤس کی طرف سے حج کے لئے جانے والوں کی تربیت کے لئے اورینٹیشن کورس چلائے جائیں۔

۱ انگریزی میگزین کالی یگ (Kali Yug) کی نمائندہ مسز روپا شرما نے ۸ مئی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اسلام کی سماجی اور اخلاقی تعلیمات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جس طرح گیتا اور ہندو سماج دونوں ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ یہی معاملہ اسلام اور مسلمان کا ہے۔ آپ کو چاہئے کہ مسلمانوں کو اسلام کی روشنی میں دیکھیں نہ کہ مسلمانوں کی پریکٹس کو دیکھ کر اسلام کے بارہ میں رائے قائم کریں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near sys Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, [illegible]
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. [illegible]
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION,
481, Coventry Road, Birmingham [illegible]
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-[illegible]

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-[illegible]

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at [illegible], Delhi.

فروری ۱۹۹۸ ، شمارہ ۲۵۵

توکل کی حقیقت

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپ سے توکل علی اللہ کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، میں اپنے اونٹ کو باندھوں اور پھر خدا پر توکل کروں یا اونٹ کو چھوڑ دوں اور پھر توکل کروں۔ آپ نے فرمایا کہ اونٹ کو باندھو اور پھر خدا پر توکل کرو (یا رسول اللہ اعقلها و أتوكل أو أطلقها و أتوكل قال اعقلها و توكل) الترمذی

یہاں یہ سوال ہے کہ اونٹ کو باندھنے کے بعد توکل کیوں۔ بظاہر توکل یہ ہونا چاہیے کہ آدمی اپنے معاملہ کی تدبیر نہ کرے، اور یہ بھروسہ رکھے کہ خدا اس کے معاملے کو درست کر دے گا۔ جب آدمی خود ہی اپنے معاملے کی پوری تدبیر کر رہا ہو تو ایسی حالت میں بظاہر خدا پر بھروسہ ایک غیر ضروری امر دکھائی دیتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی کام کی تکمیل کے لیے ہمیشہ دو طرح کے عوامل ہوتے ہیں۔ ایک معلوم عوامل جو انسان کے اپنے بس میں ہوتے ہیں۔ دوسرے، غیر معلوم عوامل، جن کو انسان نہ جانتا ہے اور نہ ان کا اہتمام کر سکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی واقعہ ہمیشہ ان دونوں قسم کے اسباب کی یکجائی اور موافقت سے انجام پاتا ہے ــــ اگر ایک نوعیت کے عوامل موجود ہوں اور دوسری نوعیت کے عوامل موجود نہ ہوں تو اس دنیا میں کبھی کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آسکتا۔

مذکورہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے بس والے ظاہری اسباب کو استعمال کرنے میں کمی نہ کرے، وہ اپنی سمجھ اور اپنی طاقت کے مطابق اس کا پورا اہتمام کرے۔ اس اہتمام کے بعد وہ دعا کرے کہ خدایا، جو کچھ میرے بس میں تھا وہ میں نے کر دیا۔ اب جو کچھ میرے بس میں نہیں ہے ان کے لیے تو میری طرف سے کافی ہو جا، بقیہ اسباب جو تیرے اختیار میں ہیں ان کو بھی تو میری موافقت میں جمع کر دے۔ یہی مطلب ہے اس اسلامی مقولہ کا کہ ــــ (السعی منی والاتمام من اللہ) (کوشش میری طرف سے، اور اس کو تکمیل تک پہنچانا خدا کی طرف سے)

آدمی خواہ کتنا ہی کوشش کرے پھر بھی کچھ اسباب اس کے دائرہ سے باہر رہتے ہیں۔ آدمی اپنی کوشش میں صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ یہ بقیہ اسباب خدا کی مدد سے اس کے موافق ہو جائیں۔

نیوز ۲۴

بی بی سی لندن نے اپنے ٹی وی پر ایک نیا چینل شروع کیا ہے۔ اس کا نام نیوز ۲۴ (News-24) ہے۔ وہ ۲۴ گھنٹے چلے گا اور رات دن کے ہر لمحہ میں اہل برطانیہ کو خبریں فراہم کرتا رہے گا۔

میں نے اس خبر کو پڑھا تو اچانک میرے دماغ میں آیا کہ اسی قسم کا ایک اور زیادہ بڑا ہمہ وقتی چینل ہے جو نہ صرف رات دن چل رہا ہے بلکہ وہ کروڑوں سال سے جاری ہے۔ مزید یہ کہ وہ کسی ایک ملک کو خبریں دینے کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ سارے عالم کو اور تمام انسانی نسلوں کو مسلسل خبریں دے رہا ہے۔

یہ کائناتی ٹی وی وہ ہے جس کو خود کائنات کے خالق نے قائم کیا ہے۔ دنیا کی ہر چیز پہاڑوں اور سمندروں سے لے کر درخت کے پتوں اور صحرا کے ذروں تک ہر چیز گویا اس کائناتی خبر رسانی کے نظام کا ٹی وی سیٹ ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں ہر لمحہ یہ پیغام دے رہی ہیں کہ یہ کائنات کس لیے پیدا کی گئی ہے۔ انسان کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور انسان کا مستقبل آخر کار کس چیز سے وابستہ ہے۔ پہاڑ اور درخت جیسی چیزیں اگر خاموش زبان میں یہ خبریں دے رہی ہیں تو سمندر کی موجیں اور چڑیوں کے چہچہے اس خبر کو بلند آواز میں نشر کر رہے ہیں۔

انسان کی تخلیق اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ وہ اس عالمی خبر رسانی سے بھرپور استفادہ کر سکے۔ انسان کو آنکھیں اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ اس خدائی ٹی وی کے مناظر کو دیکھے۔ انسان کو جو کان دیے گئے ہیں وہ اسی لیے ہیں کہ وہ اس نشریاتی نظام کی آوازوں کو سنے۔ انسان کو دماغ اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ اس مشاہدہ اور سماعت کا تجزیہ کر کے ان سے سبق حاصل کرے۔ انسان کو دل اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ ان ربانی خبروں پر تڑپے۔ انسان کو ہاتھ اور پاؤں اس لیے دیے گئے ہیں کہ وہ ان خبروں کے مطابق ہمہ تن متحرک ہو جائے۔

جنت ان لوگوں کے لیے ہے جو خدائی خبر رسانی کے اس عالمی نظام سے رہنمائی حاصل کریں۔ اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنا لیں۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو اس رہنمائی کو لینے میں ناکام رہیں۔ ایسے لوگ گویا کہ اندھے اور بہرے ہیں۔ وہ مستقبل کی ابدی زندگی میں بھی اندھے اور بہرے بنے رہیں گے۔

وَن مَین ٹو مشن

۱۰ دسمبر ۱۹۹۶ کو مسٹر مقصود عالم (پیدائش ۱۹۳۶) سے ملاقات ہوئی۔ وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں اور دہلی میں پریکٹس کرتے ہیں۔ اپنی دیانت اور مہارت کی بنا پر وہ لوگوں کے درمیان ایک مقبول شخصیت بن گئے ہیں۔ میرا طریقہ ہے کہ جب میں کسی سے ملتا ہوں تو اس سے یہ کہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے تجربات بتائیے۔ چنانچہ مسٹر مقصود عالم سے بھی میں نے یہی سوال کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کئی تجربات بتائے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ اس انسان کی ایک کامیاب مثال ہیں جس کو خود انھیں کے الفاظ میں ایک آدمی، دو مشن (one man, two missions) کہا جا سکتا ہے۔

اپنے مشن میں دیانت دارانہ خدمت کی وجہ سے وہ دہلی کے اعلیٰ طبقوں میں ایک قابل اعتماد شخص بن گئے ہیں۔ ان کی بات کو لوگ سنتے ہیں اور مانتے ہیں۔ اپنی اس پوزیشن کا وہ یہ تعمیری فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ وہ مذہبی اور رفاہی اور تعلیمی اداروں کی رضاکارانہ خدمت کر رہے ہیں۔ وہ ان اداروں کو صرف مفید قانونی مشورے دیتے ہیں بلکہ ان اداروں کو صاحب حیثیت افراد سے مسلسل تعاون دلاتے رہتے ہیں۔ ان کے کہنے پر یہ لوگ خوشی سے ان اداروں کو تعاون دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جب مقصود عالم صاحب ان کے لیے سفارش کر رہے ہیں تو وہ ضرور ایسا ادارہ ہوگا جس کی مدد کی جائے۔

یہ بلاشبہ ایک قابل تقلید مثال ہے۔ ہمارے درمیان ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو "وَن مَین ٹو مشن" کا یہ رول ادا کرنے کے اہل ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ ایک طرف وہ اپنی معاش کے لیے اپنا پسندیدہ کام کریں، دوسری طرف وہ یہ کریں کہ اپنی حاصل کردہ پوزیشن کو اس مقصد کے لیے استعمال کریں کہ اپنے حلقہ میں لوگوں کو آمادہ کریں کہ وہ ان اداروں کا تعاون کریں جو مختلف میدان میں انسانیت کی کوئی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح ہر آدمی بیک وقت دو کردار ادا کر سکتا ہے۔ ایک طرف وہ اپنی معاشی ضرورت فراہم کرے، اسی کے ساتھ وہ دوسروں کی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ بن جائے۔

تعمیر ملت کا بہترین پروگرام یہ ہے کہ ہر آدمی وَن مَین ٹو مشن کا نمونہ بن جائے۔

مغربی تہذیب اور اسلام

صحیح البخاری میں روایت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن الله ليؤيد هذا الدين بالرجل الفاجر (اللہ اس دین کی مدد فاجر wicked شخص سے بھی کرے گا) یہ حدیث ڈکوٹومس تھنکنگ (dichotomous thinking) کے اعتبار سے بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ثنائی طرز فکر کا عملی جواب ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان صرف دو کیٹگری — صالح اور فاجر میں تقسیم نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کی ایک تیسری قسم بھی ہے، اور وہ مؤید (supporter) کی ہے۔ یعنی ایک انسان بظاہر صالح نہیں ہے، بظاہر وہ فاجر دکھائی دیتا ہے۔ تب بھی یقینی طور پر اس کے اندر ایک تیسری صفت ہوسکتی ہے، اور وہ یہ کہ وہ کسی اعتبار سے ہمارے لیے تائید (support) کا ذریعہ بن جائے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں حدیبیہ اسی غیر ثنائی طرز فکر کی ایک عملی مثال ہے۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے حدیبیہ کا فریق مقابل اسلام دوست نہ تھا، اس لیے لوگوں نے اپنے ثنائی ذہن کے مطابق یہ سمجھ لیا کہ وہ اسلام دشمن ہے۔ مگر پیغمبر اسلام اپنی ربانی فراست (وزڈم) کی بنا پر اس dichotomy کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے دریافت کرلیا کہ یہاں ایک تیسری صورت بھی موجود ہے۔ اور وہ خود فریق مخالف میں دعوت کے چھپے ہوئے امکانات ہیں۔ چنانچہ آپ نے فریق ثانی سے امن کا معاہدہ کرکے دعوت کے امکانات کو کھول دیا۔ اس کے بعد موافق ماحول میں دعوت کے امکانات استعمال ہونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال میں اسلام کی تاریخ بدل گئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب کا معاملہ بھی عین یہی ہے۔ آج دوبارہ مسلمان اس معاملہ میں اسی قسم کی dichotomy کا شکار ہورہے ہیں۔ چوں کہ بظاہر مغربی تہذیب انھیں اسلام دوست دکھائی نہیں دیتی اس لیے ثنائی طرز فکر کی بنا پر وہ سمجھ لیتے ہیں کہ مغربی تہذیب اسلام کی دشمن ہے۔ حتی کہ کچھ انتہا پسند (extremists) اس کو دجال بتا رہے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس dichotomy سے باہر آجائیں تو معلوم ہوگا کہ مغربی تہذیب اگر اسلام دوست نہیں تو وہ اسلام دشمن بھی نہیں۔ بلکہ حدیث کی زبان میں وہ اسلام کی معاون (supporter) ہے۔

کو دوبارہ اعلیٰ مومنانہ فراست (divine wisdom) کی ضرورت ہے جو حدیبیہ کے موقع پر اختیار کی گئی۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو دوبارہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ ناموافق صورت حال میں موافق حالات برآمد ہو جائیں گے اور ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ان چھپے ہوئے موافق امکانات کو استعمال کرکے اسلام کی نئی تاریخ بنا سکیں۔

مغربی تہذیب کے علم بردار اپنے سیاسی اور اقتصادی انٹرسٹ کے تحت بہت سی ایسی کارروائیاں کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک ہمارے ملی انٹرسٹ کے خلاف ہوتی ہیں۔ بطور واقعہ میں اس بات کو درست مانتا ہوں۔ مگر اس کا تعلق حقیقۃً اسلام دشمنی سے نہیں ہے۔ یہ تمام تر کامپٹیشن کا معاملہ ہے۔ یہ دنیا کامپٹیشن کے اصول پر بنائی گئی ہے، اس لیے اس قسم کے واقعات یہاں ہمیشہ جاری رہتے ہیں اور جاری رہیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ان کو فطرت کا تقاضا قرار دیتے ہوئے اپنی ساری توجہ اُن امکانات کی تلاش اور ان کو استعمال کرنے میں لگادیں جو بظاہر مخالف حالات کے باوجود ہمارے لیے یہاں پوری طرح موجود ہیں۔

دجال کی حدیث بذاتِ خود صحیح ہے۔ مگر جہاں تک جدید مغربی تہذیب کا تعلق ہے وہ یقینی طور پر حدیث دجال کے تحت نہیں آتی۔ مغربی تہذیب کا معاملہ زیادہ صحیح طور پر اُس دوسری حدیث سے تعلق رکھتا ہے جو ادخالُ الکلمہ کی نسبت سے بطور پیشین گوئی وارد ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب ادخال الکلمہ کی خدائی اسکیم کے لیے ایک معاون عامل (supporting factor) بن کر ابھری ہے۔ دجال والی حدیث سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔

مذکورہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ اسلام کا کلمہ ساری دنیا کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر کے اندر داخل ہو جائے گا۔ غور کیجیے تو موجودہ اسباب کی دنیا میں اس پیشین گوئی کو عملی طور پر واقعہ بنانے کے لیے بہت سے معاون ذرائع درکار تھے۔ یہ معاون ذرائع پچھلے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ یہ صرف جدید مغربی تہذیب ہے جس نے تاریخ میں پہلی بار ان تمام وسائل و ذرائع کو مکمل طور پر مہیا کر دیا ہے جو ادخال الکلمہ کے عمل کی تکمیل کے لیے ضروری تھے۔

اس طرح حدیث کے الفاظ میں، مغربی تہذیب کا کیس نہ دوست کا کیس ہے اور نہ دشمن کا کیس، بلکہ اس کا کیس تیسرا ہے، اور وہ موید (سپورٹر) کا کیس ہے۔ اس معاملہ کی عملی وضاحت کے

یہاں اس نوعیت کی کچھ تائیدی چیزیں مختصر طور پر بطور مثال ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ ادخال الکلمہ کے لیے سب سے پہلی ضروری چیز جو درکار تھی وہ کمیونی کیشن کے عالمی ذرائع ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مغرب کا لایا ہوا تہذیبی انقلاب انسانی تاریخ کا وہ پہلا واقعہ ہے جس نے اس قسم کے عالمی کمیونی کیشن کو ہماری دسترس میں دے دیا جو اس عمل کی تکمیل کے لیے ناگزیر طور پر درکار تھا۔

۲۔ دوسری لازمی ضرورت کھلی مذہبی آزادی تھی۔ اگر مذہبی آزادی نہ ہو تو مطلوب نوعیت کی کامیاب عالمی پیغام رسانی ممکن نہیں۔ یہ بھی مغربی تہذیب ہی کی دین ہے کہ اس نے ایک ایسا دور پیدا کیا جہاں تاریخ میں پہلی بار مذہبی آزادی کو انسان کے مقدس حق کے طور پر مان لیا گیا۔

۳۔ ادخالُ الکلمہ کی اسکیم کو عالمی سطح پر مکمل کرنے کے لیے بے پناہ دولت درکار تھی۔ یہ چیز بھی مغربی تہذیب ہی کے ذریعہ بالواسطہ طور پر مسلم ملکوں کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ مغربی تہذیب ہی کے حاملین تھے جنھوں نے مسلم ملکوں میں پٹرول کی دولت دریافت کی۔ پھر یہی لوگ ہیں جنھوں نے جدید مشینی دور پیدا کر کے اس پٹرول کو قیمتی (commodity) کی حیثیت دے دی۔ اس طرح سے حاصل شدہ دولت نے مسلمانوں کو آج اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ ادخالُ الکلمہ کی عالمی مہم کی بڑی سے بڑی قیمت دے کر اسے جاری رکھ سکیں۔

۴۔ مغربی تہذیب کے ذریعہ حاصل شدہ تائیدوں میں سے ایک تائید یہ ہے کہ اس نے پہلی بار فری انکوائری کے اصول کو کامیابی کے ساتھ مقدس کتابوں تک وسیع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری تمام مذہبی کتابیں غیر تاریخی ثابت ہو گئیں۔ اب استثنائی طور پر صرف قرآن ایک تاریخی طور پر ثابت شدہ کتاب کی حیثیت سے باقی رہا۔ اس طرح مغربی تہذیب کے پیدا کردہ علمی انقلاب نے اسلام کو عملاً پہلی کے درجہ میں مذہب کا واحد قابل اعتبار نمائندہ بنا دیا۔

۵۔ پھر یہ مغربی تہذیب ہی ہے جس نے فطرت کے چھپے ہوئے رازوں کو دریافت کیا جو کہ قرآن کی سچائی کی تصدیق کرنے والے تھے۔ اس طرح مغربی تہذیب ہی کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے قرآن کی اس آیت کی سائنسی تفسیر لکھی کہ —— ہم انھیں آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ یہ حق ہے (41:53)

مغربی تہذیب کے حاملین نے غیر مطابق فطرت کے بے شمار نئے مسائل پیدا کیے
جو اسلام کی صداقت کو عالمی بنیادوں پر بہت درست ثابت کر رہے ہیں۔

مگر اس سبب کی بنا پر میری قطعی رائے ہے کہ مغربی تہذیب دجال کا ظہور نہیں بلکہ
امکانات کے اعتبار سے وہ اسلام کے حق میں تائید الٰہی کا ظہور ہے۔ اس نے وہ تمام اسباب پیدا
کر دیے ہیں جو ادخال الکلمہ کی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ موجودہ زمانہ میں
ان امکانات کو استعمال کرتے ہوئے یہ کام بخوبی طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

یہ پراسس بالفعل شروع ہو چکا ہے۔ آج ہر دن ہزاروں لوگ اسلام کو دین فطرت پا کر
اس کو قبول کر رہے ہیں۔ حدیبیہ کا معاملہ طے ہونے کے بعد قرآن کی سورہ الفتح اتری تھی اس میں
کہا گیا کہ:

"that it may be a sign for the believers, and that He may guide you to a straight path. (48 20)

دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ معاملہ اس لیے ہوا تاکہ تم کو ایک علامتی واقعہ کی صورت میں بتایا جا سکے کہ
اس طرح کے معاملات میں تم dichotomy میں گرفتار نہ ہو بلکہ تیسرا راستہ تلاش کرو۔ یہ حدیبیہ
پرنسپل ہے اور مغربی تہذیب کے معاملہ میں ہمیں اسی حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنا ہے۔ اس کے
بعد خدا کی یہ بشارت ہمارے اوپر صادق آئے گی کہ ہم نے تم کو کھلی فتح دے دی (48:1)

ایک سنت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اہل اسلام کے لئے ایک معیاری نمونہ ہے۔ اس سنت کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے، خواہ وہ مسواک جیسا انفرادی معاملہ ہو یا جہاد جیسا اجتماعی معاملہ، خواہ وہ آپ کا مسئلہ ہو یا ہزاروں برس بعد کا کوئی مسئلہ۔

سنت کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک سنت وہ ہے جو اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے مطلوب ہوتی ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ صلّوا کما رأیتمونی أصلّی (مشکاۃ المصابیح، ۱/۲۱۵) اس حدیث کا تعلق اصلاً نماز کی ظاہری صورت (form) سے ہے۔ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور خود بھی اسی طرح نماز ادا کی۔ اس طرح اس کے بعد صحابہ کو دیکھ کر تابعین نے اور تابعین کو دیکھ کر تبع تابعین نے نماز پڑھی۔ یہ سلسلہ نسل در نسل امت میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ آج ہم جو نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی بالواسطہ طور پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی نقل ہوتی ہے۔

اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے اونٹ پر بیٹھ کر حج کے مراسم ادا کئے تاکہ لوگ آپ کو دیکھ سکیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، مجھ کو حج کرتے ہوئے دیکھو اور اسی کے مطابق تم اپنے مناسک ادا کرو (خذوا عنی مناسککم)

یہ سنت کی پہلی قسم ہے۔ اس میں یہ مطلوب ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی فعل کو جس شکل میں کیا ہے، عین اسی شکل میں اس کو ادا کیا جائے۔ اس کو سنت ظاہری کہا جا سکتا ہے۔

دوسری سنت سنتِ معنوی ہے۔ یعنی وہ سنت جو اپنی روح (اسپرٹ) کے اعتبار سے مطلوب ہوتی ہے۔ اس دوسری سنت میں ظاہری شکل اضافی ہے، اور اس کی معنوی روح حقیقی اور اصل مطلوب کی حیثیت رکھتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن ۲۳ سال کے عرصہ میں اترا۔ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ اترتا تو اسی وقت آپ کسی کاتب کو بلا کر اس کو لکھواتے۔ آپ کی خدمت میں ہر وقت کوئی نہ کوئی کاتب موجود رہتا۔ اس طرح کاتبان وحی کی تعداد ۴۰ سے زیادہ شمار کی گئی ہے۔ آپ کو اس کا اتنا زیادہ اہتمام

تھا۔ جیسے کہ ملک سفر میں بھی قلم اور کاغذ آپ کے ہمراہ تھا اور ایک کاتب وحی بھی ساتھ
آپ کے ساتھ [illegible] رہتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں پورا قرآن اس زمانہ کے اوراق اور لکھائی پر لکھا جا چکا تھا۔ بہت سے صحابہ مثلاً زید بن ثابت انصاری پورے قرآن کے حافظ تھے۔ آخر عمر میں آپ نے ایک بار پورے قرآن کو سلسلہ وار پڑھا اور صحابہ کی ایک جماعت نے اس کو براہ راست آپ سے سنا۔ اس کو حدیث کی کتابوں میں العرضۃ الاخیرۃ کہا گیا ہے۔

اس طرح کے مختلف اہتمام کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو ایک جلد کی صورت میں جمع نہیں فرمایا۔ آپ کی وفات کے وقت قرآن یا تو لوگوں کے سینہ میں تھا، یا متفرق ٹکڑوں اور اوراق پر لکھا ہوا تھا۔ وہ ایک واحد کتاب کی صورت میں مرتب نہیں ہوا تھا جیسا کہ آج وہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقینی طور پر اس سے باخبر تھے کہ اس صورت حال کو بعد کے لوگ کتاب اللہ کے بارے میں شوشے بنائیں گے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں مستشرقین نے اس واقعہ کو لے کر طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر مستشرقین کی مرتب کردہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) کی پانچویں جلد میں اس مسئلہ کو اٹھایا گیا ہے اور اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک توجیہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا خیال تھا کہ قیامت کا وقت قریب آگیا ہے اور جلد ہی یہ دنیا ختم ہو جائے گی، اس لئے قرآن کو ایک جلد میں مرتب کرنے کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوا:

ان الرسول کان یتوقع قرب قیام الساعۃ ونھایۃ العالم فی زمن قریب۔ فکان لا داعی الی جمع القرآن (الوعی الاسلامی، کویت، رمضان ۱۴۱۰ھ)

ان امکانی خطرات کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل کہ آپ نے قرآن کو ایک صحیفہ کی صورت میں مجلد نہیں کرایا، یہ کوئی بھول یا غلطی کی بات نہیں ہے، یہ خود آپ کی ایک سنت ہے۔ ایسا آپ نے قصد و ارادہ کے تحت کیا۔ کیوں کہ اس سے ایک اہم دینی فائدہ وابستہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن دین کو کامل کرنا تھا، اس لئے ناممکن تھا کہ آپ کسی دینی کام کو غیر کامل حالت میں

[illegible]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو اپنی زندگی ہی میں قرآن کو ایک مجلد کی صورت میں مرتب کر سکتے تھے۔ بہت سی اسلامی ضرورتیں اس کی متقاضی تھیں کہ مسجدوں میں رکھا جائے تو آپ کے بعد قرآن کا الٹ پھیر ہی انجام ہوتا جو کچھ امت کے اندر تکرار اچھے لگ جنھوں نے قرآن کو الگ الگ کی صورت کو ملی لکھ جاتے۔ قرآن کے سلسلہ میں انھیں اس کے سوا کوئی اور کام کرنا تھا جس میں وہ اپنے آپ کو مشغول کریں۔ قرآن کی تدوین کو نا تمام چھوڑ کر آپ نے اپنے بعد امت کو ایک بہت بڑی مشغولیت عطا کر دی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں ۱۲ھ میں یمامہ (سعودی عرب) میں ایک جنگ ہوئی۔ اس میں ۷۰ ایسے مسلمان شہید ہو گئے جو پورے قرآن کے حافظ تھے۔ اس سے حضرت عمر فاروق کو اندیشہ ہوا کہ قرآن کے حافظ اگر اسی طرح ختم ہوتے رہے تو قرآن کا علم اٹھ جائے گا۔ انھوں نے حضرت ابوبکر سے کہہ کر قرآن کی تدوین کرائی۔

تاہم یہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ اولاً خلیفہ اول کو اس میں تردد ہوا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، اس کو ہم کیسے کریں۔ کافی بحث کے بعد وہ راضی ہوئے۔ اب ایک مستقل سرگرمی جاری ہوگئی۔ مثلاً حضرت عمر اور حضرت زید روزانہ مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جاتے اور لوگوں سے کہتے کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی حصہ لکھا ہوا موجود ہو، وہ یہاں لا کر مسجد میں جمع کرے۔

حضرت زید بن ثابت انصاری اپنی مختلف صلاحیتوں کی وجہ سے اس کے لئے موزوں سمجھے گئے کہ وہ اس عظیم کام کے ذمہ دار اعلیٰ مقرر کئے جائیں۔ انھوں نے تمام جمع شدہ مکتوب اجزاء کو پڑھا۔ ان کو حافظوں کی مدد سے جانچا۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار کسی کتاب کے لئے (double checking) (دہرا جانچ) کا نظام قائم کیا گیا۔ یعنی کتابت کو حافظہ سے جانچا گیا اور حافظہ کو کتابت سے۔ تاہم حضرت زید بن ثابت (م ۴۵ھ) کے لئے یہ اتنا سخت کام تھا کہ انھوں نے کہا:

فواللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علی مما امرنی بہ من جمع القرآن (المصاحف لابن ابی داؤد)

خدا کی قسم، اگر وہ مجھ پر یہ ذمہ داری ڈالتے کہ پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کو میں اپنی جگہ سے ہٹا دوں تو وہ میرے لئے اس حکم سے زیادہ سخت نہ ہوتا جو ابوبکر و عمر

ے قرآن کو جمع کرنے کے لئے جد وجہد

یہ سرگرم عمل پر از واقعات جد وجہد کے بعد جب قرآن ایک کتاب کی صورت میں مدون ہو گیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ بڑی تعداد میں جو بکھرے ہوئے اجزاء جمع ہوئے تھے، ان کو کیا کیا جائے۔ اب بحث شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ متفقہ فیصلہ کے تحت ان سب کو جلا کر ختم کر دیا گیا۔

یہ پورا عمل طرح طرح کے واقعات سے بھرا ہوا کام جس کی تفصیل کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کو ایک نئی زبردست مشغولیت دے دی۔ اس مشغولیت کے دوران ان کے اوپر دین کے بہت سے نئے نئے پہلو واضح ہوئے۔ حتی کہ انھوں نے قرآن کو از سر نو دریافت (rediscover) کیا۔ انھوں نے قرآن کے ساتھ از سر نو اپنے زندہ تعلق کو استوار کیا۔ قرآن ان کے لئے محض ایک تقلیدی کتاب نہ رہا، بلکہ ایک ایسی کتاب بن گیا جس کو انھوں نے گویا اپنی تلاش اور محنت کے دوران دوبارہ نئے شعور کے ساتھ دریافت کیا تھا۔

یہ سنت جس کو ہم نے سمجھنے کی خاطر معنوی سنت کا نام دیا ہے، وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ جس طرح آپ کی دوسری سنتیں ہمیشہ کے لئے مطلوب ہیں، اسی طرح یہ معنوی سنت بھی ہمیشہ کے لئے مطلوب ہے۔ مزید یہ کہ وہ سب سے اہم سنت ہے، کیوں کہ اسی کے ذریعہ سے امت کا احیاء ہوتا ہے۔ وہ امت کے افراد کو مسلسل طور پر زندہ اور سرگرم عمل رکھنے کا سب سے زیادہ طاقت ور ذریعہ ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال لیجئے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے اس لئے اتاری ہے کہ اس کے ذریعہ سے تمام دنیا والوں کو آگاہ کیا جائے (الفرقان ۱) جیسا کہ معلوم ہے، قرآن عربی زبان میں ہے، جب کہ دنیا کی قوموں میں ہزاروں مختلف زبانیں رائج ہیں۔ ایسی حالت میں تمام قومیں کس طرح قرآن سے آگاہی لے سکتی ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہوتا کہ ہر قوم براہ راست اسی منزل قرآن سے ہدایت حاصل کرے تو وہ قرآن کو کسی بین اقوامی زبان (Lingua franca) میں اتارتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ مومنین قرآن اس کتاب کو تمام قوموں کی زبانوں میں ترجمہ کریں اور اس طرح اس کو تمام لوگوں تک ان کی قابل فہم صورت میں پہنچائیں۔

یہ گویا رسول اور اصحاب رسول کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو موجودہ زمانہ میں ضرورت تھی کہ اس سنت نبوی پر عمل کیا جاتا۔ مثلاً اس کی ایک صورت یہ تھی کہ موجودہ زمانہ میں جو نئے سوالات پیدا ہوئے اور مواصلات کے جدید ذرائع کے ظہور نے اس کا امکان پیدا کر دیا تھا کہ قرآن کو بآسانی تمام قوموں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ اب اگر ہمارے رہنماؤں نے اس سنت کو زندہ کیا ہوتا اور وہ قوم کو ابھارتے کہ قرآن کا ہر زبان میں مستند ترجمہ کرو، اس کو چھپاؤ۔ اور اس کو ساری دنیا میں پھیلاؤ تو یہ اتنا بڑا کام ہوتا کہ امت پوری کی پوری اس کام میں مشغول ہو جاتی۔ اس سنت پر عمل شروع کرنے کے بعد اس کے بے شمار پہلو نکلتے۔ ہر آدمی اس میں اپنے لئے کرنے کا کام پا لیتا۔

اس طرح گویا مسلمان قرآن کو موجودہ زمانہ کے لحاظ سے از سر نو دریافت (rediscover) کرتے۔ قرآن دوبارہ ان کے لئے ایک زندہ کتاب بن جاتا جو ان کی پوری زندگی میں دینی ہلچل پیدا کر دیتا۔ مگر بر وقت اس قسم کی رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے پوری ملت سیاست کی چٹان پر بے فائدہ طور پر اپنا سر پٹک رہی ہے اور نتیجۃً دین سے بھی محروم ہے اور دنیا سے بھی۔

موجودہ زمانہ میں اس غلطی پر مزید اضافہ یہ کیا گیا ہے کہ غیر دعوتی کام کو دعوت کا نام دے دیا گیا ہے۔ کوئی مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کو دعوت کہہ رہا ہے۔ کوئی مسجد اور مدرسہ بنانے کو دعوت کا کام سمجھ رہا ہے۔ کوئی مفروضہ دشمنان اسلام کے خلاف جنگ چھیڑتا ہے اور اس کو دعوت کا نام دے دیتا ہے۔ کوئی دوسرے مذہب کے لوگوں سے مناظرہ بازی کرتا ہے اور اس کو دعوت کا عمل قرار دے رہا ہے۔ کوئی اسلامی سیاست کا ہنگامہ کھڑا کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ یہی دعوت کا اصل کام ہے۔

اس قسم کی ہر کوشش ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہے۔ دعوت الی اللہ ایک متعین عمل کا نام ہے، اور وہ ہے، خدا کے دین کو اس کی بے آمیز صورت میں غیر مسلموں تک پہنچانا۔ یہ وہی کام ہے جس کو قرآن میں انذار و تبشیر کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ ایسا کام ہے جو ناصح اور امین بن کر انجام دیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کی نسبت سے امانت دار اور بندوں کی نسبت سے ناصح اور خیر خواہ۔

اس غلطی نے موجودہ زمانہ میں دعوت کے اصل مقصد ہی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ دعوت کا تمام تر اصل مقصد یہ ہے کہ خدا کے بندے خدا کے تخلیقی منصوبہ سے آگاہ ہوں۔ وہ خدا کی مرضی سے واقف ہو کر اس کے مطابق زندگی گزاریں۔ اور پھر خدا کی رحمت و نصرت کے مستحق بنیں۔ اور جو لوگ اس کو ماننے سے انکار کریں، ان پر خدا کی حجت تمام ہو۔ اور آخرت میں وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں آپ کے تخلیقی منصوبہ کی خبر نہیں تھی۔ اس لئے ہم اس کی ذمہ داری سے بری ہیں۔

موجودہ زمانہ میں دعوت کے نام پر مسلمانوں نے جو سرگرمیاں جاری کر رکھی ہیں اور جن کو مجموعی اعتبار سے صحوۃ اسلامیہ (اسلامی بیداری) کہا جاتا ہے، اس میں یہ سارا مقصد فوت ہو گیا ہے۔ اصل دعوتی مہم میں مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان داعی اور مدعو کا تعلق قائم ہوتا ہے، مگر موجودہ نام نہاد صحوہ اسلامیہ میں دونوں ایک دوسرے کے لئے قومی حریف یا قومی رقیب بن گئے ہیں۔

اسی قسم کا برعکس نتیجہ خود مسلمانوں کی نسبت سے ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ موجودہ قسم کی سرگرمیوں نے اس چیز کا خاتمہ کر دیا ہے جو اصلاً اسلام کا مطلوب و مقصود ہے۔ دعوت الی اللہ کا عمل جب مطلوب صورت میں جاری ہو تو وہ مسلمانوں کے اندر مثبت کیفیات کو ابھارتا ہے۔ مگر موجودہ سرگرمیوں نے برعکس طور پر مسلمانوں کے اندر منفی کیفیات کو فروغ دیا ہے۔

صحیح دعوتی عمل آدمی کے اندر دوسروں کے حق میں شفقت کے جذبات پیدا کرتا ہے مگر موجودہ قسم کے عمل نے مسلمانوں کے اندر نفرت کے جذبات پیدا کر دئے ہیں۔ صحیح دعوتی عمل آدمی کو یک طرفہ صبر کرنا سکھاتا ہے مگر موجودہ قسم کے عمل نے مسلمانوں کو بے صبر حتی کہ تشدد پسند بنا دیا ہے۔ صحیح دعوتی عمل آدمی کو دوسروں کی ہدایت کا حریص بناتا ہے۔ مگر موجودہ عمل نے مسلمانوں میں صرف یہ جذبہ ابھار رکھا ہے کہ وہ لوگوں کو زیر کر کے ان کے اوپر غالب آجائیں۔ صحیح دعوتی عمل یہ سکھاتا ہے کہ دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کر دو۔ مگر موجودہ عمل نے مسلمانوں کا یہ حال کر رکھا ہے کہ ہر ایک دوسری قوموں کی سازشیں

کے خلاف نفرت کا مزاج بنا ہوا ہے۔ صحیح دعوتی عمل لوگوں کے اندر اعلیٰ نفسیات کو بیدار کرتا ہے کہ ان کے اوپر احساس کی ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں۔ مگر موجودہ عمل نے ہر مسلمان کو اپنے حقوق کی جدوجہد کا شہسوار بنا رکھا ہے۔ صحیح دعوتی عمل لوگوں کے اندر روحانیت کی لطیف کیفیات کو جگاتا ہے۔ مگر موجودہ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نے ہر مسلمان کے اندر سیاست کا طوفانی جوش ابھار دیا ہے۔

اس غلطی کا یہ شدید تر نتیجہ نکلا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر مثبت سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ اس کے برعکس ان کے درمیان ہر طرف منفی باتوں اور منفی سرگرمیوں کا دور دورہ ہے۔ مسلمانوں کو اہل عالم کے لئے دوبارہ نفع بخش بننا تھا۔ مگر احتجاج اور شکایت کی ہم غلطی نے ان کو ایک قسم کا پروٹسٹنٹ گروہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اہل عالم کے لئے اثاثہ بننے کے بجائے وہ اہل عالم کے لئے بوجھ بن کر رہ گئے ہیں۔

کسی تحریک کے صحت و سقم کو جانچنے کے لئے سب سے زیادہ آسان اور قریبی معیار یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ جو لوگ اس سے متاثر ہوئے ہیں ان میں یہ تحریک کس قسم کا ذہن اور مزاج بناتی ہے۔ افرادِ تحریک کا مزاج تحریک کے صحت و سقم کو جانچنے کا یقینی معیار ہے۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمانہ کی تقریباً تمام اسلامی تحریکوں نے اپنے افراد کے اندر جو مزاج بنایا ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی کہیں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو تو فوراً وہ اس کو اپنے لئے عزت و وقار کا سوال بنا لیتے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک قومی مزاج ہے نہ کہ دعوتی مزاج۔ دعوتی مزاج کیا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے دور نبوت کی ایک مثال لیجئے۔ یہ مثال وہ ہے جو مدنی دور میں صلح حدیبیہ کے بحرانی وقت میں سامنے آئی۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ، قریش نے حدیبیہ کے سفر میں رکاوٹ ڈال کر رسول اور اصحاب رسول کو اس سے روک دیا تھا کہ وہ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے مصلحت کا تقاضا تھا کہ اس نازک موقع پر کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جو اسلام اور اہل اسلام کی عزت و وقار کو مجروح کرنے والا ہو۔ مگر اس وقت اس قسم کے اندیشوں کو یکسر نظر انداز کر کے قریش سے یکطرفہ صلح کا معاملہ کیا گیا۔ اور تمام مسلمان عمرہ کئے بغیر حدیبیہ کے مقام سے واپس لوٹ آئے۔

اس وقت ایک نہایت نازک مسئلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھا۔ آپ نے سفر سے پہلے مدینہ میں خواب دیکھا تھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کر رہے ہیں۔ اسی خواب کا اعلان کر کے آپ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ اب عمرہ کئے بغیر حدیبیہ سے واپس لوٹ جانا بے حد نازک معاملہ تھا۔ کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ ایسا کرنے سے کچھ لوگ نعوذ باللہ آپ کی پیغمبری پر شک کرنے لگیں گے اور آئندہ وہ آپ کی باتوں پر زیادہ یقین نہیں کریں گے۔

حدیبیہ میں قیام کے دوران قریش کے لوگوں نے کئی بار سرکشی کی۔ مثلاً ایک بار عین نماز کی حالت میں آ کر صحابہ پر پتھر مارنے لگے۔ ایک بار ایک صحابی کو تیر مار کر ہلاک کر دیا وغیرہ۔ اب سوال تھا کہ اگر ان کی ان حرکات پر خاموشی اختیار کر لی جائے تو وہ دلیر ہو جائیں گے اور آئندہ مسلمانوں کے خلاف اور زیادہ زیادتیاں کریں گے۔

ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ اگر رسول اور اصحاب رسول عمرہ کئے بغیر اپنے وطن کو واپس چلے جائیں تو قریش کے حوصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ آج وہ عمرہ کو روک رہے ہیں۔ کل وہ حج پر پابندی لگائیں گے۔ آج وہ مکہ میں داخل ہونے نہیں دے رہے ہیں۔ کل وہ مدینہ میں بھی ہمارا رہنا مشکل کر دیں گے۔ اس لئے ضروری تھا کہ پہلے ہی موقع پر سخت کارروائی کر کے ان کا حوصلہ توڑ دیا جائے۔

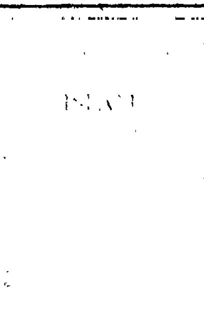
رسول اور اصحاب رسول کے لئے عمرہ کا یہ سفر ایک علامتی حیثیت رکھتا تھا۔ بظاہر اس کے اوپر یہ فیصلہ ہونا تھا کہ آئندہ عرب میں مذہبی اعتبار سے کیا صورت حال رہے گی۔ مسلمان اپنے مذہبی عقیدہ کے مطابق، اس ملک میں رہنے دئے جائیں گے یا نہیں رہنے دئے جائیں گے گویا یہ محض ایک عمرہ کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ علامتی طور پر وہ مذہبی آزادی کا وسیع تر مسئلہ تھا۔

مگر پیغمبر کی نظر میں یہ سب کی سب جزئی مصلحتیں تھیں۔ زیادہ بڑی اور کلی مصلحت یہ تھی کہ حالات کے اندر چھپے ہوئے دعوتی مواقع کو استعمال کیا جا سکے۔ چنانچہ آپ نے جزئی مصلحتوں کو نظر انداز کر دیا اور کلی مصلحت کو اہمیت دیتے ہوئے قریش سے امن کا معاہدہ کر لیا۔

صحیح اجتہاد اور صحیح عملی منصوبہ بنانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ

مسلمانوں میں مثبت ذہن تھا۔ وہ عزت اور بے عزتی کے احساس سے اوپر اٹھ کر معاملات کو دیکھتے تھے۔ ان میں یہ صلاحیت ہو کہ کسی کی مخالفانہ روش ان کے ذہنی توازن کو درہم برہم نہ کرے۔ وہ معاملات کو قومی تعصب کی نظر سے نہ دیکھیں بلکہ بے آمیز نگاہ سے خالص اصولی اعتبار سے ان کا جائزہ لیں۔ ان کا انقلاب ردعمل کے تحت نہ بنے بلکہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کی روشنی میں طے پائے۔

مسلمانوں کے عوام اور خواص دونوں اس معیار سے بہت زیادہ دور ہو گئے ہیں۔ اس لئے آج پہلا کام یہ ہے کہ انھیں دوبارہ اس معیار حق پر لایا جائے۔ جب تک ان میں یہ معیار پیدا نہ ہو، وہ نہ فکری اعتبار سے کوئی بڑا کام کر سکتے ہیں اور نہ عملی اعتبار سے۔



ISLAM: CREATOR OF THE MODERN AGE

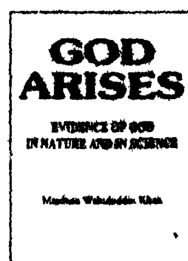
By Maulana Wahiduddin Khan

Antiquity was an age of superstition the present age is of science Before reaching its present-day zenith, the modern, scientific age had to pass through three stages. The first was marked by the eradication of the superstitious mentality, the second saw the practical beginnings of scientific research; the third is the spectacular culmination of the scientific process in the second half of the twentieth century The present volume examines the Islamic contribution to the completion of the first two stages during the millenium immediately following upon the emergence of Islam.

22 x 14 5 cm 125 pages ISBN 81-85063-78-8, Rs 65

GOD ARISES

By Maulana Wahiduddin Khan



This book, the result of 30 years spent by the author in exhaustive research, attempts to present the basic teachings of religion in the light of modern knowledge and in a manner consistent with modern scientific method After a thorough investigation of the subject, the writer has reached the conclusion that religious teachings are, academically, valid and as understandable and intellectually acceptable as any of the theories propounded by men of science

"... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal Without doubt, this book is one of that kind" — *Al-Ahram* (Cairo)

22 x 14 5 cm, 271 pages ISBN 81-85063-14-1, Rs 85

ایک تقریر

"پرشین انفلوئنس آن انڈین کلچر" ایک وسیع سبجیکٹ ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں میں اس کے صرف ایک پہلو پر اختصار کے ساتھ کچھ عرض کروں گا۔ یہ پہلو ہے — فارسی مقولوں اور فارسی اشعار کا ہندستانی سوسائٹی میں رواج اور اس کے اخلاقی اثرات۔

۱۲ نومبر ۱۹۹۹ کا واقعہ ہے۔ میں انڈین ایر لائنز کی مارننگ فلائٹ کے ذریعہ دہلی سے بڑودہ جارہا تھا۔ راستہ میں حسب معمول میں اپنے بیگ سے قلم کاغذ نکال کر کچھ لکھنے لگا۔ میرے پاس کی سیٹ پر زیادہ عمر کے ایک ہندو بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا نام مسٹر مکند دوبے (Mr. Mukund Dubey) ہے۔ ریٹائر ہونے سے پہلے وہ ہندستان کی فارن سروس میں تھے۔ اب وہ دہلی میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں (Tel. 3718047)

مجھ کو لکھتے ہوئے دیکھ کر مسٹر دوبے نے کہا: اردو لکھ رہے ہیں یا فارسی۔ میں نے پوچھا کیا آپ فارسی جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں ایران بھی جا چکا ہوں۔ میں نے دوبارہ کہا کہ فارسی کا کوئی مقولہ جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ انھوں نے شیخ سعدی کا یہ مقولہ میرے کاغذ پر لکھ دیا: چگونہ شکر نعمت گزارم کہ مردم آزاری ندارم (خدا کی اس نعمت کا میں کس طرح شکر ادا کروں کہ میں لوگوں کو ستانے کی طاقت نہیں رکھتا)

یہ چھوٹا سا واقعہ ایک دور کو بتاتا ہے جب کہ ہندستان میں پڑھے لکھے ہندو اور مسلمان عام طور پر فارسی زبان جانتے تھے۔ فارسی کے حکیمانہ مقولے اور اشعار لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ مجلسوں میں فارسی کے الفاظ اور جملے اس طرح دہرائے جاتے تھے جس طرح آجکل انگریزی کے الفاظ اور جملے دہرائے جاتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ہمارے گھروں میں فارسی کا عام رواج تھا۔ عورتیں تک فارسی زبان سیکھتی تھیں۔ تقریباً ۶۰ سال پہلے کی بات ہے۔ ہمارے گھر کی ایک خاتون مسلمہ خانم نے اپنے والد مولانا اقبال احمد سہیل سے فارسی پڑھنا شروع کیا۔ انھوں نے فارسی انشا کی ایک کاپی بنائی۔ اس پر وہ اردو جملوں کو فارسی میں تبدیل کرتی تھیں اور پھر اصلاح

کے لئے انہیں مولانا سہیل کو دکھاتی تھیں۔ اس کاپی کے صفحۂ اول پر انھوں نے جلی حرفوں میں لکھا تھا ـــــ "اردو کا جدید فارسی ساختن" مولانا سہیل نے ان کو دیکھا تو اس کو کاٹ کر اس کے بجائے حسب ذیل الفاظ لکھ دیئے: عبارت اردو را بہ پارسی آوردن۔

تاریخی طور پر ہندستان میں تقریباً ۷۰۰ سال کا زمانہ ایسا گزرا ہے جب کہ ملک میں فارسی زبان کو اسی طرح غلبہ حاصل تھا جس طرح انگریز کے آنے کے بعد یہاں انگریزی زبان کو غلبہ حاصل ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک محمد بن قاسم کو چھوڑ کر ملک میں جتنے بھی مسلم فاتحین آئے تقریباً سب کی زبان فارسی تھی۔ چنانچہ الناس علی دین ملوکہم کے اصول پر فارسی زبان اور کلچر کو یہاں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔

اس تاریخی عمل کے اثرات آج بھی مختلف صورتوں میں یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً آج بھی کسی مہمان کی آمد پر خوش آمدید کہنا یا رخصتی کے وقت خدا حافظ کہنا براہ راست طور پر فارسی زبان و تہذیب کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

اس دور میں فارسی زبان اور کلچر کے جو اثرات ملک کے اوپر پڑے ان میں سے ایک یہ تھا کہ فارسی کے اقوال اور اشعار زبان زد عام ہو گئے۔ خاص طور پر اہل علم کے درمیان عام طور پر یہ حال ہو گیا کہ کسی بھی موقع پر کوئی حکیمانہ بات یا کوئی سبق آموز کلمہ کہنا ہوتو فوراً فارسی کا کوئی ضرب المثل یا کوئی شعر لوگوں کی زبان پر آ جاتا تھا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں صدیوں تک یہ حال رہا ہے کہ نہ صرف کلچر کے پہلوؤں میں فارسی زبان کے اثرات ظاہر ہوئے بلکہ یہاں کی سماجی زندگی میں اخلاقیات کی تشکیل کا ذریعہ سب سے زیادہ فارسی اقوال و امثال بنے رہے۔

مثلاً ایک لمبے زمانہ تک یہ حال تھا کہ کسی ہندستانی گھر میں کوئی مہمان آتا اور اس کے کھانے کے لئے کپڑے کا دسترخوان بچھایا جاتا تو اس کے اوپر یہ فارسی شعر لکھا ہوا ہوتا تھا:

شکر بجا آر کہ مہمان تو　　روزیٔ خود می خورد برخوان تو

یعنی شکر ادا کر کہ تمہارا مہمان اپنی روزی کو تمہارے دسترخوان پر کھا رہا ہے۔ اس طرح صدیوں تک فارسی زبان اس ملک میں حکمت ربانی اور اخلاقیات انسانی کی اشاعت کا ذریعہ بنی رہی۔ لوگوں کی سوچ اور ان کا اخلاقی سلوک فارسی کلچر سے غیر معمولی طور پر متاثر رہا۔

۱	راہ راست برو گرچہ دور است	درست راستہ چلو خواہ وہ دور ہو
۲	مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید	مشک وہ ہے جو خود مہکے نہ کہ عطار کہے
۳	یک در گیر محکم گیر	ایک دروازہ پکڑو اور جم جاؤ
۴	خوردن برائے زیستن است نہ زیستن برائے خوردن	کھانا زندگی کے لئے ہے نہ کہ زندگی کھانے کے لئے
۵	تونگری بہ دل است نہ بہ مال	دولت مندی دل سے ہے نہ کہ مال سے
۶	چاہ کن را چاہ در پیش	کنواں کھودنے والے کے سامنے کنواں ہوتا ہے
۷	آن است جوابش کہ جوابش نہ دہی	اس کا جواب یہ ہے کہ جواب نہ دو
۸	گربہ کشتن روز اول	بلی کو پہلے ہی دن ہلاک کرو
۹	دیر آید درست آید	جو دیر میں ہوتا ہے وہ درست ہوتا ہے۔
۱۰	شنیدہ کے بود مانند دیدہ	سنا ہوا کب دیکھنے کی طرح ہوتا ہے۔
۱۱	جویندہ یابندہ	ڈھونڈنے والا پاتا ہے
۱۲	یک من علم را دہ من عقل باید	ایک من علم کے لئے دس من عقل چاہئے۔
۱۳	بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال	بزرگی کا تعلق عقل سے ہے نہ کہ زیادہ عمر سے۔
۱۴	صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد	صبر کڑوا ہے مگر اس کا پھل میٹھا ہے۔
۱۵	آں چہ برخود نہ پسندی بر دیگراں مپسند	جو چیز اپنے لئے پسند نہ ہو اس کو دوسروں کیلئے بھی پسند نہ کرو
۱۶	عاقلاں را اشارہ کافی است	عقل مند کے لئے اشارہ کافی ہے۔
۱۷	قطرہ قطرہ دریا گردد	بوند بوند مل کر دریا بنتا ہے۔
۱۸	جوئندہ یابندہ	ڈھونڈنے والا پاتا ہے۔
۱۹	چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی	عقلمند وہ کام کیوں کرے جس کے بعد شرمندہ ہونا پڑے
۲۰	پدرم سلطان بود	میرا باپ بادشاہ تھا
۲۱	داشتہ بکار آید	رکھا ہوا کام آتا ہے
۲۲	یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد	میں ایک لمحہ کے لئے غافل ہوا اور سو سال دور ہوگیا۔
۲۳	مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش	ہوشیار چڑیا جال میں پھنس جائے تو اس کو تحمل کرنا چاہئے

یہ صورت فارسی زبان کی بات نہیں بلکہ یہ کم و بیش ہر زبان کی بات ہے۔ ہر زبان میں پہلے اسی طرح سبق اور نصیحت کے کلمات عمومی طور پر رائج ہوتے تھے، ان کلمات سے لوگوں کو اصلاحی شعور اور اخلاقی تنبیہ ملتا تھا مگر موجودہ زمانہ میں یہ صورت حال تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ اب ہماری زبانیں اخلاق کی معلم جیسی نہیں رہیں، بلکہ کھیل و تفریح جیسے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ قدیم زمانہ جس کو روایتی زمانہ کہا جاتا ہے وہ پیغمبروں کی تعلیمات سے بنا تھا۔ ہر قوم میں اچھے مصلحین بڑی تعداد میں پیدا ہوتے رہے جنھوں نے نصیحت اور سبق کی باتیں کیں۔ ان کی یہ باتیں مقولے اور کہاوت بن کر لوگوں کے درمیان عمومی طور پر پھیل گئیں۔ لوگ مختلف مواقع پر ان مقولوں کو دہراتے اور ان سے سبق لیتے۔

موجودہ زمانہ میں جو صنعتی انقلاب آیا اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے انسانیت کو روایتی دور سے نکال کر سائنسی دور میں پہنچا دیا۔ یہ اس کا ظاہری پہلو ہے مگر اس کا داخلی پہلو یہ ہے کہ اس نئے انقلاب نے آزادی کے نام پر لوگوں کے ذہن و مزاج کو پوری طرح بدل ڈالا ہے۔ اب لوگوں کے درمیان جو مقولے رائج ہوئے وہ مصلحین کے مقولے نہ تھے بلکہ وہ کھلاڑیوں اور فلمی ہیروں کے مقولے تھے۔ مذہبی شخصیتوں کی جگہ سیاسی شخصیتوں نے لے لی، صوفیوں اور درویشوں کی جگہ سماج میں ان لوگوں کو غلبہ حاصل ہوگیا جو اپنے ساتھ مادی اور ظاہری رونقیں رکھتے تھے۔

اس تبدیلی نے پوری صورت حال کو بدل ڈالا ہے۔ آج اسکول سے لے کر ٹی وی تک لوگوں کی تربیت اس سے مختلف انداز میں ہو رہی ہے جو پہلے اخلاقی نصیحتوں کے زیر سایہ ہو رہی تھی ——— موجودہ زمانہ میں عمومی سطح پر جو اخلاقی بگاڑ دکھائی دیتا ہے اس کی کم از کم ایک وجہ یہ بھی ہے۔

متفرقات سفر

حدیث میں آیا ہے کہ: السفر قطعة من العذاب (فتح الباری ۳/۶۲۸) یعنی سفر عذاب کا ایک جزء ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ سفر کوئی بری چیز ہے اور اہل ایمان کو سفر نہ کرنا چاہیے۔ اس حدیث میں "عذاب" دراصل تعب اور مشقت کے معنی میں ہے یہ بات خود روایت کے اگلے الفاظ سے ثابت ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ سفر آدمی کو کھانے اور پینے اور سونے سے روک دیتا ہے (یمنع احدکم طعامه وشرابه ونومه) النووی نے اس کی یہی تشریح کی ہے (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۳/۷۰)

تعب اور مشقت اسلام کے دوسرے اعمال میں بھی ہے مثلاً روزہ، حج، جہاد وغیرہ۔ واقعات بتاتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار سفر فرمایا۔ نبوت سے پہلے آپ نے تجارتی اسفار کیے، نبوت کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ مثلاً دعوتی سفر، ہجرت کا سفر، جہاد کا سفر، حج اور عمرہ کا سفر وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ سفر بے حد اہم چیز ہے۔ اگر وہ صحیح ذہن کے ساتھ کیا جائے تو سفر عین عبادت بن جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں اہل ایمان کی ایک صفت السائحون بتائی گئی ہے۔ یعنی سفر کرنے والے (التوبہ ۱۱۲)

موجودہ دنیا میں ہر اچھے کام کے ساتھ مشقت جڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح سفر بھی ایک مشقت کا معاملہ ہے مگر کسی چیز کا پُر مشقت ہونا کوئی برائی کی بات نہیں۔ یہ دراصل مشقت ہی ہے جو کسی عمل میں جان پیدا کرتی ہے۔ مشقت انسان کے دل دماغ کو جگاتی ہے۔ مشقت کے ذریعہ آدمی کے تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔ مشقت آدمی کو نئے نئے تجربات تک پہنچاتی ہے اور اس طرح اس کی تخلیقیت میں اضافہ کرتی ہے۔

مجھے اپنی زندگی میں کثرت سے اسفار پیش آئے ہیں ان اسفار کے ذریعہ میں نے بہت کچھ جانا۔ ان سفروں کے ذریعہ مجھے "السائحون" کی اہمیت سمجھ میں آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کا پچاس فی صد حصہ اگر مطالعہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے تو اس کا بقیہ پچاس فی صد سیاحت اور سفر کے

ذریعہ تھا۔ مطالعہ اگر معلومات کو بڑھاتا ہے تو سفر تجربات میں اضافہ کا ذریعہ ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ متعلق تاثرات و تجربات یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

ایک صاحب نے کشمیر کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ الجمعیۃ کے زمانہ (۱۹۶۷) سے میں ایک ہی بات کہتا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ کشمیر کا مسئلہ ۱۹۴۷ میں طے ہو چکا۔ اس قسم کے معاملات تاریخی عوامل کے تحت طے ہوتے ہیں۔ اور تاریخی عوامل اس کو قطعی طور پر طے کر چکے ہیں۔ اب غوغائی سیاست یا گن کلچر کے ذریعہ اس فیصلہ کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ کشمیر کے لوگ تاریخ کے فیصلہ کو قبول کریں اور موجودہ سیاسی نظام کے تحت تعمیری میدانوں میں اپنا مستقبل بنائیں۔

۱۹۸۹ میں جب مسلح کشمیری تحریک چلی، اس کے بعد بھی بار بار میں یہ بات مختلف طریقہ سے کشمیریوں تک پہنچاتا رہا ہوں۔ میڈیا میں اس سلسلہ میں جو کچھ میں نے کہا وہ عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے۔ اس کے علاوہ میری ذاتی ڈائری میں بعض نہایت عبرت انگیز اندراجات اس کی بابت موجود ہیں۔

۱۔ مسلح جدوجہد شروع ہونے کے جلد ہی بعد ۱۲ دسمبر ۱۹۸۹ کو کشمیر کے ایک صاحب مجھ سے دہلی میں ملے۔ یہ مسٹر منظور احمد عرف سیف اللہ (محلہ خانیار، سری نگر) تھے۔ انھوں نے اپنی تحریک کی کامیابی کے بارہ میں نہایت جوش کا مظاہرہ کیا۔ میری ڈائری میں مذکورہ تاریخ کے صفحہ میں ان کے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: "کشمیر پانچ سال میں آزاد ہو جائے گا"۔
کشمیری نوجوان کے ان الفاظ کے نیچے ڈائری میں میں نے اپنی رائے ان لفظوں میں لکھی تھی: "میں نے کہا کہ یہ صرف نادانی کی بات ہے۔ اس طرح کشمیر کو آزاد کرنا ممکن نہیں ہے۔ موجودہ حالت میں آزادی کشمیر کی تحریک صرف کشمیر کو برباد کرنے کی تحریک ہے"۔

۲۔ دوسرا واقعہ ۲۷ جنوری ۱۹۹۲ کا ہے۔ اس روز سری نگر کے ایک اسلام پسند غلام نبی ہاگرو ایڈوکیٹ مجھ سے دہلی میں ملے۔ انھوں نے بھی کشمیری تحریک کے مستقبل کے بارہ میں نہایت پرجوش باتیں کیں۔ انھوں نے میری ڈائری میں مذکورہ تاریخ کے تحت اپنے قلم

نے حسب ذیل الفاظ لکھے: "ہندستان سے علاحدگی کے بعد جو کشمیر بنے گا، ان شاء اللہ وہ کشمیر اسلامی کشمیر ہوگا"

ان کی اس تحریر کے نیچے ڈائری میں میری رائے ان الفاظ میں لکھی ہوئی ہے: "میرے نزدیک ہندستان سے علاحدہ ہوکر (بالفرض) جو آزاد کشمیر یا پاکستانی کشمیر بنے گا وہ ایک برباد کشمیر ہوگا۔ کشمیریوں کے لیے جو اپنی ہندستانی کشمیر یا پاکستانی کشمیر میں نہیں ہے، بلکہ ہندستانی کشمیر یا برباد کشمیر میں ہے"

۱۹۸۹ میں جب کشمیر کے لوگوں نے اپنی مسلح تحریک شروع کی تو وہ سمجھتے تھے کہ وہ "انڈیا" کے خلاف اپنی تحریک شروع کر رہے ہیں۔ مگر حقیقۃً وہ تاریخ کے خلاف لڑنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے، اور تاریخ کے خلاف لڑ کر کوئی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اپنی تحریک کے آغاز میں جو کشمیری امیدوں اور حوصلوں سے بھرے ہوئے نظر آتے تھے، آج وہ مایوسی اور پست ہمتی کا شکار ہو چکے ہیں۔ انھیں محسوس ہو رہا ہے کہ انھوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا، اور اس کے بدلے میں پایا کچھ بھی نہیں۔

اتنی بے معنی جنگ شروع ہی کیوں ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آج کل کی جنگ لڑنے والے شروع نہیں کرتے، بلکہ ہمیشہ لڑانے والے شروع کرتے ہیں۔ آج کل مسلمان جگہ جگہ جہاد کے نام پر جو خونیں ٹکراؤ کر رہے ہیں اس میں رہ نمایانہ کردار کون ادا کر رہا ہے۔ یہ وہ دانشور ہیں جو دور اپنے دفتروں میں بیٹھ کر اشتعال انگیز مضامین لکھتے ہیں۔ وہ لیڈر ہیں جو دوسرے ملکوں میں بیٹھ کر تیز و تند بیانات دیتے رہتے ہیں، وغیرہ۔ یہ سب جدید کمیونی کیشن اور میڈیا کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ پہلے زمانہ میں لڑانے والے کو بھی لڑنے والوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ اب نئے ذرائع کی بنا پر یہ ممکن ہوگیا ہے کہ لڑانے والا دور سے صرف الفاظ لکھ کر اور بول کر جہاد کا کریڈٹ لیتا رہے۔ جنگ اور ٹکراؤ کے نقصان سے وہ بھی محفوظ رہے اور اس کے بچے بھی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ اکثر مسلم قائدین پر تنقید کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ میں نے کہا کہ میں کسی قائد پر کبھی ذاتی تنقید نہیں کرتا۔ میں صرف ان کی عملی پالیسی پر تنقید کرتا ہوں۔ موجودہ زمانہ کے قائدین نے تقریباً بلا استثنا ایسا کیا ہے کہ انھوں نے ملت کو الٹی راہوں

اٹھایا جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ اور نکلنے والا نہ تھا۔ یہی آج ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ہر جگہ نااہل مسلم قائدین یہی کر رہے ہیں۔ وہ تباہی و بربادی کے نقیب بنے ہوئے ہیں پھر کیوں نہ ان پر تنقید کی جائے۔

میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الحُطَمَۃ (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ) حطم کے معنی ہیں چور چور کر دینا۔ حطمہ اسی کا اسم مبالغہ ہے۔ یعنی سب سے برا چرواہا (قائد) وہ ہے جو لوگوں کو چور چور کر دینے والا یا کچل دینے والا ہو۔

اس حدیث کا ایک مصداق وہ حکام ہیں جو اپنے اقتدار کا غلط استعمال کر کے لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اس کا دوسرا مصداق وہ قائدین ہیں جو بھڑکانے والے نعرے اور جذباتی اقدامات کے ذریعہ مسلمانوں کو غیر ضروری طور پر طاقتور گروہوں سے لڑا رہے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ساری دنیا میں مسلمان یک طرفہ ہلاکت کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایسے تمام قائدین پر فرض تھا کہ وہ چپ رہیں، وہ قوم کو ٹکراؤ کے راستہ پر نہ لے جائیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان جو ہر جگہ مظالم کا شکار ہو رہے ہیں، اس کو عام طور پر ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ دشمنوں کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ انھیں نااہل قائدین کے غلط اقدامات کا نتیجہ ہیں۔ اس اعتبار سے یہ تمام قائدین ان شر الرعاء الحطمۃ کا مصداق ثابت ہوئے ہیں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد ہمیں پچاس سال ملے مگر آزادی کے بعد ملک کی تعمیر کا جو کام ہونا تھا وہ نہ ہو سکا۔ آزاد ہندستان ایک تباہ ہندستان بنا ہوا ہے۔ آزادی کے بعد ہمیں ایک اور گاندھی کی ضرورت تھی جو ہمیں نہ مل سکا۔

میں نے کہا کہ یہ بات درست نہیں۔ یہ دوسرا گاندھی بھی ہم کو ملا مگر وہ کچھ کر نہ سکا۔ ۱۹۴۷ کے بعد بھی مہاتما گاندھی ایک عرصہ تک زندہ رہے مگر وہ نئے ہندستان میں بے اثر ہو گئے۔ حتی کہ خود انھوں نے کہا کہ "اب میری کون سنے گا"۔ انگریز مخالف سیاست میں گاندھی کامیاب تھے مگر ہندستان موافق سیاست میں گاندھی ناکام ہو گئے۔ منفی سیاست سب سے زیادہ آسان کام ہے، اور مثبت سیاست سب سے زیادہ مشکل کام۔

ایک صاحب سے موجودہ زمانہ کی مسلم دنیا کے حالات پر گفتگو ہوئی۔ آج کل ساری مسلم دنیا میں بے فائدہ ٹکراؤ اور بے معنی لڑائی عام ہے۔ ہر مسلمان اس کو جہاد کے نام پر لڑ رہا ہے۔ یہ سب تعلیم کی کمی کا نتیجہ ہے۔ تعلیم سے میری مراد صرف دینی تعلیم نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کے لیے عصری تعلیم بھی انتہائی ضروری ہے۔ تاکہ مسلمان اس حدیث کا مصداق بن سکیں : وعلیٰ یکون بصیراً بزمانہ۔

ایک بار مسٹر رام جیٹھ ملانی کی رہائش گاہ (نئی دہلی) پر ایک میٹنگ تھی۔ اعلیٰ طبقہ کے کچھ ہندو شریک تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ ایک صاحب نے پیغمبر اسلام ؐ کے بارہ میں کہا کہ وہ امی تھے۔ رام جیٹھ ملانی نے فوراً جواب دیا : وہ امی تھے یا نہیں تھے، یہ الگ بات ہے۔ مگر میں تو یہ جانتا ہوں کہ انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو اس وقت تک تاریخ میں کسی نے نہیں کہی تھی۔ انھوں نے کہا : عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ قیمتی ہے۔

۱۲ اپریل کو آغا سید برہان الدین شاہ صاحب کے یہاں صبح کی چائے تھی۔ ان کے جد امجد ۱۸۴۲ میں افغانستان سے ہندستان آئے تھے۔ انھوں نے کوہ نور ہیرے کا قصہ بتایا۔ اس کی تاریخ اگرچہ اختلافی ہے۔ تاہم عام طور پر مانا جاتا ہے کہ ایران کے نادر شاہ نے جب ۱۷۳۹ میں دہلی کو لوٹا تو وہ کوہ نور کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کی موت کے بعد وہ اس کے فوجی سردار احمد شاہ درانی (افغانستان) کو ملا اور اس کے بعد شاہ شجاع کو۔

انھوں نے بتایا کہ شاہ شجاع کوہ نور کو ہمیشہ اپنی پگڑی کے اندر رکھتا تھا۔ ایک بار مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے یہاں شاہ شجاع اور دوسرے والیانِ ریاست کو مدعو کیا۔ جب سب لوگ آکر بیٹھ گئے تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا : آج میں شاہ شجاع کا دستار بدل بھائی بنوں گا۔ شاہ شجاع نے کہا کہ اے کور چشم، میں جانتا ہوں کہ تو کیا چاہتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی دستار سے ہیرا نکالا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کو دے دیا۔ ۱۸۴۹ میں جب پنجاب کو برٹش انڈیا میں ملا دیا گیا تو اس کے بعد رنجیت سنگھ کے لڑکے دلیپ سنگھ کوہ نور کو لے کر لندن گئے۔ وہاں انھوں نے اس کو ملکۂ برطانیہ وکٹوریہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد سے وہ تاج برطانیہ کا حصہ ہے۔

یہ عمل معلوم ہے کہ ہیرا کوئلہ سے تیار ہوتا ہے۔ کروروں سال کے فطری عمل کے بعد سیاہ کوئلہ کا ایک ٹکڑا چمک دار ہیرا بن جاتا ہے۔

ہیرا خالص کاربن ہوتا ہے۔ اس کا ترکیبی جزء وہی ہے جو کوئلہ کا ہے۔ مگر کوئلہ سیاہ ہوتا ہے اور ہیرا انتہائی چمک دار۔ نیز ہیرا تمام معلوم مادوں میں سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ہیرا صرف زینت کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں اپنی انتہائی سختی کی وجہ سے وہ مختلف صنعتی مقاصد میں استعمال ہوتا ہے۔

ہیرا اور کوئلے کا یہ فرق علامتی طور پر حقیقی انسان اور غیر حقیقی انسان کے فرق کو بتاتا ہے۔ دونوں کی حیاتیاتی اصل اسی طرح ایک ہے جس طرح ہیرے اور کوئلے کی اصل ایک ہے۔ مگر حقیقی انسان خدا کی دنیا میں ہیرا انسان ہوتا ہے اور غیر حقیقی انسان صرف ایک کوئلہ انسان۔ دین کا کام ہو یا دنیا کا کام، ہر ایک کے لیے ہیرا انسان درکار ہوتے ہیں۔ کوئلہ انسان نہ دین کے کام کے ہیں اور نہ دنیا کے کام کے۔

ایک صاحب نے ایک مسلم دانشور کا مضمون دکھایا جو حیدرآباد کے ایک اخبار (۷ اپریل ۱۹۹۶) میں چھپا تھا۔ اس میں امریکہ کا تقابل ہندستان سے کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ امریکہ کی اقلیت کو تعصب کا سامنا نہیں۔ جب کہ ہندستان کی اقلیت کو تعصب کا سامنا پیش آرہا ہے۔ مضمون نگار نے لکھا تھا:

"امریکہ میں جنرل کولین پاویل کی ترقی کی داستان بتاتی ہے کہ امریکہ میں گزشتہ ۴۵ برسوں میں سفید فام امریکیوں کا سیاہ فام امریکیوں کے ساتھ امتیازی سلوک بہت بڑی حد تک ختم ہوا ہے۔ لیکن اس ۴۵ سال کی مدت میں ہندستان نے تعصب، فرقہ واریت اور تنگ نظری کی منزل کی سمت میں سفر کیا ہے۔"

میں نے کہا کہ یہ تقابل غلط ہے۔ امریکہ میں اگر اقلیت کے کچھ افراد نے ترقی کی ہے تو ہندستان میں بھی اقلیت کے بہت سے افراد نے ترقی کی ہے۔ آزادی کے بعد یہاں بہت سے اقلیتی افراد صدر، چیف جسٹس، ایر مارشل، گورنر، چیف منسٹر اور دوسرے عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ نہایت غلط رہنمائی ہے کہ ہندستان کی مایوسانہ تصویر پیش کر کے مسلمانوں کو بے حوصلہ کیا جائے۔

[illegible] ایک قاری نے کہا کہ میں برابر الرسالہ پڑھتا ہوں۔ مگر آپ کی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ ہمیشہ مسلمانوں کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں آخر صبر کب تک۔ میں نے کہا کہ میں بھی آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ قرآن و حدیث میں بار بار نماز پڑھنے کے لیے کہا گیا ہے آخر نماز کب تک۔ انھوں نے کہا کہ نماز تو ایک عبادت ہے اور اس کو آخر دم تک ادا کرنا ہے۔ میں نے کہا یہی میرا جواب صبر کے بارہ میں ہے۔ صبر بھی ایک عبادت ہے اور اس کو آخر دم تک انجام دینا ہے۔ اسی لیے قرآن میں صبر اور نماز کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

غدر کی غیر منصوبہ بند اور تیاری کے بغیر لڑائی ۱۸۵۷ کے آغاز میں بیرک پور اور برہام پور (بنگال) سے شروع ہوئی۔ تاہم انگریزوں نے بہت جلد اس کو دبا دیا۔ اس کے بعد ۱۰ مئی ۱۹۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی کے ہندستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ وہ ہتھیار لے کر نکل پڑے۔ یہاں کے انگریز افسروں کو مارا۔ ان کے گھر جلا دیے، وغیرہ۔ تاہم انگریز جو زیادہ بہتر ساز و سامان سے مسلح تھے، نیز وہ ٹیلی گراف کا نظام بھی قائم کر چکے تھے، انھوں نے دوسرے مقامات سے فوج بلا کر بغاوت کو کچل دیا، اور دہلی کی بہادر شاہ ثانی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جن کے نام پر بغاوت کی گئی تھی۔ یہ بغاوت، برعکس طور پر، ہندستان میں انگریزوں کے اقتدار کو زیادہ مستحکم کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

اس کے بعد انگریزوں نے یہاں ۱۸۹۲ میں میرٹھ کالج قائم کیا۔ اس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ لوگوں کا ذہن جنگ جوئی سے ہٹا کر تعلیم کی طرف موڑ دیا جائے۔ تاہم انگریزوں کا مقصد جو بھی ہو، اس علاقہ کے لوگوں کے لیے یہ ایک قیمتی موقع تھا۔ مگر اس وقت یہاں کے لوگ، خاص طور پر مسلمان، انگریزوں کے خلاف نفرت کی نفسیات میں مبتلا تھے، چنانچہ وہ اس تعلیمی موقع کی طرف راغب نہ ہو سکے۔ مسلمان اگر نفرت کے احساسات سے آزاد ہوتے اور ۱۸۹۲ میں قائم ہونے والے اس تعلیمی ادارہ سے بھرپور فائدہ اٹھاتے تو یقینی طور پر آج اس علاقہ کی تاریخ دوسری ہوتی۔

زندگی کا ایک راز وہ ہے جو ایک قول میں اس طرح کہا گیا ہے کہ علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ہو (اطلبوا العلم ولو کان بالصین)۔ اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی کے پاس بھی سارے

مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے قیمتی مواقع دوستوں کے پاس نہیں بلکہ دشمنوں کے پاس موجود ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں عقل مندی یہ ہے کہ اپنے اور غیر یا دوست اور دشمن کی تقسیم سے اوپر اٹھ کر ہر اس موقع کو استعمال کیا جائے جو ممکن اور قابل حصول ہو۔

خود سنت رسول میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ہجرت کے سفر میں آپ نے مکہ کے ایک مشرک (عبد اللہ بن اریقط) کو اپنا رہنما بنایا۔ جنگ بدر کے مشرک قیدیوں کے ذریعہ مدینہ کے مسلم بچوں کو تعلیم دلوائی۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ حکمت کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے، جہاں وہ اس کو پائے تو وہی اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے (الكلمة الحكمة ضالة المؤمن فاين وجدها فهو احق بها) الترمذی، کتاب العلم

جو لوگ اس حکمتِ حیات کو جانیں وہی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس حکمت سے بے خبر ہوں ان کے لیے خدا کی اس دنیا میں جو چیز مقدر ہے وہ صرف یہ کہ وہ انسانی قافلوں سے بچھڑ جائیں۔ اور اس کے بعد اپنے بچھڑے پن کا الزام دوسروں پر ڈالنے کے لیے لفظی احتجاج کا طوفان برپا کریں جس کو سننے کے لیے بھی وہاں ان کے سوا کوئی شخص موجود نہ ہو۔

میرٹھ کے بارہ میں آپ کوئی معلوماتی کتاب پڑھیں تو اس میں لکھا ہوگا کہ ہندستان میں ۱۸۵۷ کی بغاوت کا آغاز نمایاں طور پر میرٹھ سے ہوا :

The initial uprising of the 1857 Indian Mutiny occurred there (VI/753)

یہ واقعہ جس کو ہندستانیوں نے ریوولٹ کا نام دیا اس کو انگریزوں نے میوٹنی کہا تھا۔ میوٹنی اور ریوولٹ میں بہت فرق ہے۔ ریوولٹ وہ ہے جس میں پوری قوم شامل ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں میوٹنی چھوٹے درجہ کی باغیانہ شورش کو کہا جاتا ہے، جیسے سمندری جہاز کا عملہ اپنے کیپٹن کا باغی ہو جائے۔

۱۸۵۷ کی شورش کو انگریزوں نے میوٹنی کہا تو کچھ ہندستانی اس پر غصہ ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی جنگ آزادی کو میوٹنی کہنا ایک سازش ہے تاکہ اس کی اہمیت کو گھٹایا جا سکے۔

مگر جب جنگ آزادی جب مہاتما گاندھی کی قیادت میں چلائی گئی تو انگریز اس کو سبوتاژ نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "سازش" کی ایک حد ہے۔ جب معاملہ اس حد سے گزر جائے تو اس کے خلاف کوئی سازش کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں رہتا۔

تقریباً چالیس سال پہلے میری ملاقات میرٹھ کے ایک مسلمان سے ہوئی تھی۔ وہ لمبے قد کے شاندار شخصیت کے آدمی تھے، مگر وہ دونوں آنکھوں سے اندھے ہو چکے تھے۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں وہ فوج کو انڈا سپلائی کرنے کا کام کرتے تھے۔ وہ دیہاتوں سے انڈے منگاتے تھے، روزانہ بہت سے انڈے ٹوٹے ہوئے نکلتے تھے، انھوں نے ان انڈوں کو پھینکنا پسند نہیں کیا۔ اس کے بجائے وہ خود انھیں کھانے لگے۔ روزانہ صبح سے شام تک وہ تقریباً پچاس انڈے کھا جاتے تھے۔ ابتداءً انھیں فائدہ محسوس ہوا۔ مگر اس غیر فطری خوراک کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ وہ مکمل طور پر اندھے ہو گئے۔

انڈا عام حالت میں ایک صحت بخش غذا ہے۔ مگر اس کی زیادتی ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے۔ یہی معاملہ ہر چیز کا ہے۔ اسی لیے اسلام میں اعتدال اور توسط کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ ہر معاملہ میں صحیح طریقہ وہی ہے جو فطری طریقہ ہو، اور فطری طریقہ ہمیشہ اعتدال کا طریقہ ہوتا ہے۔

میرٹھ کے ایک صوفی شاعر وارث میرٹھی تھے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ نومبر ۱۹۴۷ میں پاکستان چلے گئے۔ ان کے صاحبزادے مظفر وارثی کا ایک انٹرویو قومی آواز (۲۸ اپریل ۱۹۹۶) میں چھپا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ پروفیسر طاہر القادری نے جب نظام مصطفوی کا نعرہ لگایا تو میں اپنی کشتیاں جلا کر ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ان کے لیے میں نے اسٹیٹ بینک کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ مگر ان کو قریب سے دیکھ کر میں بہت مایوس ہوا۔ وہ کسی بھی معاملہ میں فیئر نہیں، سیاست میں بھی نہیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ "طاہر القادری سے اپنے ہزار اختلاف کے باوجود میں ضرور کہوں گا کہ اس جیسا مقرر پورے برصغیر میں نہیں"۔

یہی موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمانوں کا اصل المیہ ہے۔ لاجواب مقرر دوسرے

نظروں میں صرف لاجواب لفّاظ ہوتا ہے، اور لفاظ قسم کے لوگ کبھی کوئی صحیح عمل رہنمائی نہیں دے سکتے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے ہر جگہ یہی کیا ہے کہ انھوں نے ایسے افراد کو اپنا قائد بنایا جو لاجواب مقرر یا لاجواب شاعر یا لاجواب انشاء پرداز تھے۔ پچھلے سو سال میں ساری مسلم دنیا میں ایک بھی ایسی مثال نہیں کہ حکمت و تدبر والے کسی شخص نے مسلمانوں کے درمیان قیادت کا مقام حاصل کیا ہو۔ مقرر اور شاعر اور انشاء پرداز قسم کے لوگ تدبر یا گہری سوچ سے خالی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ یہی کر سکتے تھے کہ جذباتی الفاظ بول کر قوم کو ایسے خیالی راستوں کی طرف دوڑا دیں جس کا کوئی انجام نکلنے والا نہ ہو، اور انھوں نے یہی کام انجام دیا۔

یکم مئی ۱۹۹۶ کو میرٹھ میں ایک واقعہ ہوا۔ روزنامہ عوام (دہلی) کے نمائندہ مسٹر کامران زبیری کی رپورٹ کے مطابق، اس کی تفصیل یہ ہے:

"تھانہ کوتوالی علاقہ میں آج دوپہر آپسی رنجش کے تحت ایک شخص نے اپنے ہی پڑوسی کو چاقوؤں سے گود کر جان سے مار ڈالا، جس سے علاقہ میں تناؤ کا ماحول بن گیا اور اس حادثے کو فرقہ وارانہ سمجھ کر بازار بند ہو گئے۔ موصولہ اطلاعات کے مطابق محلہ محل والا کے رہنے والے عقیل نے اپنے پڑوسی شیر افگن کو چاقوؤں سے گود دیا جس سے موقع پر ہی اس کی موت ہو گئی۔ بتایا جاتا ہے کہ چاقو لگنے کے بعد شیر افگن بھاگتا ہوا پڑیوں کے محلے میں پہنچا، وہاں اس نے دم توڑ دیا۔ غیر مسلم محلے میں مرنے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش میں یہ افواہ اڑا دی کہ ایک مسلمان کو ہندوؤں نے مار دیا، جس سے علاقہ میں زبردست کشیدگی پھیل گئی اور ذرا سی دیر میں سبھی بازار بند ہو گئے۔ علاقہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر ریپڈ ایکشن فورس کے جوان فوراً ہی موقع پر نہ پہنچ جاتے اور عقیل کو گرفتار نہ کر لیتے تو یہاں فساد تک ہونے کا اندیشہ تھا کیوں کہ مارنے والا ہندو بتایا جا رہا تھا۔ اس حادثے کے بعد شاہین پرویز اور اظہار منظور نے علاقہ میں پہنچ کر لوگوں کی غلط فہمی کو دور کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ شیر افگن کی ایک بہن کی شادی ۷ مئی کو دہلی میں ہونی تھی اور گھر کے دوسرے سبھی افراد پہلے ہی دہلی روانہ ہو چکے تھے لیکن وہ یہاں سے ایک ٹیپ ریکارڈر ٹھیک کروانے کے لیے رک گیا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ

[illegible] رنجش کسی لڑکی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے معاملے کو لے کر تھی۔ [illegible] کو دیکھتے ہوئے بھاری پولیس فورس تعینات کر دی گئی ہے اور پولیس و انتظامیہ کے اعلیٰ افسران موقع پر پہنچ گئے ہیں۔ حالات قابو میں ہیں"

فسادات بیشتر حالات میں غلط فہمی کی بنا پر ہوتے ہیں۔ غلط فہمی اور افواہیں بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ جاتی ہیں جہاں معاملہ پولیس اور انتظامیہ کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ الم ناک صورت حال پیش آتی ہے جس کو فساد کہا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ کوئی واقعہ پیش آتے ہی فوراً مقامی ذمہ داران حرکت میں آجائیں تو واقعہ ایک حد پر رک جائے گا اور سرکاری انتظامیہ کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ اس کو کنٹرول کر سکے، جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں پیش آیا۔

کان پور کے جناب نیاز احمد صاحب (Tel 607437) نے ۱۶ دسمبر ۱۹۹۷ء کی ایک ملاقات میں کہا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہمارے لیے پولیس یا پی۔ اے۔ سی کا کوئی مسئلہ نہیں جیسے ہم انسان ہیں ویسے ہی وہ بھی انسان ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے کچھ پُرجوش نوجوان خود اپنی نادانی سے ان کو غیر ضروری طور پر اپنا دشمن بنا لیتے ہیں۔ مثلاً وہ دیواروں پر لکھ دیں گے کہ پی۔ اے۔ سی مُردہ باد۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے نعروں کے بعد ان کے دل میں ہمارے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

انھوں نے اپنا تجربہ بتایا کہ پچھلے عید کے موقع پر حسب معمول ان کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ ہمارے محلہ میں ایک جگہ تقریباً چھ پی اے سی کے جوان ڈیوٹی پر تھے۔ میں نے یہ کیا کہ عید کے دن ایک ٹرے میں سویاں وغیرہ رکھ کر ان کے پاس گیا اور کہا کہ یہ ہماری طرف سے آپ لوگوں کے لیے عید کا تحفہ ہے۔ اس سے وہ لوگ اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ وہ منظر نظر آنے لگا جو قرآن کی اس آیت میں بیان ہوا ہے —— پس تمہارے اور جس کے درمیان بظاہر عداوت ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کہ تمہارا کوئی قریبی دوست (حم السجدۃ ۳۴)

اس کے بعد ان پولیس والوں کا یہ حال ہوا کہ جب وہ مجھ کو دیکھتے تو فوراً ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاتے اور کہتے کہ چاچا جی، ہمارے لائق کوئی کام ہو تو بتائیے ہم آپ کی سیوا میں ہیں۔

[illegible] میرٹھ ۱۹۹۲ء میں ایک نوجوان کی موت کا واقعہ پیش اس کا جائزہ [illegible] طارق ارشد شہید، ناموس انسانیت۔ کئی صفحے کے اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ

* [illegible] طارق ارشد نے میرٹھ کے فساد ۱۹۹۰ میں اپنی جان قربان کر دی۔ طارق ارشد کا جرم اس کے [illegible] یہ تھا کہ فساد کے دوران اس نے اپنے پڑوسی غیر مسلموں کو اپنی جان پر کھیل کر ان کو موت سے بچایا تھا۔ اور جب ایک مسلم نوجوان جس کو غیر مسلم فسادیوں نے شہید کر دیا تھا اور اس کی لاش مسلم نوجوان اٹھا کر لے گئے تھے، طارق نے لاش حاصل کرنے کے لیے پولیس کو طاقت کے استعمال سے روک دیا اور مسلمانوں سے لاش کو پولیس کے سپرد کرنے کو کہا۔ اس پر مشتعل ہو کر یہ کہتے ہوئے کہ اس نے تین کافروں کو بچایا ہے، طارق کے فرقہ کے لوگوں نے ہی اس کو چاقو مار کر شہید کر دیا۔

یہ ایک اہم واقعہ ہے۔ لیکن میگزین میں اس کو بالکل غیر واضح اور ادبی اسلوب میں بیان کیا گیا تھا جس کا اندازہ اوپر کے اقتباس سے ہو رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ اتنے اہم واقعہ کو خالص واقعاتی اور تمثیلی انداز میں بیان کیا جائے تاکہ اس کا بھرپور فائدہ حاصل ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان جب تک شاعروں اور ادیبوں کے سحر سے باہر نہیں آئیں گے، ان کی زبان جدید معیار کے مطابق ترقی نہیں کر سکتی۔

میگزین میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر نقل کی گئی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ دوسری عالمی جنگ کے موقع پر میری یہ قطعی رائے تھی جس پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران کی اکثریت کو اتفاق تھا کہ اگر برطانیہ یہ مان لے کہ جنگ کے بعد ہندستان کو آزادی دے دی جائے گی تو ہم لڑائی میں شریک ہو سکتے ہیں۔ گاندھی جی کو اس سے سخت اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم ایسی آزادی لینا ہی نہیں چاہتے جو لڑائی کے سایہ میں ہم کو ملے۔ اس لیے وہ کسی طرح بھی لڑائی میں شرکت کے لیے تیار نہ تھے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجاویز کا ڈرافٹ گاندھی جی ہی بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اپنے اس ریزولیوشن کا ڈرافٹ بنوانے کے سلسلے میں اور پنڈت نہرو گاندھی جی کے پاس گئے۔ انھوں نے اپنے پورے اختلاف کے باوجود اس تجویز کا ڈرافٹ بنا دیا۔

[illegible] ان کو بہت تھکا دیتا ہے [illegible] کرتا ہے [illegible] کر کے
[illegible] ایک [illegible] کے بعد ہی یہ اعلیٰ اخلاقی صفت پیدا ہو سکے۔

چاند چودھری میگزین میں میرٹھ کی بہت سی شخصیتوں کا تعارف تھا۔ ان میں سے ایک عجیب شخص [illegible] یہاں کے ایک سیدھے سادے آدمی تھے۔ تحریک آزادی میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ آزادی کے بعد انھوں نے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی تھی۔ ایک دن یہ کہہ کر کہ بھارت میں اب زندہ رہنا ملک و قوم پر ایک بوجھ ہے، کمر سے اینٹیں باندھ کر اپنے گھر کے کنویں میں گر گئے۔ تاہم میگزین میں اس واقعہ کی کوئی تاریخ درج نہیں تھی۔

میرٹھ کے محمد یامین صاحب پرانے کانگریسی رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں ۱۹۴۹ میں جب اجودھیا کی بابری مسجد میں مورتیاں رکھ دی گئیں اور پھر عدالت کے حکم سے مسجد میں تالا لگا دیا گیا تو مولانا آزاد نے کچھ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ "بابری مسجد کے مسئلہ کو عدالت کے ذریعہ طے کرایا جانا چاہیے، اس کو سڑکوں پر لانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

مولانا آزاد کا یہ مشورہ نہایت صحیح تھا۔ مگر اسی کے ساتھ مولانا آزاد کو جاننا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت نہایت جذباتی ہے۔ کوئی بھی غیر ذمہ دار لیڈر جذباتی تقریریں کر کے انھیں سڑکوں پر لا سکتا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ فکر و شعور میں اصلاح کی ایک مستقل مہم چلا کر مسلمانوں کو حقیقت پسند بنایا جائے تاکہ مفاد پرست افراد جھوٹے الفاظ بول کر انھیں گمراہ نہ کر سکیں۔ مگر مولانا آزاد یا ان کے ساتھیوں نے تعمیر شعور کی یہ مہم نہیں چلائی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مشورہ ہندستانی مسلمانوں کی عملی پالیسی نہ بن سکا۔

مولانا آزاد کا مشورہ اصولی طور پر بالکل درست تھا۔ ۱۹۴۷ کے بعد اسی ملک میں بہت سی ناجائز قبضہ والی مسجدوں کو عدالت کے ذریعہ واگزار کرانے میں کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ پھر بابری مسجد کے معاملہ میں ناکامی کیوں ہوئی، اس کا سبب دراصل اسی فطری طریقہ سے انحراف تھا۔

• بابری مسجد کا مسئلہ بھی عدالت میں زیر سماعت تھا۔ مگر اسی کے ساتھ کچھ سطحی لیڈر اس کو سڑکوں پر نکال لائے۔ ابتداءً یہ مسئلہ ایک قصبہ کے کچھ ہندوؤں اور کچھ مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ مگر جب اس کو نعروں اور جلسوں کی دھوم مچا کر پورے ملک کا مسئلہ بنایا گیا تو وہ پورے ملک کی ہندو اکثریت اور

[illegible] ۱۹۹۲ء میں ملک کی ایک نہایت [illegible] پر بہت [illegible]
[illegible] کا یہی بدترین انجام ہے جس سے وہ حالات پیدا کیے جنھوں نے ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو
ایک [illegible] میں داخل ہو جائے اور وہ بابری مسجد کو توڑ ڈالے۔

[illegible] میرٹھ کے پاس ایک گاؤں ہے۔ اس کا نام جاجاوہ ہے۔ یہیں ایک سید ظل حسنین رضوی رہتے تھے۔ ان کا خاندان تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا۔ پاکستان بننے سے چند دن پہلے ان کے چھوٹے بھائی جاجاوہ سے دہلی گئے اور وہاں سے ایک گراموفون خرید لائے۔ ان کی والدہ اس پر بہت خفا ہوئیں۔ انھوں نے کہا کہ لوگ تو گھر بار چھوڑ کر پاکستان جا رہے ہیں اور تم گراموفون خرید لائے ہو۔ بھائی نے کہا کہ ہم لوگ جب پاکستان جائیں گے تو اس کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ والدہ نے بگڑ کر کہا کہ پاکستان تو پاک جگہ ہے۔ وہاں کیا گراموفون بجائے جائیں گے وہاں تو ہر وقت اللہ اللہ ہوا کرے گا۔

ایک عام مسلمان کے ذہن میں اس وقت پاکستان کا یہی تصور تھا۔ کیوں کہ مسلم لیگ نے ہر طرف یہ شعر پھیلا رکھا تھا: پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ۔ مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ موجودہ پاکستان میں اللہ کے نغمے گم ہو گئے۔ ہر طرف بس غیر اللہ کے ہنگامے جاری ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔

لاہور کے پروفیسر محمد اسلم جنھوں نے اپنے پڑوسی سید ظل حسنین رضوی سے سن کر یہ قصہ لکھا ہے۔ وہ پاکستانی تحریک کے اس برعکس انجام کی توجیہہ اس طرح کرتے ہیں:

"ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ قیام پاکستان کے موقع پر ایک اسپیشل ٹرین مرکزی حکومت کے مسلم افسروں کو لینے کے لیے دہلی بھیجی گئی۔ جب وہ ٹرین وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ مسلم آفیسرز بذریعہ ہوائی جہاز کراچی روانہ ہو چکے ہیں۔ ٹرین کے منتظمین نے کراچی سے رابطہ قائم کیا تو وہاں سے جواب ملا کہ زیڈ اے بخاری (م ۱۹۷۵) ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ ٹرین خالی واپس لانے کے بجائے دہلی اور یوپی سے موسیقاروں، میراثیوں، طبلہ نوازوں، طوائفوں اور رباہیوں کو پاکستان لے آئے۔ چنانچہ بخاری صاحب کی خواہش پر اس ٹرین میں یہ فن کار پاکستان تشریف لے آئے۔ اور پھر انھوں نے وہ اودھم مچایا کہ الامان والحفیظ۔ سید ظل حسنین رضوی کی والدہ

پاکستان [illegible] ہیں سنتا پا [illegible] تحسین ساجنوں کی کتاب [illegible]
[illegible] مطبوعہ لاہور ۱۹۹۵ صفحہ ۵۱۶)

کیسی عجیب بات ہے کہ جس پاکستان کو مفکر اعظم علامہ اقبال نے سوچا اور اس کا وقت اسلامیہ ہند کے مسائل کا حل بتایا۔ اور جس کو قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنی تمام صلاحیت استعمال کرکے بنوایا، وہ خود بانی پاکستان کی زندگی ہی میں اتنا کمزور نکلا کہ چند غیر معروف فوجی کارروں نے اس کو بالکل چیٹ کرکے رکھ دیا۔ یہ واقعہ زید اے بخاری کی شخصیت کو داغدار نہیں کرتا بلکہ وہ خود مفکر اعظم کی فکر اور قائد اعظم کی قیادت کو مشتبہ قرار دے رہا ہے۔

عوام اور رہنما میں یہ فرق ہے کہ عوام آج کو دیکھتے ہیں اور رہنما کل کو دیکھتا ہے۔ عوام صرف ان باتوں کو جانتے ہیں جن کے درمیان وہ بروقت گھرے ہوئے ہیں۔ اور رہنما اپنی برتر صلاحیت کی بنا پر ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ وہ حالات سے اوپر اٹھ کر وسیع تر دنیا کو دیکھ سکے۔ عوام چیزوں کو صرف اپنی پیشانی کی نظروں سے دیکھ پاتے ہیں۔ مگر جو رہنما ہے اس کی بصیرت اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ جن چیزوں کو عام لوگ دیکھ نہیں پاتے ان کو بھی وہ اپنی اندرونی نگاہ سے جان لیتا ہے۔

اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ رہنما کے عمل کو حال کے اعتبار سے نہیں بلکہ مستقبل کے اعتبار سے جانچا جاتا ہے۔ یہ دراصل بعد کو پیش آنے والے حالات ہیں جو بتاتے ہیں کہ رہنمائی درست تھی یا نہیں۔

سماجی یا قومی زندگی میں جب کوئی اقدام کیا جاتا ہے تو وہ اقدام اگرچہ حال میں کیا ہوا عمل ہوتا ہے مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ مستقبل میں نکلتا ہے۔ اس لیے کسی اقدام کی صحت کو جانچنے کا معیار مستقبل ہے نہ کہ حال۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی سب باتیں ٹھیک ہیں مگر آپ کو کسی کے اوپر تنقید نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ یہ بات آپ اپنی عقل سے کہہ رہے ہیں، مگر قرآن و حدیث میں اس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔ اسلام کے دور اول میں تنقید عام تھی اور کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید کو برا ماننا قومی زوال کی علامت ہے، اور تنقید کو خوش دلی کے ساتھ سننا قومی عروج کی علامت۔

مومن مومن کا آئینہ ہے: المؤمن مرآۃ المؤمن (سنن ابو داؤد، نمبر [illegible]) یعنی ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدین النصیحۃ ([illegible]) یعنی دین نصیحت ہے۔

ایک آدمی کے اندر جب اسلام کی سچی اسپرٹ پیدا ہوتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کا خیر خواہ بن جاتا ہے۔ اسی خیر خواہی کا نام نصیحت ہے۔ اس خیر خواہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ دوسروں کے لیے آئینہ کی مانند ہو جائے اور دوسروں کو ان کی واقعی حیثیت سے آگاہ کرتا رہے۔

دوسروں کو فہمائش کرنا اگر دوسروں کو کمتر دکھانے کے لیے ہو اور اس لیے ہو کہ دوسروں کے اوپر اپنی برتری ظاہر کی جائے تو یہ ایک گناہ کا فعل ہے اور اس پر خدا کی طرف سے سخت پکڑ کا اندیشہ ہے۔ اس کے بجائے اگر فہمائش کا مقصد دوسرے کی خیر خواہی اور سچی اصلاح ہو تو یہ ایک عظیم ثواب کا کام ہے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو ڈاکٹر رفیق ذکریا کی انگریزی کتاب "بڑھتی ہوئی تفریق" پڑھے ہوئے تھے۔ یہ کتاب ۱۹۹۵ میں پنگوئن بکس انڈیا کی طرف سے چھپی ہے:

The Widening Divide
An insight into Hindu-Muslim relations

انھوں نے کہا کہ مصنف نے اس کتاب میں آپ کی بابت یہ لکھا ہے کہ آر ایس ایس کے ساتھ آپ کا قریبی ربط (close association) ہے اور اس بنا پر آپ مسلمانوں کے درمیان ایک مشتبہ شخصیت بن گئے ہیں (صفحہ ۲۷۵) انھوں نے کہا کہ میں آپ کا الرسالہ پڑھتا ہوں مگر اس میں آپ نے اس تبصرہ کی بابت کچھ نہیں لکھا۔

میں نے کہا کہ یہ ایک نہایت سطحی تبصرہ ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلم دانشوروں کے معیار کو بتاتا ہے۔ آپ دیکھئے۔ اس کتاب کو انھوں نے نام لیے بغیر مہاتما گاندھی (اور نہرو) کے نام ڈیڈیکیٹ کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انھوں نے ہندو مسلم یونیٹی کے لیے بہت کام کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بھی اسی ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کر رہا ہوں۔ مگر میں اسی کام

پھر انھوں نے جو کوئی انعام دیا وہ آزاد دین احین کے ساتھ [illegible] دیا۔
یہ کیسا عجیب تضاد ہے کہ آدمی اگر ہندو مسلم اتحاد کے لیے مسلمانوں سے [illegible] تو وہ قابل تعریف ہیں۔ اور میں اگر اسی اتحاد کی خاطر ہندوؤں کے مختلف طبقات سے ملوں تو مجھ کو ایک بدنام جماعت کے ساتھ وابستہ کر کے ایک مشتبہ شخصیت ظاہر کیا جانے لگے۔ کیا یہی ان تمام دانشوروں کا حال ہے۔ کیا ایسے پست دانشوروں سے لوگوں کو کوئی صحیح اور مثبت رہنمائی مل سکتی ہے۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ دعوت فرض عین ہے یا فرض کفایہ۔ میں نے کہا کہ دعوت فرض عین ہے یا فرض کفایہ، یہ ایک قانونی اور منطقی سوال ہے۔ زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ دعوت سب سے بڑا ثواب کا کام ہے۔ آدمی کی یہ فطرت ہے کہ جس چیز میں زیادہ نفع ہو ادھر وہ فوراً دوڑتا ہے، اس کے بارہ میں قانونی بحثیں نہیں کرتا۔ پھر دعوت ہی کے معاملہ میں آپ کیوں اس قسم کے فنی اور قانونی سوالات اٹھا رہے ہیں۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ حکومت و اقتدار اسلام میں مطلوب نہیں ہے بلکہ موعود ہے۔ وہ عالم تھے، اس لیے سمجھ گئے کہ میرا اشارہ قرآن کی آیت (النور ۵۵) کی طرف ہے۔ مگر جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے: وکان الانسان اکثر شیئ جدلا، انھوں نے فوراً ہی اس کی تردید کے لیے ایک لفظ پالیا۔ انھوں نے کہا: حکومت اگر مطلوب نہیں ہے تو متروک بھی تو نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ حکومت جب مطلوب شے نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اسلامی تحریک کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اور جو چیز نشانۂ تحریک نہ بن سکے وہ اس اعتبار سے متروک ہی قرار پائے گی۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ دور میں بہت سے نئے فتنے اٹھے۔ مثلاً انکار حدیث کا فتنہ، نئی نبوت کا فتنہ، وغیرہ۔ مگر میرے نزدیک دور جدید کا سب سے بڑا فتنہ وہ ہے جس کو "مکمل اسلام" کہا جاتا ہے۔ بقیہ تمام فتنے ننگے فتنے تھے، اس لیے ان کو پہچاننا آسان تھا۔ مگر وہ فتنہ جو "مکمل اسلام قائم کرو" کے نعرہ کے ساتھ اٹھا وہ ایک نقاب پوش فتنہ تھا۔

جس کا نتیجہ ہے کہ ملک اس کے بحران میں مبتلا ہو گئے

مکمل اسلام نے موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ دینی نقصان پہنچایا ہے۔ اسلام ایک عملی نظریہ ہے۔ مگر اس نظریہ نے سارا فوکس سیاست کی طرف کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جو اندر سے بالکل خالی تھے مگر بیرونی طور پر وہ سیاسی اقتدار کا حصول بنے ہوئے تھے۔

مکمل اسلام کے اس نظریہ نے تمام مسلم ملکوں میں مسلمانوں کو حکمراں اور غیر حکمراں طبقہ میں بانٹ کر انھیں ایک دوسرے کے خلاف لڑا دیا۔ اس کے نتیجہ میں مسلم ملکوں کے بہترین مواقع برباد ہو کر رہ گئے۔

پھر اسلام کی یہ سیاسی تعبیر اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا عمل غیر مسلموں کو اسلام سے بھڑکانے کا سبب بن گیا۔ انھوں نے سمجھا کہ اسلام کوئی جنگ جو مذہب ہے جو ساری دنیا کے خلاف لڑائی کر کے انھیں محکوم بنانا چاہتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کی اشاعت کے نہایت قیمتی مواقع کھلے تھے۔ مگر سیاسی اسلام پسندوں کی متشددانہ کارروائیوں نے تمام مواقع کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

علمی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ لوگ وہی غلطی کر رہے ہیں جس کو تقابل کی غلطی کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کو ماننے والے اپنے مکمل اسلام کا تقابل جزئی اسلام سے کرتے ہیں۔ حالاں کہ اس معاملہ میں یہ تقابل نہیں ہے، یہاں جو تقابل ہے وہ فروعی اسلام اور اساسی اسلام میں ہے۔ مکمل اسلام کے نام پر یہ لوگ در اصل فروعی اسلام کو لے رہے ہیں اور اساسی اسلام کو چھوڑ رہے ہیں۔ اور جب اساسی اسلام چھوٹ جائے تو صرف ایک ظاہری دھوم باقی رہے گی، وہاں صحیح معنوں میں نہ اساسات باقی رہیں گے اور نہ فروع۔

ایران کی دار السلطنت تہران میں تنظیم اسلامی کانفرنس (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) کا سہ روزہ اجلاس ۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ کو مکمل ہوا۔ اس کانفرنس میں ۵۵ اسلامی ملکوں کے سرکاری نمائندے شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے اعلانیہ (تہران ڈکلریشن) پر ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ اس ڈکلریشن میں اسلام کے نام پر ہونے

دہشت گردی کی مکمل مذمت کی گئی ہے۔
میں نے کہا کہ مجھے اس پر کوئی خوشی نہیں کیونکہ اصل مسئلہ تشدد کے خاتمہ کا ہے جو وہ اعلانیہ کے باوجود ختم ہونے والا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اعلانیہ میں تشدد کی جو مذمت کی گئی ہے وہ مجمل انداز میں ہے وہ متعین انداز میں نہیں۔ اور غیر متعین اور غیر مشخص مذمت کا عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں۔

میں نے کہا کہ اسلام میں جنگ صرف منظم حکومت کے لیے جائز ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے غیر حکومتی سطح پر جہاد کے نام سے جو لڑائیاں جاری کر رکھی ہیں وہ صرف فساد ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک اردو اخبار کے ایڈیٹر نے کہا کہ آپ مسلم لیڈروں پر تنقید کرتے ہیں مگر آپ ہندو لیڈروں پر تنقید نہیں کرتے۔ اس کا راز کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا راز آپ کی بے خبری ہے۔ آپ نے شاید میری کچھ چیزیں پڑھی ہیں اور بہت سی دوسری چیزیں آپ نے نہیں پڑھیں اس لیے آپ کو یہ غلط فہمی ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھ کو کسی بھی شخص یا کسی بھی فرقہ سے کوئی عداوت نہیں۔ میرے دل میں سب کے لیے یکساں طور پر خیر خواہی کا جذبہ ہے۔ میرا یہی خیر خواہی کا جذبہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ قوم یا انسانیت کے لیے جہاں کہیں کوئی قابلِ اصلاح بات دیکھوں، دلائل کی روشنی میں اس کی وضاحت کروں۔

اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ عام ہندو لیڈر تو درکنار، میں نے اس ملک کی اس سب سے بڑی شخصیت پر تنقید کی ہے، جس کو فادر آف دی نیشن کا درجہ حاصل ہے۔ اور جس پر کھلی تنقید کرنے کی ہمت پچھلے پچاس سال سے نہ کسی ہندو کو ہوئی اور نہ کسی مسلمان کو۔ یہ مہاتما گاندھی کی شخصیت ہے۔ میری اس بات کے ثبوت کے لیے آپ انگریزی روزنامہ پائنیر کا شمارہ ۲۶ جنوری ۱۹۹۷ دیکھ سکتے ہیں۔ میری یہ تنقید اتنی خلافِ توقع تھی کہ امریکہ کے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز نے اپنے شمارہ ۳۱ جنوری ۱۹۹۷ میں اس کا خلاصہ شائع کیا۔

اخبار پائنیر کے زیر انتظام نئی دہلی میں ایک خصوصی جلسہ ہوا۔ اس میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس جلسہ میں گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ کیا گاندھی آج کے انڈیا میں کامیاب ہو سکتے تھے:

[illegible] سے ایک میں تھا۔ جن کے نام یہ ہیں: [illegible] گاندھی، [illegible] کے آر ملکانی۔ اس ڈسکشن میں لوگوں نے جو کچھ کہا وہ پانیر کے شمارہ [illegible] میں تفصیل سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ اس کو اس میں دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا وہ بھی اس میں تفصیل سے چھپا ہوا موجود ہے۔ میں نے اس موقع پر جو بات کہی تھی اسی کو اخبار نے اس رپورٹ کا عنوان بنایا ہے جو یہ ہے ——— گاندھی نے ایک پُرامن کو کی قیادت کی۔ وہ کوئی ریولیوشن نہیں لائے:

He presided over a non-violent coup, he didn't usher in a revolution.

میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ تبدیلی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کو انگریزی میں کو کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک حکمراں کو ہٹا کر دوسرے حکمراں کو اس کی جگہ بٹھا دینا، بغیر اس کے کہ عمومی زندگی میں کوئی انقلاب آیا ہو۔ دوسری تبدیلی وہ ہے جس کو ریولیوشن کہا جاتا ہے۔ یہ وہ تبدیلی ہے جس میں افراد کا کیریکٹر، سماجی اداروں کے حالات اور پورا سسٹم بدل کر کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اس تقسیم کے مطابق مہاتما گاندھی جو چیز لائے وہ ایک کو تھا نہ کہ ریولیوشن۔

اپنی اس رائے کے حق میں تفصیلی دلائل دیتے ہوئے میں نے کئی باتیں کہیں۔ مثلاً میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے اپنی سوچ کے تحت برٹش راج کو تمام خرابیوں کی جڑ سمجھ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ جب انگریزوں کا اقتدار ختم ہوگا اور حکومت ملکی لیڈروں کے ہاتھ میں آجائے گی تو تمام معاملات اپنے آپ درست ہو جائیں گے۔ مگر یہ ایک معصومانہ سوچ ہے کسی ملک یا سماج کے حالات اس کے افراد کے اندر تعمیری شعور جگانے سے آتے ہیں نہ کہ محض حکومتی افراد کے بدلنے سے۔

ایک ہندو پروفیسر میری باتیں سن کر کسی قدر غصہ ہو گئے۔ انھوں نے شدید لہجہ میں کہا کہ آپ گاندھی پر تنقید کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں۔ میرے دل میں گاندھی کی محبت ہے مگر میرے دل میں اپنے ملک کی محبت اس سے بھی زیادہ ہے:

I love Gandhi, but I love India more than Gandhi.

پھر یہیں سے کہا کہ تنقید بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ آج بھی لوگ اسی ناکام سیاسی طرز عمل کو اپنائے ہوئے ہیں۔ مثلاً جے پرکاش نارائن نے اسی ذہن کے تحت یہ تحریک چلائی کہ اس ملک کی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ کانگریس راج کو اگر ختم کر دیا جائے تو یہاں مکمل انقلاب (ٹوٹل ریولوشن) آ جائے گا۔ اسی نظریے کے تحت انھوں نے زبردست سیاسی دھوم برپا کی، یہاں تک کہ ۱۹۷۷ میں کانگریس پارٹی کا اقتدار ختم ہو کر جنتا پارٹی کا اقتدار قائم ہو گیا۔ مگر حقیقی حالات میں کچھ بھی اصلاح یا تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم سارے معاملہ پر از سر نو غور کریں۔ تاکہ نیا ہندستان بنانے کے لیے نتیجہ خیز عمل کیا جا سکے۔

۱- [illegible] کے نمائندہ مسٹر ریجس نس بوم (Regis Nusbaum) نے [illegible] ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر پچھلے پچاس سال کے دوران ہندستانی مسلمانوں کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ترقی کے وہی تمام مواقع موجود ہیں جو کسی بھی دوسرے ملک میں ہو سکتے ہیں۔ تاہم مسلمان ان مواقع کو بخوبی طور پر استعمال نہ کر سکے۔ اس کی واحد وجہ خود مسلمانوں کی نااہل قیادت ہے۔ تاہم مسلمان اب جاگ اٹھے ہیں، اور انھوں نے نئے شعور کے تحت ان مواقع کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

۲- بی بی سی ٹی وی ٹیم نے ۸ جولائی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ کسی بھی گروہ کے لیے عدم تحفظ کا مسئلہ خارج سے نہیں بلکہ داخل سے ہوتا ہے۔ گروہ کے اندر اگر داخلی استحکام ہو اور وہ ہوش مندی کے ساتھ زندگی گزارنا جانتے تو اس کے لیے کسی بھی مقام پر عدم تحفظ کا کوئی سوال نہیں۔

۳- آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کے تحت ایک پینل ڈسکشن ہوا جو ۱۸ جولائی ۱۹۹۷ کو براڈکاسٹ کیا گیا۔ اس کا موضوع تھا: سیرتِ نبویؐ اور امن عالم کا مسئلہ۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ یہ بتایا گیا کہ امن کا قیام اسلام کا اولین مطلوب ہے، کیوں کہ امن کے بغیر کوئی مثبت کام نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا طریق کار پر امن طریق کار ہے۔ متشددانہ طریق کار سراسر اسلام کے خلاف ہے۔

۴- انگریزی ہفتہ وار آوٹ لک (Outlook) کے نمائندے مسز سوادھوا اور مسٹر پراشنت پنجیار نے ۲۲ جولائی ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستان کے پچھلے پچاس سال کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کی سیاسی قیادت اگرچہ ناکام ہو گئی ہے لیکن انٹلکچول قیادت تیزی سے ابھر رہی ہے اور مسلمانوں کا تعمیری مستقبل بنانے میں معروف ہے۔ موجودہ حالات میں یہ ایک امید افزا صورت حال ہے۔

۵- [illegible] ۱۹۹۷ کو آل انڈیا ریڈیو (نئی دہلی) کی ٹیم نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق [illegible] آزادی کے بعد کے ہندستان میں [illegible] جواب [illegible] رہنمائی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اگر انسان کو اپنی حالت پر چھوڑا جائے تو فطرت کی رہنمائی میں اپنے آپ وہ چل رہا ہے۔ مگر ہمارے ملک میں دو اسباب سے فطرت کے اس نظام میں خلل پیدا ہوا ہے۔ ایک، اخبارات کی یک طرفہ رپورٹنگ۔ دوسرے، لیڈروں کی جذباتی سیاست۔

۶- ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کی نمائندہ مسز فرحت رضوی نے ۸ اگست ۱۹۹۷ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستان کے حال اور مستقبل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان کے مستقبل کی تعمیر کے لیے واحد نکاتی فارمولا ایجوکیشن ہے۔ اگر ملک میں تعلیم عام ہو جائے تو اس کے تمام مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

۷- ہندی روزنامہ جن ستّا کے نمائندہ مسٹر طاہر نے ۸ اگست ۱۹۹۷ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق پچھلے پچاس سالہ ہندستان سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان کی مصیبت دو چیز ہے۔ اخبار اور نیتا۔ یہ دونوں کے دونوں منفی رول ادا کر رہے ہیں۔ اگر یہ دونوں مثبت رول ادا کریں تو دیش کے سارے معاملات اپنے آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔

۸- بی بی سی کے نمائندہ مسٹر شکیل اختر نے ۱۲ اگست ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر پچھلے ۵۰ سال کے دوران ہندستانی مسلمانوں کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ۱۹۴۷ کے بعد ملکی لیڈروں نے سیکولرزم کو اختیار کیا۔ یہ بہت صحیح فیصلہ تھا۔ اس فیصلہ کی وجہ سے مسلمانوں کو غیر معمولی فائدے حاصل ہوئے۔

۹- انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، نئی دہلی میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایکولوجی کی طرف سے ۱۷ اگست ۱۹۹۷ کو ایک نیشنل سمپوزیم ہوا۔ اس کا عنوان تھا: اگلے پچاس سال کے لیے انڈیا کا ایجنڈا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمارے لیے مستقبل کا واحد نکاتی فارمولا ایجوکیشن ہے۔

۱۰- [illegible] حسن حماد نے ۱۰ اگست ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا [illegible] ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل حقیقۃً چیلنج ہیں۔ چیلنج زندگی کا حصہ ہے۔ وہ ہمیشہ رہتا ہے۔ اس لیے میں ان مسائل کو ترقی کا زینہ سمجھتا ہوں۔ ہندستانی مسلمانوں نے ۱۹۴۷ کے بعد بہت زیادہ ترقی کی ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ وہ ترقی کریں گے۔

۱۱- ایک دعوتی پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے سلطنت عُمان کا سفر کیا۔ یہ سفر ۲۹ اگست ۱۹۹۷ سے لے کر ۴ ستمبر تک جاری رہا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۱۲- اسٹیٹسمین (دہلی) کے نمائندہ مسٹر ضیاء السلام نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا موضوع اسلام میں عورتوں کے حقوق تھا۔ یہ انٹرویو اسٹیٹسمین کے شمارہ ۱۹ ستمبر ۱۹۹۷ میں شائع ہوا ہے۔

۱۳- کمپال باغ (نئی دہلی) میں ۲۰ ستمبر ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ یہ روحانیت کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس تھی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور روحانیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۱۴- جین مہا سبھا کی طرف سے نئی دہلی میں ۲۱ ستمبر ۱۹۹۷ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کی صدارت ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے کی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور امن اور اتحاد کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۱۵- نئی دہلی کے نہرو اسٹیڈیم میں ایک ہفتہ کے لیے ہیلتھ میلہ لگایا گیا۔ اس موقع پر ۲۶ ستمبر ۱۹۹۷ کو یہاں جمعہ کی نماز ادا کی گئی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور جمعہ کے بعد نماز کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۱۶- ۲۸ ستمبر ۱۹۹۷ کو دور درشن کی ٹی وی ٹیم مرکز میں آئی۔ اس نے صدر اسلامی مرکز کی پوری زندگی کے بارے میں تفصیلی پروفائل تیار کیا۔ اس میں بچپن اور تعلیم سے لے کر موجودہ الرسالہ مشن تک ہر پہلو کے بارے میں سوال و جواب تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مذہب کے

پائے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر دو تصور ہیں۔ ایک وحدت الوجود اور دوسرے وحدت الشہود۔ میں وحدت الوجود کے نظریہ کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک صحیح مذہبی نظریہ وہی ہے جس کو اسلام میں توحید کہا گیا ہے۔

۱۷- ۶-۷ اکتوبر ۱۹۹۷ کو وینس (اٹلی) میں امن کے موضوع پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع سے متعلق ایک مقالہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور اسلام میں امن اور انسانیت اور روحانیت کے تصور کو واضح کیا۔

۱۸- تل ابیب (فلسطین) میں امن عالم کے موضوع پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس ۱۹-۲۰ اکتوبر ۱۹۹۷ کو ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور امن (پیس) کے موضوع پر ایک پیپر پیش کیا۔ یہ پیپر ان شاء اللہ الرسالہ انگریزی میں شائع کر دیا جائے گا۔
اس سفر میں انھوں نے مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی بھی زیارت کی۔

۱۹- ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۷ کو گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو صاحبان شریک ہوئے۔ اس کا انتظام سوادھیائے کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور ملک کے موجودہ حالات پر اظہار خیال کیا۔
اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان میں سیاسی عدم استحکام کا مسئلہ بظاہر نامعلوم مدت تک کے لیے پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر ملک میں سماجی سطح پر استحکام کی حالت پیدا ہو جائے تو سیاسی اُدل بدل کے باوجود ملک ترقی کرتا رہے گا۔ جیسا کہ مثال کے طور پر اٹلی میں ہے۔ اور خود ہندستان میں زرعی دور میں تھا۔

۲۰- گاندھی پیس فاؤنڈیشن (نئی دہلی) میں ۴ نومبر ۱۹۹۷ کو ایک آل انڈیا سمپوزیم ہوا۔ اس کا موضوع سرودیہ الائنس تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور صدر جلسہ کی حیثیت سے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم لوگوں کو چاہیے کہ حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے غیر سیاسی میدان میں سماجی تعمیر کا کام کریں۔ اگر مستحکم سماج بن جائے تو سیاسی اُدل بدل کے باوجود ملک ترقی کرتا رہے گا۔

۲۱- [illegible] نومبر [illegible] کی ٹیم نے صدر اسلامی مرکز کا ایک ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع [illegible] گاندھی اور نیا ہندستان تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ گاندھی کا اہنسا کا اصول فطرت کا ایک اصول ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر ہندستانی سماج کی نئی تعمیر کی جا سکتی ہے۔

۲۲- [illegible] (نئی دہلی) نے ۸ نومبر ۱۹۹۷ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ عورت اور مرد کو اسلام میں کیا درجہ دیا گیا ہے۔ بتایا گیا کہ اسلام میں عورت اور مرد دونوں کو برابر کا درجہ حاصل ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسجدوں میں نماز کے لیے عورتوں کو اجازت ہے۔ مگر اپنی گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے وہ زیادہ نہیں جا سکتی ہیں۔ اس لیے مسجد میں جانا ان کے لیے لازمی نہیں قرار دیا گیا ہے۔

۲۳- جین سماج (آچاریہ تلسی گروپ) کی طرف سے ۹ نومبر ۱۹۹۷ کو راج گھاٹ نئی دہلی میں ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع ملک میں بڑھتا ہوا بھرشٹاچار اور اس کا حل تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس جلسہ میں شرکت کی اور موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کیا۔

۲۴- نینی تال کے اُمشل پبلک اسکول کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے نینی تال کا سفر کیا۔ وہاں دو بڑے پروگراموں میں خطاب کیا اور بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ یہ سفر ۱۱-۱۳ نومبر ۱۹۹۷ کو ہوا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے ساتھ شائع کر دی جائے گی۔

۲۵- ادھیاتمک سادھنا کیندر (مہرولی، دہلی) میں ۱۶ نومبر ۱۹۹۷ کو دگمبر جین کی طرف سے ایک جلسہ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور روحانیت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۲۶- گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ۱۹ نومبر ۱۹۹۷ کو تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع تھا: آئیڈیل اور پریکٹکل کا درجہ اسلام میں۔ اس موضوع پر صدر اسلامی مرکز نے ایک تقریر کی اور قرآن و حدیث کی روشنی میں اس موضوع کی وضاحت کی۔ اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

[illegible]	
[illegible] of the Prophet Muhammad	[illegible]
Muhammad: A Prophet for All Humanity	
An Islamic Treasury of Virtues	
The Life of the Prophet Muhammad	75.00
Sayings of Muhammad	45.00
The Beautiful Commands of Allah	125.00
The Beautiful Promises of Allah	175.00
The Soul of the Qur'an	125.00
The Wonderful Universe of Allah	95.00
Presenting the Qur'an	165.00
The Muslim Prayer Companion	—
Indian Muslims	45.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	30.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	65.00
Islam As It Is	55.00
Religion and Science	45.00
The Way to Find God	20.00
The Teachings of Islam	25.00
The Good Life	20.00
The Garden of Paradise	25.00
The Fire of Hell	25.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	[illegible]
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
Uniform Civil Code	10.00

[illegible]	
تذکیر القرآن [illegible]	[illegible]
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	[illegible]
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	30/-
عظمت صحابہ	7/-
دین کامل	80/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاء اسلام	35/-
راز حیات	65/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
عظمت مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
منزل کی طرف	2/-
فکر اسلامی	50/-
طلاق اسلام میں	3/-
دین انسانیت	60/-

[illegible]	[illegible]
[illegible]	—
ڈائری جلد اول	[illegible]
کتاب زندگی	60/-
انوار حکمت	—
اقوال حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	25/-
عقلیات اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	—
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	7/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبر اسلامؐ	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	—
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
امہات المومنین	20/-
تصویر ملت	35/-
دعوت اسلام	50/-
دعوت حق	40/-
نشری تقریریں	85/-

[illegible]	[illegible]
اسلام ایک تعارف	[illegible]
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مطالعۂ اسلام	—
تعدد ازدواج	7/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	—
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرت رسولؐ	—
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-
یکساں سول کوڈ	5/-
اسلام کیا ہے	8/-
ہندی	
سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	—
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	6/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
چھوا چھوت واد اور اسلام	7/-
اتہاس کا سبق	8/-
اسلام ایک سوابھاوک دھرم	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near post Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: [illegible]
website: http://www.alrisala.org.

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2582435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

مارچ ۱۹۹۸، شمارہ ۲۵۶

صبر — بہادری ہے

صبر بہادری ہے اور بے صبری بزدلی۔ جو لوگ صبر کرنے پر تیار نہ ہوں انھیں آخر کار بزدلی کی دنیا میں پہنچنا پڑے گا۔ اور بزدلی کا دوسرا نام منافقت ہے جس سے زیادہ بری اخلاقی صفت اور کوئی نہیں۔

موجودہ دنیا میں خود فطرت کے نظام کے تحت بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان سے کوئی ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچتی ہے۔ یہ ایک فطری صورت حال ہے۔ یہ معاملہ انسانی زندگی کے آغاز ہی میں حابیل اور قابیل کے ٹکراؤ کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ تاریخ کے ہر دور میں، حتیٰ کہ پیغمبروں کے زمانہ میں بھی جاری رہا، وہ اسی طرح جاری رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے اور خود اس دنیا ہی کا خاتمہ ہو جائے۔

ایسی حالت میں کسی بھی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ اپنی پسند کے عین مطابق ایسی زندگی حاصل کرے جہاں اس کو نہ کسی سے شکایت ہو اور نہ کسی سے اختلاف۔ ایسا انتخاب موجودہ دنیا میں کسی کے لیے ممکن ہی نہیں، نہ صالحین کے لیے اور نہ غیر صالحین کے لیے۔

موجودہ دنیا میں حقیقی انتخاب صرف دو روش کے درمیان ہے۔ آپ یا تو گھر سے باہر تک ہر ایک سے مسلسل لڑتے رہیں یا شکایت و اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ پہلی روش اگر پھول کے درخت میں اس کے کانٹوں سے الجھنے کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں دوسری روش یہ ہے کہ کانٹے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے پھول کو لے لیا جائے۔

مگر پہلی روش کسی کے لیے بھی مستقل طور پر ممکن نہیں کیوں کہ وہ اپنی اور اپنے گھر کی تباہی کے ہم معنی ہے۔ اور کوئی بھی اتنا نادان نہیں کہ وہ مستقل طور پر اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے۔ اس لیے عملاً یہ ہوتا ہے کہ بے صبری کی روش اختیار کرنے والے وقتی طور پر دوسروں سے لڑتے ہیں اور آخر کار اس کا تباہ کن نتیجہ دیکھ کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں مگر ایسی خاموشی کا مطلب منافقت ہوتا ہے۔

موجودہ دنیا میں آپ کو بہر حال صبر کرنا ہے۔ اگر آپ اصول کی بنیاد پر صبر نہ کریں تو آپ کو مفاد کی بنیاد پر صبر کرنا پڑے گا اور اسی دوسری روش کا نام منافقت ہے۔

مبنی بر قلب

الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ، الا وھی القلب۔
(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱/۱۲۶)

سن لو کہ جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سن لو کہ گوشت کا یہ ٹکڑا دل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں تمثیل کی زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی اصلاح کا حقیقی ذریعہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح جسمانی اعتبار سے آدمی اس وقت صحت مند ہوتا ہے جب کہ اس کا دل ٹھیک کام کر رہا ہو۔ اسی طرح کسی انسان کی دینی اور اخلاقی اور روحانی اصلاح اس وقت ہوتی ہے جب کہ اس کا فکر درست ہو، اس کا شعور صحیح طور پر کام کرنے لگے۔

تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں ——— اصلاحی اور انقلابی۔ اصلاحی تحریک فرد کی تبدیلی کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن تحریکوں کو انقلابی تحریک کہا جاتا ہے، ان کا نشانہ سسٹم (اجتماعی نظام) کو بدلنا ہوتا ہے۔ اصلاحی تحریک کے مطابق، افراد کے سدھار سے اجتماعی زندگی میں سدھار آتا ہے۔ اس کے برعکس انقلابی تحریکوں کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ نظام پر قابض لوگوں کو ہٹا کر اس کے اوپر اپنا کنٹرول حاصل کیا جائے تاکہ لوگوں کو بدلا جا سکے۔

موجودہ زمانہ میں تبلیغی تحریک مبنی بر قلب تحریک ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری اکثر تحریکیں مبنی بر نظام کے اصول پر قائم ہیں۔ مبنی بر نظام تحریکوں کا اصول فطرت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تحریکوں کا آخری نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ وہ آندھی اور طوفان کی طرح اٹھیں اور پھر کسی مثبت نتیجہ کے بغیر ختم ہو جائیں۔ اس دنیا میں کوئی نتیجہ صرف کسی ایسی تحریک ہی سے نکل سکتا ہے جو مبنی بر قلب کے اصول پر اٹھائی گئی ہو، جو ایک ایک انسان کو اپنا نشانہ بنائے، جو ایک ایک انسان کے اندر فکر وشعور کی روشنی پیدا کرے، جو ایک ایک انسان کے اندر یہ جذبہ ابھارے کہ اس کو خدا پرست انسان بن کر دنیا میں زندگی گزارنا ہے۔

اسلامی تحریک وہی ہے جو اسلامائزیشن آف مین کے فطری اصول پر جاری کی جائے۔ اسلامائزیشن آف اسٹیٹ کے نام پر چلائی جانے والی تحریک غیر فطری بھی ہے اور غیر اسلامی بھی۔ اس کا نتیجہ مزید تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

فطری حفاظت

مائک وولڈرج (Mike Wooldridge) بی بی سی، نئی دہلی کے بیورو چیف ہیں۔ وہ ۱۲ جنوری ۱۹۹۸ کو اپنی ٹی وی ٹیم کے ساتھ ہمارے دفتر میں آئے اور اپنی انگریزی نشریات کے لیے راقم الحروف کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔

ان کا ایک سوال یہ تھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کو عام طور پر مسلم مخالف پارٹی سمجھا جاتا ہے۔ ہندستانی پارلیمنٹ کا بارھواں الیکشن جو فروری ۱۹۹۸ میں ہونے والا ہے اگر اس میں بی جے پی جیت جائے اور مرکز میں حکومت بنالے تو کیا آپ اس کو مسلمانوں کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔

میں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ کوئی پولیٹکل پارٹی جو الیکشن جیت کر برسر اقتدار آتی ہے وہ صرف چند سال کے لیے آتی ہے اور اس کا اقتدار کسی بھی حال میں مطلق اقتدار نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں ایک باضابطہ دستور ہے۔ ہر حکومت کو اس دستور کے تحت کام کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس سے آزاد رہ کر۔

انھوں نے کہا کہ ہندستانی دستور میں حکمراں جماعت کو ایمرجنسی نافذ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، اسی سے فائدہ اٹھا کر اندرا گاندھی نے ۱۹۷۵ء میں یہاں ایمرجنسی نافذ کردی تھی، جس کی وجہ سے اندرا گاندھی کو من مانی کارروائی کرنے کا اختیار حاصل ہوگیا۔ اسی طرح اگر بی جے پی حکومت پاکر یہاں ایمرجنسی نافذ کردے تو خود اسی دستور کے مطابق اس کو لامحدود اختیارات حاصل ہوجائیں گے، اور وہ مسلمانوں کے خلاف جو چاہے گی کر سکے گی۔

میں نے کہا کہ اس قسم کا سنگین واقعہ کبھی قابل اعادہ نہیں ہوتا۔ آپ ایٹم بم صرف ایک بار گرا سکتے ہیں، بار بار ایٹم بم گرانا ممکن نہیں:

Such kind of holocaust is not repeatable in human history. You cannot drop an atomic bomb again and again.

میں نے کہا کہ اسی اصول پر یقین کی بنا پر میں نے یہ جرأت کی تھی کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب اجودھیا کی بابری مسجد ڈھائی گئی تو میں نے یہ کہا کہ اب اس ملک میں کوئی اور مسجد ڈھائی نہیں جائے گی۔ لوگ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے حادثہ کو کیا سمجھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ کاما نہیں ہے بلکہ فل اسٹاپ ہے۔ اور آپ جیسا سمجھتے تھے ویسا ہی ہوا۔ ڈھانے والے لوگ اپنے لحاظ سے بہت سی اور مسجدوں کی فہرست بنائے ہوئے تھے، مگر فطرت کے قانون نے ان کی فہرست کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ دوبارہ ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا کہ وہ کسی اور مسجد کے ساتھ ۶ دسمبر کو دہرا سکیں۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب بابری مسجد ڈھائی گئی تو شیو سینا کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے نے کہا تھا کہ مجھے ان لوگوں پر فخر ہے جنھوں نے بابری مسجد کو ڈھایا۔ مگر اسی مہینہ کے اخبارات میں بال ٹھاکرے کا یہ بیان چھپا ہے کہ بابری مسجد کی جگہ پر نہ مسجد بنائی جائے اور نہ مندر، دونوں فرقوں کو اس سے الگ مقام پر مسجد اور مندر بنانے کی جگہ دے دی جائے اور جہاں بابری مسجد تھی وہاں ایک قومی یادگار تعمیر کی جائے۔ اس معاملہ میں کانگریس نے مسلمانوں سے یہ کہہ کر معافی مانگی ہے کہ اس وقت اگرچہ مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی، مگر ہم بابری مسجد کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے بھی یہ اعلان کر دیا ہے کہ مندر مسجد کا اشو اب اس کے ایجنڈے میں نہیں، وغیرہ۔

اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کسی بڑی برائی کو مسلسل جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ کوئی بڑی برائی یا کوئی سنگین جرم جب کیا جاتا ہے تو فوراً ہی اس کے خلاف مانع اسباب اکٹھا ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے کہ اس برائی یا ظلم کی تکرار ممکن نہیں رہتی۔

اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ میں تمہارے سر پر آسمان گرا دوں گا۔ تو آپ کو کہنے والے سے لڑنا نہیں چاہیے بلکہ یہ سوچ کر چپ رہنا چاہیے کہ آسمان کو گرانا اس کے بس ہی میں نہیں۔ اسی طرح کوئی پولیٹکل پارٹی یا لیڈر اگر آپ کی مخالفت میں بڑے بڑے الفاظ بولے تو اس کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے یہ سوچئے کہ ایسا ہونا ممکن ہے یا نہیں۔ اگر وہ ممکن نہ ہو تو آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس دنیا میں کسی کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ وہ اپنے الفاظ کو واقعہ بنا سکے۔ یہاں جو چیز واقعہ بنتی ہے وہ حقائق ہیں نہ کہ کسی کے بولے ہوئے الفاظ۔

فطری زندگی

ایک بار میں ایک صاحب کے گھر پہ ان سے ملنے کے لیے گیا۔ وہاں ان کے چار چھوٹے بچے (دو لڑکی، دو لڑکا) کھیل رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بار بار اپنے والد سے ایک دوسرے کی شکایت کرتے ہیں ——— اس نے مجھے مار دیا، اس نے میرا کھلونا لے لیا، اس نے مجھے دھکیل دیا، اس نے مجھے ایسا کہہ دیا، وغیرہ۔ ان شکایتوں کے باوجود وہ سب مل کر کھیلتے رہے۔ ان کے باہمی تعلق میں پھر بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

شکایتوں کے باوجود ان کی باہمی محبت کیوں باقی رہی۔ اس کی وجہ خونی تعلق ہے۔ وہ سب بھائی اور بہن تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خون کا رشتہ رکھتے تھے۔ یہ خونی تعلق شکایتوں کے اوپر غالب رہتا تھا۔ اختلاف کے باوجود وہ انھیں آپس میں جوڑے رکھتا تھا۔

یہ فطرت کی ایک نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ دنیا میں آدمی کو کس طرح رہنا چاہیے۔ دنیا میں لوگوں کو اس طرح رہنا چاہیے کہ ان کے درمیان اختلاف اور شکایت کی صورتیں پیدا ہوں، اس کے باوجود ان کا باہمی تعلق نہ ٹوٹے، اس کے باوجود وہ محبت کے ساتھ مل جل کر زندگی گزاریں۔

دنیا میں ایسا بہرحال ہوگا کہ جب لوگ مل جل کر رہیں گے تو ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوگی۔ شکایت کے واقعات سے خالی زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ نہیں کہ انسانی سماج شکایت کے واقعات سے خالی ہو جائے۔ بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ شکایت کو نفرت تک پہنچنے سے بچایا جائے۔

بھائی بہن کے معاملہ میں جو چیز شکایت کو نفرت تک پہنچنے سے روکتی ہے وہ خونی تعلق ہے۔ اور عام انسان کے لیے اخلاقی اصول اسی روک کا کام کرتا ہے۔ خونی تعلق ایک طبعی تقاضا ہے، اس لیے اس کے اوپر کوئی ثواب یا انعام نہیں۔ مگر اخلاقی اصول کو آدمی خود اپنے ارادہ سے اختیار کرتا ہے، ایسا آدمی خود اپنے اختیار سے اپنے آپ کو ایک ڈسپلن میں باندھتا ہے، اس لیے جو آدمی اس اخلاقی ڈسپلن کا ثبوت دے اس کے لیے بہت بڑا انعام ہے، دنیا میں بھی اور آخرت کی ابدی زندگی میں بھی۔

نظام فطرت

ایک شاعر کا قطعہ ہے۔ اپنے ان دو شعروں میں اس نے نہایت سادہ طور پر زندگی کی حقیقت بتائی ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے:

کہا اونٹ پر بیٹھوں کہا ہاں اونٹ پر بیٹھو
کہا کوہان کا ڈر ہے کہا کوہان تو ہوگا
کہا دریا میں کیا اتروں کہا دریا میں ہاں اترو
کہا طوفان کا ڈر ہے کہا طوفان تو ہوگا
کہا کیا پھول کو توڑوں کہا ہاں پھول کو توڑو
کہا پرخار کا ڈر ہے کہا پرخار تو ہوگا

یہی موجودہ دنیا میں زندگی کی حقیقت ہے۔ یہاں اونٹ ہے تو کوہان بھی ہے۔ یہاں ہموار پیٹھ والا کوئی اونٹ موجود نہیں۔ یہاں دریا میں طوفان کا مسئلہ بھی ہے۔ یہاں کوئی ایسا دریا نہیں پایا جاتا جس میں سکون ہی سکون ہو۔ تموج نام کی کوئی چیز وہاں موجود نہ ہو۔ اسی طرح یہاں خدا کے اگائے ہوئے باغ میں اگر خوب صورت پھول ہیں تو اسی کے ساتھ نوک دار کانٹے بھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو آدمی کوئی چیز حاصل کرنے کا خواہش مند ہو اس کو پیشگی طور پر یہ جان لینا چاہیے کہ یہاں ترقی کا سفر کبھی ہموار راستوں سے طے نہیں ہوتا۔ یہاں مسائل پر قابو پانے کے بعد ہی کسی آدمی کے لیے کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں۔ جو آدمی مسائل و مشکلات کو عبور کرنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو، اس کو خدا کی اس دنیا میں کسی قسم کی کامیابی کی امید بھی نہ رکھنا چاہیے۔

خدا کی دنیا ویسی ہی رہے گی جیسا کہ اس کو بنایا گیا ہے۔ اس کو بدلنا یقینی طور پر ہمارے لیے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں کسی انسان کے لیے یہاں زندگی اور کامیابی کی صرف ایک صورت ہے ـــــ یہ کہ دنیا میں قائم شدہ نظام فطرت سے وہ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لے۔ اس کے سوا ہر دوسری صورت آدمی کی ناکامی میں اضافہ کرنے والی ہے نہ کہ اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے والی۔

توفیق بقدر استعداد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ۶ ھ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔ اس کا ذکر قرآن کی سورہ نمبر ۴۸ میں آیا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے :

جب منکروں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی، جاہلیت کی حمیت، پھر اللہ نے اپنی طرف سے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر۔ اور اللہ نے ان کو تقویٰ کے کلمہ پر جمائے رکھا، اور وہ اس کے حق دار اور اس کے اہل تھے، اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے (الفتح ۲۶)

اس آیت سے ایک نہایت اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ آزمائش کی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے توفیق بقدر استعداد کا نظام قائم فرمایا ہے۔ گویا کہ یہ ایک قسم کا دوطرفہ معاملہ ہے۔ جس آدمی کے اندر قبولیت کی استعداد موجود ہوگی اسی آدمی تک خدا کی توفیق پہنچے گی۔ ضروری استعداد کے بغیر کسی کو خدا کی توفیق نہیں مل سکتی۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر دو فریق تھے۔ ایک طرف قریش اور دوسری طرف مسلمان۔ قریش کے اندر سرکشی کا مزاج تھا۔ چنانچہ رسول اللہ کی طرف سے پیش کی جانے والی ہر معقول بات کا انھوں نے انکار کیا۔ حالات کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کے اندر بھی جوابی اشتعال پیدا ہو جائے اور معاہدۂ امن کے بجائے تشدد اور جنگ کی نوبت آجائے۔ مگر صحابہ کرام نے سرکشی کے جواب میں سرکشی نہیں دکھائی۔ ان کے دل کا تقویٰ اس بات کی ضمانت بن گیا کہ وہ جوابی اشتعال سے بچ جائیں۔ وہ اللہ کے منصوبہ کو سمجھ کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں۔

خدا کی طرف سے حق ظاہر کیا جاتا ہے مگر اس کے اعتراف کی توفیق وہی لوگ پاتے ہیں جو اپنے آپ کو خود پسندی کی نفسیات سے پاک کر چکے ہوں۔ خدا کی طرف سے جنتی عمل کرنے کی عملی صورتیں پیدا ہوتی ہیں مگر ان صورتوں سے فائدہ اٹھانا صرف انھیں لوگوں کے لیے ممکن ہوتا ہے جو دنیا کی طلب کو اپنے دل سے نکال چکے ہوں۔ خدا کی طرف سے دعوتی کام کے مواقع کھولے جاتے ہیں مگر ان مواقع کو استعمال کرنے کا کریڈٹ انھیں لوگوں کو ملتا ہے جو اپنے سینہ کو ہر قسم کے منفی جذبات سے پاک کر چکے ہوں۔

تعلیم نہ کہ طرزِ تعلیم

آزادی کے بعد ہندستان میں تعلیم کا چرچا ، الفاظ کی حد تک ، بہت زیادہ کیا گیا ہے۔ مگر یہ تمام چرچا جس فکر کے گرد گھومتا رہا ہے ، وہ نفس تعلیم سے زیادہ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کا ردعمل (Reaction) تھا۔ چنانچہ اس پوری مدت میں سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیا گیا وہ بذات خود تعلیم نہیں تھی ، بلکہ اس کا طرز (Pattern) تھا۔ پچھلی تقریباً نصف صدی میں ہمارے یہاں تعلیم سے زیادہ طرز تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصل کام ، قوم کو تعلیم یافتہ بنانا ، یہ تو نہ ہو سکا۔ البتہ تعلیم کے نام پر اختلافات بہت زیادہ ظہور میں آ گئے جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

اس کے مقابلہ میں جاپان کی مثال لیجیے۔ جاپان میں دوسری عالمی جنگ کے بعد جو تعلیمی نظام رائج ہوا ، وہ بنیادی طور پر امریکہ کا تجویز کیا ہوا تھا۔ ۱۹۴۶ میں تعلیم کے امریکی ماہرین (American experts on educational affairs) جاپان آئے۔ انھوں نے امریکی نقطۂ نظر کے مطابق ، ایک رپورٹ تیار کی جس کا نام یہ تھا :

Report of the United States Education Mision to Japan. (6/392)

امریکی ماہرین تعلیم کی یہی وہ رپورٹ تھی جس کے مطابق جاپان کا نظام تعلیم بنایا گیا ، اور جو آج تک کسی بنیادی تبدیلی کے بغیر رائج ہے۔ بالفاظ دیگر ، جاپان کی پوری جدید نسل نے لارڈ میکالے کے تعلیمی نقشہ کی پیروی میں تعلیم حاصل کی۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھیے تو ہندستان ناکام رہا اور جاپان کامیاب رہا۔ ہندستان تمام ملکوں سے پیچھے ہے اور جاپان تمام ملکوں سے آگے۔

ہندستان طرز تعلیم کے پیچھے پڑا رہا ، وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ جاپان نے طرز تعلیم کے مسئلہ کو نظر انداز کر کے صرف تعلیم پر اپنی ساری توجہ لگا دی ، اور وہ کامیابی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اس تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم کے سلسلہ میں اصل اہمیت کی چیز یہ ہے کہ کسی بھی طرح قوم کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے۔ اس معاملہ میں طرز تعلیم کی اہمیت صرف اضافی ہے نہ کہ حقیقی۔ اصل مسئلہ پڑھنا ہے نہ یہ کہ کیسے پڑھا جائے۔

حسن اخلاق

ہر آدمی بے اخلاق ہے اور ہر آدمی با اخلاق۔ آپ کسی بھی آدمی کا جائزہ لیجیے۔ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ نہایت اچھا اخلاق برتتے گا، اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہی آدمی اخلاق سے خالی نظر آئے گا۔ یہی موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا کیس ہے۔

بیشتر لوگ وہ ہیں جن کا اخلاق ان کے ذاتی مفاد کے تحت کام کرتا ہے۔ جہاں ان کا ذاتی مفاد ہو اور ذاتی مصلحت کا تقاضا ہو وہاں وہ اخلاق کا پیکر بن جائیں گے۔ اور جہاں ان کا کوئی فائدہ اور مصلحت نہ ہو وہاں وہ ایسے بے حس بن جائیں گے جیسے کہ اخلاقی تقاضوں سے وہ آشنا ہی نہیں۔

انھیں میں کچھ لوگ وہ ہیں جو نسبتاً بہتر نظر آتے ہیں۔ تاہم ان کا اخلاق بھی ان کی نفسیات کے تابع ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان سے متواضع بن کر ملے تو وہ بھی اس کے لیے متواضع بنے رہیں گے۔ ایسے آدمی کے ساتھ وہ شریفانہ اخلاق کا برتاؤ کریں گے۔ مگر جو شخص کسی وجہ سے ان کی انا کو ٹھیس پہنچادے تو اس کے لیے وہ اپنی ساری شرافت کھو دیں گے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کا اخلاق بربنائے اصول نہیں ہوتا بلکہ بربنائے ذات ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اخلاقی اصولوں کے ماتحت نہیں کرتے بلکہ خود اخلاق کو اپنا ماتحت سمجھتے ہیں۔ ذاتی تقاضے اور اخلاق میں ٹکراؤ نہ ہو تو وہ اخلاق برتیں گے۔ اور جب ذاتی تقاضے اور اخلاق میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو وہ اخلاق و شرافت کو بھی خیرباد کہہ دیں گے۔

سچا انسان وہ ہے جو با اصول انسان ہو۔ جو اصول کو اپنی زندگی میں سپریم حیثیت دیے ہوئے ہو، جو ہر حال میں اخلاقی اصولوں کی پابندی کرے، خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔ وہ اخلاق کو اخلاق کے لیے اختیار کرے نہ کہ مفاد کے لیے۔ وہ جس طرح اپنے دوست کے لیے بااخلاق ہوتا ہے اسی طرح وہ اپنے دشمن کے لیے بھی بااخلاق ہو۔ وہ اپنی تنقید کرنے والے کو بھی اسی طرح خوش اخلاقی کا تحفہ دے جس طرح وہ اپنی تعریف کرنے والے کو خوش اخلاقی کا تحفہ دیتا ہے۔

جو لوگ اخلاق کو مستقل اصول کے طور پر اختیار کریں وہی حقیقۃً بااخلاق ہیں۔ جن لوگوں کا اخلاق ان کے مفاد یا مزاج کے تابع ہو انھیں کبھی حسن اخلاق کا کریڈٹ ملنے والا نہیں۔

سنت صبر

صبر یہ ہے کہ جذبات یا اشتعال کے موقع پر اپنے آپ کو تھاما جائے۔ جوابی کارروائی کرنے سے پہلے اپنے جذبات کو روک کر یہ سوچا جائے کہ میرے لیے اس موقع پر صحیح ردعمل کیا ہے اور زیادہ نتیجہ خیز کارروائی کیا ہو سکتی ہے۔

کبھی جذبات کو روک لینے کا نام صبر ہے، کبھی صبر اس کا نام ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو جوابی اقدام سے باز رکھا جائے اور کبھی صبر یہ ہوتا ہے کہ اقدام تو کیا جائے مگر وہ منصوبہ بند اقدام ہو نہ کہ محض جذباتی اقدام۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک مخالف اگر کسی کو نقصان پہنچائے تو وہ اس پر صبر کر لیا وہ اس کا توڑ کرنے کی کوشش کرے۔

جواب یہ ہے کہ صبر کا مطلب خواہ مخواہ نقصان اٹھانا نہیں ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ غیر موافق صورت حال پیش آنے کے بعد ٹھنڈے ذہن سے آپ یہ سوچیں کہ آپ کا جوابی اقدام آپ کے حق میں کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرے گا یا آپ کے نقصان میں مزید اضافہ کا سبب بن جائے گا۔ صبر کا مطلب اپنے آپ کو مزید نقصان سے بچانا ہے نہ کہ غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا۔

صبر کبھی عمل کا نام ہوتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو عمل سے روک لینے کا۔ یہ دراصل حالات ہیں جو فیصلہ کرتے ہیں کہ کس موقع پر کون سا صبر مطلوب ہے۔

صبر اور بے صبری میں یہ فرق ہے کہ بے صبر آدمی نتیجہ پر غور کیے بغیر حالات کے طوفان میں کود پڑتا ہے۔ اور صبر والا آدمی صورت حال پیش آجانے کے بعد پہلے سنجیدگی کے ساتھ غور کرتا ہے، لوگوں سے مشورہ کرتا ہے۔ اور سوچے سمجھے فیصلے کے تحت وہ کارروائی کرتا ہے جو زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز ہو سکے۔

صبر حکمت عملی کا نام ہے اور بے صبری یہ ہے کہ آدمی وقتی کیفیت سے متاثر ہو کر ایسا اقدام کر بیٹھے جس کا حکمت اور دور اندیشی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ناقابلِ تسخیر طاقت

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں بار بار نشیب و فراز کے واقعات پیش آئے ہیں مگر یہ تمام واقعات سماجی اور اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں تک دعوت کا مسئلہ ہے، اس اعتبار سے اسلام مسلسل تاریخ میں مارچ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دعوت کے پہلو سے اسلام کبھی زوال کا شکار نہیں ہوا۔ اسلام کا دعوتی پہلو اس حد تک ناقابلِ شکست ہے کہ وہ اس وقت بھی جاری رہتا ہے جب کہ مسلمان اپنے ضعف کی بنا پر موثر دعوتی عمل کو جاری کرنے کے قابل ہی نہ رہے ہوں۔

اس کی ایک واضح تاریخی مثال تاتاریوں کا مسئلہ ہے۔ قدیم زمانہ میں ترکستان (روس) اور منگولیا (چین) کے علاقے میں کچھ قبائل آباد تھے جن کو ترک کہا جاتا تھا۔ ان کا ایک سردار چنگیز خان (۱۲۲۷-۱۱۶۲) تھا۔ یہ غیر معمولی صلاحیت کا آدمی تھا۔ وہ ۲۰ ہزار جنگ جو افراد کو جمع کر کے اپنے علاقے سے نکلا اور فتوحات کرتا ہوا چین سے ایران تک پہنچ گیا۔

اس کے بعد یہ قبائل آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ہلاکو خان (۱۲۶۵-۱۲۱۷) اٹھا۔ اس نے اسلامی سلطنت کو برباد کرنے کے بارے میں اپنے دادا (چنگیز خان) کے منصوبہ کو مکمل کیا۔ اس نے دار السلطنت بغداد کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور خلیفہ معتصم باللہ کو بے رحمی کے ساتھ قتل کر ڈالا۔ تاتاری سرداروں کو مسلم حکمراں (خوارزم شاہ) سے کچھ شکایت پہنچی تھی، اس بنا پر وہ غضب ناک ہو گئے اور مسلم سلطنت کو برباد کرنے کے درپے ہو گئے۔

یہ اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ خوف ناک واقعہ تھا۔ تاتاریوں کے ظلم و فساد کی بنا پر اسلامی دنیا میں ان کا اتنا زیادہ ہول طاری ہوا کہ کہا جانے لگا: اذا قیل لک ان التتر انهزموا فلا تصدق (اگر کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گئے تو یقین مت کرنا)

اس کے بعد صرف ۵۰ سال کے اندر تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے۔ ناقابلِ قیاس طور پر یہ معجزہ پیش آتا ہے کہ یہی ترک (تاتاری) جو اسلام کے کٹر دشمن تھے وہ اس کے دوست اور خادم بن گئے۔ ان کی بیشتر تعداد نے بہت تھوڑی مدت میں اسلام قبول کر لیا۔ اس

کے بعد وہ مکمل طور پر ایک بالکل نئی قوم بن گئے۔ انھوں نے مسلم دنیا کو دوبارہ آباد کیا۔ سمرقند سے لے کر حلب تک جن مسجدوں کو انھوں نے ڈھا دیا تھا ان کی دوبارہ تعمیر کر کے ان کے اندر خدائے واحد کے لیے سجدہ کیا۔ اس کے بعد تقریباً ۱۰۰ سال تک وہ اسلام کے خادم اور سپاہی بنے رہے۔

یہ معجزہ کیسے پیش آیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ اس کی صورت یہ ہوئی کہ فاتح تاتاریوں نے بہت بڑی تعداد میں مسلمان مردوں اور عورتوں کو گرفتار کیا اور ان کو اپنے گھروں میں خادم اور خادمہ بنا کر رکھ لیا۔ اس طرح ان کا اختلاط ہر وقت مسلمان مردوں اور عورتوں سے ہونے لگا۔ وہ بار بار دیکھتے تھے کہ مسلمان مرد یا عورت کوئی ایسا عمل کر رہے ہیں جو ان کی مانوسات کے خلاف ہے۔ مثلاً ملاقات کے وقت السلام علیکم کہنا۔ کوئی کام شروع کرتے ہوئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا۔ مختلف مواقع پر الحمد للہ اور جزاک اللہ کہنا۔ اسی طرح نماز اور دوسری عبادات وغیرہ۔ ان میں سے ہر چیز تاتاریوں کو اپنے معلوم اور مانوس روایت سے مختلف دکھائی دیتی تھی۔ وہ ان پر سوالات کرتے تھے۔ اس طرح گفتگوؤں کے دوران اسلام کی تعلیمات ان پر واضح ہونے لگیں۔

اسی کے ساتھ یہ ہوا کہ تاتاری جب بازاروں میں نکلتے، شکار یا اور کسی کام سے باہر جاتے تو بار بار ان کا سابقہ کسی مسلمان سے پڑتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں بھی بار بار اسلام زیر بحث آنے لگا۔ اس طرح کسی تبلیغی منصوبہ کے بغیر دعوتی عمل تاتاریوں کے درمیان مکمل طور پر جاری ہو گیا۔

اس کے بعد ان کے اسلام قبول کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اولاً ان کے حکمرانوں اور سرداروں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد عام تاتاریوں نے اس کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اسلام کی عمارت کو ڈھایا تھا وہی دوبارہ اسلام کی عمارت تعمیر کرنے والے بن گئے۔

اسلام ایک ناقابل تسخیر طاقت ہے۔ اسلام صرف اپنوں کو متاثر نہیں کرتا بلکہ غیروں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ حتی کہ ان لوگوں کو بھی جو کسی وجہ سے بظاہر اس کے دشمن بن گئے ہوں۔

جنگ اسلام میں

بعض مفکرین اسلام کا کہنا ہے کہ اسلام میں جنگ کی دو قسمیں ہیں ـــــ جارحانہ جنگ اور مدافعانہ جنگ۔ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ اس نظریہ کے لئے قرآن اور حدیث میں کوئی دلیل موجود نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں صرف ایک جنگ ہے اور وہ مدافعانہ جنگ ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، مصلحانہ تحریک ہوتی ہے، مصلحانہ جنگ نہیں ہوتی۔ مصلحانہ جنگ قرآن وسنت کے پورے ذخیرے میں ایک اجنبی چیز ہے۔ اس کا ماخذ شاعروں اور خطیبوں اور انشا پردازوں کی طبع آزمائیاں ہیں نہ کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

مشہور حدیث کے مطابق ہر قسم کی اصلاح کا مدار قلب پر ہے۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ جس طرح جسمانی نظام میں قلب کی اصلاح سے پورے جسم کی اصلاح ہوتی ہے، وہی معاملہ دینی نظام کا بھی ہے۔ انسان کو اصلاح یافتہ بنانے کی صورت یہ ہے کہ قلب یا ذہن کی سطح پر اس کے اندر اصلاح لائی جائے۔

اس حدیث کے مطابق مصلحانہ تحریک (نہ کہ مصلحانہ جنگ) کا اصول یہ ہے کہ ساری طاقت انسان کے فکر وشعور کو بدلنے پر صرف کی جائے ـــــ دلائل کے ذریعہ آدمی کی سوچ کو بدلنا۔ جنت اور جہنم کی باتوں کے ذریعہ اس کے قلب میں نرمی پیدا کرنا، خدا کی نشانیوں کی یاد دہانی کے ذریعہ اس کی ربانی فطرت کو جگانا۔ یہ ہے انسانی اصلاح کا طریقہ۔ اس کو دوسرے لفظوں میں مصلحانہ تحریک بھی کہا جا سکتا ہے۔

جنگ کا مقصد ہمیشہ کسی خارجی رکاوٹ کو دور کرنا ہوتا ہے نہ کہ انسان کے اندر باطنی کیفیت پیدا کرنا۔ باطنی کیفیت یا باطنی شعور کا ذریعہ صرف وعظ وتلقین ہے، اس کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں۔

اسلام میں جنگ کی صرف ایک قسم ہے اور وہ دفاع (Defence) ہے۔ اگر کوئی گروہ اہل اسلام کے خلاف جارحیت کرے تو حسب استطاعت اس سے مقابلہ کیا جائے گا خواہ یہ مقابلہ کھلی جنگ کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں۔ عام حالات میں اسلام کا طریقہ پر امن دعوت کا طریقہ

ب۔ اسوۂ رسول میں مخالفین سے معاملہ کا طریقہ۔

ایک مطالعہ

صلح حدیبیہ (۶ھ) کے بعد جب حالات معتدل ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے باہر مختلف علاقوں میں تبلیغی وفود روانہ فرمائے۔ انھیں میں سے ایک تبلیغی دستہ وہ تھا جو جزیرہ کے شمال میں شام کی سرحد سے ملے ہوئے علاقہ کی طرف بھیجا گیا۔ یہاں عیسائی قبائل آباد تھے اور وہ رومی (بازنطینی) حکومت کے ماتحت تھے۔

اس تبلیغی وفد میں پندرہ آدمی تھے اور ان کے سردار کعب بن عمیر الغفاری تھے۔ وہ شام کے قریب ذات اطلاح میں پہنچے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ایک مقام پر کافی لوگ جمع ہیں۔ انھوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ مگر انھوں نے ان کی پکار پر لبیک نہیں کہا۔ بلکہ ان پر تیر برسانے لگے (فدعوهم الى الاسلام فلم يستجيبوا لهم ورشقوهم بالنبل) البداية والنهاية ۴ / ۲۴۱

اس یک طرفہ حملہ میں بارہ مسلمان شہید ہو گئے۔ صرف کعب بن عمیر الغفاری زخمی حالت میں مدینہ واپس آئے۔ شامی سرحد پر بسنے والے ان عیسائیوں کا حملہ، بالواسطہ طور پر رومی سلطنت کا حملہ تھا۔ اس طرح رومی سلطنت نے سب سے پہلے اسلام کے خلاف اپنی جارحیت کا آغاز کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الحارث بن عمیر الازدی کو ایک دعوتی مکتوب دے کر حاکم بصرہ کی طرف روانہ کیا۔ جب وہ موتہ (شام) میں پہنچے تو ان کی ملاقات شرحبیل ابن عمرو الغسانی سے ہوئی۔ اس نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ حاکم بصرہ کے پاس۔ اس نے کہا، شاید تم محمد کے فرستادہ ہو۔ انھوں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا اور انھوں نے الحارث بن عمیر کو تلوار مار کر قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ قتل حاکم بصری کے اشارہ پر کیا تھا (الرسول فی المدینۃ ۲۲۹)

شرحبیل بن عمرو الغسانی عیسائی تھا اور وہ رومی حکومت کا ایک افسر تھا۔ اس کا یہ فعل بین اقوامی روایت کے مطابق، اقدام جنگ کے ہم معنی تھا۔ اس لئے آپ نے تین ہزار افراد کا ایک لشکر تیار کیا اور جمادی الاولیٰ ۸ھ میں اس کو موتہ (شام) کی طرف روانہ فرمایا۔

شرجیل کو جب مسلم لشکر کی روانگی کا علم ہوا تو اس نے ایک لاکھ آدمیوں کا لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے جمع کیا۔ اس کے ساتھ خود شاہ روم ہرقل ایک لاکھ کی فوج لے کر شرجیل کی مدد کے لئے بلقا کے مقام پر پہنچ گیا۔ اس طرح دو لاکھ کا تھا سب بہت زیادہ غیر مساوی تھا۔ یہ مقابلہ فیصلہ کن نہ بن سکا۔ تاہم مسلمانوں نے انتہائی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا کہ دشمنوں کے اوپر مسلمانوں کی فوجی صلاحیت کا رعب قائم ہو گیا۔

مستشرق واشنگٹن ارونگ (Washington Irving) نے پیغمبر اسلام کی زندگی پر ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ اس کا اقتباس دکتور علی حسنی الخربوطلی نے اپنی کتاب "الرسول فی المدینہ" میں نقل کیا ہے۔ واشنگٹن ارونگ نے لکھا ہے کہ عرب میں اسلام کی اشاعت سے جب عرب کے بکھرے ہوئے قبائل متحد ہو گئے تو شہنشاہ ہرقل کو یہ عرب اتحاد اپنے لئے خطرہ محسوس ہوا۔ اس نے طے کیا کہ ایک بڑا لشکر تیار کرے اور اپنے اس "امکانی دشمن" پر حملہ کر کے اس کو کچل ڈالے چنانچہ اس نے عرب کی سرحد پر اپنی فوجیں جمع کرنا شروع کر دیا۔ (صفحہ ۲۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر اطراف کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ ہرقل نے سرحد عرب پر فوجیں جمع کی ہیں تاکہ عرب پر حملہ کر کے اسلام کا زور توڑ دے تو آپ نے فوراً جوابی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد وہ مہم پیش آئی جس کو غزوۂ تبوک کہا جاتا ہے۔

آپ نے مسلسل وعظ و تلقین کے ذریعہ مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس مہم کے لئے نکلیں۔ چنانچہ سخت حالات کے باوجود ۳۰ ہزار آدمیوں کا لشکر اس مہم کے لئے تیار ہو گیا۔ اس سلسلہ میں جو روایتیں آئی ہیں، ان کا ایک جزء یہ ہے:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم قلّ ما يخرج فى غزوة الا كنى عنها الا ما كان من غزوة تبوك فانه بينها للناس ... فامرهم بالجهاد و اخبرهم انه يريد الروم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوہ کے لئے نکلتے تو زیادہ تر آپ اشارہ اور کنایہ سے کام لیتے تھے۔ مگر غزوۂ تبوک میں آپ نے اس سے مختلف طریقہ اختیار فرمایا۔ اس کی بابت آپ نے صاف طور پر لوگوں کے سامنے اعلان کیا۔ آپ نے انھیں جہاد کا حکم

[illegible] دیا ابتداء ان کا یہ اس بات کی غمازی ہے کہ آپ کا قصد
صلح کی طرف ہے

غزوۂ تبوک اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس کے بارہ میں بہت سی تفصیلات سیرت و حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اس واقعہ کا مطالعہ کیجئے تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق جنگ کے بارہ میں نہایت اہم اصول سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے دو اصول یہ ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ تبوک کی مہم کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فوجی اقدام بطور دفاع تھا۔ وہ جارحانہ اقدام کے طور پر نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں جارحانہ جنگ نہیں ہے۔ اسلام میں جنگی اقدام صرف اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ بطور دفاع ایسا اقدام کرنا ضروری ہو گیا ہو۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ دفاعی اقدام میں بھی ٹکراؤ لازمی طور پر ضروری نہیں ہے۔ اگر اس کا امکان ہو کہ طاقت کے مظاہرہ سے یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ دشمن پیچھے ہٹ جائے اور اپنے جارحانہ ارادہ سے باز آجائے تو اپنے اقدام کو "مظاہرہ" کی حد میں رکھا جائے گا۔ اس کو لازماً جنگی ٹکراؤ تک نہیں لے جایا جائے گا۔

یہی مصلحت تھی جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عام عادت کے خلاف غزوۂ تبوک کی تیاری پورے اعلان و اظہار کے ساتھ کی۔ اور روانگی میں بھی اخفاء کے بجائے اظہار کا طریقہ اختیار فرمایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے سرحد شام پہنچنے سے پہلے رومیوں تک یہ خبر پہنچ گئی کہ پیغمبر اسلام ۳۰ ہزار جاں بازوں کے ساتھ تمہاری طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس مظاہرہ کا متوقع فائدہ حاصل ہوا۔ رومی حکمراں نے مرعوب ہو کر اپنی فوجوں کو پیچھے لوٹنے کا حکم دے دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رومی فوجوں کی پسپائی کا علم ہوا تو آپ بھی مزید اقدام سے رک گئے (الرسول فی المدینہ، صفحہ ۲۳۴)

اسلام کی عام پالیسی یہی ہے کہ حتی الامکان جنگ سے اعراض کیا جائے۔ یہ پالیسی اسلام کے اصل مقصد و مدعا کے عین مطابق ہے۔ کیوں کہ اسلام کا مقصد لوگوں کو جہنم کے راستہ سے ہٹا کر جنت کے راستہ پر ڈالنا ہے نہ یہ کہ وہ جاہلیت کی جس زندگی میں ہیں، وہیں مار کر انھیں ختم کر دیا جائے۔

ایک تاجر کی نگاہ آدمی کی جیب پر ہوتی ہے۔ ایک جنگ باز کی نگاہ آدمی کی گردن پر۔ اس

عین برعکس اسلام کی نگاہ آدمی کے دل پر ہوتی ہے۔ اسلام کا مقصد لوگوں کے دلوں کو بدلنا ہے تاکہ وہ اپنے رب کی رحمتوں میں حصہ پاسکیں۔

کوئی شخص خواہ دشمن ہو یا غیر مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ ان سب سے پہلے وہ انسان ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہم "اس انسان" تک پہنچیں اور اس کے دل کے دروازہ پر دستک دیں۔ یہاں تک کہ اس کی فطری صلاحیت جاگ اٹھے اور وہ دینِ حق کے دائرہ میں داخل ہو جائے۔

اس کی مثال عہد رومیوں کے قصہ میں موجود ہے۔ عین اس زمانہ میں جب کہ رومیوں سے کشمکش چل رہی تھی، اسی زمانہ میں رومیوں کی اعلیٰ صف کے ایک آدمی نے اسلام قبول کر لیا۔

یہ فروۃ بن عمرو الجذامی (م ۱۲ھ) تھے۔ وہ ایک عیسائی تھے اور بنو النافرۃ کے اوپر رومیوں کی طرف سے حاکم تھے۔ بنو النافرۃ کے لوگ خلیج عقبہ اور ینبع کے درمیان رہتے تھے۔ جب اسلام کا ظہور ہوا اور اس کی خبریں عرب میں پھیلیں تو فروۃ اس سے متاثر ہو گئے۔ آخر کار انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

فروۃ الجذامی نے اپنے قبول اسلام کی اطلاع ایک قاصد کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی۔ اور ہدیہ کے طور پر ایک سفید خچر بھی آپ کے لئے روانہ کیا۔ رومی حکمراں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فروہ کو اپنے پاس بلا کر انھیں قید میں ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ فروہ کو فلسطین میں عفراء نامی ایک چشمہ کے پاس لے گئے اور تلوار مار کر انھیں قتل کر دیا۔ رومی جب فروہ کو قتل کے مقام پر لائے تو فروہ نے یہ شعر کہا:

بَلِّغْ سَرَاةَ المُسْلِمِينَ بِأَنَّنِي   سِلْمٌ لِرَبِّي أَعْظُمِي وَمَقَامِي

مسلمانوں کے سردار کو یہ خبر پہنچا دو کہ میری ہڈیاں اور میرا پورا وجود میرے رب کے لئے ہے (سیرۃ ابن ہشام ۲۶۲/۴)

فروۃ بن عمرو اگرچہ قتل کر دئے گئے۔ مگر ایک اصول پر قائم رہنے کی بنا پر قتل کیا جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ ایسا آدمی اپنے پورے وجود سے اس اصول کی صداقت کی گواہی دیتا ہے جس کی خاطر اس نے اپنی جان دی ہے۔ جہاں لوگوں نے اپنے خود ساختہ نظریات کو بازار کی سیاہی سے لکھ رکھا ہے، وہاں وہ اپنے نظریہ کی صداقت کو اپنے خون کی سرخی سے تحریر کرتا ہے۔ ایسی موت ہزاروں لوگوں کے لئے زندگی کا سبب ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ دور اول کے مسلمانوں کی اس قسم کی قربانیوں نے ایک عیسائی علاقہ کو ابدی طور پر ایک مسلم علاقہ بنا دیا۔

موافق میدان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے واقعات میں سے ایک اہم واقعہ وہ ہے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ ہجرت کے چھٹے سال کا واقعہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں خواب دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ گئے ہیں اور وہاں عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ رسول کا خواب وحی ہوتا ہے۔ چنانچہ ذوالقعدہ ۶ھ کے آغاز میں آپ عمرہ کے ارادہ سے مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ آپ کے علاوہ چودہ سو اصحاب بھی اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ عمرہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ آپ کے ساتھ قربانی کے ستر اونٹ بھی تھے جن کی گردنوں میں ہدی کی علامت کے طور پر قلادے پڑے ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھیوں کے پاس صرف ایک تلوار میان میں تھی جو قدیم قبائلی دور میں ہر مسافر کا معمول سمجھی جاتی تھی۔ ذوالحلیفہ (موجودہ بئر علی) کے مقام پر پہنچ کر پورے قافلے نے حسب قاعدہ احرام باندھ لیا اور لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کی پکار کے ساتھ مکہ (بیت اللہ) کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ بالکل عام پسند تھا۔ تمام ظاہری علامات کے مطابق یہ عمرہ ادا کرنے والوں کا قافلہ تھا۔ عرب کی پوری تاریخ میں ایسے کسی قافلہ کو کبھی روکا نہیں گیا تھا۔ مگر قریش (اہل مکہ) نے اس وقت مسلمانوں کے خلاف جنگ اور عداوت کی جو مہم چلا رکھی تھی اس نے اس سادہ سے واقعہ میں سیاسی اور قومی پہلو پیدا کر دیا۔ قریش نے اس کو اپنی عزت و حمیت کے خلاف سمجھا کہ ان کے دشمنوں کا قافلہ بغیر کسی رکاوٹ کے مکہ میں داخل ہو اور عمرہ کر کے شان کے ساتھ واپس چلا جائے۔

چنانچہ قریش نے آپ کو روکنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے خالد بن ولید کی سرداری میں ۲۰۰ سواروں کا دستہ روانہ ہوا اور مکہ سے چل کر ذی طُویٰ کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہ مقام مکہ اور مدینہ کے راستہ میں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عُسفان کے مقام پر پہنچے تھے کہ آپ کے مخبر نے یہ اطلاع دی۔ آپ نے خالد کی مڈبھیڑ سے بچنے کے لئے فوراً اپنا راستہ بدل دیا۔ سیدھے اور عام راستہ سے چلنے کے بجائے آپ پہاڑی راستہ سے گھوم کر آگے نکل گئے اور حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ تاہم قریش نے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔ آپ کا ایک آدمی جو ایک

پہاڑی پر چڑھ کر مسلمانوں کا مشاہدہ کر رہا تھا اس کو تیر مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار جب کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے، قریش کے تقریباً پچاس آدمی آئے اور پتھر پھینکنا شروع کر دیا۔ اسی طرح ایک بار قریش کے کچھ لوگ رات کے وقت آئے اور اچانک آپ کے خیموں پر حملہ کر دیا۔ وغیرہ

اس قسم کے واقعات ہوتے رہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ آپ مسلسل یہ کہتے رہے کہ ہم لڑنے کے لئے نہیں آئے ہیں بلکہ عمرہ کے لئے آئے ہیں۔ حتی کہ آپ نے حضرت عثمان کو اپنا نمائندہ بنا کر مکہ والوں کے پاس بھیجا کہ وہ سرداران قریش سے کہیں کہ زیارت کعبہ کے سوا ہمارا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ ہم طواف اور قربانی کے بعد مدینہ واپس چلے جائیں گے۔ مگر قریش نے اپنی ضد میں حضرت عثمان کو روک لیا۔ یہاں تک کہ غلط طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ حضرت عثمان قتل کر دئے گئے۔ اس وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کیا کہ فوراً مکہ پر چڑھائی کر دیں۔ بلکہ قریش کے سامنے اظہار عزیمت کے لئے صرف جہاد کی بیعت لی اور بدستور حدیبیہ میں مقیم رہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس پر بیعت لی تھی کہ اگر مقابلہ کی نوبت آئی تو ہم نہیں بھاگیں گے (بایعنا علی ان لا نفر ، سیرت ابن ہشام، جلد ۳، صفحہ ۳۳۰)

اس درمیان میں مکہ کے کچھ امن پسند لوگوں نے صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ مثلاً بنو خزاعہ کا سردار بُدیل بن ورقاء، احابیش کا سردار حُلیس بن علقمہ، بنو ثقیف کا سردار عروہ بن مسعود ثقفی، وغیرہ۔ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا حال دیکھنے کے بعد مکہ جاکر قریش کو بتایا کہ یہ لوگ صرف زیارت کعبہ کے لئے آئے ہیں۔ اس لئے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ عمرہ کے ارکان ادا کرنے کے بعد خود ہی واپس چلے جائیں گے۔

کعبہ کی زیارت سے کسی کو روکنا عرب روایات کے سراسر خلاف تھا۔ اس لئے ضد اور عداوت کے باوجود قریش کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ کھل کر مسلمانوں کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کے اشتعال کے باوجود خاموش رہے۔ آپ کے اس پر امن رویہ نے مزید یہ کیا کہ قریش سے ہر قسم کی جارحیت کا جواز چھین لیا۔ بالآخر اپنی بالاتری قائم رکھنے کی خاطر انھوں نے یہ چاہا کہ مسلمانوں کو اس پر راضی کریں کہ وہ اس سال مدینہ واپس چلے

بالآخر مکہ والوں نے صلح کا ارادہ کر لیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے سہیل بن عمرو کی قیادت میں بات چیت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سہیل" کو دیکھا تو اس سے اچھا فال لیا اور فرمایا کہ اب معاملہ سہل ہو گیا (قد سہل لکم من امرکم)، آپ نے کہا کہ اس آدمی کو بات چیت کے لئے بھیجنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قریش نے اب صلح کا ارادہ کر لیا ہے (قد اراد القوم الصلح حین بعثوا هذا الرجل)

جب صلح کی بات چیت شروع ہوئی تو سہیل بن عمرو نے بے حد ضد کا مظاہرہ کیا۔ تاہم آپ اس کی ہر ضد کو مانتے چلے گئے اور تقریباً یک طرفہ طور پر قریش سے معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدہ کی تفصیل دفعات سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

معاہدہ کی بات چیت کے دوران قریش نے بار بار ضد اور عداوت کا مظاہرہ کیا۔ مگر آپ جوابی انداز اختیار کرنے کے بجائے ان کی ہر بات مانتے رہے اور اس کو نظر انداز کرتے چلے گئے۔

ابتداء یہ تجویز پیش ہوئی کہ ایک فریق کا کوئی آدمی دوسرے فریق کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کو فریق اول کی طرف واپس کر دے۔ سہیل نے کہا کہ ہمارا آدمی آپ کے پاس آئے تو آپ کو اسے واپس کرنا ہوگا۔ مگر آپ کا آدمی ہمارے پاس ہو تو ہم اس کو واپس نہیں کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یک طرفہ شرط کو منظور کر لیا۔

معاہدہ کی کتابت حضرت علی کر رہے تھے۔ آپ نے مضمون املا کراتے ہوئے فرمایا: لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم سہیل بن عمرو نے کہا نہیں۔ بلکہ ہمارے طریقہ کے مطابق یوں لکھو باسمک اللھم۔ مسلمانوں نے یہ سن کر کہا خدا کی قسم، ہم بسم اللہ الرحمن الرحیم کے سوا اور کچھ نہ لکھیں گے (واللہ لا نکتبھا إلا بسم اللہ الرحمن الرحیم) مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بحث نہیں کی بلکہ وہی الفاظ لکھوا دئے جو سہیل بن عمرو اور اس کے ساتھی چاہتے تھے۔

اس کے بعد آپ نے اگلا جملہ ارشاد فرمایا: ھذا ما قاضیٰ علیہ محمد رسول اللہ (یہ وہ ہے جس کا فیصلہ محمد اللہ کے رسول نے کیا)۔ سہیل نے دوبارہ کہا: خدا کی قسم اگر ہم جانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ سے نہ روکتے اور نہ آپ سے جنگ کرتے۔ بلکہ یوں لکھئے

ت محمد بن عبد اللہ۔ آپ نے حضرت علی سمیت تمام صحابہ کی ناگواری کے باوجود حکم دیا کہ محمد رسول اللہ اٹ دو اور محمد بن عبد اللہ لکھو۔ (واللہ انی لرسول اللہ وان کذبتمونی۔ اکتب محمد بن عبد اللہ)

معاہدہ کی دفعات طے ہونے کے بعد اس کی کتابت جاری تھی کہ ابو جندل بن سہیل بن عمرو آگئے وہ مسلمان ہو چکے تھے مگر گھر والوں نے ان کو بیڑیوں میں باندھ رکھا تھا۔ انھوں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کے قریب حدیبیہ میں موجود ہیں تو وہ کسی طرح بھاگ کر یہاں پہنچے۔ ان کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں تھیں اور جسم پر مارپیٹ کا نشان تھا۔ انھوں نے آکر کہا کہ مجھے اس ظالم قید سے بچائیے۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ نہیں۔ یہ معاہدہ کے ایفا کا پہلا موقع ہے اور آپ پر لازم ہے کہ ابو جندل کو ہمارے حوالے کریں۔ ابو جندل نے چلا کر کہا کیا میں ظالم کافروں کی طرف لوٹا دیا جاؤں گا حالاں کہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ یہ بڑا جذباتی لمحہ تھا۔ تمام صحابہ بگڑ گئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو جندل کو صبر کی تلقین کر کے انھیں واپس کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاہدہ کر کے واپس روانہ ہوئے۔ آپ کراع الغمیم کے مقام پر پہنچے تھے کہ فرشتہ خدا کی طرف سے سورہ فتح لے کر آپ کے پاس آگیا۔ اس کو پا کر آپ اتنا مسرور ہوئے کہ آپ نے فرمایا: آج مجھ پر ایسی سورہ نازل ہوئی ہے جو مجھ کو دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے (نزل علی البارحۃ سورۃ ھی احب الی من الدنیا وما فیھا)
اس سورہ کی ابتدائی چند آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

بے شک ہم نے تم کو فتح مبین دے دی۔ تاکہ اللہ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخش دے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے۔ اور تم کو صراط مستقیم دکھائے۔ اور تم کو زبردست نصرت عطا کرے۔ وہی ہے جس نے اہل ایمان کے دلوں میں سکینت اتاری تاکہ ان کے ایمان میں ایک اور ایمان کا اضافہ ہو۔ اور زمین و آسمان کے سب لشکر اللہ ہی کے ہیں۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ تاکہ اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے۔ اور اللہ کے نزدیک یہی بڑی

کامیابی ہے اور تاکہ اللہ سزا دے منافق مردوں اور منافق عورتوں، مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو اللہ کے بارے میں برے گمان رکھتے ہیں۔ برائی کی گردش انہیں پر ہے۔ اللہ کا غضب ان پر ہوا اور اللہ نے ان پر لعنت کی اور اس نے ان کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے (الفتح ۱-۶)

"اور تم کو صراط مستقیم دکھائے"۔ اس آیت کا تعلق واضح طور پر اسی صلح کے واقعہ سے ہے یہاں نہ عقائد کا ذکر ہے اور نہ عبادات کا۔ بلکہ تمام تر ذکر صرف صلح حدیبیہ کا ہے۔ اس لئے اس سیاق میں اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ صلح حدیبیہ کا واقعہ اس لئے پیش آیا تاکہ اجتماعی مقابلہ میں حریف کے اوپر فتح پانے کی صراط مستقیم تمہیں بتائی جائے۔ موجودہ دنیا میں جب اسلام اور غیر اسلام کا مقابلہ ہو تو اس میں حقیقی فتح پانے کا خدائی راستہ صرف وہ ہے جو صلح حدیبیہ کی مثال کی صورت میں ہمارے اوپر کھولا گیا ہے۔

اس آیت میں اتمام نعمت سے مراد حق کے ساتھ غلبہ کو جمع کرنا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق اپنی کامل صورت میں پہلے بھی ملا ہوا تھا۔ البتہ اس حق کے ساتھ دنیوی غلبہ ابھی تک جمع نہیں ہوا تھا۔ صلح حدیبیہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے ملک میں غلبہ کا راستہ کھول دیا۔

"اور تاکہ خدا تم کو زبردست نصرت عطا کرے"۔ یہ آیت موجودہ دنیا میں خدا کے قانون نصرت کو بتاتی ہے۔ اہل ایمان اگر چاہتے ہیں کہ خدائی مدد ان کا ساتھ دے تو اس کا مستحق بننے کے لئے انہیں اس صلاحیت کا ثبوت دینا ہوگا کہ وہ اس کام میں اپنی محنتیں صرف کریں جو صلح اور امن کے حالات میں انجام دیا جاتا ہے نہ کہ وہ کام جو جنگ کے حالات میں انجام دیا جاتا ہے۔ صلح حدیبیہ سے پہلے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگی حالت قائم تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسلمانوں کے سامنے یہ نشانہ تھا کہ وہ غیر مسلموں کی گردن کاٹیں۔ صلح کے بعد نشانہ بدل گیا۔ اب ان کا کام یہ قرار پایا کہ وہ غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کا پیغام داخل کریں۔ گویا خدائی نصرت کا مستحق بننے کا راز غیر مسلموں کو اپنا حریف بنانا نہیں ہے بلکہ اس کا راز یہ ہے کہ غیر مسلموں کو اپنا مدعو بنایا جائے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں کے دلوں پر جو سکینت نازل ہوئی وہ کیا تھی۔ وہ یہ تھی کہ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ وہ متعلقہ معاملہ میں ردعمل کا رویہ اختیار نہ کریں بلکہ ردعمل کی نفسیات سے بلند ہو کر مثبت رویہ کا ثبوت دیں۔ انہوں نے اشتعال کے موقع پر بے اشتعالی کا طریقہ اختیار کیا۔ غرض ثانی

کی طرف سے تھا جیسا ہو، اور اگر انھوں نے خدا کو چھوڑ کر ایک خود شرائط پر ان سے صلح کرلی۔

"ایمان پر ایمان کا اضافہ" سے مراد یہ ہے کہ اب تک وہ معمول کے حالات میں ایمان والے بنے ہوئے تھے۔ اب انھوں نے غیر معمولی حالات میں صاحب ایمان ہونے کا ثبوت دیا۔ جس خدا کو وہ پہلے جذبات کے ٹھہراؤ کی حالت میں مانے ہوئے تھے اس خدا کو اب انھوں نے جذبات کے ہیجان کی حالت میں مانا۔ جس خدا کے حکم کی تعمیل مزاج کی موافقت کے ساتھ کر رہے تھے، اس خدا کے حکم کی تعمیل انھوں نے مزاج کی مخالفت کے باوجود کی۔ جس خدا کے نام پر انھوں نے اپنا سر اونچا کیا تھا، اسی خدا کے حکم سے انھوں نے اب اپنا سر نیچا کر لیا۔

"زمین و آسمان کا تمام لشکر اللہ کا ہے"۔ یہ بات اس موقع پر کیوں کہی گئی۔ جواب یہ ہے کہ خدا کی ایک سنت کو بتانے کے لئے۔ اس کائنات میں ہر قسم کی طاقت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ رسول اور اصحاب رسول کو فرشتوں کی فوج کے ذریعہ معجزاتی طور پر غالب کر سکتا تھا۔ مگر یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں کے لئے خدا کا یہ قانون نہیں۔ موجودہ دنیا میں ہر ایک کو آزادی ہے۔ اس لئے یہاں تمام واقعات اسباب کے پردے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ خدا نے اپنے رسول کو "ذلت آمیز صلح" پر راضی ہو جانے کا حکم اسی لئے دیا، کیوں کہ موجودہ عالم اسباب میں باعزت فتح کی منزل تک پہنچنے کا راستہ یہی ہے۔

متفقہ روایات کے مطابق سورہ فتح حدیبیہ سے لوٹتے ہوئے ذی قعدہ ۶ھ میں نازل ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں دشمن سے صلح کر لینے کو فتح مبین کہا گیا ہے۔ اس صلح کی تاریخ اور اس کی دفعات کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا خلاصہ یہ تھا کہ دشمن کی تمام شرائط کو مان کر اس سے یہ عہد لے لیا جائے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اگلے دس سال تک جنگ نہ ہوگی۔ گویا اس سورہ میں جس چیز کو فتح مبین کہا گیا ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ تھا کہ دشمن کو میدان جنگ سے ہٹا کر میدان امن میں لایا جائے۔

اس معاہدہ کا فریق اول (مسلمان) محض عام قسم کا ایک گروہ نہ تھا بلکہ وہ ایک داعی گروہ تھا۔ اس کے پاس دنیا کی سب سے بڑی صداقت تھی۔ ایسی صداقت جو عقل اور فطرت کو مسخر کر لینے والی ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو اس معاہدہ کے معنی اس وقت یہ تھے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے

بہت سے مقابلہ کو بدل دیا جائے۔ جو مقابلہ جو اب تک جنگ کے میدان میں ہو رہا تھا اس کو غیر جنگی دعوت کے میدان میں لایا جائے۔

بعثت نبوی سے لے کر صلح حدیبیہ تک تقریباً ۲۰ سال کی مدت ہے۔ اس طویل مدت میں ایمان لانے والے مسلمانوں کی تعداد صلح حدیبیہ کے بعد صرف دو سال میں ہوئے۔ حدیبیہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف ڈیڑھ ہزار مسلمان تھے۔ جب کہ حدیبیہ کے بعد دو سال سے بھی کم مدت میں آپ نے مکہ کی طرف مارچ کیا تو آپ کے ساتھ دس ہزار مسلمان شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہجرت کے بعد مسلسل جنگوں کی وجہ سے اشاعت اسلام کا کام ٹھپ پڑ گیا تھا۔ دس سالہ ناجنگ معاہدہ کے بعد جب فضا معتدل ہوئی تو اشاعت اسلام کا کام پوری تیزی سے ہونے لگا۔ گویا کہ جنگی صورت حال کی بنا پر اسلام کا زیادہ طاقت ور ہتھیار غیر استعمال شدہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ حدیبیہ کے ناجنگ معاہدہ نے اس طاقت ور ہتھیار کو قابل استعمال بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ معاہدہ حدیبیہ کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔

حدیبیہ کا معاملہ فتح مبین اس لئے تھا کہ اس نے اس بات کو ممکن بنا دیا کہ اسلام کے سب سے طاقت ور ہتھیار کو اس کے حق میں استعمال کیا جائے۔ حدیبیہ کی اسپرٹ یہ ہے کہ فریق ثانی کی ضد اور مخالفت کی وجہ سے اگر ٹکراؤ کی فضا پیدا ہو جائے تو یک طرفہ صبر کے ذریعہ ٹکراؤ کی اسٹیج چلائے تاکہ اسلامی دعوت کی راہ ہموار ہو سکے۔

فہمِ دین

۲۶ دسمبر ۱۹۹۶ کو ۱۰ فلسطینی عرب ہمارے دفتر (نئی دہلی) میں آئے۔ ان کے قائد شیخ کمال الخطیب تھے جو فلسطین کی اسلامک موومنٹ کے وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ بقیہ نوجوان وہ تھے جو دہلی کی مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ پورے ملک میں زیر تعلیم فلسطینی نوجوانوں کا سالانہ جتماع (کیمپ) بنگلور میں اسی سال دسمبر میں ہوا۔ یہ لوگ اس میں شرکت کے لیے جا رہے تھے ان میں سے ایک استاد جہاد محمد تھے وہ ریسرچ کے تحت دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے : 6846964

یہ سب نوجوان انتہا پسند فلسطینی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کہ تشدد کے ذریعہ فلسطین کے مسئلہ کو حل کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجیے۔ میں نے کہا کہ نہ صرف فلسطین بلکہ کشمیر، الجزائر اور اس قسم کے دوسرے تمام مقامات کے لیے میری ایک ہی نصیحت ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تمام لوگ تشدد کے طریقہ کو مکمل طور پر ختم کر دیں اور صرف امن کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی تحریک چلائیں۔ وہ کسی بھی حال میں اور کسی بھی عذر کو لے کر متشددانہ طریقہ نہ اختیار کریں۔

میں نے کہا کہ آپ کو میرا یہ مشورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی میں ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ کی یہ روایت آئی ہے کہ : ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین أمرین إلا أخذ أیسرھما (فتح الباری ۶/۶۵۲) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کسی معاملہ میں دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان طریقہ کا انتخاب فرماتے۔

میں نے کہا کہ آپ اور آپ جیسے دوسرے لوگ آزادئ وطن یا جہاد اسلام کے نام سے جو تحریک چلا رہے ہیں اس میں باعتبار اسلوب آپ کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ ایک پُر تشدد طریقہ اور دوسرا پُر امن طریقہ۔ بروقت آپ لوگوں نے اپنی تحریک کے لیے پُر تشدد طریقہ کو اختیار کر رکھا ہے۔ مذکورہ روایت کے مطابق یہ سنت رسول کے خلاف ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں آپ اختیار ایسر (اختیار اسہل) کے طریقہ کو اپنائیں۔ یعنی تشدد کے طریقہ کو

چھوڑ کر پرامن جدوجہد کے اصول پر اپنی تحریک چلائیں۔

ایک فلسطینی نوجوان نے کہا کہ صحیح بخاری کی اس روایت میں آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ما لم یکن اثما (جب تک کہ وہ گناہ نہ ہو)۔ اس وقت فلسطین اور دوسرے اس قسم کے مقامات پر ظالم دشمن ہمارا قتل کر رہا ہے اور ان کی اقتصادیات کو تباہ کر رہا ہے پھر اس سے بڑا اثم اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس اثم عظیم کی موجودگی میں کیسے اختیار ایسر کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ خود حدیث کے الفاظ کے مطابق اس اثم کی موجودگی میں ہمیں امن کے سہل طریقہ کو چھوڑ کر تشدد کے مشکل طریقہ کو اختیار کرنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ ما لم یکن اثما کا یہ مطلب نہیں۔ پوری حدیث اس طرح ہے کہ ما لم یکن اثما، فان کان اثما کان ابعد الناس منہ (جب تک کہ وہ اثم نہ ہو۔ اور اگر وہ اثم ہو تو آپ اس سے بہت زیادہ دور رہتے تھے) یہاں "وہ" سے مراد فریق ثانی کی روش نہیں ہے۔ بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریقہ ہے۔ اس کا تعلق فعلِ غیر سے نہیں ہے بلکہ فعلِ رسولؐ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی صورت حال کے مقابلہ کے لیے جب آپ کو دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہو تو آپ ہمیشہ آسان طریقہ کے ذریعہ سے فریق ثانی کا مقابلہ کرنے کی کوشش فرماتے۔ بشرطیکہ اختیار کیا جانے والا یہ طریقہ اثم نہ ہو۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ ایک شخص کو پیاس لگی ہوئی ہے، اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس کے سامنے دو صورتیں ہیں۔ ایک طرف وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس شراب کی بوتل رکھی ہوئی ہے۔ دوسری طرف اس کے علم میں آتا ہے کہ اس علاقہ میں پانی کا ایک چشمہ ہے مگر وہ پہاڑ کے اوپر واقع ہے۔ اس مثال میں شراب پی کر اپنی پیاس بجھانا بظاہر آسان ہے اور چل کر پانی تک پہنچنا بظاہر مشکل۔ مگر یہاں شریعت کا حکم ہوگا کہ وہ آدمی آسان ہونے کے باوجود شراب سے اپنی پیاس نہ بجھائے بلکہ سفر کرکے چشمہ تک پہنچے اور اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھائے۔

ابن حجر العسقلانی نے حدیث کے مذکورہ حصہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ای ما لم یکن الاسہل مقتضیا للاثم فانہ حینئذ یختار الاشد (فتح الباری ۶/۶۹۵) یعنی جب

ے آسان طریقہ کسی اثم کا مقتضی نہ ہو اور جب وہ طریقہ اثم کا مقتضی ہو تو آپ مشکل طریقہ کا انتخاب فرماتے۔

سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری عمر نبوت میں اس اصول کا اختیار کیا کہ جہاں آسان طریقہ اور مشکل طریقہ، دو میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا موقع ہو تو آپ نے ہمیشہ آسان کا انتخاب فرمایا۔

مثلاً مکہ میں بیت اللہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ اب اس معاملہ میں آپ کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ ایک انتخاب تھا ـــــ بیت اللہ میں داخل ہو کر بتوں کو توڑنا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ پر امن طور پر یہ تبلیغ کی جائے کہ اے لوگو، بت پرستی کو چھوڑو اور ایک خدا کی عبادت کرو۔ ان دونوں میں بت شکنی کا طریقہ واضح طور پر مشکل تھا اور پر امن تبلیغ کا طریقہ اس کے مقابلہ میں واضح طور پر آسان۔ چنانچہ آپ نے مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کو لے لیا۔

اسی طرح ہجرت کے موقع پر آپ کے سامنے دو میں سے ایک کا انتخاب تھا۔ ایک یہ کہ مکہ والوں کے ظلم کے خلاف مسلح لڑائی چھیڑیں، اور دوسرے یہ کہ اپنے اصحاب کے ساتھ خاموش طور پر مکہ سے مدینہ چلے جائیں۔ یہاں بھی آپ نے مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کا انتخاب فرمایا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ مشرک قبائل بارہ ہزار کی تعداد میں مسلح ہو کر مدینہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آپ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ نوجوان مسلمانوں کی رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جنگ کی تیاری کی جائے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت سلمان فارسیؓ نے بتایا کہ ایران میں جب اس قسم کی صورت حال پیش آتی ہے تو اپنے اور دشمنوں کے درمیان خندق کھود کر مسلح ٹکراؤ کو روک دیا جاتا ہے۔ اس وقت آپ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ کو اختیار فرمایا جو دو ممکن صورتوں میں سے آسان صورت کے ہم معنی تھا۔

اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر آپ کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اپنے تقریباً پندرہ سو اصحاب کو لے کر قریش سے مسلح ٹکراؤ کریں۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ قریش سے صلح کر کے جنگ کو ٹال دیا جائے اور اپنی طاقت کو پر امن تبلیغ کی طرف موڑ دیا جائے۔ یہاں بھی آپ نے دوسرا طریقہ اختیار فرمایا جو مشکل کے مقابلہ میں آسان کا انتخاب لینے کے ہم معنی تھا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف عربی جاننا کافی نہیں۔ مذکورہ اشخاص عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اہل علم بھی تھے۔ مگر مذکورہ حدیث کو وہ نہ سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان جاننے کے ساتھ آدمی کے اندر سنجیدگی ضروری ہے جس کو قرآن میں تقویٰ کہا گیا ہے (البقرہ ۲۸۲) اگر سنجیدگی نہ ہو تو صرف عربی زبان کو جاننا قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

قرآن کے مطابق، تقویٰ علم صحیح کا ذریعہ ہے (واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ) آدمی کے اندر اگر تقویٰ کی صفت نہ ہو تو خارجی معلومات کا کوئی بھی ذخیرہ اس کا بدل نہیں بن سکتا۔ تقویٰ عالم کے لیے ایک خدائی لگام کی مانند ہے۔ یہ لگام اس کو ادھر اُدھر منحرف ہونے سے بچاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کا مفہوم متعین کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مفہوم اپنی خواہشات اور اپنے تعصبات کے تحت مقرر کیا جائے۔ جو لوگ اس قسم کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ بظاہر ایک آیت یا ایک حدیث کا حوالہ دیں گے۔ مگر اس آیت اور اس حدیث میں وہ خود اپنے آپ کو پڑھ رہے ہوں گے نہ کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی بات کو۔ ایسے لوگ اپنے جذبات و خیالات میں اتنا زیادہ گم ہوتے ہیں کہ ان کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ آیت یا حدیث کو بے لاگ انداز میں سمجھ سکیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی پوری طرح خالی الذہن ہو کر قرآن و حدیث کو پڑھے، وہ کھلے ذہن کے تحت یہ جاننے کی کوشش کرے کہ خود آیت یا حدیث کے الفاظ سے کیا مفہوم نکل رہا ہے۔ ایسے ہی لوگ اس کے صحیح مفہوم تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

اس معاملہ میں تقویٰ کا رول یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر احتیاط کا مزاج بناتا ہے، خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ آیت یا حدیث کا ٹھیک وہی مفہوم لے جو واقعی طور پر اس سے نکلتا ہے نہ کہ کوئی خود ساختہ مفہوم جو آدمی کے اپنے دماغ میں تو ضرور ہے، مگر آیت کے الفاظ میں جس کا کوئی وجود نہیں۔

تھے کہ آسان طریقہ کسی امر کا متقاضی نہ ہو۔ اور جب معاملہ امر کا متقاضی ہو تو آپ مشکل طریقہ اختیار کرتے

حقیقت کا مطالبہ تھا) ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں اس

اصول کو اختیار فرمایا کہ جہاں آسان طریقہ اور مشکل طریقہ، دو میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا موقع ہو

تو آپ نے ہمیشہ آسان کا انتخاب فرمایا۔

مثلاً مکہ میں بیت اللہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ اب اس معاملہ میں آپ کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ ایک انتخاب تھا —— بیت اللہ میں داخل ہو کر بتوں کو توڑنا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ پر امن طور پر یہ تبلیغ کی جائے کہ اے لوگو بت پرستی کو چھوڑو اور ایک خدا کی عبادت کرو۔ ان دونوں میں بت شکنی کا طریقہ واضح طور پر مشکل تھا اور پر امن تبلیغ کا طریقہ اس کے مقابلہ میں واضح طور پر آسان۔ چنانچہ آپ نے مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کو لے لیا۔

اسی طرح ہجرت کے موقع پر آپ کے سامنے دو میں سے ایک کا انتخاب تھا۔ ایک یہ کہ مکہ والوں کے ظلم کے خلاف مسلح لڑائی چھیڑیں، اور دوسرے یہ کہ اپنے اصحاب کے ساتھ خاموش طور پر مکہ سے مدینہ چلے جائیں۔ یہاں بھی آپ نے مشکل طریقہ کو چھوڑ کر آسان طریقہ کا انتخاب فرمایا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ مشرک قبائل بارہ ہزار کی تعداد میں مسلح ہو کر مدینہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ آپ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ نوجوان مسلمانوں کی رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جنگ کی تیاری کی جائے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت سلمان فارسیؓ نے بتایا کہ ایران میں جب اس قسم کی صورت حال پیش آتی ہے تو اپنے اور دشمنوں کے درمیان خندق کھود کر مسلح ٹکراؤ کو روک دیا جاتا ہے۔ اس وقت آپ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ کو اختیار فرمایا جو دو ممکن صورتوں میں سے آسان صورت کے ہم معنی تھا۔

اسی طرح حدیبیہ کے موقع پر آپؐ کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کو لے کر قریش سے مسلح ٹکراؤ کریں۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا انتخاب یہ تھا کہ قریش سے صلح کر کے جنگ کو ٹال دیا جائے اور اپنی طاقت کو پر امن تبلیغ کی طرف موڑ دیا جائے۔ یہاں بھی آپ نے وہ طریقہ اختیار فرمایا جو مشکل کے مقابلہ میں آسان کا انتخاب لینے کے ہم معنی تھا۔

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے صرف عربی جاننا کافی نہیں۔ مذکورہ لوگ عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اہل علم بھی تھے۔ مگر مذکورہ حدیث کو وہ نہ سمجھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان جاننے کے ساتھ آدمی کے اندر سنجیدگی ضروری ہے جس کو قرآن میں تقویٰ کہا گیا ہے (البقرہ ۲۸۲) اگر سنجیدگی نہ ہو تو صرف عربی زبان کو جاننا قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

قرآن کے مطابق، تقویٰ علم صحیح کا ذریعہ ہے (واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ) آدمی کے اندر اگر تقویٰ کی صفت نہ ہو تو خارجی معلومات کا کوئی بھی ذخیرہ اس کا بدل نہیں بن سکتا۔ تقویٰ عالم کے لیے ایک خدائی لگام کی مانند ہے۔ یہ لگام اس کو ادھر ادھر منحرف ہونے سے بچاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کا مفہوم متعین کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مفہوم اپنی خواہشات اور اپنے تعصبات کے تحت مقرر کیا جائے۔ جو لوگ اس قسم کی نفسیات میں مبتلا ہوں وہ بظاہر ایک آیت یا ایک حدیث کا حوالہ دیں گے۔ مگر اس آیت اور اس حدیث میں وہ خود اپنے آپ کو پڑھ رہے ہوں گے نہ کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی بات کو۔ ایسے لوگ اپنے جذبات و خیالات میں اتنا زیادہ گم ہوتے ہیں کہ ان کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ آیت یا حدیث کو بے لاگ انداز میں سمجھ سکیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی پوری طرح خالی الذہن ہو کر قرآن و حدیث کو پڑھے، وہ کھلے ذہن کے تحت یہ جاننے کی کوشش کرے کہ خود آیت یا حدیث کے الفاظ سے کیا مفہوم نکل رہا ہے ایسے ہی لوگ اس کے صحیح مفہوم تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

اس معاملہ میں تقویٰ کا رول یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر احتیاط کا مزاج بناتا ہے، خدا کی پکڑ کا اندیشہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ آیت یا حدیث کا ٹھیک وہی مفہوم لے جو واقعی طور پر اس سے نکلتا ہے نہ کہ کوئی خود ساختہ مفہوم جو آدمی کے اپنے دماغ میں تو ضرور ہے، مگر آیت کے الفاظ میں جس کا کوئی وجود نہیں۔

بمبئی کا سفر

بھارتیہ ودیا بھون کے زیر انتظام بمبئی میں ۲۹-۳۰ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع تھا : اقدار پر مبنی سماج۔ اس کی دعوت پر بمبئی کا سفر ہوا۔ یہاں اس کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۶ جنوری کی شام کو دہلی ایرپورٹ پہنچا۔ یہاں بمبئی کے تین صاحبان مل گئے۔ یہ تینوں بمبئی کے مقامی لیڈر ہیں۔ اپنے قول کے مطابق، آئندہ الکشن کے مسئلہ پر راجدھانی کے مسلم لیڈروں سے بات کرنے کے لیے وہ دہلی آئے تھے اور اب یہاں سے واپس جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ مسلمانوں کی انتخابی پالیسی کے بارہ میں آپ لوگوں نے کیا طے کیا۔ انھوں نے کسی قدر جوش کے انداز میں کہا : ہمیں نان کانگرس اور نان ہندتو پارٹیوں کا ساتھ دینا ہے۔ ہمیں مسلم دشمن طاقتوں کو ہرانا ہے، یہ ہماری انا کا سوال ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ تھرڈ فورس (third force) کو ووٹ دیں گے جس کے افراد آج کل آپ کی دل پسند باتیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے دوبارہ پرجوش طور پر جواب دیا : ہاں، اس میں کیا شک ہے۔ میں نے کہا کہ نام نہاد تھرڈ فورس تو نو فورس ہے۔ اس کا ساتھ دے کر آپ صرف اپنے ووٹ کو ضائع کریں گے۔ آپ کی اس نگیٹو ووٹنگ کا فائدہ براہ راست انھیں لوگوں کو ملے گا جن کو آپ مسلم دشمن کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔

بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذکورہ انتخابی پالیسی سراسر ناکام رہی۔ ریاستی الکشن فروری ۱۹۹۵ میں نام نہاد تیسرے محاذ (تھرڈ فرنٹ) کے نمائندے بری طرح ہار گئے۔ اور انتخابات کے بعد بھاجپا اور شیوسینا نے مل کر مہاراشٹر میں اپنی حکومت بنائی۔ یعنی انھیں لوگوں نے جن کو مسلمان اس الکشن میں ہرانا چاہتے تھے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے لوک سبھا کے الکشن (اپریل-مئی ۱۹۹۶) میں اسی سابقہ غلطی کو پھر دہرایا۔ حیدرآباد کے روزنامہ سیاست (۷ جولائی ۱۹۹۶) میں ڈاکٹر مسعود علی خان (ICSSR) نے تفصیلی تجزیہ کر کے بتایا کہ ۱۹۹۶ میں گیارھویں لوک سبھا کے

الکشن نے اس عوش فہمی کا خاتمہ کردیا ہے کہ مسلم ووٹ توازن کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ جس پارٹی کی طرف گر جائیں اسس کی کامیابی یقینی ہے۔

یہ ایک نمائندہ واقعہ ہے جس میں نام نہاد مسلم لیڈروں کی پوری تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ لوگ اپنی عظمت کی بنا پر ہمیشہ انا اور وقار کی سیاست چلاتے ہیں۔ اور اسی لیے وہ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ ان کو یہ سادہ سی حقیقت نہیں معلوم کہ الکشن میں شرکت انا کی تسکین کے لیے نہیں ہوتی۔ بلکہ اس لیے کی جاتی ہے اگلے چند سالوں (نہ کہ ہمیشہ کے لیے) کمیونٹی کے مفادات کو بقدر امکان (نہ کہ مکمل طور پر) محفوظ کیا جاسکے۔ وقار کی سیاست تباہی کی سیاست ہے۔ اور بدقسمتی سے نااہل مسلم قیادت نے ہندستان کے مسلمانوں کو اسی تباہی کا تحفہ دیا ہے۔

دہلی سے بمبئی کا سفر انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۱۰۵ کے ذریعہ طے ہوا۔ جہاز ٹھیک وقت پر پونے چھ بجے روانہ ہوا، اور تقریباً دو گھنٹہ کی پرواز کے بعد بمبئی پہنچ گیا۔ یہاں ایرپورٹ پر کئی ساتھی موجود تھے۔ ان کے ہمراہ شہر کے لیے روانگی ہوئی۔ یہاں میرا قیام ہوٹل میٹرو پیلس کے کمرہ نمبر ۲۰۲ میں تھا۔

ہوٹل کے کمرہ میں تھوڑی دیر ساتھیوں سے گفتگو ہوئی۔ لوگوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد وقتی طور پر یہاں کے مسلمانوں میں الرسالہ مشن کے خلاف جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ اللہ کے فضل سے اب تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ الرسالہ کی اور کتابوں کی مانگ دوبارہ بڑھ گئی ہے۔ لوگ اعتراف کر رہے ہیں کہ اس بحران میں وہی راستہ درست تھا جس کی رہنمائی الرسالہ میں دی گئی تھی۔

ہوٹل میں تھوڑی دیر قیام کے بعد ہم لوگ باندرہ کے جناب جاوید صاحب کے یہاں گئے۔ ان کی رہائش گاہ پر نماز عشاء کے بعد ایک میٹنگ رکھی گئی تھی۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان تقریباً ۲۵ کی تعداد میں شریک ہوئے۔ ان سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ موجودہ زمانہ میں جو جدید تقاضے پیدا ہوئے ہیں وہ کیا ہیں اور ان کے درمیان رہتے ہوئے کس طرح اسلامی زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ٹی وی کی صورت میں جو کلچرل انویژن ہے اس

کے خلاف چیخ پکار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ وہ تو جاری رہے گا۔ ہمارے نوجوان جوان کا شکار ہو رہے ہیں اس کی اصل وجہ ان کا چیپ ٹیسٹ ہے۔ ہمیں ان کے ٹیسٹ کو اونچا کرنا ہوگا۔ مثلاً میرا اپنا حال خدا کے فضل سے یہ ہے کہ میرا انٹلکچول لیول اتنا بلند ہو چکا ہے کہ میں اس قسم کی چیزوں سے انجوائے نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں ان کا شکار بھی نہیں ہوتا۔ یہی اس مسئلہ کا حل ہے۔

۲۷ جنوری کو ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کا دین انٹرسٹ (مفاد) ہے۔ آج ہر آدمی، خواہ وہ ایک مذہب کا ہو یا دوسرے مذہب کا، صرف انٹرسٹ کے ٹرم میں سوچتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی کا انٹرسٹ دولت ہے اور کسی کا انٹرسٹ قیادت اور مقبولیت۔ یہ مزاج اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ اگر کوئی شخص انٹرسٹ کے خلاف بول رہا ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس میں بھی اس کا کوئی انٹرسٹ شامل ہوگا۔

۲۷ جنوری کو جمعہ کا دن تھا۔ ہوٹل میں لوگ ملاقات کے لیے آتے رہے اور ان سے ملی اور ملکی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ جمعہ کی نماز ماڈرن ڈیری کی مسجد میں پڑھنا تھا۔ جب ہماری گاڑی ہوٹل سے مسجد کے لیے روانہ ہوئی تو راستہ میں میں نے دیکھا کہ ہمارے سامنے جو گاڑی جا رہی ہے اس کی باڈی کے پیچھے لکھا ہوا ہے محفوظ دوری پر رہو (Keep safe distance) میں نے سوچا کہ یہی کامیاب زندگی کا اصول ہے۔ اس دنیا میں سڑک پر محفوظ سفر کے لیے بھی یہی واحد اصول ہے، اور زندگی کے وسیع تر سفر میں بھی یہی واحد کارآمد اصول ہے۔

ماڈرن ڈیری کی مسجد میں مولانا شمس الحق قاسمی امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہاں جمعہ کی نماز پڑھی۔ نماز سے پہلے آدھ گھنٹہ کی تقریر تھی۔ یہ بتانے کی کوشش کی کہ مسجد انسان سازی کا تربیتی مرکز ہے۔ یہاں انسان کے اندر وہ اوصاف پیدا کیے جاتے ہیں جو دینی اور دنیوی اعتبار سے بہتر زندگی گزارنے کی کلید ہیں۔

مسجد میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ مولانا مظاہر الحق قاسمی (۲۷ سال) رُدرپور (ضلع نینی تال) میں رہتے ہیں۔ وہ کئی سال سے الرسالہ پڑھ رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ الرسالہ سے آپ نے کیا سبق لیا۔ انھوں نے کہا کہ مجاہدانہ زندگی۔ الرسالہ آدمی

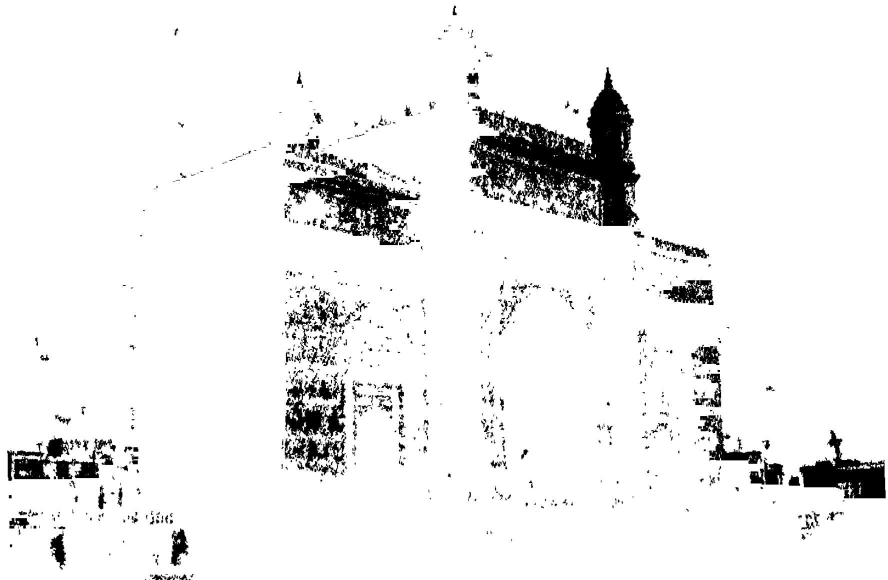
کرنا مسئلہ زندگی گزارنے کی فکری تربیت ہے۔
ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ بمبئی میں کس مسلم تنظیم کا زیادہ اثر ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی کا نہیں۔ صرف یہ ہے کہ کوئی قومی اشو کھڑا ہوتا ہے تو اس کے نام پر کوئی تنظیم یا جماعت وقتی طور پر کچھ ہیرا پھیری کر لیتی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔
۱۷ جنوری کو مغرب کی نماز آدرش نگر میں پڑھی۔ یہاں مسجد کے ساتھ ایک رہائشی مدرسہ قائم ہے۔ اس میں اس وقت ۵۰ لڑکے زیر تعلیم ہیں اور چار استاد ہیں۔ اس کو جناب جی ایم صدیقی نے بنایا ہے اور وہی اس کو چلا رہے ہیں۔
جی ایم صدیقی صاحب نے بتایا کہ جنوری۔ فروری ۱۹۹۳ میں جب بمبئی میں فساد ہوا تو مدرسہ کے بارہ میں ہم لوگوں کو تشویش پیدا ہوئی۔ کچھ مسلمانوں نے مشورہ دیا کہ مدرسہ کے بچوں کو یہاں سے دوسرے مقام پر منتقل کر دیا جائے۔ مقامی ہندوؤں کو جی ایم صدیقی اور ان کے دوستوں کی پریشانی کا علم ہوا تو یہ ہندو مسٹر صدیقی سے ملے اور کہا کہ آپ لوگ نہ پریشان ہوں اور نہ کہیں اور منتقل ہوں۔ ان کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے امن کمیٹی بنائی اور ڈیڑھ ماہ تک رات دن گھوم گھوم کر علاقہ کا پہرہ دیتے رہے۔
ایک مجلس میں جناب محمود ایوبی صاحب (صحافی) بھی تھے۔ ایک صاحب نے فسادات وغیرہ کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا: زلزلہ آیا کرے، مکان پھر بنا لیں گے۔
جناب جی ایم صدیقی صاحب نے آج رات کے کھانے پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بلایا تھا۔ یہاں تقریباً دو گھنٹہ کی نشست میں مجھے اظہار خیال کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ اسلام کی از سر نو تعبیر (reinterpretation) کا مسئلہ ہے۔ آج کا زمانہ پوری طرح ایک بدلا ہوا زمانہ ہے۔ اب نئے حالات کے لحاظ سے اسلام کی ابدی تعلیمات کی از سر نو تشریح کرنا ہے۔ تاکہ دور جدید میں بھی اسلام پوری طرح ایک قابل عمل نظریہ دکھائی دینے لگے (اس معاملہ کی تفصیل "فکر اسلامی" میں دیکھی جا سکتی ہے)
مہاراشٹر کے سابقہ الیکشن پر کچھ لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس کا ایک سبق یہ ہے کہ الیکشنی تقریریں ہمیشہ بے حقیقت ہوتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۹۵ کے اس الیکشن

یہ کہا جاتا ہے کہ مسٹر منوہر جوشی نے اپنی انتخابی مہم میں کہا تھا کہ پہلی ہندو ریاست مہاراشٹر میں بنے گی

The first Hindu State will be established in Maharashtra (Manohar Joshi)

اس الیکشن کے جو نتائج سامنے آئے اس کے بعد منوہر جوشی کو موقع ملا کہ وہ مہاراشٹر میں چیف منسٹر ہو جائیں۔ مگر اقتدار میں آنے کے بعد ہندو اسٹیٹ بنانا تو درکنار، انھوں نے ہندو اسٹیٹ کی بات بھی نہیں کی۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی انسان کے الفاظ کبھی تاریخ نہیں بناتے۔ تاریخ ہمیشہ حقیقی اسباب کے زور پر بنتی ہے نہ کہ لاؤڈ اسپیکر پر بولے ہوئے الفاظ کی بنیاد پر۔

ایک بار ایک سڑک پر چلتے ہوئے یہاں کا مشہور گیٹ وے آف انڈیا نظر آیا۔ یہ ایک تاریخی گیٹ ہے۔ انگریز بمبئی میں سمندر کے راستہ سے داخل ہوئے تھے۔ یہاں سمندر کے ساحل پر انھوں نے ایک اونچا گیٹ بنایا جو گیٹ وے آف انڈیا کہا جاتا ہے (دوسرا گیٹ نئی دہلی میں بنایا گیا جس کا نام انڈیا گیٹ ہے) یہ گیٹ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں بنایا گیا



Gateway of India, Bombay, early 20th century

تھا جب ہندستان آیا۔ اس وقت وہ انگریز کے داخلۂ ہند کا عظمت نشان تھا۔ آج وہ عملی طور پر انگریزوں کی ہند سے واپسی کی ایک حسرت یادگار بن چکا ہے۔

یہی اس دنیا کے لیے خدا کا تاریخی قانون ہے۔ اس قانون میں کسی کا استثنار نہیں، خواہ وہ ایک قوم ہو یا کوئی دوسری قوم۔

۲۷ جنوری کو صبح سویرے نیند کھل گئی۔ فجر کی نماز کے بعد کچھ دیر تک ٹہلتا رہا۔ ہوٹل کے پاس بچوں کا ایک اسکول ہے۔ اس سے بندے ماترم کے گانے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ انسان بھی کیسا عجیب ہے جو مخلوق کی حمد گاتا ہے، لیکن خدا کی حمد گانے کی تڑپ اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔

چائے پینے کے بعد باتھ روم گیا۔ میرا معمول ہے کہ صبح کو فراغت کے بعد وضو کرتا ہوں اور پرسکون کے عالم میں دو رکعت نماز ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں۔ آج صبح ۸ بجے ہوٹل کے کمرہ میں حسب معمول نیت باندھ کر کھڑا ہوا تو قرآن کا ایک حصہ پڑھتے ہوئے اچانک آواز بلند ہوگئی۔ میں تقریباً گونج دار آواز میں قرآن کی تلاوت کرتا رہا۔ یہ ایک قسم کا غیر شعوری عمل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کے مشرکانہ شور وغل کو سن کر میرا جذبۂ توحید جاگ اٹھا اور بے ساختہ طور پر میں کتاب توحید کو اعلان کے انداز میں اپنی زبان سے دہرانے لگا۔

۲۸ جنوری کی صبح کو ۸ بجے ایک پروگرام تھا۔ یہ نیشنل ویمنز پالی ٹکنک (قائم شدہ ۱۹۸۰) میں تھا۔ یہاں لڑکیوں کی تعداد تقریباً ۷۰۰ ہے۔ خواتین ٹیچر کی تعداد ۲۵ ہے۔ یہ مسٹر جی ایم صدیقی کی محنتوں سے قائم ہوا ہے۔ یہاں ہوم سائنس کے مختلف موضوعات پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں سلائی سے لے کر کمپیوٹر تک تمام ضروری فنون شامل ہیں۔

اس کا معیار نہایت اعلیٰ ہے۔ چنانچہ یہاں کے ایک ایجوکیشن افسر نے ایک بار مسٹر جی ایم صدیقی کو بلایا۔ اس نے کہا کہ ہم اکثر اسکول کے ذمہ داروں کو شکایت کے لیے بلاتے ہیں۔ مگر آپ کو ہم نے اس لیے بلایا ہے کہ ہم آپ کے کام کا اعتراف اور قدر دانی کریں۔

یہ بچیاں زیادہ تر کم آمدنی والے خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ نسیم علی خان صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ آمدنی کا کوئی تعلق تعلیم سے نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک

سبق آموز واقعہ سنایا۔ نومبر ۱۹۹۳ میں لاتور کے علاقہ میں سخت زلزلہ آیا جس میں بستیاں تباہ ہو گئیں۔ اس میں جو لوگ بری طرح متاثر ہوئے ان میں سے ایک ۱۲ سالہ لڑکا سنجے تھا۔ اس کا گھر تباہ ہو گیا۔ اس کے باپ نے بستی سے باہر جنگل میں ایک معمولی ٹینٹ میں اس کو رکھ دیا۔ سنجے کے حالات آخری حد تک خراب ہو گئے تھے۔ مگر یہی لڑکا ہے جس نے اُس سال ہائی اسکول کے امتحان میں پورے مہاراشٹر میں ٹاپ کیا۔

سنجے نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ جنگل کے ٹینٹ میں جانا میرے لیے ایک ایڈوانٹج بن گیا۔ وہاں کوئی دوست یا رشتہ دار ملنے والا نہیں تھا، نہ ٹی وی جیسی کوئی اور چیز۔ اس طرح سارا وقت پڑھنے کے لیے مل گیا۔ نسیم صاحب نے جگہ کا نام بتائے بغیر یہ قصہ سنایا۔ پھر طالبات سے پوچھا کہ بتائیے یہ بچہ کہاں کا تھا۔ ایک لڑکی زینت نے اٹھ کر کہا کہ لاتور کا۔ جناب اقبال صاحب نے فوراً پچاس روپیہ اپنی جیب سے نکالا اور اس لڑکی کو بطور انعام دیا۔

میں نے اپنی تقریر میں تعلیم کی اہمیت بتائی۔ میں نے کہا کہ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ گویا خدا کا ایک پودا ہے۔ اس کو بڑھ کر پورا درخت بننا ہے۔ پودے کو درخت بنانے کا یہ عمل تعلیم کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ تعلیم کا یہ کام بے حد نازک بھی ہے اور بے حد اہم بھی۔ ضرورت ہے کہ اس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا جائے۔

تقریب کے بعد ہم لوگوں کو مدرسہ کی کلاسیں دکھائی گئیں۔ ایک بعد ایک تمام کلاس دیکھیں۔ اس دوران ہم لوگ جب کسی کمرہ میں داخل ہوتے تو وہاں کی طالبات کھڑی ہو جاتیں اور بلند آواز سے کہتیں السلام علیکم۔

مگر ایک کمرہ میں ایسا نہیں ہوا۔ ہم لوگ حسب معمول اس کے اندر داخل ہوئے۔ لیکن تمام لڑکیاں اپنی اپنی میز پر جھکی ہوئی لکھنے میں مشغول رہیں۔ کسی ایک نے بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ اٹھ کر ہم کو سلام کرے یا ہماری طرف دیکھے۔

میں نے جاننا چاہا کہ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کمرہ میں جو لڑکیاں تھیں وہ دراصل ٹیسٹ دے رہی تھیں۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ ہمارے پاس صرف ڈیڑھ گھنٹہ کا وقت ہے، وہ ایک منٹ کھوئے بغیر اپنے اس وقت کو استعمال کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہی وہ

انسان کا معاملہ ہے۔ مگر انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ وہ ایک عمرانی ٹیسٹ دے رہا ہے، اور صرف محدود مدت کے لیے اس کو حاصل ہے تو وہ مذکورہ لڑکیوں سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو جائے گا۔

آفتاب احمد صاحب بامرہ میں کلثوم کتاب گھر چلاتے ہیں۔ یہ کتاب گھر عملاً الرسالہ اور الرسالہ کی مطبوعات کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ایک بار کچھ مخالفین نے انہیں دھمکی دی کہ تم الرسالہ اور الرسالہ کی مطبوعات کا کام بند کرو، ورنہ ہم کتاب گھر میں آگ لگا دیں گے۔ آفتاب احمد صاحب نے کہا کہ بہت اچھا۔ آپ آئیے، میں اپنی طرف سے آپ کو پانچ لیٹر تیل فری دوں گا۔ انھوں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ اس لیے کہ اس سے تو ہماری پبلسٹی ہوگی۔ ہمارا کام اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ وہ شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

۲۸ جنوری کی شام کو حسب ذیل افراد ملاقات کے لیے ہوٹل میں آئے :

مسٹر پی این جوگ، مسٹر دلیپ کورم بیلکر، مدھو دیولیکر، گوپال بلی رام۔ یہ سب کٹر ہندو حلقہ سے تعلق رکھتے تھے اور صحافی تھے، دیر تک باتیں ہوئیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آج کا مسلم نوجوان کس طرح سوچتا ہے۔

نسیم علی خاں صاحب نے کہا کہ آج کے مسلم نوجوانوں کی سوچ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں جب بہت سے مسلمان پاکستان چلے گئے تو ہم نے ہندستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے اس ملک کے لیے قربانی دی۔ مگر ہندو لوگوں کی طرف سے ہمیں کوئی قدر دانی نہیں ملی۔

ایک ہندو نے کہا کہ آپ کی سوچ یہ ہے کہ آپ نے ہندستان میں رہنے کا فیصلہ کرکے قربانی دی ہے۔ دوسری طرف ہندو نوجوان کی سوچ یہ ہے کہ دیش کے بٹوارہ کے وقت مسلمانوں نے کہا تھا کہ ہنس کے لیا ہے پاکستان، لڑ کر لیں گے ہندستان۔ اسی لیے آپ لوگ یہاں ٹھہر گئے تاکہ لڑ کر ہندستان کو لے سکیں۔ میں نے سوچا کہ دونوں طرف کس طرح دو مختلف سوچ الگ الگ چل رہی ہے۔ اس کا علاج چیخ پکار نہیں ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ میل ملاپ ہے۔ اس غلط فہمی کو میل ملاپ ہی کے ذریعہ ختم کیا جا سکتا ہے۔

مسٹر جوگ (پیدائش ۱۹۲۲) ہندوؤں کے انتہائی کٹر طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ آر ایس ایس کے سرگرم ممبر ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک کتاب یہ ہے :

B.N. Jog, Threat of Islam; Indian Dimensions Unnati Prakashan, Bombay 1994

۵۰۰ صفحہ کی یہ کتاب پوری کی پوری اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندستان میں آکر زبردستی یہاں کے ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ اب اس کا حل یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو دوبارہ ان کے سابق مذہب کی طرف واپس کر دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ عمل میں فرق یہ ہوگا کہ ابتدائی تبدیلیٔ مذہب (کنورژن) جبر کے ذریعہ ہوا، اب دوبارہ تبدیلیٔ مذہب (reconversion) ان کے آزاد ارادہ کے تحت ہوگا (صفحہ ۴۸۲)

کتاب کی رسید بھیجتے ہوئے میں نے مسٹر جوگ کو لکھا تھا کہ میں فلاں تاریخ کو بمبئی آرہا ہوں اور فلاں جگہ میرا قیام ہوگا۔ اس کے مطابق وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ملنے کے لیے آئے۔ میں نے ان سے بالکل معتدل انداز میں گفتگو کی۔ کسی قسم کی بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب پڑھ لی ہے۔ اس کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان کے مسلم حکمرانوں نے ہمیشہ ہندو کے اوپر ظلم کیا اور انھیں زبردستی مسلمان بنایا۔ یہی تمام مسائل کی اصل جڑ ہے، اور اب اس کا حل صرف ری کنورژن ہے، یعنی ان مسلمانوں کو دوبارہ ان کے قدیم مذہب کی طرف واپس لوٹانا۔

مگر کتاب میں یہ بات دعویٰ کی زبان میں کہی گئی ہے۔ اس کے حق میں کوئی تاریخی دلیل نہیں دی گئی ہے۔ جب کہ تمام بڑے مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ جبری تبدیلیٔ مذہب کی بات تاریخ سے ثابت نہیں ہوتی۔ مثلاً انگریز مورخ ڈاکٹر ٹائٹس (Titus) نے لکھا ہے کہ ہندستان میں اسلام کا داخلہ ایک پُرامن داخلہ (Peaceful Penetration) تھا۔ یہی بات خود سوامی ویویکانند نے لکھی ہے۔ حتی کہ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ کہنا ایک لغویات (nonsense) ہے کہ ہندستان میں جبری کنورژن ہوا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اگر ہندستان کی تعمیر و ترقی کی پہلی شرط یہ ہے کہ پندرہ کروڑ مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنایا جائے تو پھر یہ ترقی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ جن ہندوؤں نے آپ کے بقول، جبر کے تحت اپنا مذہب بدلا تھا وہ سیکڑوں سال پہلے تھے۔ موجودہ مسلمان تو ان کی بہت

معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن نفسیات اور تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جب کوئی گروہ اپنا مذہب بدلتا ہے تو چند نسلوں کے بعد وہ ان کا فخر بن جاتا ہے۔ موجودہ مسلم نسلوں کے لیے اسلام ان کا فخر ہے۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی گروہ اپنے فخر کو کبھی نہیں چھوڑتا۔

پچھلے پچاس برس میں اس نظریہ کے ماننے والوں نے مسلمانوں کے خلاف تشدد کی حد تک جا کر زبردست تحریک چلا رکھی ہے، مگر وہ کسی بھی مسلمان کو "ری کنورٹ" کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ مسلمان توحید کو اپنا فخر بنا چکے ہیں اور اب وہ ری کنورژن کو توحید سے شرک کی طرف واپسی سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کو ان کا فخر چھوڑنے پر راضی کیا جا سکے۔ پھر وہ کون سی تدبیر ہے جس کے ذریعہ اس ناممکن کو ممکن بنایا جا سکے گا۔

مسٹر جوگ نے میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ ان کے چہرہ سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے موقف کی کمزوری پر وہ شرمندہ ہو رہے ہیں۔

جناب ہارون شیخ صاحب نے بتایا کہ ضیاء الدین خلیفہ (۸۰ سال) انجمن ہائی اسکول میں پرنسپل تھے۔ ان کا ایک تجربہ بہت سبق آموز ہے۔ ان کا طریقہ تھا کہ وہ کلاس کا معائنہ کرتے اور لڑکوں کا جائزہ لیتے۔ جس طالب علم کو دیکھتے کہ وہ سب سے زیادہ شریر ہے، اسی کو کلاس کا مانیٹر بنا دیتے۔ اور وہ لڑکا بہترین مانیٹر ثابت ہوتا تھا۔

میں نے کہا کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ شریر آدمی سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور جو آدمی میٹھی باتیں کرے اس کو اچھا سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ شریر آدمی کا مطلب یہ ہے کہ وہ غیر منافق ہے۔ اور غیر منافق آدمی ہی ہمیشہ کام کا ہوتا ہے۔ منافق آدمی سے آپ کسی بھی کام کی امید نہیں کر سکتے۔

جناب نسیم علی خاں صاحب نے ضیاء الدین خلیفہ صاحب کا ایک اور تجربہ بتایا۔ انھوں نے انجمن اسلام کے تحت انگلش میڈیم کا ایک اسکول کھولا اور اردو کو اس میں سکنڈ لینگویج بنا دیا۔ انجمن اسلام کے تحت جو خالص اردو میڈیم اسکول چل رہے ہیں ان کے معیار کے بارہ میں عام طور پر لوگوں کو شکایت ہے۔ اس کے برعکس انگلش میڈیم اسکول (اردو سکنڈ لینگویج کے ساتھ) کا معیار نہایت اعلیٰ ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ نسیم علی خاں صاحب نے کہا کہ اردو میڈیم والوں کے سامنے دوسرے اردو میڈیم اسکول ہوتے تھے۔ اس بنا پر ان میں مقابلہ کا جذبہ

پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب کہ انگلش میڈیم والوں کے سامنے مقابلہ کے لیے انگلش اسکول ہوتے ہیں جو نہایت اعلیٰ معیار پر چلائے جا رہے ہیں۔ اس بنا پر انگلش میڈیم کا معیار اپنے آپ زیادہ اعلیٰ ہو جاتا ہے۔

میرے کمرہ میں ٹائمس آف انڈیا کا بمبئی ایڈیشن (۲۶ جنوری) موجود تھا۔ اس کے پہلے صفحہ پر ایک نمایاں چار کالمی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ گاندھی سمادھی کی تقریب سے فراغت کے بعد مسٹر نیلسن منڈیلا ایک کرسی پر تعجب آمیز مسرت کے انداز میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور مرکزی وزیر مسٹر جگدیش ٹائٹلر ان کے قدموں کے پاس زمین پر بیٹھ کر ان کو جوتا پہنا رہے ہیں۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا :

South African President Nelson Mandela being helped by Union surface transport minister Jagdish Tytler to tie his shoes after laying a wreath at Gandhi samadhi in New Delhi on Wednesday. Rochell Mitirara, grand-daughter of Mr. Nelson Mandela, looks on.

یہ نیلسن منڈیلا کی قربانیوں کی قیمت ہے۔ وہ ۱۹۱۸ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ساؤتھ افریقہ کی سیاہ فام اکثریت کی آزادی کی جدوجہد شروع کی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ جیلوں میں گزرا۔ یہاں تک کہ لمبی پُرمشقت جدوجہد کے بعد ۱۹۹۳ میں وہ ساؤتھ افریقہ کے پہلے بلیک پریسیڈنٹ بنائے گئے۔ یہ ایک شخص کی قربانیوں کی وہ قیمت ہے جو دنیا میں اسے ملی۔ اسی طرح کچھ اللہ کے بندے آخرت کے لیے قربانیاں دیں گے۔ اور پھر شاندار تر انداز میں وہ وہاں اس کی ابدی قیمت پائیں گے۔

بھارتیہ ودیا بھون کا جلسہ ۲۹ ـ ۳۰ جنوری ۱۹۹۵ کو تھا۔ وہ بھون کی وسیع عمارت کے ہال میں ہوا۔ بمبئی کے حلقۂ الرسالہ کی طرف سے اس موقع پر الرسالہ کا اور کتابوں کا اسٹال لگایا گیا۔ بہت سے لوگوں نے کتابیں دیکھیں اور اپنے لیے حاصل کیں۔

دو روزہ اجلاس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں، اور موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔ میری تقریر ۳۰ جنوری کو تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انسانی سماج وہی ہے جو اقدار (respect) پر مبنی ہو۔ جس سماج میں اقدار مٹ جائیں وہ حیوانی

جنگل ہے ۔ یہ ایسے ہیں جس کو انسانی سماج نہیں کہا جا سکتا۔

پھر میں نے کہا کہ ہمارے ملک میں جتنی بھی بڑی تحریکیں اٹھیں وہ سب روایت شکنی کی بنیاد پر اٹھیں۔ اور روایت شکن تحریکیں اٹھانا ہی اقدار کو توڑنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں اٹھنے والی تحریکیں ہی اگر سب کچھ ہوتیں تو اب تک ہمارے ملک میں اقدار کا یکسر خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ مگر خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ اقدار کا احترام خود انسانی فطرت کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یہی انسانی فطرت ہے جس کی بنا پر آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں اقدار کا تصور ہمارے سماج میں باقی ہے۔

میں نے کہا کہ ہماری تعلیم گاہیں، ہمارا میڈیا، ہماری مجلسیں، غرض ہماری تمام فکری سرگرمیوں کو اقدار رخی ہونا چاہیے۔ یہی کسی سماج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ سماج کے اندر اگر اقدار کا تصور زندہ ہو تو بقیہ مطلوب چیزیں اپنے آپ زندہ ہو جائیں گی۔ اور اگر اقدار مٹ جائیں تو بقیہ مطلوب چیزیں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

میں نے کہا کہ سو سال پہلے سوامی ویویکانند امریکہ گئے۔ ایک روز وہ وہاں شہر کی ایک سڑک پر چل رہے تھے۔ اس دوران ایک امریکی مرد اور عورت قریب سے گزرے۔ سوامی جی حسب معمول سادہ قسم کے گیروے لباس میں تھے۔ ان کو یہ لباس کچھ غیر مہذب دکھائی دیا۔ عورت نے اپنے مرد ساتھی سے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ یہ شخص کوئی جنٹل مین دکھائی نہیں دیتا۔ سوامی ویویکانند نے اس کی یہ بات سن لی۔ سوامی جی آہستہ چل کر ان کے قریب گئے اور کہا کہ خاتون محترم، مجھے معاف کیجئے۔ آپ کے دیس میں درزی کسی آدمی کو جنٹل مین بناتا ہے۔ مگر میں جس دیس سے آیا ہوں، وہاں کیرکٹر کسی آدمی کو جنٹل مین بناتا ہے :

Excuse me Madam. In your country tailor makes a man gentleman, but in the country from which I come character makes a man gentleman.

سو سال پہلے ایک ہندستانی امریکہ میں جا کر یہ بات کہہ سکتا تھا۔ مگر آج کوئی ہندستانی باہر کے ویس میں اس قسم کی بات کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ امریکہ کے ایک سفر میں میں نے ایک امریکی پروفیسر سے سوامی ویویکانند کا یہ واقعہ بیان کیا۔ اس نے جواب دیا کہ سو سال پہلے تمہارا

لیا ایپیاری ہوا۔ یہ سکس آج کے انڈیا کے لیے کہی گئی بات ایک اچھوت اعلم ہے…
تر پیش کی جا چکی ہیں۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے جتنے بھی رہنما ہیں، مثلاً سید جمال الدین افغانی،
مہ اقبال، ابوالکلام آزاد، سید قطب، سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید ابوالحسن علی ندوی، ان میں سے
رایک نے امت کے احیاء کا راز یہ بتایا کہ امت کے اندر امامت اور قیادت کا شعور جگایا جائے۔
گر یہ الٹی خوراک تھی۔ کوئی بھی نظام، خواہ وہ سیکولر ہو یا دینی، ایسے لوگوں کے درمیان نہیں
ل سکتا جہاں ہر شخص قائدانہ حوصلہ اپنے سینہ میں لیے ہوئے ہو۔ ایک لاکھ آدمی ہوں تو ۹۹۹۹۹
دمی کو مقتدی بننا پڑتا ہے تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک شخص آگے کھڑے ہو کر ان کی امامت
رے۔ یہ سبق جو ہر روز نماز میں دیا جاتا ہے یہی کامیاب نظام کا راز بھی ہے۔ جس سماج کے لوگ
اتحتی قبول کرنے پر راضی ہوں انھیں کے یہاں کوئی صحیح نظام اقتدار قائم ہوتا ہے۔ اس کے
برعکس جہاں ہر آدمی حاکم بننا چاہتا ہو وہاں وہی خلفشار وجود میں آتا ہے جو آج ہمارے ہر ادارہ
میں چھوٹی سطح پر اور افغانستان اور پاکستان جیسے ملکوں میں زیادہ بڑی سطح پر دکھائی
دے رہا ہے۔

موجودہ زمانہ کی تحریکوں نے پوری ملت کو قیادت پسند ملت بنا دیا ہے۔ یہی تمام
باہمی جھگڑوں کی جڑ ہے۔ اگر نماز با جماعت والی اسپرٹ لوگوں کے اندر جگائی جاتی تو تمام لوگ
اقتدار پسند ہوتے اور پھر اپنے آپ وہ چیز وجود میں آجاتی جس کو متحدہ طاقت کہا جاتا ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے حادثہ کے فوراً بعد میں بمبئی گیا تھا جب کہ وہاں فساد ہو گیا تھا اور ابھی کرفیو نافذ
تھا۔ اس موقع پر پولیس کی خصوصی اجازت سے مدھو ہیتا (وفات ۲۷ اگست ۱۹۹۵) وغیرہ نے ایک
جلسہ کرایا، اس موقع پر اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے میں نے کہا تھا:

"بمبئی کے بھائیو اور بہنو، ہم ایک ایسے وقت میں آپ کے پاس آئے ہیں جب کہ
آپ ایک بڑے صدمہ سے دوچار ہوئے ہیں۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے پاس
دعاؤں اور آنسوؤں کے سوا کوئی اور چیز دینے کے لیے نہیں۔ اس جنونی دور میں آپ کا جو نقصان
ہوا اس کو میں آپ کی طرف لوٹا نہیں سکتا۔ مگر میرے پاس زندگی کا ایک پیغام ہے اور زندگی کا

پیغام بااصول موت کی بجھ سے زیادہ بڑا ہے۔ میرے پاس مادی طاقت نہیں مگر میرے اس اخلاقی طاقت ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس دنیا میں ہمیشہ پرابلم کے ساتھ سولیوشن موجود ہوتا ہے۔ اجودھیا کے واقعہ میں بھی مائنس پوائنٹ کے ساتھ پلس پوائنٹ موجود ہے۔

زیادہ بڑی بات یہ نہیں کہ آگ جلاتی ہے، اس سے زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ یہاں پانی ہے جس سے ہم آگ کو بجھا سکتے ہیں۔ زیادہ بڑی بات یہ نہیں کہ جسم کو زخم لگتا ہے، زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ جسمانی نظام میں ہیلنگ پراسس ہے جو زخم کا اندمال کرتا ہے۔ زیادہ بڑی بات یہ نہیں کہ درخت کے پتے جھڑتے ہیں، زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ دوبارہ ہری پتیاں نکل آتی ہیں۔

موجودہ سفر میں اندازہ ہوا کہ میرا مذکورہ اندازہ اب بمبئی میں ایک واقعہ بن چکا ہے۔ ۶ دسمبر کا حادثہ یہاں کے مسلمانوں کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوا۔ آج وہ ہر لحاظ سے پہلے سے زیادہ بہتر ہیں۔

یکم فروری ۱۹۹۵ کی صبح کو بمبئی سے دہلی کے لیے واپسی ہوئی۔ یہ سفر انڈین ایر لائنز کے ذریعہ طے ہوا۔ راستہ میں کچھ اخبارات دیکھے۔ ایک اخبار میں ایک پرائیویٹ ایر لائنز کا اشتہار تھا۔ اس میں ایر لائنز کے بارے میں مختلف تفصیلات دی گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ "آج ہم بھارت کے مختلف حصوں سے روزانہ ۲۵ مقامات سے ۲۰ کمرشیل پروازیں کرتے ہیں۔" اس میں مزید بتایا گیا تھا کہ :

"ہر قسم کی خرابی سے مبرا دس طیاروں کا شاندار بیڑا جس کی بہترین نگہداشت کے لیے ہی ایک کروڑ امریکی ڈالر کے فاضل پرزے اسٹاک کیے گئے ہیں۔"

یہ زندگی کا ایک قانون ہے جس کا تعلق صرف ہوائی جہاز سے نہیں ہے بلکہ تمام معاملات سے ہے۔ جو لوگ پیشگی تحفظ کی اس تدبیر کو اختیار کر سکیں وہی اس دنیا میں کامیابی کے ساتھ منزل پر پہنچتے ہیں۔ اسی کو شاعر نے ان لفظوں میں بیان کیا :

سفینہ بنا رکھیں طوفان سے پہلے

اکنامک ٹائمس میں ساؤتھ افریقہ کے بارے میں تفصیلی معلومات تھیں، جن کے صدر مسٹر نیلسن منڈیلا آج کل نئی دہلی آئے ہوئے ہیں۔ ۲۵ جنوری کی شام کو راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے ہال میں ان کی تقریر تھی۔ اس میں میں بھی خصوصی دعوت کے تحت شریک تھا۔

مذکورہ اخبار کے صفحہ ۱۲ پر ایک تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ ساؤتھ افریقہ کی وزارت خارجہ کے مسلمان ڈپٹی منسٹر مسٹر عزیز (Aziz Pahad) فیڈریشن آف انڈین چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے پریسیڈنٹ مسٹر اے کے رنگٹا سے دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون کے مسئلہ پر مصروف گفتگو ہیں۔

میں نے سوچا کہ یہی مسلمانوں کے لیے صحیح طریقہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ عقیدہ اور مذہب کے معاملہ میں وہ اپنے علاحدہ تشخص کو پوری طرح برقرار رکھیں۔ اور اسی کے ساتھ ملکی مسائل میں وہ یکساں طور پر برادران وطن کے ساتھ شریک ہوں۔ وہ بیک وقت پورے معنی میں مسلمان بھی ہوں اور پورے معنی میں ہندستانی بھی۔

فرانکفرٹ یونیورسٹی (جرمنی) کے ایک اسکالر جرجین اشٹین (Jürgen Stein) ہندستان کے کاسٹ سسٹم پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس کے تحت وہ مسلم سماج کا بھی مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۹ نومبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ان کو جو باتیں بتائی گئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ فرق نیچر کا ایک قانون ہے۔ فرق سے مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ مسابقت ترقی کا سبب بنتی ہے۔ اس سلسلہ میں انھیں قرآن کی بعض آیتیں بتائی گئیں جس کو انھوں نے بہت پسند کیا۔ مثلاً الزخرف ۳۲، آل عمران ۱۴۰۔

کناڈا کے ایک ریسرچ اسکالر پراوڈفٹ (D S. Proudfoot) ہندستان میں فرقہ وارانہ تعلقات پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ مسلم نقطۂ نظر سے ان کو ضروری معلومات دی گئیں۔ یہ انٹرویو انھوں نے ۱۸ نومبر ۱۹۹۶ کو لیا۔

نئی دہلی (انڈیا انٹرنیشنل سنٹر) میں ۲۳ نومبر ۱۹۹۶ کو گلوبل ایتھکس پر ایک بین اقوامی کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اخلاقیات کے موضوع پر اسلام کی روشنی میں ایک تقریر کی۔ اس کانفرنس کی تمام کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔

۲۱-۲۲ نومبر ۱۹۹۶ کو پونہ میں ایک بین اقوامی اجتماع ہوا۔ جس کا عنوان تھا: ورلڈ کنونشن آن ریورنس فار آل لائف۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور احترام انسانیت کے موضوع پر اسلام کی روشنی میں ایک تقریر کی۔ اس اجتماع کی تمام کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔

اکھل بھارتیہ رچناتمک سماج کے تحت ۵ دسمبر ۱۹۹۶ کو متھرا ریفائنری (متھرا) میں سرودھرم سمیلن ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع کے اعتبار سے اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ اس سمیلن میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔

سوادھیائے موومنٹ کے ایک پروگرام کے تحت ۲۸-۲۹ نومبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز نے ناندیڑ اور حیدرآباد کا سفر کیا۔ اس دوران ملاقات اور تقریر کی صورت میں اسلام کے مثبت تعارف کی کوشش کی گئی۔ لوگوں نے نہایت دل چسپی کے ساتھ سنا اور کہا کہ ہماری

بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں۔

صدر سو پبلک اسکول (نئی دہلی) میں ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ جس میں اسکول کے طلبہ اور اساتذہ شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اسلام کی مثبت تعلیمات کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۸۔ نوئیڈا کے کمیونٹی سنٹر میں ۱۴ دسمبر ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلم اور غیر مسلم شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور انسانی احترام کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ صبر کب تک۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ صبر مرتے دم تک۔ صبر ایک عبادت ہے جس طرح نماز ساری عمر پڑھی جاتی ہے اسی طرح صبر بھی ساری عمر کرنا ہے۔ کیونکہ جس طرح نماز ایک عبادت ہے اسی طرح صبر بھی ایک عبادت ہے۔ قرآن میں دونوں کا حکم ایک ساتھ دیا گیا ہے۔

۹۔ صدر اسلامی مرکز نے کلکتہ، مرشد آباد، برہم پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں ملاقاتوں اور خطابات کا پروگرام رہا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ یہ دورہ ۲۰ دسمبر ۱۹۹۷ کو شروع ہوا اور ۲۴ دسمبر کو واپسی ہوئی۔

۱۰۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ریکارڈ کی۔ اس کا موضوع یہ تھا —— انفرادی اور اجتماعی زندگی پر رمضان کے اثرات۔ احادیث کی روشنی پر ۱۲ منٹ اظہار خیال کیا گیا۔

۱۱۔ بہار پردیش مسلم کانفرنس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بوکارو کا سفر کیا۔ ۲۷-۲۹ دسمبر ۱۹۹۷ کو وہاں ملاقات اور خطابات کے مختلف پروگرام ہوئے۔ دو تقریروں کا موضوع یہ تھا: اسلام کا پیغام انسانیت کے نام، مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل۔

۱۲۔ بتاریخ ۲۹ - ۳۰ نومبر اور یکم دسمبر ۱۹۹۷ کو بمبئی میں تبلیغی جماعت کا عالمی اجتماع منعقد کیا گیا۔ جس میں الرسالہ فورم بمبئی کی جانب سے بک اسٹال لگایا گیا۔ اور لوگوں نے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اور کافی کتابیں خریدیں۔

۱۳۔ بی بی سی (ٹی وی) کی ٹیم نے ۱۶ جنوری ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات

تعلق زیادہ تر اس سوال سے تھا کہ کیا ہندستانی مسلمانوں کو فرقہ پرست ہندو پارٹیوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ جواب میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ خطرہ کی بات بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ انٹرویو انگریزی میں تھا۔

۱۳- جکارتہ میں ۱۸-۱۹-۲۰ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک انٹرنیشنل سیمینار ہوا۔ اس کو یونیسکو کی طرف سے کیا گیا تھا، اور موضوع تھا —— امن عالم۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اس موقع پر اسلام اینڈ نان وائلنس کے عنوان سے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر ۱۹ جنوری کو ہوٹل ایشیا کے ہال میں ہوئی۔ اس اجتماع میں مختلف ملکوں کے لوگ شریک تھے۔

بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں۔

ہمدرد پبلک اسکول (نئی دہلی) میں ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ جس میں اسکول کے طلبہ اور اساتذہ شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اسلام کی مثبت تعلیمات کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۸۔ نوئیڈا کے کمیونٹی سنٹر میں ۱۴ دسمبر ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلم اور غیر مسلم شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور انسانی احترام کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ صبر کب تک۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ صبر مرتے دم تک۔ صبر ایک عبادت ہے۔ جس طرح نماز ساری عمر پڑھی جاتی ہے اسی طرح صبر بھی ساری عمر کرنا ہے۔ کیونکہ جس طرح نماز ایک عبادت ہے اسی طرح صبر بھی ایک عبادت ہے۔ قرآن میں دونوں کا حکم ایک ساتھ دیا گیا ہے۔

۹۔ صدر اسلامی مرکز نے کلکتہ، مرشد آباد، برہم پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں ملاقاتوں اور خطابات کا پروگرام رہا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ یہ دورہ ۲۰ دسمبر ۱۹۹۷ کو شروع ہوا اور ۲۴ دسمبر کو واپسی ہوئی۔

۱۰۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ریکارڈ کی۔ اس کا موضوع یہ تھا ——— انفرادی اور اجتماعی زندگی پر رمضان کے اثرات۔ احادیث کی روشنی پر ۱۲ منٹ اظہار خیال کیا گیا۔

۱۱۔ بہار پردیش مسلم کانفرنس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بوکارو کا سفر کیا۔ ۲۷-۲۹ دسمبر ۱۹۹۷ کو وہاں ملاقات اور خطابات کے مختلف پروگرام ہوئے۔ دو تقریروں کا موضوع یہ تھا: اسلام کا پیغام انسانیت کے نام، مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل۔

۱۲۔ بتاریخ ۲۹ - ۳۰ نومبر اور یکم دسمبر ۱۹۹۷ کو بمبئی میں تبلیغی جماعت کا عالمی اجتماع منعقد کیا گیا۔ جس میں الرسالہ فورم بمبئی کی جانب سے بک اسٹال لگایا گیا۔ اور لوگوں نے غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کیا اور کافی کتابیں خریدیں۔

۱۳۔ بی بی سی (ٹی وی) کی ٹیم نے ۱۶ جنوری ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات

تعلق زیادہ تر اس سوال سے تھا کہ کیا ہندستانی مسلمانوں کو فرقہ پرست ہندو پارٹیوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ جواب میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ خطرہ کی بات بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ انٹرویو انگریزی میں تھا۔

۳۔ کلکتہ میں ۱۸-۱۹-۲۰ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک انٹرنیشنل سیمینار ہوا۔ اس کو یونیسکو کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اور موضوع تھا ـــــ امن عالم۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اس موقع پر اسلام اینڈ نان وائلنس کے عنوان سے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر ۱۹ جنوری کو ہوٹل ایشیا کے ہال میں ہوئی۔ اس اجتماع میں مختلف ملکوں کے لوگ شریک تھے۔

بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئی ہیں۔

۷۔ ... پبلک اسکول (نئی دہلی) میں ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ جس میں اسکول کے طلبہ اور اساتذہ شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اسلام کی مثبت تعلیمات کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۸۔ نوئیڈا کے کمیونٹی سنٹر میں ۱۴ دسمبر ۱۹۹۷ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ مسلم اور غیر مسلم شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور انسانی احترام کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ صبر کب تک۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ صبر مرتے دم تک۔ صبر ایک عبادت ہے جس طرح نماز ساری عمر پڑھی جاتی ہے اسی طرح صبر بھی ساری عمر کرنا ہے۔ کیونکہ جس طرح نماز ایک عبادت ہے اسی طرح صبر بھی ایک عبادت ہے۔ قرآن میں دونوں کا حکم ایک ساتھ دیا گیا ہے۔

۹۔ صدر اسلامی مرکز نے کلکتہ، مرشد آباد، برہم پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں ملاقاتوں اور خطابات کا پروگرام رہا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ یہ دورہ ۲۰ دسمبر ۱۹۹۷ کو شروع ہوا اور ۲۴ دسمبر کو واپسی ہوئی۔

۱۰۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی نے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ریکارڈ کی۔ اس کا موضوع یہ تھا —— انفرادی اور اجتماعی زندگی پر رمضان کے اثرات۔ احادیث کی روشنی میں ۱۲ منٹ اظہار خیال کیا گیا۔

۱۱۔ بہار پردیش مسلم کانفرنس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بوکارو کا سفر کیا۔ ۲۷-۲۹ دسمبر ۱۹۹۷ کو وہاں ملاقات اور خطابات کے مختلف پروگرام ہوئے۔ دو تقریروں کا موضوع یہ تھا: اسلام کا پیغام انسانیت کے نام، مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل۔

۱۲۔ بتاریخ ۲۹ - ۳۰ نومبر اور یکم دسمبر ۱۹۹۷ کو بمبئی میں تبلیغی جماعت کا عالمی اجتماع منعقد کیا گیا۔ جس میں الرسالہ فورم بمبئی کی جانب سے بک اسٹال لگایا گیا۔ اور لوگوں نے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اور کافی کتابیں خریدیں۔

۱۳۔ بی بی سی (ٹی وی) کی ٹیم نے ۱۶ جنوری ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات

متعلق زیادہ تر اس سوال سے تھا کہ کیا ہندستانی مسلمانوں کو فرقہ پرست ہندو پارٹیوں کی
طرف سے خطرہ ہے۔ جواب میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ خطرہ کی بات بالکل بے بنیاد
ہے۔ یہ انٹرویو انگریزی میں تھا۔

۱۴- جموں میں ۱۸-۱۹-۲۰ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک انٹرنیشنل سیمینار ہوا۔ اس کو یونیسکو کی طرف
سے کیا گیا تھا۔ اور موضوع تھا ---- امن عالم۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر
اس میں شرکت کی اور اس موقع پر اسلام اینڈ نان وائلنس کے عنوان سے ایک تقریر
کی۔ یہ تقریر ۱۹ جنوری کو ہوٹل ایشیا کے ہال میں ہوئی۔ اس اجتماع میں مختلف ملکوں
کے لوگ شریک تھے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

الرسالہ

Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near ova Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org.

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of
The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

اپریل ۱۹۹۸، شمارہ ۲۵۵

اسلامی اخلاق

شوہر اور بیوی کے درمیان اگر اختلاف ہو جائے تو اس وقت دونوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا حکم بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ —— طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو قاعدے کے مطابق رکھ لینا ہے۔ یا خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینا (الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ) البقرہ ۲۲۹۔ یہ آیت اپنے ابتدائی مفہوم کے لحاظ سے شوہر اور بیوی کے تعلق کے بارے میں آئی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کا ایک وسیع تر انطباق بھی ہے۔ یہ آیت دراصل اسلام کی ایک اخلاقی اسپرٹ کو بتاتی ہے۔ اس اسپرٹ کا تعلق تمام انسانی تعلقات سے ہے۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی معاملاتی تعلق قائم ہوتا ہے۔ مثلاً مل کر سفر کرنا، مل کر ادارہ چلانا، مل کر تجارت کرنا، وغیرہ۔ اس طرح کے ہر ملاپ میں دو یا زیادہ انسان کبھی محدود مدت کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور کبھی لمبی مدت کے لیے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں مستقل تعلق کے نام پر دو شخصوں کے درمیان ملاپ قائم ہوتا ہے۔ مگر بعد کو ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ ان کا باہمی تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔

ایسے تمام معاملات میں اتحاد کے متعلق طرفین کو جس اسلامی اصول کی پابندی کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ یا تو خوش اسلوبی کے ساتھ تعلق کو باقی رکھیں، یا خوش اسلوبی کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

دو انسان جب کسی مقصد کے لیے باہم متحد ہوں تو شریعت انھیں یہ حکم نہیں دیتی کہ وہ ہر حال میں اپنے اتحاد کو باقی رکھیں۔ لیکن معاملے کے دونوں فریقوں کے لیے شریعت کا یہ لازمی حکم ہے کہ وہ اتحاد اور اختلاف دونوں حالتوں میں اخلاقی معیار کو ترک نہ کریں۔ دونوں میں سے کسی کو یہ حق نہیں کہ تعلق ٹوٹنے کے بعد ایک فریق دوسرے کو بدنام کرنے لگے یا اس کی جڑ اکھاڑنے کے لیے سرگرم ہو جائے۔

صلح بہتر ہے

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ نزاع کی صورت میں دونوں فریق آپس میں صلح کر لیا کریں۔ اور صلح بہتر ہے، اور حرص انسانوں کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے (النساء ۱۲۸)
یہ اصول انسانی زندگی کے تمام معاملات کے لیے ہے، خواہ اس کا تعلق گھر کے معاملہ سے ہو یا باہر کے معاملہ سے۔ خواہ وہ دو آدمیوں کا مسئلہ ہو یا پوری جماعت کا مسئلہ۔ خواہ وہ قومی ہو یا بین اقوامی۔ اجتماعی زندگی کے تمام نزاعی معاملات کا یہی واحد حل ہے۔

صلح کی قابل عمل صورت صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ معاملہ کے دونوں فریق اسٹیٹس کو (حالت موجودہ) پر راضی ہو جائیں۔ اس میں واحد رکاوٹ حرص ہے۔ معاملہ کا ایک یا دوسرا فریق حرص میں پڑ کر اسٹیٹس کو کو توڑنا چاہتا ہے، بر وقت طے ہوئے پر راضی نہ ہو کر وہ مزید کو حاصل کرنا چاہتا ہے جس کے لیے فطری طور پر دوسرا فریق آمادہ نہیں ہوتا۔ بس یہی حرص صلح میں رکاوٹ بن جاتا ہے اور پھر دونوں فریق انتہائی بے فائدہ طور پر لڑائی کو جاری رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے طے ہوئے کو بھی کھو دیتے ہیں۔

صلح کو اکثر لوگ نزاعی معاملہ کی سطح پر جانچتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ایک ثانوی درجہ کی چیز ہے۔ زیادہ اہم اور زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ صلح آدمی کے لیے نئے عمل کا دروازہ کھولتی ہے۔ صلح کے بعد آدمی کو اپنا سفر جاری رکھنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ نزاع کی حالت سفر حیات کو روکتی ہے، اور صلح کا معاملہ زندگی کے رکے ہوئے سفر کو از سر نو جاری کر دیتا ہے۔

صلح کوئی پسپائی نہیں۔ صلح دراصل پریکٹیکل وزڈم (عملی حکمت) کا دوسرا نام ہے۔ صلح حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ صلح کا مطلب جذباتی مواقع پر غیر جذباتی فیصلہ لینا ہے۔ صلح یہ ہے کہ نزاعی معاملات میں آدمی انانیت کا شکار نہ ہو۔ وہ کسی چیز کو اپنے لیے پرسٹیج اشو (ساکھ کا مسئلہ) نہ بنائے۔ وہ ہمیشہ تدبر اور انضباط کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ جذباتیت اور اشتعال کا۔

ٹکراؤ عمل کا دروازہ بند کرنے والا ہے اور صلح عمل کا دروازہ کھولنے والا۔

اعتراف

کوئی آدمی جب ایک شخص کے فضل وکمال کا اعتراف نہ کرے تو اس کی وجہ ہمیشہ اس کا یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کسی اور کا اعتراف کرنے سے اس کا اپنا قد چھوٹا ہو جائے گا۔ مگر وہ بھول جاتا ہے کہ ایسا کر کے وہ اپنے آپ کو زیادہ بڑے اندیشہ میں مبتلا کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے سامنے اس کا قد ہمیشہ کے لیے چھوٹا ہو جائے۔

ایک شخص کو اگر کوئی فضل وکمال حاصل ہے تو وہ اس کی اپنی ایجاد نہیں ہے۔ وہ براہ راست خدا کا عطیہ ہے۔ اس لیے اس کا اعتراف کرنا خدا کا اعتراف کرنا ہے، اور اس کا اعتراف نہ کرنا خدا کا اعتراف نہ کرنا۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ عدم اعتراف کی روش اختیار کرتے ہوئے وہ خدا سے ڈرے۔ وہ اس کو انسان کا معاملہ نہ سمجھتے ہوئے وہ اس کو خدا کا معاملہ سمجھے۔

اس معاملہ کا ایک اور پہلو ہے جو بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے کا اعتراف کرنا سادہ طور پر صرف دوسرے کا اعتراف کرنا نہیں ہے۔ وہ خود اپنی شخصیت کے ارتقاء کا معاملہ ہے۔ آدمی دوسرے شخص کے فضل کا اعتراف کر کے اپنی انسانیت کو بڑھاتا ہے اور دوسرے شخص کا اعتراف نہ کر کے اپنی شخصیت کو انسانی اعتبار سے مجروح کر لیتا ہے۔

اعتراف اور بے اعترافی کا معاملہ مزید آگے بڑھ کر پورے سماج سے جڑا ہوا ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے شخص کا اعتراف کرے تو وہ سماج میں اعلیٰ انسانی قدروں کو فروغ دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ دوسرے کی حیثیت کا اعتراف نہ کرے تو سماج میں ناقدری اور بے اعترافی کی روایات فروغ پائیں گی۔

اعتراف اور بے اعترافی کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ اعتراف کرنے والا پورے سماج میں قدردانی کی اعلیٰ روایت قائم کرتا ہے۔ اس کے برعکس اعتراف نہ کرنے والا پورے سماج کو ناقدری کے راستہ پر ڈال دیتا ہے۔ بے اعترافی اگرچہ ایک شخص کرتا ہے مگر اس کا اثر پورے سماج پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے اعترافی کے معاملے میں آدمی کو آخری حد تک محتاط رہنا چاہیے۔

بڑائی کا جذبہ

انسان کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے۔ اسی لیے قرآن میں شیطان کو طاغوت کہا
گیا ہے۔ قرآن کی آیات میں خدا نے شیطان کو یہ حکم دیا کہ وہ آدم کا سجدہ کرے مگر اس نے سجدہ
کرنے سے انکار کیا۔ اس کے بعد خدا اور شیطان میں جو مکالمہ ہوا اس کو قرآن نے ان الفاظ میں
بیان کیا ہے: خدا نے کہا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا
تھا۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے۔
خدا نے کہا کہ تو اتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں گھمنڈ کرے۔ پس نکل جا یقیناً تو ذلیل
ہے۔ ابلیس نے کہا کہ اس دن تک کے لیے تو مجھے مہلت دے جبکہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے
خدا نے کہا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ابلیس نے کہا کہ چوں کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی لوگوں کے
لیے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان
کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے۔ اور تو ان میں اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے کہا کہ
نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں تم سب سے
جہنم کو بھر دوں گا (اعراف ۱۸-۱۲)

انسان کی اصل کمزوری کیا ہے جس کی وجہ سے اس کے اندر اخلاقی برائیاں پیدا ہو
ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہر آدمی صرف اپنے آپ کو بڑا دیکھنا چاہتا ہے۔ اب چوں کہ انسانوں میں ف
ہے۔ یہاں خود فطرت کے قانون کے مطابق کوئی چھوٹا ہوتا ہے کوئی بڑا اس لیے آدمی جس
اپنے سے بڑا دیکھتا ہے، اس کے خلاف وہ جلن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ جلن آدمی کو منفی نفسیا
میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ اس کے پورے کردار کو منفی کردار بنا دیتی ہے۔

اپنے کو بڑا دیکھنے کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ آدمی کو برابر عمل پر ابھارتا ر
یہ اس جذبہ کا غلط استعمال ہے کہ آدمی حسد اور جلن کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ اور پھر ہر قسم کی اخ
برائیوں کو اپنے لیے جائز کر لے۔ سچا انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ جب وہ کسی کو اپنے سے بڑا دی
یہ واقعہ اس کے لیے عمل کا جذبہ بیدار کرنے کا سبب بن جائے۔

شاکلہ کا مسئلہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ — اور ہم جب انسان کے اوپر انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور اکڑ جاتا ہے۔ اور پیٹھ موڑ لیتا ہے۔ اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ناامید ہو جاتا ہے۔ کہو کہ ہر ایک اپنے شاکلہ پر عمل کر رہا ہے، پس تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے (بنی اسرائیل ۸۳ - ۸۴)

انسان کی سوچ، متاثر سوچ (کنڈیشنڈ تھنکنگ) ہوتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی دولت اور خوش حالی کے ماحول میں ہو تو اس کے اندر بے جا خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے سے باہر کسی شخص کو اہمیت نہیں دیتا۔ اور دوسروں کی بات پر زیادہ دھیان دے پاتا۔ اس کے برعکس جو آدمی مصیبت اور بدحالی کا شکار ہو تو وہ حوصلہ کھو دیتا ہے۔ وہ ہر ایک کے بارے میں بے اعتمادی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دونوں ہی کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتے اور نہ اپنے عمل کی بے لاگ منصوبہ بندی میں کامیاب ہوتے۔ یہی مثال تمام معاملات کے لیے ہے۔

مثلاً حدیبیہ کے وقت اہل مکہ نے سارے معاملہ کو حال کے اعتبار سے دیکھا اور اہل ایمان نے مستقبل کے اعتبار سے۔ اہل مکہ قریبی احوال میں گم تھے۔ اور اہل ایمان قریبی احوال سے اوپر اٹھ کر معاملہ کو دور اندیشی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ حال کے اعتبار سے دیکھنے کی وجہ سے اہل مکہ کو نظر آیا کہ چودہ سو مسلمان اگر مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں تو لوگوں کی نظر میں ان کا وقار ختم ہو جائے گا، اس لیے وہ ان کے مخالف بن گئے۔ اس کے برعکس اہل ایمان نے دیکھا کہ اگر امن کا معاہدہ کر کے وہ لوٹ جائیں تو اس کے نتیجہ میں دعوت کے غیر معمولی مواقع کھل جائیں گے اور حال کی ظاہری شکست مستقبل کی عظیم فتح میں بدل جائے گی۔

دنیا میں آدمی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے محدود دائرہ سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ وہ ذاتی تعصبات کے بجائے عمومی حقائق کی روشنی میں اپنی رائے بنائے۔ وہ شاکلۂ انسانی میں گم کر نہ رہ جائے بلکہ شاکلۂ ربانی کی سطح تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

دہرا پن نہیں

خدا نے کسی انسان کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب ۴) اس کا مطلب ہے کہ خدا کو یہ پسند نہیں کہ آدمی کسی معاملہ میں دہرا انداز اختیار کرے۔ ڈبل اسٹینڈرڈ شخص پر خدا اپنی رحمت نہیں کرتا۔

سچا انسان وہ ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ جو کہے وہی کرے، اور جو اس کو کرنا ہے وہی بولے۔ بولنے کے وقت کچھ کہنا اور کرنے کے وقت کچھ اور کرنا، یہ خدا پرست انسان کا طریقہ نہیں۔

ڈبل اسٹینڈرڈ انسان ہی کا دوسرا نام منافق ہے۔ ایسا انسان اپنی حقیقی شخصیت کو چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ایسی بات بولتا ہے جس کے بارہ میں وہ سنجیدہ نہیں ہوتا۔ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اسٹیج پر ایسی تقریریں کرتا ہے جس کو وہ گھر آتے ہی بھول جاتا ہے۔ ایسا انسان ایک ایکٹر ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں ایک خدا پرست انسان۔

منافق اور مخلص انسان میں یہ فرق ہے کہ منافق انسان کا اندر اور باہر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور مخلص انسان اندر اور باہر دونوں اعتبار سے ایک ہوتا ہے۔ منافق انسان کا مقصد لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اور مخلص انسان کا مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا۔

منافق انسان کے اندر فکری اور عملی تضاد پایا جاتا ہے کیوں کہ وہ حالات کو دیکھ کر اپنے فکر و عمل کو بدلتا رہتا ہے۔ مگر مخلص انسان کے یہاں تضاد نہیں ہوتا۔ کیوں کہ مخلص انسان کی سوچ اور اس کا کردار اٹل خدائی اصولوں کے ماتحت ہوتا ہے اور ان خدائی اصولوں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس دنیا میں مخلص انسان ہی خدا کا مطلوب انسان ہے۔ یہی وہ انسان ہے جو خدا کی ابدی رحمتوں کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

خواہش پرستی نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۳۸ میں حضرت داؤدؑ سے خطاب کرتے ہوئے ایک اصولی بات فرمائی گئی ہے۔ فرمایا: تم خواہش کی پیروی نہ کرو، وہ تم کو خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی (ص ۲۶)

خدا نے انسان کے لیے ایک درست راستہ مقرر کیا اور پھر ہر انسان کی فطرت میں اسی کی تمیز رکھ دی۔ انسان اگر اپنی فطرت کی اس خاموش رہنمائی کو سمجھے اور اس کی پیروی کرے تو وہ کبھی بے راہ نہ ہو، وہ زندگی کی شاہراہ پر سیدھا چلتا رہے یہاں تک کہ وہ آخری منزل پر پہنچ جائے۔

فطرت کی اس شاہراہ سے بھٹکانے والی چیز صرف ایک ہے اور وہ انسان کی خود اپنی خواہش ہے۔ یہ خواہش زندگی کے ہر موڑ پر انسان کو بہکاتی ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اپنے آپ کو خواہش کے اثر میں نہ آنے دے۔ جو آدمی اپنی خواہش سے مغلوب ہو گیا وہ لازماً فطرت کے سیدھے راستہ سے ہٹ جائے گا، اور جو آدمی فطرت کی راہ سے ہٹ جائے اس کے لیے تباہی کے سوا اور کوئی انجام نہیں۔

آدمی کی خواہش اس کو مختلف طریقوں سے بھٹکاتی ہے۔ کبھی اس کو ظاہری رونقوں کے فریب میں الجھا کر گہری حقیقتوں سے دور کر دیتی ہے، کبھی وقتی فائدہ کی خاطر اس کو اس راہ سے ہٹا دیتی ہے جو مستقل فائدہ کی طرف جانے والی ہے۔ کبھی کسی معاملہ کو غیرت و حمیت کا سوال بنا کر آدمی کو مشتعل کر دیتی ہے۔ وہ انجام سے بے پروا ہو کر لڑنا بھڑنا شروع کر دیتا ہے جس کا ایک طرفہ نقصان سب سے زیادہ خود اسی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

آدمی کی خواہش، آدمی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ جو شخص کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خواہش کو اپنے کنٹرول میں رکھے۔ نہ یہ کہ خود خواہش کے کنٹرول میں آ جائے۔ خواہش پرستی کے مقابلہ میں دوسرا طریقہ اصول پسندی کا طریقہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خواہشوں کا شکار نہ بنے بلکہ وہ اعلیٰ انسانی اصولوں کی پیروی کرے۔ اس کا ہر رویہ سوچے سمجھے اصول کے تحت متعین ہوتا ہو نہ کہ محض نفس اور خواہش کی پیروی کے تحت۔

صبر، عجلت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ـــــ پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا، اور ان کے لیے عجلت نہ کرو (الاحقاف ۳۵) اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہے صابرانہ عزیمت، اور دوسری چیز ہے بے صبری اور عجلت۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے، اس کو سمجھنے کے لیے قرآن کی ان آیتوں کا مطالعہ کیجیے جو نبوت کے ابتدائی دور میں مکہ میں اتاری گئیں:

اے کپڑے میں لپٹنے والے، اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ اور اپنے کپڑے کو پاک رکھ۔ اور گندگی کو چھوڑ دے۔ اور ایسا نہ ہو کہ احسان کرو اور زیادہ بدلہ چاہو۔ اور اپنے رب کے لیے صبر کرو (مدثر ۱-۷)

سورہ مدثر کی ان آیات کی روشنی میں مذکورہ فرق کو متعین کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ موجودہ حالات میں صرف انہی چند احکام پر عمل کرو، اور بقیہ تمام معاملات کو صبر کے خانہ میں ڈال دو۔

یعنی انذار و تبشیر کے انداز میں لوگوں کو مسئلۂ آخرت سے آگاہ کرو۔ اللہ کی عظمت و کبریائی تمہارا موضوع کلام بن جائے۔ اچھے اخلاق اور اعلیٰ کردار میں اپنے آپ کو ڈھال لو۔ ہر قسم کی اعتقادی اور عملی برائیوں سے آخری حد تک دور رہو جاؤ۔ لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو، مگر ان سے بدلہ پانے کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے۔

یہ گویا پانچ نکاتی پروگرام تھا جو اس وقت دیا گیا۔ اگرچہ اس وقت مکہ میں اس کے سوا بہت سے مسائل تھے۔ مثلاً کعبہ میں ۳۶۰ بتوں کا ہونا، سماج میں طرح طرح کے جرائم، مکہ کی پارلیمنٹ (دار الندوہ) پر مشرکین کا قبضہ، عرب میں رومی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کا سیاسی نفوذ، وغیرہ۔ مگر ان سب پر صبر کا حکم دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ، اس وقت جن کاموں کے لیے نتیجہ خیز جدوجہد ممکن ہے، ان پر محنت کرو۔ اور جن کاموں میں بروقت نتیجہ خیز عمل ممکن نہیں ہے ان سب کو مستقبل کے حالات پر چھوڑ دو۔

ایک آیت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی صفت بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں (اشداء علی الکفار) الفتح ۲۹

کچھ لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اہل اسلام کا برتاؤ غیر مسلموں سے نرمی کا نہیں بلکہ سختی کا ہونا چاہیے۔ ان کو ہمیشہ غیر مسلموں سے کڑا سلوک کرنا چاہیے۔ یہ بات سر اسر غلط ہے۔ رسول اللہ کے بارہ میں حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا (کان خلقہ القرآن) اگر اس آیت کا مطلب یہ ہو تو آپ کو اپنے معاصر غیر مسلموں سے کڑا برتاؤ کرنا چاہیے تھا۔ حالاں کہ ایسا نہیں۔ حدیث اور سیرت کی کتابیں بتاتی ہیں کہ آپ نے ہمیشہ اپنے زمانہ کے غیر مسلموں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کیا۔ حتی کہ بہت سے واقعات ہیں جب کہ کسی غیر مسلم نے آپ کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا۔ اس وقت بھی آپ اس کے لیے نرمی کا پیکر بنے رہے۔

شدید کے لفظی معنی سخت کے ہیں۔ ھُوَ شدیدٌ علیَّ کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فلاں شخص کو اپنے اثر میں لانا مجھ پر سخت دشوار ہے۔ گویا اس سے مراد کڑا یا کرخت ہونا نہیں ہے بلکہ غیر اثر پذیر ہونا ہے۔ الحماسہ میں ایک شاعر کہتا ہے کہ جوانی کی عمر میں آدمی اگر مردانگی سے عاجز رہ جائے تو ادھیڑ عمر میں اس کو حاصل کرنا اس پر سخت دشوار ہوگا:

اذا المرءُ أعيته المروءة ناشئاً فمطلبُها کهلاً علیه شدیدُ

مذکورہ قرآنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ وہ غیر مسلموں کا اثر قبول نہیں کرتے۔ وہ مکمل طور پر با اصول زندگی گزارتے ہیں۔ وہ غیر مسلم قوم یا غیر مسلم تہذیب کے درمیان رہ کر بھی ان کا اثر نہیں لیتے۔ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مومن کا برتاؤ نرم کے بجائے سخت ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے درمیان اثر پذیر بن کر رہنے کے بجائے غیر اثر پذیر بن کر رہتا ہے۔ غیر مسلموں کا اثر لینے کے معاملہ میں وہ پتھر کی طرح سخت ثابت ہوتا ہے۔ اس آیت کا تعلق اصلاً برتاؤ سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ہمیشہ با اصول انداز میں زندگی گزاری جائے۔

صبر کی اہمیت

پروگرام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کی حیثیت مثبت پروگرام کی ہو۔ اور دوسرا وہ جو اتفاقی ضرورت کے تحت اختیار کی جائے۔ مثلاً صحت بخش غذا ہمارے جسم کی مستقل ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ کبھی جسم کو دوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر دوا کی حیثیت صرف وقتی مطلوب کی ہے۔ غذا ہمارے جسم کی مستقل ضرورت ہے اور دوا ہمارے جسم کی صرف اتفاقی ضرورت۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین میں صبر کی حیثیت مثبت تعلیم کی ہے۔ صبر ہماری مستقل دینی ضرورت ہے۔ اس کے مقابلہ میں جنگ کی حیثیت صرف وقتی ضرورت کی ہے۔ صبر ایک عظیم نیکی ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں مطلوب ہے۔ جب کہ جنگ صرف اس وقت مطلوب ہوتی ہے جبکہ انتہائی ناگزیر حالات میں بطور دفاع اس کی ضرورت پیش آگئی ہو۔

صبر وہ اہم ترین اصول ہے جو موجودہ امتحان کی دنیا میں ہر وقت اور ہر شخص کو درکار ہے۔ صبر کے بغیر کوئی شخص اس امتحان کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر نہیں سکتا۔

اس دنیا میں آدمی کو اپنے نفس کے مقابلہ میں صبر کرنا ہے۔ شیطان کی ترغیبات کے مقابلہ میں صبر کرنا ہے۔ دوسرے انسانوں کی طرف سے پیش آنے والی ناخوشگواریوں پر صبر کرنا ہے۔

صبر کی ضرورت ہر لمحہ اور ہر موقع کے لیے ہے۔ نقصان کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے کو مایوسی سے بچائیں۔ فائدہ کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے اندر اٹھنے والے برتری کے احساس کو کچل کر ختم کر دیں۔ بیماری کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ آہ وفغاں نہ کریں۔ صحت کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے اندر فخر و ناز کے جذبات کو نہ اٹھنے دیں۔ اشتعال انگیزی کے موقع پر صبر یہ ہے کہ آپ اپنے کو مشتعل ہونے سے بچائیں۔ اور جب کوئی شخص آپ کی تعریف کرے تو اس وقت صبر یہ ہوگا کہ آپ اس سے کبر کی غذا لینے کے بجائے سراپا تواضع بن جائیں۔

صبر کوئی انسانی قانون نہیں، وہ خود فطرت کا ایک قانون ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے ہر معاملہ سے ہے، خواہ وہ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔

احترام انسانیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام انسان خدا کی عیال ہیں۔ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اچھا انسان وہ ہے جو اس کی عیال کے ساتھ اچھا سلوک کرے (روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: الخلق کلہم عیال اللہ واحب خلق اللہ الی اللہ احسنہم صنیعاً الی عیالہ) ادب الدنیا والدین للبصری ۵۲۷

انسانی سماج کی بہتر تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے احترام پایا جائے، لوگ ایک دوسرے کی عزت کریں، لوگ ایک دوسرے کے قدرداں بنے ہوئے ہوں۔

احترام کا یہ جذبہ لوگوں کے اندر کس طرح پیدا کیا جائے۔ اس کا سب سے زیادہ موثر اور کامیاب طریقہ یہ ہے کہ یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرائی جائے کہ جس خالق نے مجھ کو پیدا کیا ہے اسی خالق نے دوسرے انسانوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ تمام انسان گویا ایک خدا کا کنبہ ہیں۔ تمام انسان ایک خدا کے عیال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ شعور آدمی کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے اور دوسرے میں فرق نہ کرے۔ وہ دوسرے کو بھی اتنا ہی قابل قدر سمجھے جتنا وہ خود اپنے آپ کو قابل قدر سمجھ رہا ہے۔ کسی انسان کی تحقیر کرتے ہوئے وہ محسوس کرے کہ میں نے خدائی کنبہ کے ایک فرد کی تحقیر کی۔ اسی طرح جب وہ کسی انسان کو عزت دے تو وہ اس سے یہ خوشی حاصل کرے کہ اس نے خدائی کنبہ کے ایک فرد کو عزت و احترام دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کے لیے اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں کہ وہ ایک ایسا عمل کرے جو اس کو یہ خوشی دے رہا ہو کہ میں نے خدائی کنبہ کے ایک شخص کو عزت دی ہے۔ خدائی کنبہ کے ایک شخص کے ساتھ احترام کا معاملہ کیا ہے۔ یہ نظریہ ایک طرف آدمی کو خدا کی نظر میں قابل انعام بناتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک عظیم فائدہ یہ ہے کہ اس عمل کے دوران انسان کے اندر اعلیٰ احساسات جاگتے ہیں۔ وہ دوسرے کو عزت دے کر خود اپنے آپ کو ایک باعزت انسان بنا لیتا ہے۔

قدرت کے باوجود

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — جب تم کو اپنے دشمن پر قدرت حاصل ہو جائے تو اسے معاف کرنے کو اس پر اپنی قدرت کا شکرانہ بنالو (رُوِيَ عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال: اذا قدرت على عدوك فاجعل العفو عنه شكراً للقدرة عليه) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۳۰۰

اخلاق کیا ہے۔ اخلاق اعلیٰ انسانی کردار کا دوسرا نام ہے۔ انسانی تعلقات میں کسی شخص سے جس اعلیٰ سلوک کی توقع کی جاتی ہے اسی کو اخلاق کہتے ہیں۔ کسی انسان کی انسانیت کو پہچاننے کا معیار یہی اخلاق ہے۔

ایک شخص سے آپ کی دشمنی ہوگئی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ آپ نے اس کو زیر کر کے اس کے اوپر قابو پالیا۔ اس وقت ایک صورت یہ ہے کہ آپ اس معاملہ کو صرف انتقام کی نظر سے دیکھیں، آپ یہ سوچیں کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس سے بھرپور بدلہ لیا جائے اور اپنے انتقام کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے۔ مگر یہ نہایت چھوٹی سوچ ہے، اعلیٰ انسانیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ سارے معاملہ کو خدا کی نظر سے دیکھیں۔ آپ اپنی کامیابی کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی کامیابی سمجھیں۔ ایسی حالت میں آپ کے جذبات بالکل مختلف ہوں گے اب آپ کے اندر شکر کا جذبہ ابھر آئے گا۔ اپنی کامیابی کے بعد شکر کی سب سے زیادہ اعلیٰ صورت آپ کو یہ دکھائی دے گی کہ آپ اپنے دشمن کو معاف کر دیں۔

قابو پانے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک زبردست قربانی کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے باہر کے دشمن کو کچلنے کے بجائے، خود اپنے نفس کو کچلنا پڑتا ہے۔ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے بعد ہی کسی کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ قابو پانے کے بعد بھی اپنے دشمن کو معاف کر دے۔

معاف کرنا ایک نیکی ہے۔ اور قدرت کے باوجود معاف کرنا سب سے بڑی نیکی۔

اصلاح کا جذبہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — مومن، مومن کا آئینہ ہے۔ جب وہ اس میں کوئی عیب دیکھتا ہے تو اس کو درست کر دیتا ہے (المؤمن مرآۃ المؤمن، إذا رأى فيه عيباً أصلحه) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۲۰۱

انسان کی انسانیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خیر خواہ ہو۔ ہر انسان دوسرے انسان کی بہتری چاہے۔ ہر انسان کا یہ حال ہو کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھے، وہ ان کی ترقی پر خوش ہو، اور اگر کسی بھائی میں کوئی خرابی دیکھے تو وہ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت اس کی اصلاح کے لیے مستعد ہو جائے۔

جس سماج میں لوگوں کا یہ حال ہو وہاں ہر انسان دوسرے انسان کے لیے آئینہ کی مانند ہوگا۔ اگر آپ آئینہ کے سامنے کھڑے ہوں تو وہ کسی کمی یا زیادتی کے بغیر آپ کے اصل چہرے کو دکھا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک سچے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ جب بھی کسی دوسرے انسان کے اندر کوئی کمی یا خرابی دیکھتا ہے تو اس کا انسانی جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اس سے باخبر کر دے۔ سچے انسان کے لیے ایسے معاملہ میں چپ رہنا ممکن نہیں۔

آئینہ جب کسی کو اس کے چہرے کی خرابی دکھاتا ہے تو اس کے اندر کوئی برا جذبہ نہیں ہوتا۔ آئینہ کا کام صرف خرابی کو بتانا ہے نہ کہ خرابی والے انسان کو نیچا دکھانا۔ اسی طرح سچا انسان وہ ہے جو اپنے بھائی کو اس کی خرابی سے آگاہ کرے تو اس کے دل میں بھائی کے خلاف نفرت یا حقارت کا کوئی جذبہ نہ ہو، ایسا کرتے ہوئے نہ وہ اپنے آپ کو اونچا سمجھے اور نہ دوسرے کو نیچا۔ اس کا مقصد صرف عیب کی اصلاح ہو نہ کہ عیب کا اشتہار۔

آئینہ آدمی کے چہرہ پر کوئی دھبہ بتائے تو آدمی کسی رکاوٹ کے بغیر فوراً اس کو قبول کر لیتا ہے۔ مگر جب انسان کسی آدمی کو اس کا عیب بتائے تو اکثر وہ اس کو اپنی عزت اور غیرت کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ یہ جذبہ آدمی کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ انسان کی نشاندہی کو بھی اسی طرح خوش دلی کے ساتھ قبول کرے جس طرح وہ آئینہ کی نشاندہی کو قبول کرتا ہے۔

اپنا محاسبہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تم لوگ خود اپنا محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے (حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا) الترمذی

انسان موجودہ دنیا میں عمل کرنے کے لیے آزاد ہے مگر وہ انجام کے معاملہ میں آزاد نہیں۔ آپ کو اختیار ہے کہ جو چاہیں بولیں اور جو چاہیں کریں۔ مگر آپ کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ اپنے آپ کو اپنے قول و عمل کے انجام سے بچا سکیں۔

آدمی اپنی زبان سے کڑوا بول بولے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ سننے والوں پر کڑوے بول کا بھی وہی رد عمل ہو جو میٹھے بول کا ہوتا ہے۔ جو آدمی اپنی زبان سے کڑوا بول بولے اس کو جاننا چاہیے کہ اس کو بہر حال لوگوں کی طرف سے منفی رد عمل کی قیمت بھگتنی پڑے گی۔ جو آدمی بے سوچے سمجھے عمل کرے اس کو جاننا چاہیے کہ اس کا اس قسم کا عمل فطرت کے قانون کے مطابق اپنا نتیجہ ظاہر کرے گا نہ کہ اس کی ذاتی خواہش کے مطابق۔

آدمی کے قول و عمل کا ایک انجام وہ ہے جو فوری طور پر دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ دوسرا انجام وہ ہے جو موت کے بعد آخرت میں ظاہر ہوگا۔ آخرت کا انجام بھی بہر حال اسی طرح سامنے آنے والا ہے جس طرح دنیا کا انجام آدمی کے سامنے فوراً آجاتا ہے۔ آدمی کو بلا شبہ یہ اختیار ہے کہ وہ جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ مگر یہ اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنے قول و عمل کے انجام سے اپنے کو بچا سکے، نہ موجودہ دنیا میں اور نہ آخرت کی دنیا میں، جو مرنے کے بعد ہر ایک کے سامنے آنے والی ہے۔

ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ ہر آدمی اپنا نگراں آپ بن جائے۔ ہر آدمی اس کو اپنا معمول بنالے کہ ہر روز وہ اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ ہر آدمی اپنا بے لاگ جائزہ لے کہ اس نے جو کچھ کیا یا کہا، کیا وہ اس قابل تھا کہ اس کو کہا جائے اور کیا جائے، یا وہ اس قابل نہ تھا۔ قبل اس کے کہ آدمی کی کارگزاری کا انجام اس کے اوپر ٹوٹ پڑے اسے چاہیے کہ وہ اپنا محاسبہ کرکے پیشگی طور پر اس سے بچنے کے لیے فکر مند ہو جائے۔

تکمیلِ انسانیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ——— جس نے لوگوں سے معاملہ کیا پھر ان سے ظلم نہیں کیا۔ اور ان سے بات کی اور جھوٹ نہیں بولا۔ اور ان سے وعدہ کیا پھر ان کی خلاف ورزی نہیں کی تو وہ ان میں سے ہے جس نے اپنی انسانیت کی تکمیل کر لی

(رُوِی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: مَن عامل الناس فلم یظلمهم وحدّثهم فلم یکذبهم، ووعدهم فلم یخلفهم فهو ممّن کملت مروئته) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۵۰۱

کامل انسان کون ہے، کامل انسان وہ ہے جس کے اندر انسانیت کی اعلیٰ صفات پائی جائیں۔ جو ہر تجربہ میں اور ہر موقع پر یہ ثابت کرے کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک انسان ہے نہ کہ انسان کی صورت میں صرف ایک حیوان۔

انسان کی پہچان اس کی صورت نہیں ہے بلکہ اس کا معاملہ ہے۔ جو آدمی دوسروں سے معاملہ کرتے ہوئے اپنی انسانیت کو قائم رکھے وہی سچا اور حقیقی انسان ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی معاملہ کے وقت ان امیدوں کو پورا نہ کر سکے جو ایک انسان سے بحیثیت انسان کی جاتی ہیں تو وہ اپنی انسانیت کو ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا۔

اس سلسلہ میں ایک انسانی صفت یہ ہے کہ آدمی جب کسی سے معاملہ کرے تو وہ اس کے ساتھ ظلم نہ کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے روکے کہ وہ دوسروں کے ساتھ حق تلفی کرنے لگے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اسی چیز کو لے جو عدل و انصاف کے اعتبار سے اس کا حق ہے۔ اور جو چیز امر واقعہ کے اعتبار سے اس کا حق نہ ہو اس کو وہ ہرگز نہ لے، خواہ بظاہر وہ اس کو لینے کی قدرت رکھتا ہو۔

اسی طرح انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیشہ سچ بولے، وہ کبھی اپنی زبان سے ایسی بات نہ نکالے جو حقیقت کے اعتبار سے جھوٹ ہو۔ اسی طرح انسان کی ایک اعلیٰ صفت یہ ہے کہ جب وہ کسی سے کوئی وعدہ کرے تو ہر حال میں وہ اس کو پورا کرے۔ کسی آدمی کے باکردار ہونے کی سب سے زیادہ یقینی پہچان یہی ہے۔

حسنِ اخلاق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ قیامت کے دن مومن کی ترازو میں سب سے زیادہ وزنی چیز اچھا اخلاق ہوگا۔ اور خدا اس شخص سے نفرت کرتا ہے جو بے حیائی کی بات بولے اور بدزبانی کرے (قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اثقل شیٔ فی میزان المومن یوم القیامۃ خلق حسن و ان اللہ یبغض الفاحش البذی) الترمذی

اخلاق انسان کی پہچان ہے۔ جیسا اخلاق ویسا انسان۔ کوئی آدمی اچھا لباس پہن کر اچھا آدمی نہیں بنتا۔ یہ دراصل اچھا اخلاق ہے جو کسی انسان کو اچھا انسان بناتا ہے۔

انسانی اخلاق کی پہچان سب سے پہلے اس کی زبان سے ہوتی ہے۔ زبان آدمی کی اندرونی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ کوئی آدمی اپنی اندرونی شخصیت کے اعتبار سے جیسا ہوگا ویسا ہی وہ اپنی زبان پر ظاہر ہوگا۔

جس آدمی کے اندر انسانیت ہو، وہ تواضع اور ہمدردی کے احساسات میں جی رہا ہو، جو اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہو کہ اس کے اوپر دوسروں کے حقوق ہیں اور ان حقوق کو ہر حال ادا کرنا ہے۔ ایسا آدمی جب کلام کرے گا تو اس کی زبان میں دوسروں کی رعایت شامل ہوگی۔ وہ ہر حال میں انصاف کی بات بولے گا۔ اس سے دوسروں کو میٹھے کلام کا تحفہ ملے گا۔

اس کے برعکس جس آدمی کے دل میں کبر ہو، جس کا سینہ ذمہ داری کے احساس سے خالی ہو، جو دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنا نہ جانتا ہو۔ ایسا آدمی جب دوسروں سے کلام کرے گا تو اس کے کلام میں بے حسی ہوگی۔ اس کے الفاظ بدخواہی کی کڑواہٹ لیے ہوئے ہوں گے۔ دوسروں کی طرف سے اس کے خلاف کوئی سخت بات پیش آجائے تو وہ فوراً مشتعل ہو جائے گا اور بدگوئی اور بدگمانی کا انداز اختیار کرے گا۔ اچھا انسان وہ ہے جو لوگوں کے درمیان پھول کی طرح رہے۔ اور برا انسان وہ ہے جو لوگوں کے درمیان اس طرح رہے کہ وہ لوگوں کے لیے کانٹا بنا ہوا ہو۔

امانت داری

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — جس شخص نے اپنی امانت تمہارے سپرد کی۔ اس کی امانت اس کو واپس کرو۔ کوئی شخص تم سے خیانت کرے تب بھی تم اس کے ساتھ خیانت نہ کرو (ادِّ الامانۃ الیٰ من ائتمنک ولا تخن من خانک) الترمذی

عام حالت میں ایک آدمی اپنی فطرت پر ہوتا ہے، فطرت انسان کی نہایت صحیح معلّم ہے۔ چنانچہ عام حالت میں انسان وہی کرتا ہے جو اسے کرنا چاہیے۔ وہ امانتوں کو ادا کرتا ہے اور لوگوں کے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے جو انسانیت کے مطابق ہو۔

انسان کی اصل جانچ عام حالت میں نہیں ہے بلکہ خاص حالت یا ہنگامی حالت میں ہے۔ مثلاً چھوٹی امانت کا معاملہ ہو تو آدمی اس کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا۔ وہ وقت پر اسے ادا کر دیتا ہے۔ لیکن جب معاملہ کسی بڑی امانت کا ہو تو اس وقت وہ بدل جاتا ہے۔ وہ انسانی اور اخلاقی اصولوں کو توڑ کر یہ کوشش کرنے لگتا ہے کہ اس کو امانت ادا کرنا نہ ہو، دوسرے کی چیز کو وہ اپنے قبضہ میں لے لے۔

مگر یہ سخت غیر انسانی فعل ہے۔ امانت ہر حال میں قابلِ ادائیگی ہے۔ خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ حتیٰ کہ اگر صاحب امانت کے پاس اپنی امانت کے حق میں کوئی ثبوت موجود نہ ہو تب بھی وہی اپنی امانت کا مالک ہے اور امانت دار پر اس کی ادائیگی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ثبوت کی موجودگی میں ضروری ہوتی ہے۔

انسان کا حال یہ ہے کہ عام حالت میں وہ لوگوں کے ساتھ بدمعاملگی یا خیانت نہیں کرتا لیکن جب کوئی شخص اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرے تو وہ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ منفی جذبات سے مغلوب ہو کر وہ چاہنے لگتا ہے کہ جس نے اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ کیا ہے وہ بھی اس کے ساتھ مزید اضافہ کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرے۔ مگر ایک شخص کی خیانت دوسرے شخص کے لیے خیانت کو جائز نہیں کرتی۔

اخلاقی اصول

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے (لایؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ) متفق علیہ۔

اخلاق کا سادہ اور فطری اصول یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے لیے بھی وہی چاہنے لگے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔ اور دوسروں کے لیے بھی اس سلوک کو برا سمجھے جس سلوک کو وہ اپنے لیے برا سمجھتا ہے۔

یہ ایک ایسا معیار ہے جو ہر ایک کو معلوم ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو اس حقیقت کو نہ جانتا ہو۔ یہ اصول ہر آدمی کو ایک ایسا اخلاقی معیار دیتا ہے، جس کی روشنی میں وہ بے خطا طور پر اپنے لیے صحیح رویہ کا فیصلہ کرے، اور جو رویہ غلط ہو اس کو چھوڑ دے۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ اس کو اپنے خلاف سازش پسند نہیں، اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ بھی کسی کے خلاف سازش نہ کرے۔ ہر آدمی کو ناپسند ہے کہ کوئی شخص اس کا بدخواہ بن جائے اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ بھی کسی کے خلاف بدخواہی نہ کرے۔ ہر آدمی کو معلوم ہے کہ کڑوا بول اس کی پسند کے مطابق نہیں اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ بھی کسی کو اپنے کڑوے بول کا تحفہ نہ دے۔ ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ اگر اس کو بے عزت کیا جائے تو ایسا فعل اس کو بے حد ناگوار ہوگا اس لیے اس کو چاہیے کہ وہ کسی بھی حال میں کسی دوسرے آدمی کو بے عزت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہر آدمی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر اس کا مال چھینا جائے تو وہ کسی حال میں اس کو پسند نہیں کرے گا۔

یہی معاملہ پسند کا ہے۔ ہر آدمی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا چیزیں اس کو پسند ہیں۔ کن چیزوں کو پاکر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اب ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے اس چیز کا حریص بن جائے جس کا حریص وہ خود بنا ہوا ہے۔ وہ دوسروں کو وہی دے جس کو وہ خود پانا چاہتا ہے کسی سماج کے افراد اگر اس اصول کو اختیار کر لیں تو اپنے آپ وہ سماج ایک بہتر سماج بن جائے گا۔

بھلائی اور برائی

حدیث میں آیا ہے کہ — نواس بن سمعان صحابی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ بھلائی اور برائی کیا ہے۔ آپ نے فرمایا بھلائی حسن خلق کو کہتے ہیں اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تجھ کو برا لگے کہ لوگ اس سے باخبر ہوجائیں (عن النواس بن سمعان الانصاری قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن البر والاثم فقال البر حسن الخلق والاثم ما حاک فی صدرک وکرھت ان یطلع علیہ الناس) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔

نیکی یا بھلائی ایک جذبہ ہے جو آدمی کے دل میں ہوتا ہے۔ اور وہ انسانوں سے معاملہ کرتے ہوئے اچھے اخلاق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ نیکی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک داخلی حقیقت ہے۔ اور روزمرہ کی زندگی میں ظاہر ہونے والا حسن اخلاق اس کا خارجی ثبوت۔

جس آدمی کے دل میں نیکی ہو جب وہ لوگوں سے ملے گا تو اس کے چہرہ پر خوشی کی جھلک آجائے گی۔ جب وہ بولے گا تو اس کے الفاظ میں خیر خواہی کا جذبہ بھرا ہوا ہو گا۔ اس کا اخلاقی رویہ ہر حال میں باقی رہے گا، خواہ دوسروں نے اس کو خوش گوار انداز میں خطاب کیا ہو یا ناخوش گوار انداز میں۔ مزید یہ کہ اس کی خوش اخلاقی حقیقی خوش اخلاقی ہوگی نہ کہ محض ظاہری اور مصنوعی خوش اخلاقی۔

برائی یا برا اخلاق کیا ہے، اس کا ایک سادہ معیار فطرت نے ہر آدمی کے اندر رکھ دیا ہے۔ اور وہ ضمیر ہے۔ جب بھی آدمی کوئی بات سوچے یا وہ کوئی بری کارروائی کرے تو فوراً اس کے سینہ کے اندر بیٹھی ہوئی ضمیر کی عدالت اس کو چوکنا کرتی ہے۔ وہ خاموش زبان میں اس سے کہنے لگتی ہے کہ یہ غلط بات ہے۔ تم کو چاہیے کہ تم اسے چھوڑ دو۔ آدمی اگر ضمیر کی آواز کی پیروی کرے تو وہ کبھی برائی میں مبتلا نہ ہو۔

ضمیر کی آواز کے ذریعہ خدا ہر انسان کو متنبہ کرتا ہے۔ ضمیر خدا کی حجت ہے۔ ضمیر کی آواز کو نظر انداز کرنا خدا کی آواز کو نظر انداز کرنا ہے۔

عفو و تواضع

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — صدقہ دینے سے مال نہیں گھٹتا۔ اور بندہ جب معاف کرتا ہے تو خدا اس کی عزت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اور جو بندہ خدا کے لیے تواضع کرتا ہے خدا اس کو بلندی عطا کر دیتا ہے (ما نقصت صدقۃ من مال وما زاد اللہ عبداً بعفوٍ الا عزاً وما تواضع احدٌ للہ الا رفعہ اللہ) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔

اخلاق دوسرے لفظوں میں، دینے کا ایک معاملہ ہے۔ جب آدمی کسی سے اچھا بول بولتا ہے یا اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے تو وہ اس کو اپنی محبت دے رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کسی دوسرے کی مالی مدد کرتا ہے تو وہ بھی اپنی چیز کو دوسرے کے لیے دینا ہوتا ہے۔

بظاہر یہ دینا یک طرفہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی آدمی دوسرے سے کچھ پائے بغیر اس کو اپنے پاس سے دے رہا ہے۔ مگر کوئی بھی اخلاقی معاملہ یک طرفہ معاملہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دینے میں پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔

جس سماج میں لوگ ایک دوسرے کی مالی مدد کریں، ان کے اندر جمع کرنے کے بجائے خرچ کرنے کا مزاج ہو، اس سماج میں دولت کی گردش بڑھے گی اور استحصالی ذہنیت کا خاتمہ ہوگا۔ ایسے ماحول میں یہ بالکل فطری بات ہے کہ دینے والا مختلف طریقوں سے اپنے دینے کے فوائد میں حصہ دار بن جائے۔ ایسے سماج میں جب عمومی بہبودی آئے گی تو اس کا فائدہ ہر ایک کو پہنچے گا یہاں تک کہ دینے والے کو بھی۔

جب کوئی شخص آپ کے سامنے سرکشی کرے اور آپ اس کے مقابلہ میں جوابی انداز اختیار نہ کریں بلکہ تواضع کا انداز اختیار کریں تو فطرت کا قانون حرکت میں آکر آپ کا درجہ اونچا کر دیتا ہے اور دوسرے کا درجہ نیچا۔ اس طرح تواضع کی روش اختیار کرنا عملی نتیجہ کے اعتبار سے آدمی کے لیے سرفرازی کا سبب بن جاتا ہے۔

خدا کا پسندیدہ معاشرہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — خدا بندے کی مدد پر ہوتا ہے جب تک کہ وہ اپنے بھائی کی مدد پر ہو (اللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ) صحیح مسلم

موجودہ دنیا کا نظام خدا نے فطرت کے جس قانون کے تحت بنایا ہے اس میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے کیے ہوئے کا انجام نہ پائے۔ اس قانون کا ایک پہلو یہ ہے کہ کوئی آدمی جب سماج کے دوسرے لوگوں کی مدد کرتا ہے، وہ ان کی ضرورت کے موقع پر ان کے کام آتا ہے تو پورے ماحول میں اس کے موافق فضا بننے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ معاملہ اپنے آپ دوطرفہ بن جاتا ہے۔ جس نے دوسروں کی مدد کی تھی، دوسرے لوگ بھی مزید اضافہ کے ساتھ اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

انسان کی مدد کرنا کسی پتھر کے اسٹیچو کی مدد کرنا نہیں ہے بلکہ زندہ اور حساس انسان کی مدد کرنا ہے۔ انسان کے اندر پائی جانے والی یہی زندگی اور حساسیت معاملہ کو دوطرفہ بنا دیتی ہے۔ مدد پانے والا اپنی فطرت سے مجبور ہو کر مدد دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

سماجی نظام کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا ہر فرد صرف اپنے بارے میں سوچتا ہو۔ اس کو اپنے مفاد کے سوا کسی اور چیز کی خبر نہ ہو۔ وہ وہاں حرکت میں آتا ہو جہاں اس کا ذاتی فائدہ ہے اور جہاں اس کا ذاتی فائدہ نہ ہو وہاں وہ بے حس و بے حرکت بن جائے۔ ایسا سماج خدا کی مدد سے محروم رہتا ہے۔ ایسے سماج میں اعلیٰ انسانیت کی فضا نہیں بنتی۔ اور جہاں اعلیٰ انسانیت کی فضا نہ ہو وہاں ہر ایک کو کہیں نہ کہیں اس کا برا انجام بھگتنا پڑتا ہے۔

دوسرا سماج وہ ہے جہاں ہر آدمی اپنی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے بھی تیار رہتا ہو۔ جہاں ہر آدمی اپنے جذبات کے ساتھ دوسروں کے جذبات کا بھی لحاظ کرتا ہو۔ ایسے سماج میں اپنے آپ ہر طرف انسانیت اور اخلاق کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ماحول میں رہ رہا ہے نہ کہ غیروں کے ماحول میں۔

برائی کے بدلے بھلائی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — خدا برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو اچھائی سے مٹاتا ہے۔ گندگی، گندگی کو صاف نہیں کرتی (اِنَّ اللہ لا یمحو السیئ بالسیئ ولکن یمحو السیئ بالحسن انّ الخبیث لا یمحو الخبیث) مسند احمد

لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ہر آدمی خود اپنی فطرت کے زور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ وہ سلوک کرے جو اس کو سماج میں سرخرو بنانے والا ہو۔ پھر آدمی کیوں ایسا کرتا ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق کی روش سے ہٹ جاتا ہے، اس کا سبب جوابی نفسیات ہے۔

سماج میں جب بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے جذبات کو دوسرے آدمی سے کوئی ٹھیس پہنچے تو پہلا آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میری عزت خطرہ میں آ گئی۔ اپنی عزت کو محفوظ کرنے کا طریقہ اس کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ وہ دوسرے شخص پر جوابی حملہ کرکے معاملہ کو برابر کرے۔ مگر یہ ایک غلط تدبیر ہے۔ ایسی کسی کارروائی کا کبھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلتا۔

جس طرح ایک گندگی کو دوسری گندگی کے ذریعہ پاک نہیں کیا جا سکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ ایک غلطی کو دوسری غلطی کے ذریعہ درست کیا جائے۔ بداخلاقی کا جواب بداخلاقی نہیں۔ اس کی اصلاح کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ جس آدمی نے بداخلاقی کا سلوک کیا ہے اس کے ساتھ حسنِ اخلاق کا سلوک کیا جائے۔

جب آپ برے سلوک کا جواب برے سلوک سے دیں تو فریق ثانی کے اندر انتقامی نفسیات جاگ اٹھتی ہے۔ وہ آپ کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ برے سلوک کا جواب اچھے سلوک سے دیں تو فریق ثانی کے اندر شرمندگی کا احساس جاگ اٹھے گا، وہ خود اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے گا۔ اس کا یہ جذبہ خود ہی اس کو مجبور کرے گا کہ وہ آپ کے بارے میں اپنے رویہ کو درست کر لے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی معاملہ کو اپنے انتقامی جذبہ کی تسکین کا مسئلہ نہ بنائے، بلکہ اس کو صرف حل کی نظر سے دیکھے۔

بہترین اخلاق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— کیا میں تم کو بتاؤں کہ دنیا و آخرت میں لوگوں کا بہترین اخلاق کیا ہے۔ کہا گیا کہ ہاں اے خدا کے رسول، آپ نے فرمایا کہ جو تم سے کٹے تم اس سے جڑو، جو تم کو محروم کرے تم اسے دو، اور جو تمہارے اوپر زیادتی کرے تم اسے معاف کرو (عن عقبة بن عامر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الا انبئك بافضل اخلاق اهل الدنيا والآخرة قال نعم قال تصل من قطعك وتعطي من حرمك وتعفو عمن ظلمك) البیہقی

دنیا میں آدمی کو بار بار تلخ تجربے پیش آتے ہیں۔ کوئی شخص ایک بات پر ناراض ہو کر آپ سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ کوئی شخص آپ کو محرومی کا تجربہ کراتا ہے۔ کوئی شخص آپ کے ساتھ زیادتی کا معاملہ کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر جوابی غصہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لوگ چاہنے لگتے ہیں کہ جس سے انھیں تلخ تجربہ پیش آیا ہے اس کو بھی اپنی طرف سے تلخ تجربہ کرائیں تاکہ اس کو سبق حاصل ہو۔

مگر یہ اعلیٰ انسانی سوچ نہیں۔ اعلیٰ انسان وہ ہے جو اپنی عقل سے سوچے، جس کا رویہ خود اپنے سوچے سمجھے اصول کے تحت متعین ہوتا ہو نہ کہ دوسروں کے ردعمل کے تحت۔

ایسے انسان کا ذہن دوسروں کے رویہ سے برہم نہیں ہوتا۔ اس کی فکری پختگی اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ردعمل سے اوپر اٹھ کر اپنے لیے جینے کی سطح پا لے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، خواہ ان کی طرف سے اس کو برے سلوک کا تجربہ ہوا ہو۔

اس کی بلند فکری اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ بھی جڑا رہے جو اس کے ساتھ تعلق توڑنے کا معاملہ کرتے ہوں۔ وہ ان لوگوں کو بھی دینے میں خوشی محسوس کرے جو اس کو نہ دینے کا فیصلہ کیے ہوئے ہوں۔ کوئی شخص اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کرے تب بھی اس کا دل تنگ نہیں ہوتا، بلکہ وہ یک طرفہ طور پر ایسے لوگوں کو معاف کر دیتا ہے —— اعلیٰ اخلاق با اصول انسان کا طریقہ ہے، اور کمتر اخلاق بے اصول انسان کا طریقہ۔

آدابِ کلام

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — خدا اس شخص پر رحم کرے جس نے بھلی بات کہی اور اس کا فائدہ اٹھایا۔ یا وہ چپ رہا اور اس نے سلامتی پائی (رحم اللہ عبداً قال خیراً فغنم او سکت فسلم) ادب الدنیا والدین، صفحہ ۲۳۳

اس دنیا میں جس طرح بولنا ایک کام ہے اسی طرح چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آدمی بولے اور کبھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ آدمی چپ رہے۔ وہ آدمی خوش قسمت ہے جو اس فرق کو جانے۔ ایسا آدمی خود بھی کامیاب ہوگا اور دوسروں کو بھی اس سے کامیابی کا تحفہ ملے گا۔

آدمی کو کب بولنا چاہیے، اس کی دو لازمی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے پاس کوئی ایسی بات ہو جو سچ مچ کہنے کے قابل ہو، یہ بات وہ ہوتی ہے جس پر آدمی نے مدتوں غور کیا ہو، اس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس کے بارے میں ایک رائے قائم کی ہو، اس کا بولنا اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لیے نہ ہو بلکہ تمام تر سننے والوں کی خیر خواہی میں ہو۔

تاہم بولنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ آدمی کے پاس ایک صحیح بات ہے۔ اسی کے ساتھ آدمی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی بے لاگ جائزہ کے تحت یہ دیکھے کہ اس کا بولنا نتیجہ کے اعتبار سے کیا ہوگا۔ بولنا صرف بولنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کسی نتیجہ کے لیے ہوتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ صرف اس وقت بولے جب کہ اس کو یقین ہو کہ اس کا بولنا کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرے گا۔

جب آدمی کے پاس بولنے کے لیے کوئی بہت سوچی سمجھی بات نہ ہو یا حالات بتاتے ہوں کہ اس کا بولنا کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے کا سبب نہیں بنے گا تو ایسی حالت میں آدمی کے اوپر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ چپ رہے۔ ایسے موقع پر اس کا چپ رہنا ہی اس کے لیے باعثِ خیر ہے نہ کہ بولنا۔

اس دنیا میں خدا کی مدد اس کو ملتی ہے جو دنیا میں قائم کیے ہوئے خدائی قانون کی پابندی کرے۔ یہ دنیا خدا کے مقرر قوانین پر چل رہی ہے۔ یہ قوانین کبھی نہیں بدلتے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ قانون فطرت سے ٹکرانے کے بجائے اس سے ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کرے۔

دوسروں کے حقوق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص مومن نہیں جو خود سیر ہو کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے (عن ابن عباس قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لیس المومن بالذی یشبع وجارہٗ جائعٌ الیٰ جنبہٖ) البیہقی

جس انسان کے اندر اعلیٰ احساس زندہ ہو وہ کبھی اس کو پسند نہیں کرے گا کہ وہ خود تو فراغت کے ساتھ کھائے اور پیئے جب کہ اس کو معلوم ہو کہ اس کے قریب ایسے افراد موجود ہیں جو بھوک کے مسئلہ سے دوچار ہیں اور ان کے پاس اپنی بھوک مٹانے کے لیے کوئی سامان موجود نہیں۔

یہ ایک انسانی احساس ہے۔ اس کا تعلق محدود طور پر صرف کھانے پینے سے نہیں بلکہ ہر انسانی ضرورت سے ہے۔ سچے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ جب بھی وہ کچھ انسانوں کو ضرورت کی حالت میں دیکھے تو وہ ان کے لیے تڑپ اٹھے۔ اس کو اس وقت تک چین نہ آئے جب تک کہ وہ ان کی ضرورت پوری نہ کر دے۔

اس ضرورت کا تعلق زندگی کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ اگر آپ کا یہ حال ہو کہ آپ اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے تو بے حد فکرمند ہوں لیکن اپنے پڑوسیوں یا اپنے ہم وطنوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا جذبہ آپ کے اندر نہ پایا جائے تو یہ بھی اسی کوتاہی میں شامل ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ اپنے گھر والوں کی معاشیات کو درست کرنے کے لیے رات دن ایک کیے ہوئے ہوں لیکن دوسروں کی معاشیات کے بارے میں آپ کچھ نہ سوچیں تو آپ کی یہ روش بھی اسی حدیث کی مصداق قرار پائے گی۔

خدا کی جنت ایک لطیف اور نفیس کالونی ہے۔ اس میں وہی لوگ داخل کیے جائیں گے جو اپنے اندر آفاقی مزاج رکھتے تھے، جو تمام انسانوں کے درد کو اپنا درد بنائے ہوئے تھے۔

اسی طرح موجودہ دنیا میں کوئی اچھا انسانی سماج وہ لوگ بناتے ہیں جن میں یہ صفت ہو کہ وہ خود کھانے کے ساتھ دوسروں کو کھلائیں۔ وہ اپنے لیے سوچنے کے ساتھ دوسروں کے لیے بھی سوچیں۔ وہ اپنی ضرورتوں کی فراہمی کے ساتھ دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کی تڑپ رکھتے ہوں۔ وہ انسانی سماج میں اس طرح رہیں جیسے کہ یہ سماج ایک وسیع کنبہ ہے اور وہ اس کنبہ کے ایک فرد۔

نجات کا ذریعہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیفوں سے اسے بچائے تو اس کو چاہیے کہ وہ قرض دار کو مہلت دے یا وہ اس کو معاف کر دے (عن ابی قتادة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سرّہ ان ینجیہ اللہ من کرب یوم القیامة فلینفّس عن معسر او یضع عنہ) مسلم

ایک آدمی اپنی ضرورت کے لیے کسی سے قرض لے اور جب ادائیگی کا مقرر وقت آئے تو وہ اس کی ادائیگی کی طاقت نہ رکھتا ہو، ایسی حالت میں قرض دینے والے کو چاہیے کہ وہ قرض دار کو مزید مہلت دے۔ اور اگر اس کے حالات کو دیکھتے ہوئے قرض دینے والا اپنے قرض کو معاف کر دے تو اس کا یہ عمل خدا کو بہت پسند ہے۔ خدا ایسے بندوں کے ساتھ آخرت میں آسانی کا معاملہ فرمائے گا جو دنیا میں انسانوں کے ساتھ آسانی کا معاملہ کریں۔

اس اصول کا تعلق صرف قرض سے نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ سماجی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے اور دوسرا آدمی یہ قدرت رکھتا ہے کہ وہ اس کو اس مشکل سے نکالے اور اس کو راحت پہنچائے۔ ایسا ہر موقع آدمی کے لیے اس اعتبار سے نہایت قیمتی ہے کہ وہ اپنے بھائی پر مہربانی کر کے زیادہ بڑے پیمانے پر اپنے لیے خدا کی مہربانی حاصل کر لے۔

دوسرے کا بوجھ اتارنا اپنے انجام کے اعتبار سے اپنے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے۔ دوسرے کے کام آنا آخر کار یہ فائدہ دیتا ہے کہ آدمی کا خود اپنا بگڑا ہوا کام بن جائے۔ جو آدمی دوسروں کی ضرورتیں پوری کرے خدا اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور زیادہ بڑے پیمانے پر اس کی ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔

کسی کو مشکل حالت میں دیکھ کر تڑپنا ایک اعتبار سے انسانیت کی بات ہے۔ جو شخص ایسا کرے اس نے گویا اپنے انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ اسی کے ساتھ اس کا دوسرا عظیم تر فائدہ یہ ہے کہ ایسا کر کے آدمی اپنے آپ کو خدا کی عنایت کا مستحق بنا لیتا ہے۔ یہ گویا دنیوی عمل کی اخروی قیمت ہے اور بلاشبہ کسی انسان کے لیے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں۔

پابند زندگی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ مومن کی مثال اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے کھونٹی کی رسّی سے بندھا ہوا گھوڑا، وہ گھومتا ہے اور پھر اپنی کھونٹی کی طرف واپس آجاتا ہے (مثلُ المومن ومثل الایمان کمثل الفرس فی آخیتہٖ یجول ثم یرجع الی آخیتہٖ) البیہقی بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۲/۱۲۲۶

انسان کو دنیا کی زندگی میں کھلے ہوئے گھوڑے کی طرح نہیں رہنا ہے بلکہ بندھے ہوئے گھوڑے کی طرح رہنا ہے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی کو مقرر اصولوں کا پابند بنائے۔ وہ ایک با اصول انسان کی زندگی گزارے نہ کہ بے اصول انسان کی زندگی۔

یہ با اصول زندگی کیا ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی حرام اور حلال میں تمیز کرے۔ خدا نے جن چیزوں کی اجازت دی ہے ان کو استعمال کرے اور خدا نے جن چیزوں سے روکا ہے ان سے وہ اپنے آپ کو روکے رہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ تعمیری انداز میں سوچے اور تخریبی سوچ سے ہر حال میں اپنے آپ کو باز رکھے۔ وہ اپنی زبان سے صرف درست بات نکالے اور جہاں غلط بات کا موقع ہو وہاں وہ اپنی زبان کو بند کرلے۔ لوگوں سے معاملہ کرنے میں وہ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرے، وہ کبھی لوگوں کے ساتھ بے انصافی کا معاملہ نہ کرے، لوگوں کے درمیان اس کا سلوک ذمہ دارانہ سلوک ہو، غیر سنجیدگی اور غیر ذمہ داری کی روش کو وہ ہمیشہ کے لیے ترک کردے۔

گھوڑے کو مادی رسّی باندھتی ہے۔ مگر انسان کو جو چیز باندھتی ہے وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے اخلاقی اور انسانی اصول ہیں۔ گھوڑا مجبور ہوتا ہے کہ وہ رسی کے دائرہ سے باہر نہ جائے۔ یہی کام انسان خود عائد کی ہوئی پابندی کے تحت کرتا ہے۔ انسان کی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنی رسّی آپ بن جائے۔ وہ اس پابند زندگی کو آزادانہ طور پر اختیار کرلے جس کو ایک گھوڑا مجبورانہ طور پر اختیار کیے ہوئے ہے۔

ناکام وہ ہے جو آزادی پاکر بے قید ہوجائے اور کامیاب وہ ہے جو آزادی کے باوجود پابند زندگی گزارے۔

نرم روش

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ——— مومن کی مثال کھیتی کے پودے جیسی ہے جس کو ہوائیں ہلاتی رہتی ہیں۔ ایک جھونکا اس کو زمین پر گرا دیتا ہے اور دوسرا جھونکا اس کو سیدھا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آجائے (مثل المؤمن کمثل الخامة من الزرع تفیئها الریاح، تصرعها مرة وتعدلها اخریٰ، حتی یاتیه اجله) متفق علیہ بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۱/ ۴۹۰

خدا پرست انسان اکڑ والا انسان نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک نرم انسان ہوتا ہے۔ اپنی فکر اور عقیدہ پر کامل یقین رکھنے کے باوجود، عملی زندگی میں اس کا رویہ ہمیشہ نرمی والا ہوتا ہے نہ کہ سختی والا۔

سماجی زندگی میں کوئی آدمی اپنے عقیدہ میں تو بے لچک ہو سکتا ہے مگر لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے بے لچک بننا اس کے لیے ممکن نہیں۔ عقیدہ ایک ذاتی معاملہ ہے اور وہ حقیقتِ واقعہ سے مطابقت کے تحت بنتا ہے مگر عملی روش میں لوگوں کے ساتھ رعایت کرنا ضروری ہے۔ لوگوں کی رعایت کیے بغیر عملی زندگی کا کوئی ڈھانچہ بننا ممکن نہیں۔

عملی زندگی میں کوئی شخص اکڑ کی روش کیوں اختیار کرتا ہے، یہ ہمیشہ انانیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ جب بھی کسی سے اختلاف کی صورت پیش آتی ہے تو آدمی فوراً اس کو اپنے لیے غیرت کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر میں نے اس معاملہ میں لچک دکھائی تو میں فریق ثانی کے مقابلہ میں چھوٹا بن جاؤں گا۔ یہی احساس اس کو لچک دار رویہ اختیار کرنے سے روک دیتا ہے۔ وہ اپنے موقف کو اصولی موقف قرار دے کر اس پر جم جاتا ہے۔ حالانکہ ایسے موقع پر اصولی موقف یہ ہے کہ معاملہ کو غیرت کا سوال نہ بنایا جائے، بلکہ نرمی اور لچک کا انداز اختیار کرتے ہوئے معاملہ کو حل کیا جائے۔

خدائی عقیدہ کے تحت جو انسان بنتا ہے اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ ساری بڑائی خدا کے لیے ہے، میں اس کا صرف بندہ ہوں اور میرے پاس عجز کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ احساس خدا پرست انسان کو ایک نرم انسان بنا دیتا ہے۔ جس کا اظہار لوگوں کے درمیان مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔

نرمی اور رعایت کا طریقہ ایک خدائی طریقہ ہے۔ اس کے برعکس شدت اور کٹر پن کا طریقہ سراسر غیر خدائی طریقہ۔

یکساں انسان

حدیث میں آیا ہے کہ — پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ایک مقام پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دوران وہاں سے ایک جنازہ گزرا، آپ (اس کے احترام میں) کھڑے ہو گئے۔ آپ سے کہا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کیا وہ انسان نہ تھا (الیست نفسا) فتح الباری ۲/۱۱۳

خدا پرستانہ زندگی کا اصول یہ ہے کہ ہر انسان کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جائے، خواہ وہ ایک مذہب سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے مذہب سے۔ خواہ وہ اپنی قوم کا آدمی ہو یا غیر قوم کا آدمی۔ احترام کا تعلق اس حقیقت واقعہ سے ہے کہ خدا نے جس طرح مجھ کو پیدا کیا ہے اسی طرح اس نے دوسرے انسانوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ ایک انسان خواہ وہ کوئی بھی مذہب یا کلچر اختیار کرلے اس کی انسانی حیثیت بہر حال باقی رہتی ہے۔ اور اس مشترک حیثیت کی بنا پر وہ تمام لوگوں کے لیے بدستور قابل احترام بنا رہتا ہے۔

جب آپ کسی آدمی کو دیکھیں اور آپ کی نظر اس کے اختلافی پہلو پر چلی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ اس کے بارے میں نفرت اور توحش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ آپ اس کو اس نظر سے دیکھیں کہ وہ ایک انسان ہے۔ وہ خدا کا ایک تخلیقی شاہکار ہے۔ اس کا موجوداتی وجود خدا کی اعلیٰ صفات کی یاد دلاتا ہے۔ تو ایسی حالت میں آپ ظاہری اختلافات کو بھول کر خدا کی خدائی میں گم ہو جائیں گے۔

اب مخلوق کے آئینہ میں آپ کو خالق دکھائی دینے لگے گا۔ انسان کی صورت میں آپ ایک ایسی ہستی کا تصور کرنے لگیں گے جو آپ ہی کی طرح خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جو اتنا ہی محترم ہے جتنا آپ خود اپنے کو محترم سمجھتے ہیں۔ جس کا تعلق خدا کے ساتھ اتنا ہی ہے جتنا خود آپ کا تعلق خدائے رحمٰن و رحیم کے ساتھ ہے۔

کسی انسان کا احترام انسان کے لیے نہیں ہوتا بلکہ خدا کے لیے ہوتا ہے۔ مومن جب کسی انسان کا احترام کرتا ہے تو یہ اس کی طرف سے دراصل اس کے خدائی احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ اور خدائی احساسات کے اظہار کی کوئی حد نہیں۔ اس کا تعلق کانٹے سے بھی اتنا ہی ہے جتنا پھول سے، وہ ایک انسان کے معاملہ میں بھی اسی طرح ظاہر ہوتا ہے جس طرح کسی دوسرے انسان کے معاملہ میں۔

تربیت گاہ

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خیرکم خیرکم لاهله (صحیح الجامع ۱/۳۳۵۱) تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔ یعنی جو آدمی اپنے گھر کے لوگوں سے معاملہ کرنے میں بہتر ہو گا وہی باہر والوں سے معاملہ کرنے میں بھی بہتر ثابت ہو گا۔

گھر ہر آدمی کی فطری تربیت گاہ ہے۔ گھر کے اندر محدود سطح پر وہ سارے معاملات پیش آتے ہیں جو باہر سماج کے اندر زیادہ وسیع طور پر پیش آتے ہیں۔ اس لیے جو آدمی محدود دائرہ میں بہتر انسانیت کا ثبوت دے گا، وہ باہر کے وسیع تر دائرہ میں بھی بہتر انسانیت والا بن کر رہ سکے گا۔

ایک صاحب گورنمنٹ سروس میں تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ بیوی کو دبا کر رکھنا چاہیے۔ گھر کے اندر وہ روزانہ اپنے اسی نظریہ پر عمل کرتے۔ وہ ہمیشہ گھر کی خاتون کے ساتھ سخت انداز میں بولتے۔ وہ ان کے ساتھ شدت والا سلوک کرتے۔ تاکہ وہ ان کے مقابلہ میں دب کر رہیں۔

گھر کی تربیت گاہ میں ان کا جو مزاج بنا اسی کو لے کر وہ دفتر میں پہنچے۔ یہاں ان کی افسر (باس) اتفاق سے ایک خاتون تھیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہاں بھی ان کا وہی گھر والا مزاج قائم رہا۔ وہ اپنی افسر خاتون کے ساتھ بھی اسی قسم کا "مردانہ" معاملہ کرنے لگے جس کے عادی وہ اپنے گھر کی خاتون کے ساتھ ہو چکے تھے۔

لیڈی افسر ابتداءً ان کے ساتھ ٹھیک تھی۔ مگر ان کے غیر معتدل انداز نے لیڈی افسر کو بھی ان سے برہم کر دیا۔ اس نے بگڑ کر ان کا ریکارڈ خراب کر دیا۔ ان کا پروموشن رک گیا۔ وہ طرح طرح کی دفتری مشکلات میں پھنس گئے۔

صحیح اصول وہ ہے جو گھر کے اندر اور گھر کے باہر دونوں جگہ یکساں طور پر مفید ہو۔ یہ اصول شرافت کا اصول ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ گھر کے اندر شرافت کے ساتھ رہے۔ وہ بڑوں کو عزت دے اور چھوٹوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرے۔ یہ اصول گھر کے اندر بھی کامیاب ہے اور گھر کے باہر بھی۔ یہ آدمی کی اپنی ضرورت ہے کہ وہ گھر کے اندر اعتدال کے ساتھ رہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو باہر کی دنیا میں بھی لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک غیر معتدل ہو جائے گا۔

ناقابلِ معافی جرم

سنن ابی داؤد میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ خدا نے فرمایا: کبریائی میری چادر ہے، اور عظمت میری اِزار ہے، پس ان دونوں میں سے کسی میں جو شخص مجھ سے نزاع کرے گا میں اس کو آگ میں پھینک دوں گا (الکبریاءُ ردائی، والعظمۃ إزاری، فمن نازعنی واحداً منھما قذفتہ فی النار) کتاب اللباس ۴/۵۹

اس حدیث میں تمثیل کی زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر قسم کی بڑائی اور ہر قسم کی برتری صرف ایک خدا کا حق ہے۔ جو شخص اس معاملہ میں کلی یا جزئی طور پر خدا کا ہمسر بننا چاہے وہ نہ صرف دنیا میں ذلیل ہوگا بلکہ آخرت میں اس کو شدید تر عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مثال کے طور پر خدا کی عظمت وکبریائی کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہی عزت دینے والا ہے اور وہی ذلت دینے والا۔ وہی کسی کو رزق دیتا ہے اور کسی کو رزق سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کے سوا کسی کو یہ طاقت نہیں کہ کسی کو کچھ دے یا اس سے کوئی چیز چھین لے۔

مثلاً ایک شخص کو کسی آدمی پر غصہ آگیا۔ یہ غصہ انتقام تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے درپے ہوگیا کہ مذکورہ آدمی کو بے عزت کرے، اس کے رزق کا ذریعہ اس سے چھین لے۔ وہ اس کو اس کے ماحول میں بے جگہ بنا دے۔ کسی شخص کی طرف سے اس قسم کی تخریبی کوشش خدا کی عظمت وکبریائی سے گویا نزاع کرنا ہے۔ یہ نعوذ باللہ خدا کے اختیارات کو اس سے چھیننے کی جسارت کرنا ہے۔

اس قسم کا فعل حد درجہ سنگین ہے۔ جو شخص ایسا کرنے کی کوشش کرے وہ بظاہر اپنے حریف کے ساتھ یہ فعل کر رہا ہوتا ہے۔ مگر حدیث کی زبان میں وہ براہ راست خدا سے نزاع کر رہا ہے۔ وہ خدا کے اس نظام میں دخل دینے کی کوشش کر رہا ہے جس میں خدا نے کسی دوسرے کو شریک نہیں کیا۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے خدا کی خدائی میں شریک ہونے کی کوشش کرنا ہے۔ اور خدا کی خدائی میں شریک بننے کی کوشش بلاشبہہ ایک ایسا جرم ہے جو ہرگز قابلِ معافی نہیں۔

انسان کی بڑائی کبر میں نہیں ہے بلکہ تواضع میں ہے۔ انسانیت کی تمام ترقیاں متواضع انسان کے لیے مقدر ہیں نہ کہ متکبر انسان کے لیے۔

لایعنی سے پرہیز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ۔۔۔۔ آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ان کاموں کو چھوڑ دے جن میں کوئی فائدہ نہیں (من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ) ادب الدنیا والدین للبصری صفحہ ۸۳ ۔

سچا انسان ایک بامقصد انسان ہوتا ہے۔ اس کی ساری توجہ ایک متعین مقصد کی طرف لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ مقصدیت اس کے اندر یکسوئی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ اس کام میں مشغول ہوتا ہے جس کا اس کے مقصد سے واضح تعلق ہو اور جو چیز اس کے مقصد کے اعتبار سے غیر متعلق ہو اس سے وہ اپنے آپ کو دور کر لیتا ہے۔

ایسا آدمی ضروری اور غیر ضروری میں فرق کرتا ہے۔ کسی کام کو کرنے سے پہلے وہ دیکھتا ہے کہ یہ کام اس کے مقصد کے اعتبار سے کس حد تک ضروری ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو بولنے سے پہلے سوچتا ہے کہ اس کا بولنا کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے والا ہے یا وہ ایک بے فائدہ کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔ حتی کہ اپنے مقصد کے بارے میں اس کی حساسیت اس کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنی سوچ کے اوپر بھی نگراں بن جائے۔ وہ اپنے دماغ کو ایسی باتیں سوچنے میں استعمال نہ کرے جس کا کوئی مثبت فائدہ اس کو یا انسانیت کو ملنے والا نہیں۔

بے مقصد انسان اور بامقصد انسان کا فرق یہ ہے کہ بامقصد انسان سوچی سمجھی زندگی گزارتا ہے اور بے مقصد انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی واضح نشانہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی منزل کے بغیر اپنی زندگی کے دن گزارتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتا ہے۔

سچا انسان وہ ہے جو بااصول انسان ہو۔ ایسے انسان کی سرگرمیاں اصول کے تحت ہوتی ہیں نہ کہ محض ذاتی خواہش کے تحت۔ ایسا انسان اپنی ذاتی خواہش کو الگ رکھ کر چیزوں کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ ایسے انسان کا حال فطری طور پر یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف انہی چیزوں کو لیتا ہے جن کی کوئی اصولی اہمیت ہو اور جو چیزیں اصول کے اعتبار سے غیر اہم ہوں ان کو وہ چھوڑ دیتا ہے، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی بارونق دکھائی دیتی ہوں۔

اچھا انسان، برا انسان

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — کیا میں تم کو بتاؤں کہ تم میں سب سے زیادہ برے لوگ کون ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسولؐ۔ آپ نے فرمایا۔ تم میں سب سے زیادہ برے وہ ہیں جو چغلی کرتے پھریں، جو دوستوں کے درمیان بگاڑ ڈالیں۔ جو لوگوں کے عیوب تلاش کریں (عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال: الا اخبرکم بشرارکم، فقالوا بلیٰ یا رسول اللہ، قال: من شرارکم المشاؤون بالنمیمۃ، المفسدون بین الاحبۃ الباغون للعیوب) ادب الدنیا والدین للبصری صفحہ ۲۲۲

فطرت کے نقشہ میں ہر انسانی کردار کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ مثالیں اس لیے ہیں کہ انسان ان پر غور کرے، وہ ان سے نصیحت لے۔ اور پھر وہ اچھے کردار کو اپنائے اور جو برا کردار ہے اس سے دور رہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ دنیا میں دو قسم کی مکھیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہد کی مکھی، جو ہمیشہ خوشبو اور مٹھاس کی تلاش میں ہوتی ہے۔ وہ جس پھول میں خوشبو اور مٹھاس دیکھتی ہے فوراً اڑ کر وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح وہ پھولوں کی مٹھاس لے کر اسے جمع کرتی ہے تاکہ وہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچا سکے۔ دوسری مثال عام مکھی کی ہے۔ اس کو گندگی سے دل چسپی ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت اڑتی رہتی ہے۔ صرف اس لیے کہ جہاں وہ گندگی پائے وہاں پہنچ کر اس سے اپنا حصہ وصول کرے۔

اسی طرح انسانوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ انسان جو بھلائی کو پسند کرتا ہو۔ وہ لوگوں کے درمیان جائے تو ان سے ان کی بھلی باتوں کو لے اور اسے دوسروں تک پہنچائے۔ وہ لوگوں کے درمیان اچھی اور بھلی باتوں کا سفیر بن جائے۔ یہی وہ انسان ہے جس کو بہتر انسان کہا جائے۔ ایسا انسان فطرت کا مطلوب انسان ہے۔ فطرت کے تمام اعلیٰ امکانات ایسے ہی لوگوں کے لیے مقدر کیے گئے ہیں۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کی روح کو برائیوں کے تذکرہ سے غذا ملتی ہو۔ ایسا انسان جب لوگوں سے ملتا ہے تو اس کی ساری دل چسپی یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی برائیوں کو تلاش کرے اور اگر کوئی برائی نہ ملے تو فرضی طور پر خود ساختہ برائیوں کو ان کی طرف منسوب کر دے، اور پھر ان فرضی یا واقعی برائیوں کو لوگوں سے بیان کرتا رہے۔

فخر و ناز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فخر و ناز نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو (ان العجب لیأکل الحسنات کما تأکل النار الحطب) احیاء علوم الدین للغزالی ۳

انسان کے اندر فطری طور پر انا کا جذبہ رکھا گیا ہے، کوئی بھی شخص نہیں جو اس احساس سے خالی نہیں۔ یہ جذبہ انسان کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے، وہ اس لیے ہے کہ آدمی کے اندر عزم و ہمت پیدا ہو۔ وہ جوکھم کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھے۔ وہ خود اعتمادی کی طاقت سے مسلسل آگے بڑھتا رہے۔

مگر اکثر لوگ اس جذبہ کا برا استعمال کرتے ہیں۔ ان کا انا کا جذبہ خود اعتمادی کے بجائے خود پسندی اور ذاتی فخر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ انا کے جذبہ کا غلط استعمال ہے۔ اور کسی چیز کا غلط استعمال ہمیشہ اس کو برا بنا دیتا ہے، خواہ حقیقت کے اعتبار سے وہ چیز کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔

فخر و ناز کا جذبہ کوئی سادہ چیز نہیں۔ وہ انسان کی تمام خوبیوں کو کھا جاتا ہے، وہ انسان کے اندر اعلیٰ خصوصیات کے ارتقاء میں ایک مستقل رکاوٹ ہے۔ فخر کی نفسیات آدمی کو خود پسند بنا دیتی ہے، اور جو آدمی خود پسند ہو جائے اس نے گویا اپنے آپ کو ذاتی خول میں بند کر لیا۔ ایسا آدمی اس صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے کہ وہ خارجی حقیقتوں کو سمجھے، وہ دوسروں سے فائدہ اٹھائے، وہ اپنے سے باہر کی چیزوں کو اپنی ترقی کا زینہ بنا سکے۔

ایسا آدمی کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو اس میں بھی اس کا فخر کا جذبہ شامل رہتا ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے خود نمائی کے لیے کرتا ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا محور اس کی اپنی ذات بن جاتی ہے، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ آدمی کی سرگرمیوں کا محور وہ حقیقت ہو جو اس کے باہر اعلیٰ سطح پر قائم ہے۔

فطرت انسان کے اندر تواضع دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن فخر پسند آدمی کبر کی تصویر بنا ہوا ہے۔ فطرت حقیقتوں کے اعتراف کو پسند کرتی ہے، مگر ایسا آدمی بے اعترافی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ فطرت تمام انسانوں کو ایک نظر سے دیکھتی ہے اور ایسا آدمی چاہتا ہے کہ اس کو استثنائی مقام دیا جائے۔ فطرت کے ساتھ اس قسم کی عدم مطابقت موجودہ دنیا میں قابل عمل نہیں۔

پڑوسی کا حق

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے، خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کون۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جس کا پڑوسی اس کی زیادتیوں سے امن میں نہ ہو (قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ لا یؤمن، واللہ لا یؤمن، واللہ لا یؤمن، قیل من یا رسول اللہ؟ قال الذی لا یأمن جارہ بوائقہ) بخاری، کتاب الادب۔ مسلم، کتاب الایمان۔

انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ وہ جہاں بھی رہتا ہے ایک سماج کے اندر رہتا ہے حتی کہ آدمی جب سفر کرتا ہے اس وقت بھی کچھ لوگ اس کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ یہ تمام لوگ انسان کے پڑوسی ہیں۔

اب ایک انسان وہ ہے جو لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے ان کی پوری طرح رعایت کر رہا ہو۔ وہ ایسی بات نہ کہے جس سے لوگوں کے جذبات بھڑکیں۔ وہ ایسا کام نہ کرے جو اس کے قریبی لوگوں کے لیے مسئلہ پیدا کرنے والا ہو، وہ اپنی زندگی کے لیے سرگرم ہو مگر اس طرح کہ اس کی سرگرمی دوسروں کے لیے نقصان یا پریشانی کا سبب نہ بنے۔ یہ وہ انسان ہے جس نے اپنے پڑوسی کا حق ادا کیا۔

دوسرا انسان وہ ہے جو صرف اپنی رعایت کرنا جانتا ہو، دوسروں کی رعایت سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ایسا انسان دوسروں کے لیے مستقل مسئلہ بنا رہے گا۔ وہ اپنے غیر محتاط بول سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے گا۔ وہ ایسی کارروائیاں کرے گا جو دوسروں کا امن و سکون چھین لینے والی ہوں، وہ جب اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہے گا تو اس کے لیے وہ ایسی غیر ذمہ دارانہ کارروائیاں کرے گا جو دوسروں کی زندگی میں خلل ڈالنے والی ہوں۔ ایسا انسان اپنے قریبی لوگوں کے لیے برا پڑوسی ہے۔

جو آدمی اپنے پڑوسی کے لیے اچھا ہو، وہی اچھا انسان ہے، اور جو آدمی اپنے پڑوسیوں کے لیے برا ہو وہی برا انسان۔ اپنے فائدہ کے لیے دوسرے کو نقصان پہنچانا بلاشبہ ایک جرم ہے اور کون شخص اس جرم کا مجرم ہے، اس کو جاننے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ اس آدمی کا پڑوس ہے۔ پڑوسی انسان گویا خدا کی عدالت ہے۔ جس انسان کے بارہ میں اس کے پڑوسی اچھی رائے رکھیں وہ اچھا انسان ہے اور جس انسان کو اس کے پڑوسی برا سمجھیں وہ بلاشبہ برا انسان۔

اخلاقی کنٹرول

ابو مسعود البدری ایک صحابی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک بار وہ اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وہاں آ گئے۔ آپ نے یہ دیکھ کر کہا کہ اے ابو مسعود جان لو کہ اللہ تمہارے اوپر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنا تم اس غلام پر قدرت رکھتے ہو۔ یہ سن کر ابو مسعود کے ہاتھ سے کوڑا گر گیا۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ میں کبھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے غلام کو آزاد کر دیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو آگ تم کو پکڑ لیتی (صحیح مسلم بحوالہ ریاض الصالحین، صفحہ ۳۹۸)

دنیا میں ظلم و زیادتی کی جتنی صورتیں ہیں ان سب کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک انسان کا سابقہ جب کسی دوسرے انسان سے پیش آتا ہے تو وہ اس کو صرف ایک انسانی معاملہ سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ بس ایک انسان ہے اور اگر میں اس کے ساتھ ظلم یا بے انصافی کروں تو اس کے آگے کہیں میری پکڑ ہونے والی نہیں۔

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانوں کے اوپر ایک برتر طاقت ہے اور وہ خدا ہے۔ خدا ہر انسان کی نگرانی کر رہا ہے۔ جو شخص کسی دوسرے کو ناحق ستائے یا اس کے ساتھ بے انصافی کرے تو خدا ایسے شخص کو پکڑے گا اور اس کو اس کے فعل کی سخت سزا دے گا۔

خدائی پکڑ کا یہ احساس کسی انسان کے لیے سب سے بڑا روک ہے۔ وہ انسان کو بتاتا ہے کہ جس معاملہ کو تم صرف ایک انسانی معاملہ سمجھ رہے ہو وہ حقیقۃً ایک خدائی معاملہ ہے۔ کسی انسان کے مقابلہ میں تم طاقت ور ہو سکتے ہو، مگر خدا کے مقابلہ میں کوئی بھی طاقت ور نہیں۔ خدا کی پکڑ جب ظاہر ہوگی تو نہ کوئی طاقت والا اس کی زد سے بچے گا اور نہ کوئی بے طاقت والا۔

مذکورہ عقیدہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاقی کنٹرول میں رکھے۔ وہ اپنی آزادی کو کسی بھی حال میں غلط طور پر استعمال نہ کرے۔ اگر آپ کو اس حقیقت کا یقین ہو جائے تو کوئی انسان آپ کو کمزور نہیں دکھائی دے گا جس کو آپ دبائیں، اور نہ کوئی انسان آپ کو بے یار و مددگار نظر آئے گا جس کے اوپر اپنی ظالمانہ کارروائیوں کے لیے آپ دلیر ہو جائیں۔

غصہ نہیں

حدیث میں ہے کہ ایک شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے کچھ ایسی باتیں بتائیے جن کے تحت میں زندگی گزاروں اور وہ زیادہ نہ ہوں کہ میں بھول جاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ تم غصہ نہ کرو (عَنْ حُمَیْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ أَنَّ رَجُلًا أَتٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ عَلِّمْنِیْ کَلِمَاتٍ أَعِیْشُ بِہِنَّ وَلَا تُکْثِرْ عَلَیَّ فَأَنْسٰی، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: "لَا تَغْضَبْ") مؤطا امام مالک، صفحہ ۶۵۲

غصہ تمام انسانی خرابیوں کی جڑ ہے۔ جو آدمی اپنے غصہ پر قابو پالے وہ بقیہ تمام خرابیوں سے اپنے آپ بچ جائے گا۔ کسی آدمی کو اگر صرف ایک جامع اور کلیدی نصیحت کرنی ہو تو وہ صرف یہ ہوگی ——— اپنے آپ کو غصہ سے بچاؤ۔

غصہ کا مزاج ہر انسان میں ہوتا ہے۔ مگر عام حالات میں غصہ آدمی کے اندر سویا ہوا ہوتا ہے۔ یہ غصہ صرف اس وقت جاگتا ہے جبکہ کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آکر اس کو جگا دے۔

دنیا کی زندگی میں یہی آدمی کا امتحان ہے جب وہ کسی کی زبان سے کڑوی بات سنے اور اس کے سینہ میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھے تو آدمی کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ غصہ کی آگ کو بجھائے نہ یہ کہ غصہ کی آگ کو اتنا بھڑکائے کہ خود بھی اس میں جل کر ختم ہو جائے۔

کامیاب انسان وہ ہے جس کا یہ حال ہو کہ غصہ کے حالات میں بھی وہ غصہ نہ کرے۔ اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہ ہو۔ ایسا آدمی معاملہ کو بڑھائے بغیر ابتدائی مرحلہ ہی میں اس کو ختم کر دے گا۔ غصہ نہ کرنے کی عادت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے فائدہ طور پر ضائع ہونے سے بچا لیتا ہے۔ وہ ناموافق حالات میں بھی اپنے لیے موافق امکانات دریافت کر لیتا ہے۔

غصہ نہ کرنا عالی ظرفی کی علامت ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو آدمی غصہ کرے وہ اپنے اس عمل سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ ظرف کی بلندی کی صفت اس کے اندر موجود نہیں۔

انسان کو ستانا

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — تم لوگ خدا کے بندوں کو تکلیف نہ دو، اور ان کو عار نہ دلاؤ۔ اور ان کی پوشیدہ باتوں کو تلاش نہ کرو (لا تؤذوا عباد اللہ ولا تعیروہم ولا تطلبوا عوراتہم) مسند احمد بحوالہ جامع العلوم والحکم، صفحہ ۲۹۳

اچھا انسانی سماج بنانے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے اندر اخلاقی احساس زندہ ہو۔ وہ دوسروں کی رعایت کرنا جانتے ہوں، وہ اپنے اوپر دوسروں کا یہ حق سمجھتے ہوں کہ انھیں دوسروں کے لیے ہرگز مسئلہ نہیں بننا ہے، حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ ان کے پاس بظاہر اس کے لیے کوئی عذر موجود ہو۔

ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ سماج کے اندر اس طرح رہے کہ اس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کو اپنی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکالنے چاہئیں جس سے دوسروں کے جذبات مجروح ہونے والے ہوں۔ اس کو ایسی کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیے جس میں اس کی اپنی ذات کے لیے تو فائدہ ہو مگر دوسروں کے لیے وہ نقصان کا سبب بن جائے۔ ایسا ہر قول اور عمل گویا دوسروں کو ستانا ہے اور جو آدمی دوسرے انسانوں کو ستائے وہ ایک بے قیمت آدمی ہے خدا کی نظر میں بھی اور بندوں کی نظر میں بھی۔

آدمی کے ساتھ کبھی ایسا واقعہ پیش آتا ہے یا اس سے کوئی ایسی غلطی ہو جاتی ہے جس کے بارہ میں اس کو شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی بات کا تذکرہ کرکے اس کو عار دلانا درست نہیں۔ تم وہی تو ہو جس نے ایسا کیا یا جس کے باپ نے ایسا کیا، اس قسم کی باتیں کہہ کر کسی کو شرمندہ کرنا ایک غیر انسانی فعل ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دوسرے کی عزت وحرمت کا بھی اتنا ہی لحاظ کرے جتنا وہ خود اپنی عزت وحرمت کا لحاظ کرتا ہے۔ ہر آدمی کی کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں، جن کو وہ پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ دوسرے لوگ اسے جانیں۔ جو شخص لوگوں کی ایسی باتوں کے پیچھے پڑے، وہ کھود کرید کر ان کا پتہ لگائے اور لوگوں کے درمیان ان کو پھیلائے، وہ ایک ایسا غیر اخلاقی فعل کرتا ہے جو اچھا سماج بنانے کی راہ میں مستقل رکاوٹ ہے۔

زبان کا استعمال

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ سب سے بڑے گناہ گار وہ لوگ ہیں جو بہت زیادہ بے فائدہ باتیں کریں (اکثر الناس ذنوبا اکثرھم کلاما فیما لایعنیہ) جامع العلوم والحکم، صفحہ ۹۱

انسان کو جو قیمتی چیزیں دی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک نہایت قیمتی چیز زبان ہے۔ زبان کے ذریعہ آدمی بولتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ دوسروں سے تبادلہ خیال کرتا ہے۔ زبان دوسروں سے تعلق قائم کرنے کا سب سے زیادہ اہم ذریعہ ہے۔ اس اعتبار سے زبان ایک ایسی نعمت ہے جو اس دنیا میں انسان کے سوا کسی اور کو نہیں دی گئی۔

زبان کو اگر بقدر ضرورت استعمال کیا جائے تو اس میں انسان کے لیے نہایت عظیم فائدے ہیں۔ لیکن اگر زبان کو غیر ضروری کاموں میں استعمال کیا جانے لگے تو یہ انتہائی مفید چیز انسان کے لیے ایک انتہائی مضر چیز بن جائے گی۔

زیادہ بولنے کا مطلب دوسرے لفظوں میں کم سوچنا ہے۔ جو آدمی ہر وقت بولتا رہے وہ اس سے محروم ہو جائے گا کہ وہ دوسروں کی باتیں سنے اور اس سے اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔ زیادہ بولنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر علم و فکر کی صلاحیت ترقی نہ کر سکے۔

یہ زبان کے بے ضرورت استعمال کا نتیجہ تھا۔ لیکن جب زبان کو غلط طور پر استعمال کیا جانے لگے تو اس کا نقصان اتنا زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ اس کا حساب لگانا ممکن نہیں۔

زبان کا غلط استعمال یہ ہے کہ آدمی اس کو دوسروں کی برائی کرنے میں استعمال کرے۔ وہ افواہوں کو پھیلائے اور غلط معلومات کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کرے۔ وہ زبان کے ذریعہ ایسی باتیں کرے جس سے لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف بے اعتمادی پیدا ہو۔ لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں، لوگ ایک دوسرے کے خلاف غیر ضروری شک میں مبتلا ہو جائیں۔

بے فائدہ کلام اگر زبان کی نعمت کی ناقدری ہے تو غلط کلام زبان کی نعمت کا برا استعمال ہے۔ اور خدا کی نظر میں دونوں ہی یکساں طور پر جرم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بدلہ لینا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ (اگر تم بدلہ لو تو اسی کے مثل بدلہ لو جو تمہارے ساتھ کیا گیا ہے۔ النحل ۱۲۶)

یہاں الفاظ بظاہر عام ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب لینا سراسر غلط ہوگا کہ کوئی شخص آپ کو گالی دے تو آپ بھی اس کے جواب میں اس کو اسی طرح گالی دینے لگیں۔ یہاں اگرچہ کوئی شرط مذکور نہیں مگر وہ یہاں مفہوم (understood) ہے۔ وہ شرط یہ کہ تم جو بدلہ لو وہ اسلامی اخلاق کے دائرہ میں ہو نہ کہ اس سے باہر۔ معروف اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی ہم اپنے کسی مخالف کا جواب دے سکتے ہیں نہ کہ معروف اسلامی اور اخلاقی حدود کے باہر۔

مثلاً اگر کسی نے ہمارے خلاف نعرہ لگایا ہے تو ہم اس کو پتھر نہیں مار سکتے۔ کسی سے ہم کو اصولی اختلاف ہے تو ہم الزام تراشی کے انداز میں اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ کسی قوم کے ایک فرد نے زیادتی کی ہے تو ہم اس قوم کے دوسرے افراد سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے۔ کسی نے الفاظ کے ذریعہ ہماری دل آزاری کی ہے تو ہم گولی اور بم سے اس کو سزا نہیں دے سکتے۔ کسی نے ہم کو مالی نقصان پہونچایا ہے تو ہم اس کو قتل کر کے اس سے انتقام نہیں لے سکتے۔

اسی کے ساتھ اس کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بدلہ لینے کی بھی ایک حد ہے۔ مومن اسلامی اخلاق کے باہر جا کر کسی سے بدلہ نہیں لے سکتا۔ مثلاً کوئی گالی دے تو وہ اس کو گالی نہیں دے گا۔ کوئی الزام تراشی کرے تو وہ اس کے جواب میں الزام تراشی نہیں کرے گا۔ کوئی شخص کمینہ پن کا انداز اختیار کرے تو وہ اس کے لیے کمینہ نہیں بن جائے گا۔

ایسے مواقع پر مومن کو بدلہ لینے کے بجائے اعراض کرنا ہے۔ مومن اسلامی اخلاق کے دائرہ میں بدلہ لے سکتا ہے۔ اگر معاملہ اسلامی اخلاق کے دائرہ کے باہر کا ہو تو وہ خود صبر کرے گا اور معاملہ کو خدا کے حوالے کر کے خاموش ہو جائے گا۔

برابر کا بدلہ لینا اسلام میں جائز ہے۔ مگر بدلہ لینا اتنا نازک کام ہے کہ جو شخص خدا سے ڈرتا ہو اس کو زیادہ محفوظ طریقہ سمجھے گا کہ بدلہ لینے کے بجائے اسے معاف کر دے۔

شک سے بچیے

جو لوگ آخرت کو (یا امور غیب کو) نہیں مانتے، وہ کس نفسیات کے تحت ایسا کرتے ہیں، اس کو قرآن کی سورہ نمبر ۲۷ میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کے بارہ میں ان کا علم الجھ گیا ہے۔ بلکہ وہ اس کے بارہ میں شک میں مبتلا ہیں بلکہ وہ اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں (بل ادارك علمهم في الآخرة بل هم في شك منها بل هم منها عمون) النمل ۶۶

اس آیت میں اِدّارَکَ کا لفظ بے حد اہم ہے۔ ادّارک کی اصل تدارکَ ہے۔ پھر ادغام کے اصول کے مطابق، ت کا حرف دال میں مدغم ہوگیا (لسان العرب ۱۰/۴۱۹) ادّارک یا تدارک کے ابتدائی معنی ہیں باہم مل جانا۔ قرآن میں ہے کہ حتیٰ اذا ادارکوا فیھا جمیعا (یہاں تک جب وہ سب لوگ اس میں اکٹھا ہو جائیں گے)

مختلف چیزیں جب اکٹھا ہوتی ہیں تو اس کا ایک نتیجہ اختلاط کی صورت میں نکلتا ہے۔ یعنی چیزیں باہم مل کر گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ادّارک میں اختلاط اور گڈمڈ ہونے کا مفہوم پیدا ہوگیا۔ مذکورہ آیت میں اس لفظ کا یہی نتیجہ والا مفہوم مراد ہے۔ یعنی آخرت کے بارہ میں مختلف رایوں کی وجہ سے ان کے اندر ذہنی الجھن کی کیفیت پیدا ہوئی جو بالآخر شک اور اندھے پن تک پہنچ گئی۔

موجودہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس مصلحت کی بنا پر یہاں التباس (الانعام ۹) کا قانون جاری ہے۔ یہاں حقیقتوں کو برہنہ صورت میں نہیں لایا جاتا بلکہ ملتبس صورت میں لایا جاتا ہے۔ کوئی حقیقت خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ ثابت کر دی جائے، ایک عنصر اس میں اشتباہ والتباس کا باقی رہتا ہے۔ یہی چیز شک کا باعث بنتی ہے۔ آدمی اس شک والے پہلو کو لے کر طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ایسا ہو جاتا ہے گویا وہ اندھا ہے اور اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

یہ شک کا پہلو امتحان کا تقاضا ہے۔ اس لیے وہ لازماً موجود رہے گا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر شک کے پردہ کو پھاڑے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اس دنیا میں کبھی یقین کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔

شک سے بچیے۔ شک تمام گمراہیوں کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔

صبر و تقویٰ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کی ہے۔ (الذاریات ۴۹) یہ فطرت کا ایک آفاقی اصول ہے۔ یہاں جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے وہ دو چیزوں کے تعامل سے رونما ہوتا ہے۔ کوئی بھی چیز تنہا اس دنیا میں کوئی واقعہ یا تعجب ظاہر نہیں کر سکتی۔

اس اصول کا تعلق اجتماعی زندگی سے بھی ہے۔ اس کو ایک پرانی مثل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ایک آدمی اپنا ہاتھ فضا میں ہلاتا رہے تو اس سے تالی نہیں بجے گی۔ تالی بجنے کے لیے ضروری ہے کہ دوسرا ہاتھ اس سے ٹکرائے۔ جب تک دوسرا ہاتھ نہ اٹھے تالی کا بجنا بھی رکا رہے گا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کی ضرر رسانی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مخالف کی ضرر رسانی کا ارادہ اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ فریق ثانی بھی اپنی نادانی یا سادہ لوحی سے اس کے ساتھ تعاون کا معاملہ کر بیٹھے۔ فریق ثانی اگر "دوسرا ہاتھ" بننے سے رک جائے تو دشمن کی مخالفانہ تالی بھی بجنے والی نہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ اہل اسلام کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کو اہل اسلام سے سخت بغض اور عداوت ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ :

وإن تصبروا وتتقوا لا يضركم كيدهم شيئا إن الله بما يعملون محيط (آل عمران ۱۲۰)

اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے۔

اس آیت کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ ——— دشمن کی سازش صرف ۵۰ فی صد کی حد تک کارگر ہے۔ وہ اپنی تکمیل تک صرف اس وقت پہنچتی ہے جب کہ فریق ثانی اپنی کسی غلطی سے اس کے منصوبہ کا بقیہ ۵۰ فی صد حصہ پورا کر دے۔ صبر و تقویٰ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے منصوبہ کا یہ بقیہ نصف حصہ دشمن کو حاصل نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو اس کی مخالفانہ تدبیر لازمی طور پر بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔

اس قانون کے تحت اللہ تعالیٰ نے آپ کے معاملہ کو خود آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔

حدیدی کردار

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز (الحدید)

ہم نے اپنے رسول بھیجے نشانیوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتارا تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا اس میں سخت طاقت ہے اور لوگوں کے لئے فائدہ ہے۔ اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اللہ اور رسول کی بن دیکھے۔ بے شک اللہ قوی اور زبردست ہے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مادی چیزیں انسانی اخلاقیات کے لئے تمثیل کا کام کرتی ہیں۔ اوپر کی آیت میں اس سلسلہ میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک میزان (ترازو) اور دوسرے حدید (لوہا)

ترازو کیا کام کرتا ہے۔ ترازو تولنے کا ذریعہ ہے۔ کسی چیز کے متعلق جاننا ہو کہ وہ وزن میں پوری ہے یا کم ہے تو اس کو ترازو میں رکھ کر تولتے ہیں۔ اس سے اس کی حالت پوری طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ خدا کی کتاب اسی طرح انسانی اخلاقیات کے لئے ترازو ہے۔ عام ترازو چیزوں کے وزن کو بتاتا ہے اور خدا کی کتاب اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کو۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا رویہ موجودہ دنیا میں درست رہے تاکہ وہ آخرت کی کامیابی حاصل کرے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ خدا کے ترازو سے اپنے قول وعمل کو تولتا رہے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ اگلی دنیا میں ناکام و نامراد ہو کر رہ جائے گا۔

دوسری تمثیل حدید (لوہے) کی ہے۔ حدید کی معروف حیثیت کیا ہے۔ وہ قابل اعتماد شدت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس پل یا عمارت کو لوہے پر کھڑا کیا جائے اس کے بارہ میں پورا اعتماد رہتا ہے کہ وہ طوفانوں کے مقابلہ میں بھی پوری طرح قائم رہے گی۔ اسی قسم کے انسان خدا کے دین کی نصرت کے لئے مددگار ہیں۔ خدا کے دین کی نصرت وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے اندر حدیدی کردار ہو۔ جن کے قول پر پورا اعتماد کیا جا سکے۔ جو مشکل حالات میں بھی کوئی کمزوری نہ دکھائیں، جو نفس اور شیطان کے دباؤ کے مقابلہ میں اسٹیل کی طرح بے لچک ثابت ہوں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۰ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

تصحیح

ماہنامہ الرسالہ فروری ۱۹۹۸، صفحہ ۲۵ کی آخری سطر اور صفحہ ۲۶ کی ابتدائی تین سطریں کسی قدر ترمیم و تبدیلی کے ساتھ براہ کرم اس طرح پڑھیں:

میں نہایت پرجوش باتیں کیں۔ ان کی بات کو ان کے ایک ساتھی نے مذکورہ تاریخ کے تحت اپنی دستخط کے ساتھ حسب ذیل الفاظ میں لکھا: "ہندستان سے علاحدگی کے بعد جو کشمیر بنے گا، انشاء اللہ وہ کشمیر اسلامی کشمیر ہوگا"۔ اس تحریر کے نیچے ڈائری میں میری رائے ان الفاظ میں لکھی ہوئی ہے: "میرے

ایڈیٹر ماہنامہ الرسالہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near pvs Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn,
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

مئی ۱۹۹۸، شمارہ ۲۵۸

اسلامی مشورہ

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ لیا کرو (وشاورھم فی الامر، آل عمران ۱۵۹) دوسری جگہ عام مسلمانوں کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنا کام آپس کے مشورے کرتے ہیں (وامرھم شوریٰ بینھم، الشوریٰ ۳۸)

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ لوگوں سے مشورہ کرتا ہو (ما رأیت رجلاً اکثر استشاراً للرجال من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، التفسیر المظہری)

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ صحابہ کے بارہ میں بتاتے ہیں کہ میں نے کسی کو اصحاب رسول سے زیادہ مشورہ کرنے والا نہیں پایا (ما رأیت احداً اکثر مشاورۃ من اصحاب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، تفسیر الکشاف)

حسن بصریؒ کا قول ہے کہ جب بھی کوئی گروہ مشورہ سے کام کرتا ہے تو وہ ضرور صحیح ترین رائے تک پہنچ جاتا ہے (ما شاور قوم قط الا ھدوا لارشد امورھم، صفوۃ التفاسیر) ۲۴۷/۱

مشورہ کا مطلب یہ ہے کہ مختلف لوگوں کی معلومات اور ان کے تجربات کو حاصل کیا جائے اور پھر ان کی روشنی میں زیر بحث معاملہ کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر مشورہ دینے والے سنجیدہ ہوں، اور مشورہ لینے والے حق پسند ہوں تو مشورہ اتنا مفید ثابت ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مفید کوئی چیز نہیں۔ مشورہ امکانی نقصانات سے بچنے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہے۔

مشورہ دینے والے کو چاہیے کہ جو کچھ بولے سوچ کر بولے، اور اپنی رائے پر کبھی اصرار نہ کرے۔ مشورہ لینے والے کو چاہیے کہ وہ کسی بات کو وقار کا مسئلہ نہ بنائے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف بات کہے تب بھی اس کو خالی الذہن ہو کر سنے۔ حتی کہ کوئی شخص سخت انداز میں تنقید کرے، تب بھی اس کے الفاظ یا لہجہ کی سختی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی اصل رائے پر غور کرے۔

اگر مشورہ دینے والے اور مشورہ لینے والے دونوں مشورہ کے ان آداب کو سمجھیں اور ان کو پوری طرح ملحوظ رکھیں تو ہر مشورہ لازمی طور پر مفید ثابت ہوگا اور صحیح فیصلہ تک پہنچانے والا بن جائے گا، فرد یا ادارہ کے معاملہ میں بھی اور پوری قوم کے معاملہ میں بھی۔

مشورہ ایک اسلامی طریقہ ہے۔ مشورہ کامیابیوں کا زینہ ہے۔

حسرت کا عذاب

موجودہ زندگی میں سب سے بڑا عذاب حسرت کا عذاب ہوتا ہے۔ آدمی کسی قیمتی موقع کو کھو دے تو اس کو سوچ کر ہمیشہ آہیں بھرتا ہے۔ کھوئے ہوئے مواقع کا غم کبھی آدمی کے سینے سے نہیں نکلتا۔ غالباً یہی معاملہ آخرت میں بھی ہوگا۔ آخرت کی دنیا میں بھی کسی انسان کے لئے سب سے بڑا عذاب غالباً حسرت کا عذاب ہوگا۔ موجودہ دنیا کے کھوئے ہوئے مواقع اس کے اوپر تیغ یادوں کو مسلط ہوجائیں گے۔ یہ ایک ناقابل برداشت غم ہوگا جس سے آدمی کبھی نجات نہ پاسکے گا۔

آدمی کی موجودہ عمر جب ختم ہوجائے گی اور وہ ہمیشہ کے لئے آخرت کی دنیا میں پہنچ جائے گا تو اس کو ایک ایک کرکے وہ لمحات یاد آئیں گے جو موجودہ دنیا میں اس کے ساتھ گزرے تھے۔ مگر اس نے اُن لمحات کو نظر انداز کیا۔ ان کو وہ اپنے اعمال نامہ کا حصہ نہ بنا سکا۔

وہ کرب ناک احساس کے ساتھ سوچے گا کہ کیسے کیسے قیمتی مواقع مجھے ملے تھے جب کہ میں ایک عمل کا ثبوت دے کر یہاں خدا کی رضا جیسی نعمت کو پاسکتا تھا۔ مگر میری بھول نے مجھ کو محروم رکھا۔ میں اس قیمتی موقع کو استعمال نہ کرسکا۔ خدا نے مجھے ایک شاندار امکان کے کنارے پہنچایا مگر اس امکان کو میں اپنے لئے واقعہ نہ بنا سکا۔

میرے سامنے فلاں صداقت ظاہر ہوئی مگر میں اس کے حق میں اعتراف کا کلمہ نہ بول سکا۔ فلاں موقع پر میں نے حق کو مظلوم ہوتے ہوئے دیکھا مگر میں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ فلاں بندۂ خدا کا فلاں حق میرے ذمہ تھا مگر میں اس کو اس کا حق لوٹانے پر راضی نہ ہوا۔ فلاں موقع پر میرے دل کی دھڑکنوں نے تیز ہوکر مجھے الارم دیا تھا مگر اس خدائی الارم کو شعوری کوشش کرکے میں نے اسے بھلا دیا۔ فلاں ٹھوکر نے مجھے انتباہ دیا تھا کہ تم غلط راستہ پر جارہے ہو مگر میں نے اس کی پروا نہیں کی اور بدستور اسی غلط راستہ پر چلتا رہا۔

عمل کی دنیا سے نکل کر جب آدمی نتیجۂ عمل کی دنیا میں پہنچے گا تو اس قسم کی بے شمار باتیں اسے یاد آئیں گی۔ وہ آہوں کی زبان میں سوچے گا کہ دنیا کے ان مواقع کو اگر میں استعمال کرتا تو اب آخرت کے عالم میں کتنے جنتی محلات کا مالک بن سکتا تھا۔ مگر ان مواقع کو برباد کرکے میں نے اپنی زندگی کو برباد کردیا۔ یہ مواقع اب ابدی طور پر مجھ سے کھوئے جاچکے ہیں۔ اس لئے اس کا برا انجام بھی اب ابدی طور پر مجھے برداشت کرنا ہے۔

قانون ہشت

اگر آپ ایک چکور کاغذ لیں اور اس کو موڑنا شروع کریں تو آپ صرف آٹھ موڑ تک اس کو موڑ پائیں گے۔ اس کے بعد نواں موڑ یا دسواں موڑ آپ کے لیے ناممکن ہو جائے گا۔ یہ اصول ہر حال میں درست ہے خواہ آپ کا کاغذ پوسٹ کارڈ کے برابر ہو یا روزنامہ اخبار کے برابر یا کسی بہت بڑے چادر کے برابر۔ ہر حال میں آپ کا موڑنا آٹھ پر جا کر رک جائے گا۔ اس کے آگے وہ نہیں بڑھے گا۔

یہ قانون ہشت (آٹھ کا قانون) ہے۔ یہ فطرت کا قائم کردہ ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں مانع قوانین موجود ہیں جو کسی کی سرگرمیوں کو ایک حد پر جا کر روک دیتے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے طاقتور کے لیے بھی اس حد بندی کو توڑنا ممکن نہیں۔

اس دنیا میں ایٹم بم صرف ایک بار گرایا جا سکتا ہے، بار بار ایٹم بم گرانا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس دنیا میں ایک شخص ظالمانہ الفاظ بولنے کے لیے آزاد ہے مگر اپنے ظالمانہ الفاظ کو واقعہ بنانا اس کے لیے ممکن نہیں۔ کوئی شخص ایک عبادت خانہ کو ڈھا سکتا ہے مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ سارے ہی عبادت خانوں کو ڈھا دے۔ ایک شخص منفی نعرے لگا کر اقتدار تک پہنچ سکتا ہے مگر کوئی بھی اقتدار اس کے لیے کافی نہیں کہ وہ اپنے نعروں کو تاریخ کا درجہ دے دے۔

فطرت کا یہ اٹل قانون اس دنیا میں ہر انسان کے لیے امن اور تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ جب تک یہ دنیا موجود ہے اس کا یہ قانون بھی لازمی طور پر موجود رہے گا۔ فطرت کا یہ قانون صرف اس وقت ختم ہوگا جب کہ خود یہ دنیا ہی ختم ہو جائے اور کوئی شخص یہاں باقی ہی نہ رہے جو ظالمانہ الفاظ بول کر لوگوں کو ڈرائے یا مفسدانہ منصوبہ بنا کر لوگوں کے اندر عدم تحفظ کا احساس پیدا کرے۔

فطرت کا یہ ناقابل تغیر قانون اپنی خاموش آواز میں کہہ رہا ہے کہ اے لوگو، تم اپنے آپ کو خود اپنے ظلم سے بچاؤ۔ کیوں کہ تم سے باہر کوئی بھی نہیں جو تم کو اپنے ظلم و فساد کا نشانہ بنا سکے۔

اسی قانون ہشت کو قرآن میں قانون دفع کہا گیا ہے۔ یعنی روک کا قانون، جو ہر چیز کو ایک متعین حد پر رہنے کے لیے مجبور کر دے۔

کسب اور وہب

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول میں تمہارے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ یہ ایک سادہ اور واضح بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنے منتخب پیغمبر کو براہ راست علم حقیقت عطا کیا اور بقیہ لوگوں کے لئے پیغمبر کو اس کے حصول کا ذریعہ بنا دیا۔ پیغمبر نے جو عمل بلا واسطہ خدائی حکم کے تحت کیا، اسی کو ہمیں پیغمبرانہ تقلید کے طور پر بالواسطہ انداز میں انجام دینا ہے۔

مگر کچھ لوگوں نے اس سیدھی اور صاف بات میں گمراہی ملا دی۔ انھوں نے کہا کہ جو چیزیں پیغمبر کے لئے قابل حصول تھیں وہ سب کی سب ہمارے لئے بھی قابل حصول ہیں۔ اللہ سے مکالمہ، فرشتہ سے براہ راست ملاقات، غیب کی خبروں پر اطلاع، وغیرہ۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ کو جب قرآن نے اسوہ قرار دیا ہے تو وہ کلی اعتبار سے ہمارے لیے اسوہ قرار پائیں گے نہ کہ صرف جزئی اعتبار سے۔ چنانچہ اکثر صوفیاء کسی نہ کسی طور پر یہ کہتے ہیں کہ عبادت و ریاضت کے ذریعہ انسان تمام کمالاتِ نبوت تک پہنچ سکتا ہے۔ اگرچہ اب کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو منصب نبوت پر فائز ہونے کا دعوی کرے۔

یہ بلاشبہ گمراہی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اسوۂ نبوت کسب میں ہے، وہب میں نہیں۔ کسی آدمی کا پیغمبر یا مُلہَم ہونا سراسر ایک وہبی چیز ہے۔ اس معاملہ میں کوئی پیغمبر کسی کے لئے نمونہ نہیں۔ البتہ پیغمبر کے اعمال و کردار کسبی ہوتے ہیں، اسی دوسرے اعتبار سے وہ ہمارے لئے نمونہ ہے۔

ایک ہے علم دین، اور دوسری چیز ہے کیفیات دین۔ علم دین کے معاملہ میں پیغمبر ایک مستثنیٰ شخصیت ہوتا ہے۔ مگر کیفیات دین میں ہر آدمی اپنی محنت کے بقدر حصہ پاتا ہے۔ جو آدمی تذکر اور تفکر کا طریقہ اختیار کرے گا اس کو ازدیاد ایمان کی نعمت ملے گی۔ جو آدمی سچا سجدہ کریگا اس کو اپنی صلاحیت کے بقدر خدا کی قربت کا تجربہ ہوگا۔ جو آدمی زہد اور دنیا سے بے رغبتی کی زندگی گزارے گا اس کے دل میں حکمت و بصیرت کا انبات ہوگا۔ جو آدمی اپنی ساری توجہ اللہ میں لگا دے گا اس پر اللہ کے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔ جو آدمی حقیقی معنوں میں صبر و تقویٰ کا ثبوت دے گا وہ ضرور نصرت خداوندی میں اپنا حصہ پائے گا۔

ذاتی نمائش

ایک مسلمان کمانے کے لیے باہر گئے۔ وہ تعلیم یافتہ تو نہ تھے، تاہم باہر انھیں کوئی اچھا کام مل گیا۔ انھوں نے کافی پیسہ کمایا۔ وہ عید کے موقع پر گھر آئے تو انھوں نے مجھ کو خصوصی طور پر اپنے یہاں عید کے دن آنے کی دعوت دی۔ میں گیا۔ سویاں لائی گئیں۔ میں نے دیکھا تو اس کے اوپر سونے کا ورق لگا ہوا تھا۔

میں نے سوچا کہ اس طرح تو چاندی کا ورق لگانا بھی بے کار ہے۔ پھر انھوں نے سونے کا ورق کیوں لگا دیا ہے۔ آخر کار سمجھ میں آیا کہ اس کے پیچھے ذاتی نمائش کا جذبہ تھا۔ چاندی کے ورق کے عمومی استعمال کی وجہ سے اس کی اہمیت گھٹ گئی ہے۔ اس لیے انھوں نے سونے کا ورق لگایا تاکہ ذاتی نمود و نمائش کا مقصد پورے طور پر حاصل ہو۔

ذاتی نمائش کا جذبہ آدمی کا سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ ہے۔ یہ جذبہ جاہلوں کے اندر بھی ہے اور عالموں کے اندر بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ جاہلوں کا جذبہ کثیف انداز میں ظاہر ہوتا ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں کا جذبہ لطیف انداز میں۔

ذاتی نمائش کا جذبہ بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ حتی کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی بظاہر اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ میں سونے اور چاندی کے سکوں میں بکنے والا نہیں، مگر عین اسی وقت وہ نمود و نمائش اور شہرت و عزت کے سکوں میں بکا ہوا ہوتا ہے۔ آدمی بظاہر خاکساری کا مظاہرہ کرتا ہے، مگر اس کی خاکساری صرف اظہار خویش کی بدلی ہوئی صورت ہوتی ہے۔ حتی کہ وہ عبادت کرتا ہے۔ وہ مال خرچ کرتا ہے۔ وہ لڑ کر اپنی جان دیدیتا ہے مگر ان سب کے پیچھے بھی حقیقۃً ذاتی نمائش کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں ساری اہمیت صرف نیت کی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ آخری حد تک اپنی نیت کو پاک رکھنے کی کوشش کرے۔ جو کچھ کرے صرف اللہ کے لیے کرے۔ جب بھی کسی عمل کے دوران اس کے اندر ذاتی نمائش کا جذبہ آجائے تو وہ اس کو شیطان کا وسوسہ سمجھتے ہوئے اللہ سے استغفار کرے۔ یہی نجات کا واحد راستہ ہے۔

دھوم کے باوجود

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ انھوں نے کروروں آدمیوں کو نماز کی اور اپنے نوعیت کے مطابق ان کو دین دار بنایا۔ مگر ان مسلمانوں کو حتی کہ ان کے اکابر کو قریب سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں مظاہر دین کی تو بہت دھوم ہے۔ مگر حقائق دین کا کہیں وجود نہیں۔

مثلاً ان کے یہاں خدا کے نام کا غلغلہ ورد ہے مگر خدا کی عظمتوں کا معنوی چرچا نہیں۔ رسول کی شان میں نظم و نثر کے قصیدے پڑھے جارہے ہیں، مگر رسول کی حقیقی اطاعت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ قرآن کی قرأت کی آوازیں گونج رہی ہیں مگر قرآن پر تدبر کرنے والا دکھائی نہیں دیتا۔ اسلام کی شریعت کو دنیا میں نافذ کرنے پر تقریریں ہو رہی ہیں مگر اسلام کی شریعت کو اپنانے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ مظاہر شرک کے خلاف جہاد کیا جا رہا ہے مگر حقیقت توحید کو دلوں میں اتارنے کی کسی میں تڑپ نہیں۔ اسلام کی اخلاقی خوبیاں بتا کر فخر کیا جا رہا ہے۔ مگر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنے کی کسی کو فرصت نہیں۔ مناظرہ بازی کے معرکے گرم ہیں مگر دعوت رب کی ناصحانہ مجالس نہیں۔

اس کی کیا وجہ ہے کہ اسلام کے مظاہر لوگوں کے اندر جاگے ہیں مگر اسلام کی حقیقت لوگوں کے اندر نہیں جاگی۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی تحریکوں نے مظاہر اسلام کو زندہ کرنے پر محنت کی۔ انھوں نے حقیقت اسلام کو زندہ کرنے پر محنت ہی نہیں کی۔

اسلام کے احیار کا کام دراصل ایمان باللہ کے احیار کا کام ہے۔ اسی سے تمام اسلامی تقاضے ظہور میں آتے ہیں۔ مگر یہی وہ کام ہے جو موجودہ زمانہ کی تحریکوں نے سرے سے انجام نہیں دیا۔ آپ موجودہ زمانہ میں چھپنے والی کسی اسلامی کتاب کو پڑھیے۔ موجودہ زمانہ میں ہونے والے کسی مسلم اجتماع میں شرکت کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ کہیں بھی اللہ کی عظمت کا چرچا نہیں۔ کہیں بھی اللہ کی بڑائی کو دلوں میں اتارنے والی باتیں نہیں۔ کہیں بھی اللہ کے جلال و جمال کا وہ تذکرہ نہیں جو فطرت انسانی کو جگائے اور دلوں میں ربانی زلزلہ پیدا کر کے انسان کو اللہ والا انسان بنا دے۔

جلسوں میں خداوند ذوالجلال کا تذکرہ نہیں۔ کتابوں میں عظمت خداوندی کا بیان نہیں۔ ایسی حالت میں یہی ہوگا کہ اسلام کے مظاہر زندہ ہوں گے، مگر اسلام کی حقیقت زندہ ہونے سے رہ جائے گی۔

جھوٹی ہوشیاری

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دیہاتی آدمی نے روزہ رکھا۔ دوپہر تک اس کو پیاس لگ گئی۔ جب پیاس نے زیادہ ستایا تو اس نے چاہا کہ چھپ کر پانی پیے۔ وہ روزانہ ندی پر نہانے کے لیے جایا کرتا تھا۔ اس نے سوچا کہ چھپ کر پانی پینے کی سب سے بہتر جگہ ندی ہے۔

وہ نہانے کے لیے ندی کی طرف گیا۔ ڈبکی لگا کر جلدی جلدی پانی پینے لگا۔ عین اسی وقت ایک کانٹے دار مچھلی اس کے منہ میں داخل ہو گئی۔ مچھلی کا کانٹا آدمی کی حلق میں پھنس گیا۔ وہ روتا چلاتا ہوا ندی سے باہر نکلا۔ اس کی ہوشیاری اس کے لیے الٹی پڑی۔ لوگوں نے اور بھی زیادہ جان لیا کہ اس نے ندی میں ڈبکی لگا کر پانی پیا ہے۔ حلق میں کانٹے دار مچھلی کے پھنسنے کی مصیبت اس کے علاوہ تھی۔

دنیا میں اکثر لوگ اسی قسم کی جھوٹی ہوشیاری میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ ایک غلط مقصد حاصل کرنے کے لیے ہوشیاری کا جال بچھاتے ہیں۔ مگر خدا کا قانون ان کے سارے تانے بانے کو بکھیر دیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو اس حال میں پاتے ہیں کہ ان کا اصل مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور بدنامی کی سیاہی مزید ہوتی ہے جو ان کو ہمیشہ کے لیے روسیاہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ حقیقت پسند بنے۔ وہ جو کچھ حاصل کرے جائز حدود میں رہ کر حاصل کرے، ناجائز حدود میں داخل ہو کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کبھی نہ کرے۔

جو لوگ بظاہر دین کا حلیہ بناتے ہیں، مگر دینی حلیہ کے پردہ میں دنیاداری کے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی مثال مذکورہ دیہاتی جیسی ہے۔ ان کے اس کھیل کا حال یقیناً کھل کر رہے گا، اگر دنیا میں نہ کھلا تو آخرت میں تو بہر حال اس کو کھلنا ہے۔ اور آخرت کا کھلنا، بلاشبہ، دنیا میں کھلنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے معاملہ کو ہمیشہ صاف رکھے۔ کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کوئی اقدام نہ کرے۔ وہ اپنے آپ کو اپنی حد کے اندر باقی رکھے، اپنی واقعی حد سے تجاوز کرنے سے بچتا رہے۔ خدا نے اس کو جائز طور پر جو کچھ دیا ہے، اس پر قانع رہ کر زندگی گزارے۔ جو شخص ایسا کرے گا وہ دنیا میں بھی کامیاب رہے گا اور آخرت میں بھی کامیاب۔

بے قیمت الفاظ

آپ بینک کے ذریعہ کسی شخص کو کچھ رقم ادا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو آپ اتنی ہی رقم کا ایک چک دیتے ہیں۔ یہ چک صرف اس وقت کار آمد ہے جب کہ بینک کے یہاں آپ کے کھاتہ میں اتنی مقدار میں رقم موجود ہو جتنی آپ نے چک کے کاغذ پر لکھی ہے۔

اگر بینک کے یہاں آپ کے کھاتہ میں ضروری رقم نہ ہو اور آپ کسی کو چک لکھ کر دے دیں تو ایسے چک کی کوئی قیمت نہیں۔ کیوں کہ اس چک کی بنیاد پر بینک رقم کی ادائگی نہیں کرے گا۔ آپ کا اس قسم کا چک صرف ایک بے قیمت کاغذی پرزہ ہے نہ کہ فی الواقع بینک چک۔ ایسے چک کو بینک کی اصطلاح میں بے کار چک (Dud cheque) کہا جاتا ہے۔

جب آپ کسی سے ایسے الفاظ بولتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ آپ کے بارے میں کوئی امید قائم کرے تو گویا آپ اس کو اپنا ایک چک دیتے ہیں۔ ایسے چک کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ آپ کے الفاظ کو وہ عمل کے وقت کیش کرا سکے۔ اگر ایسا ہو کہ عمل کا وقت آنے پر آپ اپنے قول کے تقاضے پورے نہ کریں تو گویا کہ آپ نے اپنے بھائی کو ایک بے کار چک دے دیا۔ آپ اس سے ایسے الفاظ بولے جن کے پیچھے آپ کے اخلاقی کھاتے میں عمل کی ضروری مقدار موجود نہ تھی۔

کسی قوم پر جب زوال کا وقت آجائے تو اس کا ہر فرد اسی قسم کے بے کار چک تقسیم کرنے کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ اب ہر شخص ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جس کے بارہ میں وہ سنجیدہ نہیں ہوتا۔ جس کے متعلق اس کے اندر یہ مضبوط ارادہ موجود نہیں ہوتا کہ وہ ان الفاظ کو عمل کی صورت میں پورا کرے گا۔

اس قسم کی لفظی فیاضی قرآن کی اس آیت کی مصداق ہے کہ وہ اپنی زبان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں (آل عمران ۱۶۷) یعنی ایسے لوگ بظاہر بڑے بڑے الفاظ بولتے ہیں مگر وہ اپنے بول میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ ان کے اندر یہ پختہ ارادہ نہیں ہوتا کہ انھیں اپنے ان الفاظ کو عملاً پورا کرنا ہے۔ وہ صرف کہنے کے لیے کہہ دیتے ہیں، وہ کرنے کے لیے نہیں کہتے۔

اس روش کو قرآن میں منافقین کا طریقہ بتایا گیا ہے اور منافقین کے بارے میں قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ وہ آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے (النساء ۱۴۵)

قیامت پھٹ پڑے گی

وہ ایک بے ضرر انسان تھا۔ اس نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہونچائی۔ مگر وہ کمزور تھا، اس کی پشت پر کوئی جتھا نہیں تھا۔ اس کی کمزوری نے لوگوں کو اس کے خلاف ڈھیٹ بنا دیا۔ اس کے پڑوسیوں نے اس کو ستایا۔ اس کے بڑوں نے اس کو ذلیل کیا۔ کسی نے اس کی عزت پر حملے کیے۔ کسی نے اس کے اوپر جھوٹے مقدمے قائم کیے۔ کسی نے اس کی معاشیات کو اجاڑنے کی اسکیم بنائی۔ کسی نے اس کو گھر سے بے گھر کرنے کی کوشش کی۔ ہر ایک اس کے معاملہ میں دلیر بن گیا۔

اس نے لوگوں کو مدد کے لیے پکارا۔ مگر کوئی نہ تھا جو اس کی مدد کے لیے دوڑے۔ وہ لوگ جو انسانیت کو بچانے کے لیے بڑی بڑی کانفرنسیں کر رہے تھے۔ وہ لوگ جو قوم کے تحفظ کے لیے تجویزیں اور بیانات شائع کر رہے تھے۔ وہ لوگ جو مظلوموں کی حمایت کے نام پر ٹیلی فون اور ہوائی جہاز کی تیزی کے ساتھ سرگرم تھے، سب کو اس نے آواز دی۔ مگر کوئی نہ تھا جو اس کی آواز کی طرف توجہ دے۔ شاید اس لیے کہ اس کا ساتھ دینا اپنے اندر کوئی اخباری اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے دوڑنا ان کی شان قیادت میں اضافہ کا باعث نہیں ہوتا تھا۔ اس کے معاملے کے ساتھ اپنے کو منسوب کرنے میں ان کی انا کے لیے تسکین کا کوئی سامان نہ تھا۔

"میرے مالک! میرے معاملہ میں لوگ آپ سے نہ ڈرے" اس کی زبان سے نکلا اور آنسوؤں کے قطرے بے بسی کی تصویر بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ اس نے محسوس کیا کہ بھری ہوئی دنیا میں وہ اکیلا ہے۔ عجز کے آنسوؤں کے سوا اس کا کوئی شریک اور ساتھی نہیں۔ مگر عین اس وقت فطرت کی ایک مانوس آواز اس کے کانوں میں سنائی دی: میرے بندے! تیرے آنسوؤں کے یہ قطرے میرے نزدیک تمام بموں سے زیادہ بھاری ہیں۔ اگر میں ایک آنے والے دن کے لیے زمین و آسمان کو تھامے ہوئے نہ ہوتا تو یقیناً آج زمین و آسمان ان کی تاب نہ لاکر پھٹ چکے ہوتے۔ مگر میرے بندے! وہ دن دور نہیں جب جھوٹ اور سچ کو الگ کیا جائے۔ اس دن کتنے وہ الفاظ بے معنی ثابت ہوں گے جو آج بامعنی دکھائی دیتے ہیں۔ اس دن کتنے وہ لوگ ظلم اور بے انصافی کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے نظر آئیں گے جو آج امن اور انسانیت کے چیمپین بنے ہوئے ہیں۔

ایک کہاوت

جاپان کی ایک کہاوت ہے جس کا ترجمہ انگریزی زبان میں اس طرح کیا گیا ہے —— ایک خرگوش کا پیچھا کرو، اور تم اس کو پکڑ لوگے (Chase one rabbit, and you will get it)

اگر آپ بیک وقت دو خرگوش کو پکڑنا چاہیں تو کیا ہوگا۔ ایک خرگوش پورب کی طرف بھاگ رہا ہوگا اور دوسرا خرگوش پچھم کی طرف۔ آپ کبھی ایک کو پکڑنے کے لیے پورب کی طرف دوڑیں گے اور کبھی دوسرے کو پکڑنے کے لیے پچھم کی طرف۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں بھاگ کر دور چلے جائیں گے اور آپ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ پکڑ سکیں گے۔ اس کے برعکس جب آپ صرف ایک کی طرف دوڑیں تو آپ کی دوڑنے کی پوری طاقت صرف ایک کی طرف استعمال ہوگی، اور پھر آپ اس کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ معاملہ صرف "خرگوش" کا نہیں بلکہ یہی معاملہ تمام چیزوں کا ہے۔ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو بظاہر کئی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ہر ایک کو چاہنے لگتا ہے۔ مگر کئی کو پانے کی کوشش میں وہ ایک کو بھی کھو دیتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ اپنی ساری توجہ صرف ایک پر لگاتا تو یقیناً وہ اس کو حاصل کر لیتا۔

اس کی ایک مثال کشمیر کا مسئلہ ہے۔ انڈیا اور پاکستان کی تقسیم آبادی کی بنیاد پر ہوئی۔ اس اعتبار سے کشمیر کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا۔ کیوں کہ کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ کشمیر پاکستان کو نہ مل سکا۔ اس کی واحد ذمہ داری پاکستان کے لیڈروں پر جاتی ہے۔

۱۹۴۷ میں جب برصغیر ہند کی تقسیم ہوئی تو پاکستانی لیڈروں نے چاہا کہ وہ حیدرآباد پر بھی قبضہ کریں اور کشمیر پر بھی۔ حیدرآباد پر اس لیے کہ وہاں کا صدر ریاست مسلمان ہے، کشمیر پر اس لیے کہ وہاں کی زیادہ آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

وہ حیدرآباد کے معاملہ میں صدر ریاست کی منطق کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اور کشمیر کے معاملہ میں آبادی کی منطق کو۔ یہ گویا دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑنا تھا، اور جو لوگ بیک وقت دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑیں، ان کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ ایک کو بھی نہ پکڑ سکیں۔

فساد انگیزی

ہندستان کی ایک بستی ہے۔ یہاں ۸۰ فی صد ہندو ہیں، اور ۲۰ فیصد کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں۔ کچھ پرجوش مسلمانوں کے اندر اپنے مذہب کی برتری کا جذبہ پیدا ہوا۔ ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ اس جذبہ کا اظہار وہ علمی، صحافتی، سیاسی، معاشی اور سماجی میدانوں میں کر سکیں۔ انھوں نے کالک کی روشنائی بنائی اور لکڑی کا قلم اور بستی کی کچھ دیواروں پر بھدے حرفوں میں لکھ دیا:

مورتی پوجا پاپ ہے

اب ہندوؤں میں ردعمل پیدا ہوا۔ انھوں نے عمدہ ٹائپ میں چھپوا کر بڑے بڑے پوسٹر تیار کیے اور ساری بستی کی تمام دیواروں پر اسے چسپاں کر دیا۔ اس دوسرے پوسٹر میں لکھا ہوا تھا:

قبر پوجا مہا پاپ ہے

اس کے بعد دونوں فرقوں میں تناؤ بڑھا۔ اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک ہندو اور ایک مسلمان کے درمیان لین دین کے ایک معاملہ میں جھگڑا ہوا۔ عام حالت میں وہ صرف دو آدمیوں کا جھگڑا بن کر رہ جاتا۔ مگر دوطرفہ کشیدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دو فرقوں کا جھگڑا بن گیا۔ بستی میں فرقہ وارانہ فساد ہوا جس کا نقصان یک طرفہ طور پر مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔

جن پرجوش مسلمانوں نے "مورتی پوجا پاپ ہے" کا جملہ دیواروں پر لکھا تھا، وہ اپنے گمان کے مطابق، "دعوت" کا کام کر رہے تھے، مگر باعتبار حقیقت انھوں نے صرف عداوت کا کام کیا۔ وہ مصلح نہیں بلکہ مفسد تھے۔ کیوں کہ دعوت کا پیغام دیواروں پر لکھا نہیں جاتا۔ وہ دلوں پر لکھا جاتا ہے۔ وہ فخر کا اظہار نہیں بلکہ تواضع کا اظہار ہے۔ وہ نعروں کے ذریعہ نہیں بلکہ دعاؤں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ اس کی تحریر روشنائی سے نہیں بلکہ آنسوؤں سے لکھی جاتی ہے۔ دعوت کا عمل نفرت کی زمین پر نہیں بلکہ محبت کی زمین پر انجام دیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کا اصل مذہب قومی فخر ہے۔ اپنے قومی فخر کے مذہب کو وہ اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے قومی ہنگاموں کو اسلامی دعوت اور اسلامی جہاد کا نام دیدیتے ہیں۔ اس طرح کا ہر فعل صرف سرکشی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں دینی کام نہیں۔

بے جا شکایت

ایک مسلمان اخبار نویس نے کہا کہ ہندو لوگوں میں اتنا زیادہ تعصب ہے کہ وہ کبھی مسلمانوں کا اخبار نہیں پڑھتے۔ پروفیشنل ضرورت کے تحت کوئی پڑھ لے تو پڑھ لے، مگر عام ہندو مسلمانوں کا اخبار پڑھنا پسند نہیں کرتا۔

میں نے کہا کہ بطور واقعہ یہ بات صحیح ہے کہ ہندو لوگ مسلمانوں کا اخبار نہیں پڑھتے۔ مگر اس کی وجہ تعصب نہیں، اس کی وجہ خود مسلمانوں کے اخبارات کا ایک نقص ہے جس نے انھیں ہندوؤں کی نظر میں ایسا بنا دیا ہے جس میں ان کے لیے کوئی کشش نہ ہو۔

وہ نقص یہ ہے کہ مسلمانوں کے اخبارات، تقریباً بلا استثنا، ایک قسم کا احتجاج نامہ ہوتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی قومی شکایتوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسی چیزوں کو مسلمان تو شوق سے پڑھ سکتے ہیں، کیوں کہ جس کو خارش ہو، اس کو خارش کا کھجانا بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر دوسرے فرقہ کے لوگوں کو وہ کیوں اچھے لگیں گے۔

مسلمانوں کے اخبارات بنیادی طور پر فرقہ واریت کے نمائندہ ہیں نہ کہ آفاقیت کے۔ اور یہی وہ کمزوری ہے جس نے انھیں عمومی مقبولیت تک پہنچنے نہیں دیا۔ مثال کے طور پر اگر آپ اپنے اخبار میں یہ لکھیں کہ مسلمانوں کے ساتھ داخلہ اور سروس میں تعصب برتا جاتا ہے تو یہ بات دوسروں کی نظر میں ایک قسم کی فرقہ وارانہ چیخ پکار ہوگی۔ وہ ان کو اپنے آپ سے غیر متعلق چیز نظر آئے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ یہ بتائیں کہ دنیا میں ترقی کا راز محنت ہے تو یہ بات لوگوں کو ایک آفاقی حقیقت معلوم ہوگی۔ وہ اس کو سب کی چیز سمجھیں گے نہ کہ ایک فرقہ کی چیز۔ وہ اس کو خود اپنے لیے بھی اتنا ہی متعلق سمجھیں گے جتنا کہ دوسروں کے لیے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صحافت کو آفاقی صحافت بنائیں۔ وہ اس کو انسانی قدروں کا حامل بنائیں۔ اس کے بعد انھیں کسی سے مذکورہ قسم کی شکایت نہ ہوگی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی طرف توجہ دیں تو اپنے آپ کو دوسروں کے لیے مفید ثابت کیجیے۔ اس کے بغیر نہ کوئی مسلمان آپ کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی غیر مسلمان۔

بیانِ حقیقت

ایک صورت یہ ہے کہ آپ اپنی بات کو دلیل سے ثابت کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اپنی بات کو سادہ طور پر بلا دلیل بیان کر دیں۔ انگریزی کا ایک مثل ہے کہ ایک واضح بیان مضبوط ترین استدلال ہے:

A clear statement is an argument in itself.

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بہت سی حدیثوں میں یہی دوسرا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ اتنی موثر ہیں کہ انھوں نے کروڑوں لوگوں کے اندر انقلاب پیدا کر دیا۔

اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک واضح بیان سننے والے کے لیے بذات خود دلیل بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ایک بیان کے ساتھ فطرت خود اضافہ کر کے اس کو مکمل کر لیتی ہے۔ دلیل کی کمی انسان کی فطرت خود پورا کر لیتی ہے۔

تمام حقیقتیں انسان کی فطرت کے اندر موجود ہیں۔ وہ انسان کے لاشعور میں پیدائشی طور پر رکھ دی گئی ہیں۔ آدمی جب کسی حقیقت کو مانتا ہے تو وہ اس کو اس لیے مانتا ہے کہ وہ اس کی پیدائشی معرفت کے ساتھ مطابقت کر رہی ہے۔ ایک بیان جب سننے والے کی اپنی فطرت کے ساتھ مطابقت کر رہا ہو تو اُس کے بعد اِس کی حاجت نہیں رہتی کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے دلیل و برہان پیش کی جائے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو پیاس لگی ہوئی ہو۔ اس کو پانی کا ایک گلاس پیش کیا جائے تو اس کی ضرورت نہیں کہ پانی کی اہمیت پر اس کے سامنے تقریر کی جائے یا علمی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جائے کہ پانی انسان کے لیے ضروری اور مفید ہے۔ آدمی کے اندر پانی کا احساس اس کو اس سے مستغنی کر دیتا ہے کہ وہ پانی کی اہمیت سمجھنے کے لیے دلیل کا طالب ہو۔

اسی طرح دین فطرت کا مجرد بیان بھی پوری طرح موثر ہو سکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ فی الواقع بیانِ حقیقت ہو۔ اس میں کسی غیر فطری چیز کی آمیزش نہ کی گئی ہو۔ وہ اصل واقعہ سے آتنا زیادہ مطابقت رکھتا ہو کہ وہ معرفت فطری کا بے لاگ اظہار بن جائے۔ وہ اپنے صحت بیان کی بنا پر پورے معنوں میں فطرت انسانی کا ثنی بن گیا ہو۔

بے خبری

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نے اقلیتی مسلمانوں کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت دنیا میں ۳۰۰ ملین ایسے مسلمان ہیں جو ایسے ملکوں میں رہتے ہیں جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے اور اقتدار پر جہاں غیر مسلموں کا غلبہ ہے۔ یہ مسلمان سخت بے یقینی کی حالت میں ہیں۔ وہ ابھی تک اپنی سمت متعین نہ کر سکے۔ اس سلسلہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ حالت قوت (Position of strength) کے لیے تو ان مسلمانوں کے پاس ماڈل موجود ہے۔ مگر حالت فروتنی (Position of modesty) کے لیے ان کے پاس کوئی ماڈل موجود نہیں۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس پر از سر نو ریسرچ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان مسلمانوں کو ان کے حالات کے اعتبار سے رہنمائی دی جا سکے۔

بطور واقعہ یہ بات درست نہیں کہ اسلام کے پاس "حالت قوت" کا ماڈل ہے، اس کے پاس "حالت فروتنی" کا ماڈل نہیں۔ اسلام کی تاریخ کا مکی دور مکمل طور پر اسی دوسرے ماڈل سے تعلق رکھتا ہے، جس کا زیادہ صحیح نام دور دعوت ہے۔

موجودہ زمانہ کے مصلحین نے مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لیے جو تدبیر استعمال کی، وہ صرف یہ کہ انھوں نے ان کو ان کی "شاندار تاریخ" یاد دلائی۔ شاعر اور خطیب اور انشا پرداز قسم کے مصلحین نے یہ بات اتنی زیادہ بار کہی کہ اب وہی مسلمانوں کا شاکلہ (مزاج) بن گیا۔ چنانچہ موجودہ مسلمان ماڈل کے نام سے صرف اسلام کے دور اقتدار کو جانتے ہیں۔ وہ اسلام کے دور دعوت کو نہیں جانتے۔

یہی وجہ ہے جس کی بنا پر ہم ساری دنیا میں یہ منظر دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان یا تو پست ہمتی میں پڑے ہوئے ہیں، یا سیاست کی چٹان سے سر ٹکرا کر بے فائدہ طور پر اپنے کو ہلاک کر رہے ہیں۔ یہ مسلمان اگر دعوت کے ماڈل کو جان لیں تو ان کا المیہ اچانک طربیہ میں بدل جائے۔

مزید یہ کہ "قوت" اور "فروتنی" کا تقابل بجائے خود غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے مطابق، مسلمانوں کی ایک ہی مستقل حالت ہے، اور وہ حالتِ دعوت ہے۔ ذاتی نوعیت کی شرعی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بعد، مسلمانوں کو جو کام کرنا ہے وہ اول و آخر دعوت ہے۔ اس کے سوا جو چیزیں ہیں وہ اصل مقصد کے اعتبار سے اضافی ہیں نہ کہ حقیقی

اجتماعی بصیرت

دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ بصیرت ہے۔ بصیرت میں سب سے بڑا حصہ ہے کیا ہے اور کیا چیز مسئلہ نہیں۔ آپ کس چیز کو لیں اور کس چیز کو چھوڑ دیں۔ کہاں بولیں اور کہاں چپ رہیں۔ کس معاملہ میں دخل دیں اور کس معاملہ سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔

کتا اگر آپ پر حملہ کر دے تو آپ اس سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اگر کتا دور کھڑا ہوا بھونک رہا ہو تو آپ اس کو نظر انداز کر کے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ یہ فرق زندگی کا ایک حکیمانہ اصول ہے اور ہر سمجھ دار آدمی ہمیشہ اس اصول پر عمل کرتا ہے۔

اس دنیا میں کچھ باتیں قابل لحاظ ہوتی ہیں۔ اور کچھ باتیں قابل اعراض۔ دانش مند وہ ہے جو دونوں باتوں کے فرق کو جانے۔ وہ صرف انھیں باتوں کو اہمیت دے جو فی الواقع اہمیت کے قابل ہیں۔ اور بقیہ باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سفر حیات جاری رکھے۔

جو لوگ ایسا کریں وہی اس دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ چیزوں کا فرق جانے بغیر ہر بات پر لوگوں سے الجھ جائیں، ان کے لئے صرف یہی مقدر ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی طاقت کو بے نتیجہ کاموں میں ضائع کرتے رہیں اور آخر کار ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں۔

نادان آدمی صرف حال کو جانتا ہے، دانش مند آدمی حال کے ساتھ مستقبل کو بھی۔ نادان آدمی صرف اپنی خواہشوں سے باخبر ہوتا ہے۔ دانش مند آدمی اپنی ذات سے باہر قوانین فطرت سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ نادان آدمی صرف اپنے سامنے دیکھتا ہے۔ دانش مند آدمی اپنے آگے، اپنے پیچھے، اپنے دائیں، اپنے بائیں ہر طرف نظر رکھتا ہے۔ نادان آدمی کا اقدام عاجلانہ اقدام ہوتا ہے اور دانش مند آدمی کا اقدام منصوبہ بند اقدام۔

ایک سنت

مکی دور کا واقعہ ہے، ابولہب کی بیوی ام جمیل ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

[illegible] کی۔ اس وقت آپ بیت اللہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوبکر صدیقؓ بھی آپ کے پاس موجود تھے۔ ام جمیل شاعرہ تھی۔ اس نے آپ کی ہجو میں یہ اشعار کہے کہ ہم نے ایک قابل مذمت شخص کی نافرمانی کی۔ اس کی بات ماننے سے انکار کیا اور اس کے دین سے بیزاری ظاہر کی:

مذمماً عصینا و امرہ ابینا و دینہ قلینا

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہؐ کا نام محمد کے بجائے مذمم رکھ دیا تھا۔ وہ یہی نام لے کر آپ کے خلاف سب وشتم کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کو سنتے تو فرماتے:

الا تعجبون لما صرف اللہ عنی من اذی قریش۔ یسبون و یہجون مذمماً و انا محمد (سیرۃ ابن ہشام ۱/۳۷۹)

کیا تم لوگوں کو اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ اللہ نے قریش کی اذیت مجھ سے پھیر دی۔ وہ ایک مذمم کو گالی دیتے ہیں اور اس کی ہجو کرتے ہیں اور میں تو محمد ہوں۔

یعنی جب وہ "مذمم" کہہ کر سب وشتم کرتے ہیں تو ان کا سب وشتم اس پر واقع ہوگا جو مذمم ہو۔ میں مذمم نہیں ہوں۔ میرا نام تو محمد ہے۔ پھر مجھے ان کی گالیوں پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔ گویا کسی کے برے لفظ پر اس کو غصہ ہونا چاہئے جس پر وہ پڑ رہا ہو۔ جس کے اوپر بطور واقعہ اس کے برے الفاظ پڑ نہ رہے ہوں، اس کو اسے قابل لحاظ بھی نہیں سمجھنا چاہئے۔

یہ اصول صرف حال کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ مستقبل کے لئے بھی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص ایک مخالفانہ ارادہ کا اظہار کرے تو ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کیا اس کا برا ارادہ مستقبل میں واقعہ بننے والا ہے یا نہیں۔ اگر حالات کا مطالعہ بتائے کہ اس کا برا ارادہ عملاً وقوع میں آنے والا نہیں ہے تو ایسے ناممکن الوقوع منصوبہ کا واحد حل یہ ہے کہ اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ایسی باتوں میں الجھنا دانش مند انسان کا طریقہ نہیں۔

حقیقت غالب آتی ہے

ٹائمس آف انڈیا، دوسرے تمام اخباروں کی طرح، ہر روز نئی نئی خبریں جلی حرفوں میں چھاپتا ہے۔ ان خبروں کو ہر پڑھنے والا روزانہ پڑھتا ہے۔ مگر ایک خبر جو ٹائمس آف انڈیا میں ہر

روزنامہ بتا چکی ہے۔ اس کو شاید بہت کم قارئین نے پڑھا ہوگا۔ اور ایسا تو ایک بھی قاری نہیں ہوگا جو ہر روز اس خبر کو پڑھے۔ یہ ہے اس کے صفحہ اول کی پیشانی پر اخبار کے مونوگرام کے ساتھ باریک حرفوں میں لکھا ہوا یہ فقرہ کہ سچائی غالب رہتی ہے (Let truth prevail)

تین لفظ کے اس جملہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ بلاشبہ دنیا کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ اگر صرف اس ایک حقیقت کو لوگ جان لیں اور اس کو اچھی طرح پکڑ لیں تو دنیا کے بیشتر جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

اطالوی فلکیات داں گیلیلو (Galileo) نے کوپرنیکس کے نظریہ کی حمایت کی اور کہا کہ ہماری زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ یہ رومن چرچ کے عقیدہ کے خلاف تھا۔ ۱۶۱۶ میں گیلیلو کو پوپ کی عدالت میں بلایا گیا۔ اور اس کو یہ کہنے کے لئے مجبور کیا گیا کہ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔ سزا سے ڈر کر گیلیلو نے یہ جملہ اپنی زبان سے دہرا دیا۔ مگر جب وہ عدالت سے باہر نکلا تو اس نے آہستگی سے کہا: زمین تو اب بھی سورج ہی کے گرد گھوم رہی ہے۔

فلکیاتی قوانین کوپرنیکس کے نظریہ کے حق میں تھے۔ چنانچہ مسیحی عدالت میں گیلیلو کے مجبورانہ بیان کے بعد بھی زمین سورج کے گرد گھومتی رہی۔ چرچ اگر یہ جانتا کہ لوگوں سے لفظی تردید کرانے کے باوجود عملی طور پر یہی ہوگا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی رہے گی، یہاں تک کہ ساری دنیا اس کو مسلمہ حقیقت کے طور پر مان لے تو چرچ کبھی مذکورہ قسم کی مضحکہ خیز حرکت نہ کرتا۔

یہی سچائی کا باقی رہنا ہے۔ موجودہ دنیا خود اپنے محکم قوانین پر چل رہی ہے۔ وہ کسی انسان کے الفاظ کی پابند نہیں۔ یہاں وہی ہوگا جو ہونا ہے، وہ نہیں ہوگا جو کسی نے کہہ دیا ہو۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے بہترین پالیسی یہ ہے کہ آپ کسی کے بولے ہوئے الفاظ کو نہ دیکھیں۔ بلکہ یہ دیکھیں کہ حقیقتِ واقعہ کیا ہے۔ کیوں کہ جو بات حقیقت واقعہ کے مطابق نہ ہو وہ فضا میں تحلیل ہو جائے گی اور آخر کار جو چیز باقی رہے گی اور غالب آئے گی وہ حقیقت ہوگی نہ کہ کسی ایک یا دوسرے شخص کے بولے ہوئے الفاظ۔

یہ سوچ درست نہیں

میں نے حال ہی میں ایک کتاب پڑھی۔ اس کے مصنف مسٹر چترویدی بدری ناتھ (IAS

ہے اور وہ ساڑھے تین سو صفحہ پر مشتمل ہے۔ پورا حوالہ یہ ہے:

Chaturvedi Badrinath,
Dharama, India and the World Order, 1993

اس کتاب کے ایک حصہ میں انڈیا کی تقسیم پر کلام کیا گیا ہے۔ مصنف نے ملک کی تقسیم کا ذمہ دار آر ایس ایس کو قرار دیا ہے۔ آر ایس ایس کے سابق سرسنچالک کی ایک کتاب ۱۹۳۹ میں انگریزی میں ترجمہ ہو کر چھپی تھی۔ یہ کتاب نیشن ہڈ کے بارہ میں تھی اور اس کا نام یہ تھا:

We or Our Nationhood Defined

۶۰ سال پہلے چھپنے والی اس کتاب میں انھوں نے نہ صرف انڈین نیشنلزم کو ہندو نیشنلزم کے ہم معنی قرار دیا تھا۔ بلکہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ مسلمان یا عیسائی کبھی ہندستان کا سچا نیشنلسٹ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندستان کا سچا نیشنلسٹ وہ ہے جو ہندستان کی سرزمین کو مقدس مانے۔ چونکہ مسلمان اور عیسائی ہندستان کو مقدس نہیں مانتے، اس لئے وہ سچے نیشنلسٹ بھی نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہندو ہی نیشنلسٹ ہیں کیوں کہ صرف ہندو ہی انڈیا کو تقدس کی نظر سے دیکھتے ہیں:

Only the Hindus, We, are nationalists. For the Hindus alone look upon India as a holy land, motherland, fatherland, every particle of whose dust is sacred to them. (p. 300)

مصنف لکھتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم نیشنلزم ہندو نیشنلزم کی جوابی پیداوار تھا۔ پاکستان کے نظریہ کا بیج ہندو دانشوروں نے بویا نہ کہ مسلمانوں نے:

The truth is that Muslim nationalism was a product, emotional and political, of Hindu nationalism with its insistence that India's swa, or 'one's own,' was Hindu. The seeds of the idea of Pakistan were sown, without knowing it, by the Hindu intellectuals and not by the Muslims. (p. 301)

یہ صرف ایک مصنف کی بات نہیں۔ متعدد دانشوروں نے یہی بات ایک یا دوسرے انداز سے کہی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر سیروائی، ڈاکٹر رفیق زکریا، وغیرہ۔ اس سلسلہ میں غالباً مولانا ابوالکلام آزاد کو اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب آزادی ہند (India wins Freedom)

میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے اور تقسیم ملک کی ذمہ داری کانگریس رہنماؤں بالخصوص پنڈت نہرو پر ڈالی ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت ہندستان میں ۱۹۳۷ میں ریاستوں کے الکشن ہوئے۔ اس سے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ الکشن کے بعد دونوں پارٹیاں مل کر کولیشن گورنمنٹ بنائیں گی۔ مگر جب الکشن ہوا تو چھ ریاستوں میں خلاف اندازہ کانگریس کو مطلق اکثریت حاصل ہو گئی۔ اس وقت کے صدر کانگرس جواہر لال نہرو نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم ماقبل الکشن معاہدہ کے پابند نہیں ہیں۔ اس پر کانگرس اور مسلم لیگ میں نزاع پیدا ہو گئی۔ اس کا سب سے بڑا مظاہرہ یوپی میں ہوا جہاں کانگرس نے معاہدہ کے خلاف مسلم لیگی مسلمان کو کیبنٹ میں نہیں لیا بلکہ کانگرسی مسلمان کو وزیر بنا دیا۔

یہ بات بظاہر اہم دکھائی دیتی ہے۔ مگر باعتبار حقیقت وہ ناقابل لحاظ ہے۔ کیوں کہ سیاست ہمیشہ عملی حالات کی پابند ہوتی ہے۔ سیاست کو کبھی مطلق معیار سے ناپا نہیں جا سکتا۔ حتی کہ افراد سیاست کی نیت اگر انتہائی صالح ہو تب بھی سیاست میں نظری معیار کو چلانا ممکن نہیں۔

مثال کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جب خلافت کا مسئلہ پیدا ہوا تو انصار مدینہ نے کہا کہ ایک امیر ہمارا اور ایک امیر تمہارا۔ (منا امیر ومنکم امیر) اس کے جواب میں مہاجرین مکہ نے کہا کہ دو امیر کا طریقہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہم امیر ہوں اور تم وزیر بنو۔ (نحن الامراء وانتم الوزراء) مگر اس پر عمل نہ ہو سکا اور خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق نے اپنی آخر عمر میں کہا کہ ہم نے انصار سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ان کو خلافت میں وزیر بنائیں گے مگر ہم انھیں وزیر نہ بنا سکے۔

سیاست میں اس قسم کے نشیب و فراز کا پیش آنا بالکل لازمی ہے۔ اس سے کسی حال میں مفر نہیں۔ حتی کہ اگر ملک کو تقسیم کر کے اس کا ایک حصہ ایک فرقہ کو اور دوسرا حصہ دوسرے فرقہ کو دے دیا جائے تب بھی اس قسم کے خلاف معیار واقعات بہر حال پیش آتے رہیں گے

ایسی حالت میں صرف ایک ہی ممکن حل ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو اقتدام کا اشو نہ بنایا جائے بلکہ انھیں اعراض کے خانہ میں ڈال دیا جائے۔

مسلم لیگی لیڈر اگر علم و بصیرت کے حامل ہوتے تو وہ کہتے کہ چلو کوئی حرج نہیں۔ آج اگر کانگرس مسلمان وزیر بنا رہی ہے تو کل انشاء اللہ ایسے حالات پیدا ہوں گے کہ مسلم لیگی مسلمان وزیر بنیں۔ ہماری نظر مستقبل پر ہونی چاہئے نہ کہ صرف حال پر۔ اگر مسلم لیڈرشپ اس دور اندیشی کا ثبوت دیتی تو آج یقیناً تاریخ دوسری ہوتی۔

اگر اس معاملہ کے سارے پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ گہرائی کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری مذکورہ قسم کے ہندوؤں پر نہیں ہے، بلکہ اس کی ذمہ داری تمام تر خود مسلمانوں کی نااہل لیڈرشپ پر ہے۔ کیوں کہ انھوں نے یہ غلطی کی کہ جو واقعہ صرف اس قابل تھا کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے، اس کو انھوں نے غیر ضروری طور پر اہمیت دی۔ حتی کہ اس کے اوپر اپنی ملی پالیسی کی بنیاد قائم کر دی۔

ایک تقابل

۱۹۴۷ سے پہلے غیر منقسم ہندستان میں مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے اسلام کے نام پر ایک تحریک شروع کی۔ ملک کے کچھ مسلمانوں نے ان کا ساتھ دیا۔ انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اسلام کا مقصد خدا کی زمین پر خدا کی حکومت قائم کرنا ہے۔ اپنے عقیدہ کی رو سے مسلمان کا تعلق ہر غیر الٰہی نظام سے بغاوت کا ہے نہ کہ مصالحت کا۔ اسلام کا مطالبہ ہے کہ خدا کی زمین پر صرف خدا کا قانون نافذ کیا جائے۔ غیر مسلمین خدا کی زمین پر اہل اسلام کے ماتحت ہو کر رہ سکتے ہیں مگر ان کو یہ حق نہیں کہ وہ خدا کی زمین پر اپنا قانون چلائیں یا اپنا اقتدار قائم کریں۔

اب اگر ایک انتہا پسند ہندو یہ کہے کہ تقسیم کا اصل سبب یہی اسلامی تحریک ہے۔ کیوں کہ جب غیر منقسم ہندستان میں اس قسم کی تحریک اسلام کے نام پر اٹھی اور مسلمانوں نے اس کا استقبال کیا تو ہندوؤں نے سوچا کہ ایسی حالت میں آزادی ہمارے لئے بے معنی ثابت ہوگی۔ آج ہم انگریزوں کے غلام ہیں۔ آزادی کے بعد مسلمان اپنے عقیدے کی رو سے یہ کوشش کریں گے کہ وہ پورے ملک میں حکومت الٰہیہ قائم کریں جس میں ان کی حیثیت حاکم کی ہو اور ہماری حیثیت

صرف ذمی یا محکوم کی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ ملک کو تقسیم کرکے ایک حصہ مسلمان کو دیدیا جائے تاکہ بقیہ حصہ پر ہم اپنی پسند کی حکومت قائم کرسکیں۔

مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی عالم یا مسلم دانشور ہندو کی اس دلیل کو نہیں مانے گا۔ وہ اس کو رد کرنے کے لئے کہے گا کہ یہ صرف چند سرپھرے مسلمانوں کا تخیل تھا نہ کہ ہندستان کی پوری امت مسلمہ کا نظریہ۔ یہ جواب یقیناً درست ہے۔ اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس پر میرا اضافہ صرف یہ ہے کہ یہی جواب خود ہندوؤں کی طرف سے بھی دیا جاسکتا ہے اور دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ ہندو نیشنلزم کی مذکورہ بات چند انتہا پسند ہندوؤں کا تخیل تھا۔ ہندستان کی ہندو کمیونٹی نہ پہلے اس سے متفق تھی اور نہ آج اس سے اتفاق کرتی ہے۔

گویا کہ اس معاملہ میں ہندو کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خودساختہ نظریہ سازی سے اعراض کرنا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ گروگوالکر کی خودساختہ نظریہ سازی کو اعراض کے خانہ میں ڈال دیں۔ اس قسم کی باتیں ہمیشہ قابل اعراض ہوتی ہیں نہ کہ قابل لحاظ۔

مسلم خیر خواہی

جو لوگ تقسیم ہند کا ذمہ دار ہندوؤں کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ایسا کرکے صرف اپنی نادانی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ بطور خود وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ مسلمانوں کے سر سے تقسیم کی ذمہ داری کو ہٹا رہے ہیں۔ مگر اس طرح کسی کے سر سے کوئی ذمہ داری کبھی نہیں ہٹتی۔ مسلمان تقسیم کا مطالبہ کرکے تاریخی طور پر اس کی ذمہ داری اپنے اوپر لے چکے ہیں اور پاکستان سارے عالم کو گواہ بنا کر اس کو اپنے مفاخر میں درج کرچکا ہے کہ ہندو تقسیم پر راضی نہیں تھا۔ ہمارے قائد اعظم نے اپنی غیر معمولی سیاست کے ذریعہ اس کو ماننے پر مجبور کردیا۔ ایسی حالت میں کوئی دانشور ایک نکتہ نکال کر اس قائم شدہ تاریخی واقعہ کو بدل نہیں سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ تقسیم کا ذمہ دار ہندوؤں کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ایسا کرکے مسلمانوں کی خیر خواہی نہیں کررہے ہیں۔ مسلمانوں کی سچی خیر خواہی یہ ہے کہ انھیں ان کی غلطیوں کی طرف متوجہ کیا جائے تاکہ وہ آئندہ اس کو دہرانے سے بچ جائیں، جیسا کہ عرض

کہا گیا۔ اس دنیا کا کوئی سماج مذکورہ قسم کی باتوں سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ایسی حالت میں جو لوگ ان باتوں کو اہمیت دیں وہ ہمیشہ ان میں الجھ کر اپنا نقصان کرتے رہیں گے۔ چنانچہ تقسیم کے صرف بیس سال بعد مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان اسی قسم کی باتوں پر لڑ گئے۔ یہاں تک کہ دوبارہ پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔ اس قسم کی انتہا پسندانہ نظریہ سازی کا واحد حل یہ ہے کہ ان کو خاموشی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جائے۔

تقسیم کا فیصلہ

۲۴ مارچ ۱۹۴۰ کو لاہور میں مسلم لیگ کے سیشن میں مسٹر محمد علی جناح نے صدارتی خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے مذکورہ ذہن کی بنا پر ان کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو علیحدہ ہوم لینڈ دیا جائے۔ ردعمل کا یہ ذہن مسلمانوں میں بڑھا یہاں تک کہ ملک تقسیم ہو گیا۔

اوپر کی باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو مسٹر جناح کا یہ بیان صرف نادانی کا ردعمل معلوم ہوگا۔ اس کو ہرگز رہنمائی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ مسٹر جناح صرف ایک قانون داں تھے۔ اگر وہ تاریخ کو اور حقائق حیات کو جانتے تو مسلمانوں سے کہتے کہ تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ملک کے مستقبل کی تشکیل جو چیز کرے گی وہ تاریخی حقیقتیں ہیں نہ کہ گروگولوالکر یا کسی اور انتہاپسند لیڈر کے الفاظ۔ اس لئے تم اس قسم کے الفاظ کو نظر انداز کر دو اور عظیم ہندستان میں اپنے لئے ایک عظیم مستقبل کی تعمیر کرو۔

اب غور کیجئے کہ عملاً ہندستان میں کیا پیش آیا۔ شری گروگولوالکر نے ۱۹۳۹ میں یہ الفاظ کہے تھے مگر نصف صدی سے زیادہ مدت گزرنے کے باوجود یہ الفاظ ابھی تک واقعہ نہ بن سکے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ۱۹۴۷ میں آزادی ملنے کے بعد خود ہندو لیڈروں نے ہندو عوام کی حمایت سے ملک میں طاقتور سیکولر گورنمنٹ بنائی۔ یہ سیکولر نظام آج تک یہاں قائم ہے اور کوئی بھی اس کو بدلنے پر قادر نہ ہو سکا۔

آزادی کے بعد ثمانینات (eighties) میں دوبارہ کچھ انتہاپسند ہندو ابھرے انھوں نے ہندوتو کا نعرہ لگایا اور کہا کہ ہندستانی نیشنلزم کلچرل نیشنلزم کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔

مسلم رہنماؤں اور دانشوروں نے دوبارہ اس کے متعلق سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ مسلمانوں کو ہندو کلچر میں رنگنے کی ایک سازش ہے۔ مگر عملاً کیا پیش آیا۔ دوبارہ یہی ہوا کہ ہندتو کے لیڈروں کے بولے ہوئے الفاظ واقعہ نہ بن سکے۔ انھوں نے اپنے کو کامیاب بنانے کے لئے مندر۔ مسجد کے نام پر انتہائی جذباتی تحریک چلائی۔ اس کے لئے انھوں نے اپنی ساری طاقت خرچ کر ڈالی مگر ۱۹۹۳ کے الکشن میں دنیا نے دیکھا کہ کلچرل نیشنلزم کے علمبردار سارے ملک میں زبردست سیاسی ناکامی سے دوچار ہوئے ہیں۔ اپنے نظریہ کے حق میں انھیں خود ہندو ووٹروں کی تائید بھی حاصل نہ ہو سکی۔

ہندو نیشنلزم یا کلچرل نیشنلزم کا نظریہ کیوں انڈیا میں ناکام ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ہندستانی نظریہ عالمی قومی نظریہ سے ٹکرا رہا تھا۔ اور اس معاملہ میں کسی ملک کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ نیشن ہڈ کے لئے انٹرنیشنل معیار کے سوا کوئی اور معیار اپنے لئے مقرر کرے۔ اگر کوئی ملک اس معاملہ میں علیحدہ معیار مقرر کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا معیار عملاً چلنے والا نہیں۔

تقدیس ملک کا تصور کچھ افراد کا مذہبی عقیدہ ہو سکتا ہے مگر نیشن ہڈ کے مسئلے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ عالمی معیار کے مطابق، نیشن ہڈ کی بنیاد اشتراک وطن پر ہے نہ کہ کسی تقدیسی عقیدہ پر۔ اور انڈیا میں بھی یقینی طور پر ہمیں اس عالمی معیار کو ماننا ہوگا۔ اگر نیشن ہڈ کے مذکورہ تقدیسی معیار کو صحیح قرار دیا جائے تو ساری دنیا کے لوگوں کے لئے فرض کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے دیش کے غدار ہیں۔ کیوں کہ کسی بھی ملک میں تقدیس وطن کا تصور موجود نہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ملکوں میں اعلیٰ درجہ کی حب الوطنی (patriotism) موجود ہے اور اسی لئے وہ ممالک ترقی کر رہے ہیں۔

یہی معاملہ کلچرل نیشنلزم کا ہے جو مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ عالمی ذہن سے ٹکرا رہا ہے۔ دنیا میں اس معاملہ میں غالب قومی نظریہ ملٹی کلچر نیشنلزم کا ہے۔ اور ہندستان میں کچھ لوگ اس کے خلاف یونی کلچر نیشنلزم کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ ایسی خلاف زمانہ کوشش کیسے کامیاب ہو سکتی ہے۔

امریکہ اور کناڈا میں دوسری عالمی جنگ کے بعد وہ تحریک اٹھی جس کو یونی کلچرلزم کہا جاتا ہے۔ مگر ان ملکوں کے دانشوروں نے دیکھا کہ وہ قابل عمل نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کو چھوڑ کر ملٹی کلچرلزم کے اصول کو اختیار کر لیا۔ پھر جو چیز دنیا کے دوسرے ملکوں میں کامیاب نہیں ہوئی وہ انڈیا میں کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلچر ہمیشہ تاریخی عوامل سے بنتا ہے۔ وہ اوپر سے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ انڈیا میں اسکول اور کالج کے طلبہ جب ملتے ہیں تو نمستے یا نمسکار کہنے کے بجائے وہ ایک دوسرے کو ہائے (Hi) کہتے ہیں۔ یہ گریٹنگ کا امریکی طریقہ ہے۔ اسی طرح انڈیا کے دستور میں ہندی کو قومی زبان کی حیثیت دی گئی ہے۔ مگر تمام سرکاری اور غیر سرکاری لوگ انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس قسم کے کلچرل طریقے انڈیا میں تاریخی اسباب سے رائج ہو گئے ہیں نہ کہ کسی نافذ کرنے والے نے ان کو نافذ کیا ہے۔ کلچر قوموں کے اختلاط سے اپنے آپ بنتا ہے، وہ کبھی مصنوعی طور پر نہیں بنایا جاتا۔

خلاصہ یہ کہ زندگی کے معاملات کو جو چیز تشکیل دیتی ہے وہ تاریخ کی قوتیں ہیں نہ کہ کسی کے بولے یا لکھے ہوئے الفاظ۔ اگر ایسا ہو کہ لوگ الفاظ کے بجائے حقیقتوں پر دھیان دیں۔ الفاظ کے معانی کو وہ ڈکشنری میں نہ دیکھیں بلکہ تاریخ کے صفحات میں دیکھیں تو ہمارا سماج اس ذہنی تناؤ سے بچ جائے گا جو اکثر بے بنیاد باتوں پر پیدا ہوتا ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے آخری بربادی تک پہنچ جاتا ہے۔

اس دنیا میں ہمیشہ سچائی غالب آتی ہے۔ یہی تاریخ کی اور عقل کی گواہی ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے لئے امید کا راز چھپا ہوا ہے۔

مسئلہ کی جڑ

ہندستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کی جڑ یہ ہے کہ وہ حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں آدمی اگر حقیقت واقعہ کا اعتراف کرے تو اس کو اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے آغاز مل جاتا ہے۔ اور اگر وہ حقیقت واقعہ کا اعتراف نہ کرے تو اس کو زندگی کی تعمیر کا آغاز ہی نہیں ملتا۔ اور جن لوگوں کو آغاز نہ ملے وہ اختتام تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔

ہندستان میں مسلمان کی حیثیت کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ وہ یہاں اکثریت کے بعد (next to majority) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جو آدمی کسی سماج میں مسٹر نکسٹ کی حیثیت رکھتا ہو، اس کو فریق ثانی سے یک طرفہ طور پر ایڈجسٹمنٹ کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ ہمیشہ پریشانیوں کا شکار ہوتا رہے گا۔

ساری دنیا میں جہاں بھی کوئی مسلمان مسٹر نکسٹ کی حیثیت میں ہو، وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ مثلاً ہندستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان بڑی تعداد میں عرب ممالک، امریکہ اور یورپ میں رہتے ہیں۔ ہر جگہ ان کی حیثیت یہی ہے۔ اور ہر جگہ وہ اپنی اس حیثیت کا اعتراف کرکے رہ رہے ہیں، اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ نہ ان ملکوں میں رہ سکیں اور نہ ان کو وہاں ترقی کے مواقع حاصل ہوں۔

"مسٹر نکسٹ" بننا ایک بندوبست کا مسئلہ ہے نہ کہ تفریق و امتیاز کا مسئلہ۔ مسجدمیں روزانہ مسلمانوں کو اس بات کا سبق دیا جاتا ہے۔ مسجد کے اندر ایک سو نمازی ہوں تو صرف ایک آدمی آگے امام کی جگہ کھڑا ہوتا ہے۔ باقی ۹۹ آدمی پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہی ایسا ممکن ہوتا ہے کہ مسجد کے اندر نماز باجماعت قائم ہو سکے۔

امام اور مقتدی کی یہ ترتیب کوئی تفریق و امتیاز کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ بندوبست کا مسئلہ ہے۔ یہی طریقہ فطرت نے پوری زندگی کے لیے قائم کیا ہے۔

تواضع بذاتِ خود ایک عبادت ہے۔ تواضع کا فعل بظاہر انسان کے سامنے کیا جاتا ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ خدا کے آگے جھکنا ہے۔ وہ گویا خدا کے مقابلہ میں پیدا شدہ ربانی نفسیات کا انسانی معاملات میں اظہار ہے۔

دین کے نام پر بے دینی

موجودہ زمانہ میں کچھ لوگ سیکولرزم اور لادینیت کے نام پر گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ یہ بلاشبہہ مفسد لوگ ہیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ بڑے مفسد وہ لوگ ہیں جو قرآن کا نام لے کر گمراہی پھیلائیں۔ جو قرآن کی آیتوں کی خود ساختہ تفسیر کریں۔ اور پھر اپنی اس ذاتی تفسیر کی بنیاد پر تحریک چلا کر یہ اعلان کریں کہ وہ خالص قرآن کی بنیاد پر تحریک چلا رہے ہیں۔

کچھ انقلابی نظریہ سازوں نے موجودہ صدی کے نصف اول میں ایک اسلامی نظریہ بنایا۔ اس کا عنوان "حکومت الٰہیہ" تھا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی حکومت بقیہ کائنات میں اپنے آپ قائم ہے۔ مثلاً شمسی نظام کو خدا براہ راست اپنے حکم کے تحت چلا رہا ہے۔ مگر انسانی دنیا میں اس کی حکومت قائم نہیں۔ یہاں خدا نے اپنی حکومت قائم کرنے کا کام ان لوگوں کے سپرد کیا ہے جو اس پر ایمان لاکر اس کے مومن بن جائیں۔

اسی انقلابی نظریہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ جگہ جگہ جہاد کے نام پر فساد جاری کئے ہوئے ہے۔ اپنے دعوے کے مطابق، وہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر نکل پڑا ہے تاکہ خدا سے پھرے ہوئے انسانوں سے لڑ کر انھیں زیر کرے اور پھر انسانی دنیا میں بھی خدا کا اقتدار قائم کر دے جس طرح وہ کائناتی دنیا میں قائم و نافذ ہے۔

یہ ایک بدترین گمراہی ہے۔ یہ نام نہاد انقلابی نظریہ بلاشبہہ اسلام کی مفسدانہ تفسیر ہے۔ آج بہت سے غیر مسلمین اگر اسلام کو دہشت گردی کا مذہب کہتے ہیں تو اس غلط فہمی کے لئے اصل ذمہ دار یہی نظریہ ساز مسلمان ہیں۔ کیوں کہ مذکورہ نظریہ کے بعد اسلام کی جو تصویر بنتی ہے وہ بلاشبہہ یہی ہے۔

اس خود ساختہ نظریہ کی بنیاد اس واقعہ پر ہے کہ اسلام میں انفرادی احکام کے ساتھ سیاسی احکام بھی دئے گئے ہیں۔ مگر یہ سراسر مغالطہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام کا تعلق امتحان اور آزمائش کے مسئلہ سے ہے نہ کہ حکومتِ الٰہیہ کے مسئلہ سے۔ موجودہ دنیا میں ہر انسان آزمائش کے مرحلہ میں ہے۔ یہ آزمائش باعتبار اختیار ہے، یعنی جتنا اختیار اتنی ہی آزمائش۔ مثلاً

ایک شخص کو صرف یہ اختیار ہے کہ وہ خود شراب پئے یا نہ پئے تو اس کی آزمائش صرف اس اعتبار سے ہوگی کہ وہ خود شراب پیتا ہے یا نہیں پیتا۔ دوسرے شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ شراب کی دکان کھولے یا نہ کھولے تو اس کی آزمائش اس کے اپنے دائرۂ عمل کے اعتبار سے ہوگی۔ تیسرے شخص کو یہ اختیار ہے کہ وہ شراب پینے والے کو سزا دے یا نہ دے تو اس کی آزمائش اس اعتبار سے ہوگی کہ وہ شرابی آدمی کو چھوڑ دیتا ہے یا اس کے اوپر خدا کی بتائی ہوئی سزا کو نافذ کرتا ہے۔

اسی طرح شریعت الٰہی کے تمام احکام انسان کی جانچ کے لئے ہیں اور وہ ہر انسان کے اپنے دائرہ اختیار سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی حکم یا احکام کا کوئی مجموعہ اس نظریہ سے تعلق نہیں رکھتا کہ خدا کی حکومت زمین پر یا انسانی دنیا پر قائم نہیں ہے اور اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم خدا کے نائب بن کر خدا کے اقتدار کو اس حصۂ کائنات پر نافذ کریں۔

انسان کو موجودہ زمین پر اس لئے نہیں بسایا گیا ہے کہ وہ یہاں اقتدار خداوندی کی تکمیل کرے۔ انسان کو یہاں بسانے کا واحد مقصد امتحان ہے۔ انسان کو عارضی مدت کے لئے یہاں رکھ کر خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون شخص اپنے اختیار کو جائز حدود کے اندر استعمال کرتا ہے اور کون اختیار پاکر سرکش بن جاتا ہے (خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا) اس اعتبار سے شخصی دائرہ میں حکم الٰہی کی تعمیل بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے عین وہی حیثیت رکھتی ہے جو حکومتی دائرہ میں اپنے اختیار کو استعمال کرنے کی ہے یا ہو سکتی ہے۔

تحریف یا استدلال

اس نظریہ کے حق میں قرآن سے جو دلائل دئے جاتے ہیں، وہ تحریف کی حد تک غلط ہیں۔ ان میں سے اکثر دلائل کا تجزیہ "تعبیر کی غلطی" نامی کتاب میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں ہم ان حضرات کی ایک اور دلیل کی وضاحت کریں گے۔

یہ دلیل قرآنی آیت وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (المدثر ۳) کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ خدا کو بڑا کرو۔ یعنی خدا کی سیاسی اور حکومتی بڑائی کو زمین پر قائم کرو۔ اس نظریہ کے مطابق، اسلام صرف روزہ اور نماز کا نام نہیں ہے۔ اسلام یہ ہے کہ دنیا میں سیاسی انقلاب برپا کیا جائے۔ ساری دنیا میں خدائی قانون کو نافذ کیا جائے۔ خدا کی بڑائی

موجودہ کائنات میں قائم ہے، اس کو زمین پر قائم کرکے اس کی بڑائی کی تکمیل کی جائے۔
یہ حضرات وربک فکبر کا ترجمہ کرتے ہیں ـــــــ اور اپنے رب کو بڑا کر۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ تکبیر کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا صرف اعلان یا اعتراف کر دیا جائے، زبان سے اللہ اکبر کہہ دیا جائے۔ بلکہ تکبیر سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کی سیاسی بڑائی کو زمین پر نافذ کیا جائے۔ اس کی کبریائی کی بنیاد پر مبنی حکومتی نظام کو بالفعل قائم کیا جائے۔ اپنی اس تشریح کی روشنی میں اور اپنے اس دعوے کے مطابق، یہ حضرات انقلابی تحریک چلا رہے ہیں۔ جس کا مدعا یہ ہے کہ سیکولر حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹا کر اسلام پسند حکمرانوں کو اقتدار پر بٹھایا جائے۔ اور پھر یہ اسلام پسند حکمراں خدا کے نائب بن کر خدا کی بڑائی کو زمین پر قائم کریں۔
"تکبیر رب" کا یہ مفہوم نہ صرف علمی اعتبار سے بے بنیاد ہے بلکہ وہ لرزہ خیز حد تک ایک بیجا جسارت ہے۔ کیوں کہ اللہ کی بڑائی تمام دنیا پر اپنے آپ قائم ہے۔ اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ کوئی شخص اللہ کی بڑائی کو اس کی طرف سے دنیا کے اوپر قائم اور نافذ کرے۔
بلاشبہ اسلام میں یہ بھی مطلوب ہے کہ حسب حالات سیاسی اور حکومتی معاملات میں شرعی قانون کو جاری کیا جائے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ انسانی امتحان کا مسئلہ ہے نہ کہ خدا کی بڑائی قائم کرنے کا مسئلہ۔ جس طرح انفرادی زندگی کے احکام ایک فرد کے لئے بطور آزمائش ہیں۔ اسی طرح شریعت کے اجتماعی احکام بھی ان لوگوں کے لئے آزمائش ہیں جو اجتماعی امور کا اختیار رکھتے ہوں۔ ان احکام کا اس خود ساختہ نظریہ سے کوئی تعلق نہیں کہ زمین پر خدا کی بڑائی قائم نہیں ہے اور اب ضرورت ہے کہ مسلمان یہاں خدا کی بڑائی قائم کرکے اس کے اقتدار کو مکمل کریں۔
جیسا کہ معلوم ہے، تکبیر یا اللہ اکبر کا کلمہ سب سے زیادہ نماز کے عمل میں دہرایا جاتا ہے۔ یہ عمل روزانہ پانچ اوقات میں مسجد کے اندر انجام دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسجد کے اندر خدا کا سیاسی اقتدار قائم نہ تھا، اور نمازیوں نے تکبیر (اللہ اکبر) کا عمل کرکے مسجد کے احاطہ میں خدا کی سیاسی بڑائی کا تخت بچھا دیا۔
مسجد کے ماحول میں اللہ اکبر کی تکرار ایک خالص شخصی عمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بندہ جس کو اللہ نے فکر و عمل کی آزادی دی تھی، اس نے مسجد میں آکر خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اقرار

کیا۔ اس نے اللہ اکبر کا کلمہ اپنی زبان سے ادا کرکے یہ اعتراف کیا کہ میں چھوٹا ہوں۔ بڑائی اور عظمت سب کی سب ایک ذو الجلال و الاکرام کو حاصل ہے

مسجد میں اللہ اکبر کی تکرار، اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک انفرادی اور نفسیاتی عمل ہے نہ کہ سیاسی اور حکومتی عمل۔ یہ ایک موجود عظمت کا اقرار کرتا ہے نہ کہ غیر موجود عظمت کو نافذ اور قائم کرنا۔

تکبیر رب کا حکم قرآن میں متعدد مقام پر آیا ہے۔ کہیں اسی خاص لفظ میں اور کہیں دوسرے الفاظ میں۔ اس سلسلہ میں قرآن کے چار مقامات یہ ہیں ـــــ البقرہ ۱۸۵، الحج ۳۷، الاسراء ۱۱۱، المدثر ۳۔

ان چاروں آیتوں میں تکبیر رب کا حکم آیا ہے۔ مگر تمام مفسرین نے بالاتفاق یہاں "اللہ اکبر" کہنا مراد لیا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی "کبّر" یا تکبیر کا لفظ ہے، اس کا مطلب مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ "اللہ اکبر کہو" تاہم کہنے کا مطلب مجرد کلمۂ تکبیر کا تلفظ نہیں ہے بلکہ حقیقت تکبیر کا قلبی اعتراف ہے۔ زبان سے اللہ اکبر کہنا دراصل اس بات کا ظاہری اعلان ہے کہ بندہ نے خدا کو اپنا کبیر بنا لیا ہے اور اس کے مقابلہ میں وہ اپنے کو صغیر بنانے پر راضی ہے۔

اللہ اکبر کو قائم کرنے کا محل انسان کے اپنے اندر کی روح ہے نہ کہ کوئی باہر کا ملک یا خارجی زمین۔ اس کا تعلق آدمی کے ایمان سے ہے۔ ایمان ایک شعوری دریافت ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی مظاہر کائنات کے پیچھے حقیقت کائنات کو پالے۔ وہ تخلیق سے گزر کر اس کے خالق کا جلوہ دیکھ لے۔ وہ واقعہ میں صاحب واقعہ کے وجود کا مشاہدہ کرے۔

اللہ اکبر اسی ایمانی دریافت کا ایک اظہار ہے۔ ایمان آدمی کو ایک عظیم خدا سے متعارف کراتا ہے۔ وہ آدمی کو توحید کی حقیقت سے آشنا کرتا ہے۔ اس وقت آدمی کی زبان سے کلمۂ اعتراف نکل پڑتا ہے وہی اللہ اکبر ہے۔ اللہ اکبر کا مطلب خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو چھوٹا بنانا ہے۔ اللہ اکبر کے کلمہ کی تکمیل یہ نہیں ہے کہ زمین کے اوپر شریعت کا دیوانی اور فوجداری قانون نافذ ہو جائے۔ اللہ اکبر کے کلمہ کی تکمیل یہ ہے کہ آدمی کی زبان سے جب اللہ اکبر نکلے تو اس کی روح بے اختیار ہو کر کہہ اٹھے کہ انا اصغر (میں چھوٹا ہوں)

"تکبیر رب" کے سلسلہ میں مفسرین کی تشریحات نہایت واضح ہیں۔ ہر ایک نے اس کو نفسیاتی معنی میں لیا ہے نہ کہ سیاسی معنی میں۔ یہاں نمونہ کے طور پر چند مفسرین کی تشریحات نقل کی جاتی ہیں:

تفسیر ابن کثیر ولتذکروا الله عند انقضاء عبادتکم (۱/ ۲۱۷)

لتعظموه کما هداکم لدینه وشرعه وما یحبه ویرضاه وینهاکم عن فعل ما یکرهه ویأباه (۳/ ۲۲۴)

تفسیر قرطبی ای عظّمه عظمة تامة ، صفه بانه اکبر من کل شی (۱۰/ ۳۴۵)

ای سیدك ومالکك ومصلح امرك فعظم وصفه بانه اکبر من ان یکون له صاحبة او ولد (۱۹/ ۶۰)

تفسیر نسفی لتکبروا الله ای لتعظموه حامدین علی ما هداکم الیه (۱/ ۹۵)

واختص ربك بالتکبیر وهو التعظیم ای لا یکبر فی عینك غیره (۴/ ۳۰۷)

تفسیر آلوسی ای اخصص ربك بالتکبیر وهو وصفه تعالی بالکبریاء والعظمة اعتقاداً وقولاً (۲۹/ ۱۱۶)

صفوة التفاسیر ای عظم ربك عظمة تامة واذکر بصفات العز والجلال والعظمة والکمال (۲/ ۱۸۰)

ای ولتحمدوا الله علی ما ارشدکم الیه من معالم الدین (۱/ ۱۲۲)

تفسیر مظہری ای عظمه عن ان یکون له شریك او ولیّ تعظیما بالغاً (۵/ ۵۰۴)

وصفه باوصاف الکمال ما لا یتصف به غیره (۱۰/ ۱۲۴)

مفسرین کی ان تشریحات پر غور کیجئے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تمام مفسرینِ قرآن کے نزدیک تکبیرِ رب ایک شخصی عبادت کا فعل ہے نہ کہ کوئی سیاسی اور حکومتی فعل۔ جب ایک بندہ اللہ اکبر کہتا ہے تو وہ اپنی معرفت خداوندی کا زبانی اقرار کرتا ہے۔ وہ اللہ کی عظمت اور اس کے احسانات کو یاد کرکے کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا تو ہی بڑا ہے۔ ساری عظمتیں صرف تیرے لئے ہیں۔ میں اپنے عجز کا اور تیری بڑائی کا اقرار کرتا ہوں۔

اللہ اکبر کسی نام نہاد انقلابی نظریہ کا کوئی سیاسی نعرہ نہیں۔ اللہ اکبر دراصل حمد اور شکر کا کلمہ ہے۔ یہ مومن کی قلبی حالت کا ایک لفظی اظہار ہے۔ اس کا تعلق انسان کی اندرونی شخصیت سے ہے نہ کہ کسی خارجی ڈھانچہ یا کسی بیرونی نظام سے۔

سب سے بڑی عبادت اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ مومن کا سب سے بڑا سرمایہ یہ ہے کہ وہ خداوند بزرگ و برتر کو اس طرح پالے کہ اس کی شخصیت اس کے جلال و کمال کے تصور سے نہا اٹھے، وہ صحیح معنوں میں ایک ربانی انسان بن جائے۔ مگر مذکورہ دینی تعبیر میں یہی اہم ترین چیز حذف ہو جاتی ہے۔

خدا کی عظمت ایک قائم شدہ عظمت ہے۔ وہ ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گی۔ جب آدمی اس قائم شدہ عظمت کے بارے میں سوچتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی روح خدا کی بڑائی کے احساس سے بھر جاتی ہے۔ اللہ اکبر کا کلمہ اس کو حمد اور شکر اور انابت کی کیفیت سے سرشار کر دیتا ہے۔ خدا کو آخری حد تک کامل سمجھنے کا احساس اس کے اندر عبدیت کے جذبہ کو آخری حد تک بڑھا دیتا ہے۔

مگر مذکورہ تعبیر میں ساری صورت حال بدل جاتی ہے۔ جب یہ مان لیا جائے کہ خدا کی بڑائی ابھی ادھوری ہے۔ کچھ انسانوں نے خدا کی بڑائی کے ایک حصہ پر قبضہ کر رکھا ہے تو اب توجہ کا مرکز خدا کے بجائے انسان بن جاتا ہے۔ اب خدا کی قائم شدہ بڑائی میں سرشار ہونے کے بجائے سارا ذہن ان انسانوں کی مخالفت میں لگ جاتا ہے جو خدا کی بڑائی کے ایک حصہ کو مفروضہ طور پر چھینے ہوئے ہیں۔ اور جن سے اس بڑائی کو واپس لے کر ہمیں خدا کی بڑائی کو مکمل کرنا ہے۔ "اللہ اکبر" خدائی بڑائی کے اقرار کا عنوان تھا۔ مگر اس تعبیر نے اللہ اکبر کو انسانی بڑائی کے انکار کا عنوان بنا دیا۔ ایک عظیم روحانی کلمہ محض ایک سیاسی کلمہ بن کر رہ گیا۔

پہلی صورت میں انسان کا روحانی احساس ابھرتا ہے، اور دوسری صورت میں انسان کا سیاسی احساس۔ پہلی صورت میں دین آدمی کے لئے ربانی غذا بن جاتا ہے، اور دوسری صورت میں سیاسی تقریروں اور حکومتی نزاع کا۔ پہلی صورت میں آدمی کے اندر ایک متقیانہ شخصیت ابھرتی ہے اور دوسری صورت میں سیاسی شخصیت۔ پہلی صورت میں آدمی کے اندر خوف خدا کی نفسیات جاگتی ہے اور دوسری صورت میں نفرت انسان کی نفسیات ——— آدمی عین اسی چیز کو کھو دیتا ہے جس کو در اصل اسے اس دنیا میں پانا چاہئے۔

عید اضحی

اس دنیا میں ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کا ظاہر اور دوسرا اس کا باطن۔ جیسے انسان کا ایک ظاہری جسم ہے اور دوسری چیز اس کی روح ہے جو اصل انسان کی حیثیت رکھتی ہے یہی معاملہ اس دنیا میں تمام چیزوں کا ہے۔

اسلام میں جن عبادتوں کی تعلیم دی گئی ہے ان کے بھی اسی طرح دو پہلو ہیں ایک ان عبادتوں کا فارم ہے اور دوسرے ان کی اسپرٹ۔ مثلاً نماز میں قیام اور رکوع اور سجدہ اس کا ظاہری فارم ہے اور اس کی اسپرٹ یہ ہے کہ آدمی کے اندر تواضع کا مزاج پیدا ہو۔ اسی طرح روزہ کا فارم، دن کے اوقات میں کھانا اور پانی چھوڑنا ہے اور اس کی اسپرٹ صبر ہے۔ زکوٰۃ کا فارم، اپنے مال کا کچھ حصہ دوسروں کو دینا ہے اور اس کی اسپرٹ عام انسان کے لیے خیر خواہی ہے۔

یہی معاملہ عید اضحیٰ یا عید قرباں کا ہے۔ عید اضحیٰ کی ظاہری شکل دو رکعت نماز اور ذبیحہ ہے اور اس کی اسپرٹ قربانی ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ خدا کو جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اس کو وہ تقویٰ پہنچتا ہے جو تمہارے اندر ہے۔ تقویٰ سے مراد اندرونی جذبہ ہے یعنی خدا کو یہ مطلوب ہے کہ تمہاری اپنی ذات کے بجائے خدا تمہارا مرکز توجہ بن جائے، دنیا کے بجائے آخرت تمہارا مقصود ہو، مادی ترقی کے بجائے روحانی ترقی کو تم اپنی سرگرمیوں کا نشانہ بنا لو۔

اس طرح کا مقصد محض سادہ عمل کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا، اس کے لیے اس قسم کی غیر معمولی جدوجہد درکار ہے جس کو قربانی کہا جاتا ہے۔ قربانی کی سطح پر عمل کر کے ہی آدمی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو پا سکتا ہے، اور آدمی کے اندر قربانی کی اسی اسپرٹ کو جگانے کے لیے اسلام میں عید اضحیٰ کا سالانہ تیوہار رکھا گیا ہے۔

اس قربانی کے عمل کی سب سے پہلی تاریخی مثال حضرت ابراہیمؑ نے قائم کی، وہ تقریباً چار ہزار سال پہلے عراق میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ میں عراق اور دوسری متمدن دنیا میں مادیت اور غیر خدا کی پرستش عام ہو چکی تھی یہ چیزیں تہذیب کا حصہ بن چکی تھیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں یہ چیزیں اتنا زیادہ سرایت کر چکی تھیں کہ اس ماحول میں جو پیدا ہوتا تھا وہ مادیت سے قریب اور خدا سے دور ہو جاتا تھا۔

انسانی فطرت کے بارے میں یہ بات [illegible] وہ ماحول [illegible] اور توہمات اور [illegible]
[illegible] اب ضرورت تھی کہ ایک نئی نسل تیار کی جائے جس کی انسانی فطرت کے ابدی اصولوں پر [illegible]
ہو جو [illegible] کے ماحول سے باہر آئے اور آفاقیت کی وسیع تر فضا میں جینے کے قابل ہو سکے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی نئی نسل کی تیاری کے لیے اپنی اولاد کو قربان کیا [illegible] شام کے متمدن شہروں سے نکل کر باہر آئے اور اپنے چھوٹے بچے اور ان کی ماں کو غیر متمدن حجاز کے علاقہ میں بسا دیا۔ یہاں اس وقت کوئی انسانی آبادی نہیں تھی، اس لیے وہاں وقت کی شہری خرابیاں بھی موجود نہ تھیں۔ اس وقت وہاں صرف فطرت کا ماحول تھا —— پھیلی ہوئی زمین، پہاڑ، درخت، ہوائیں، کھلی فضا، آسمان، سورج، چاند، ستارے، وغیرہ۔ شہروں میں اگر مصنوعی تہذیب کا راج تھا تو اس وقت کے حجاز میں ہر طرف فطرت کی تہذیب کے مناظر پھیلے ہوئے تھے۔

یہ گویا فطرت کی وسیع تعلیم گاہ تھی۔ اسی کے آفاقی ماحول میں اس نسل کی تعلیم و تربیت ہوئی جو بعد کو بنی اسماعیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نئی نسل توالد و تناسل کے ذریعہ تقریباً ڈھائی ہزار سال میں تیار ہوئی۔ اس نسل کا ہر فرد اس اعلیٰ فطرت کا نمونہ تھا جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے ہر فرد میں وہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف پوری طرح موجود تھے جو انسانیت کا کمال سمجھے جاتے ہیں۔

بنو اسماعیل کے انھیں اوصاف کی بنا پر ایک مغربی مورخ نے ان کو ہیروں کی ایک قوم (نیشن آف ہیروز) کا نام دیا ہے۔ فطرت کی درس گاہ میں تعلیم و تربیت پا کر ان میں کا ہر شخص ایک انسانی ہیرو بن گیا۔ چنانچہ انھیں میں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور وہ تمام اعلیٰ انسان بھی اسی نسل کے افراد تھے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے اپنی قربانی کے ذریعہ جو نئی نسل تیار کی اسی کا یہ کارنامہ تھا کہ اس نے تاریخ انسانی میں نئے دور کا آغاز کیا —— اسی گروہ نے دوبارہ اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اوصاف کے نمونے قائم کیے۔ اس نے انسانیت کے قافلہ کو خالق کی پرستش کے راستہ پر ڈالا جو مخلوق کی پرستش میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے انسانیت کو توہمات کے دور سے نکال کر سائنس کے دور میں داخل کیا۔ اس نے انسانی غلامی کا خاتمہ کیا اور اس بات کو ممکن بنایا کہ انسان آزادی اور مساوات کی فضا میں جی سکے، وغیرہ۔

عید الاضحیٰ کا تیوہار ہر سال یہ یاد دلاتا ہے کہ ہر زمانہ کے لوگوں کو دوبارہ اسی طرح قربانی کا عمل

کہ ہر زمانہ میں کچھ لوگوں کو اس مقصد کے لیے اٹھنا ہے کہ وہ قربانی کی حد تک جاکر اصلاح و تعمیر کا عمل انجام دیں۔ وہ انسانیت کے قافلہ کو اس وقت دوبارہ فطرت کی شاہراہ پر لائیں جب کہ وہ فطرت سے بھٹک گیا ہو۔

عید الاضحی کا تیوہار حضرت ابراہیم کی مثالی قربانی یاد دلاتا ہے۔ اس طرح دنیا بھر کے مسلمان علامتی طور پر حضرت ابراہیم کی تقلید کرکے یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ حقیقی طور پر حضرت ابراہیم کے طریقہ پر چلیں گے۔ وہ اپنے زمانہ میں دوبارہ سنت ابراہیمی کو ان نئے حالات کے اعتبار سے زندہ کریں گے، تاکہ انسانیت کا قافلہ رکے بغیر ترقی کی سمت میں اپنا سفر جاری رکھے۔

عید الاضحی کے موقع پر ذوالحجہ کے مہینہ میں جو کچھ کیا جاتا ہے وہ حضرت ابراہیم کی قربانی کا ایک علامتی اعادہ ہے۔ حضرت ابراہیم کی اس قربانی والی زندگی کو زیادہ جامع صورت میں حج کے موقع پر حجاز کے علاقہ میں ہر سال دہرایا جاتا ہے جہاں ابتدائی طور پر قربانی کا یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ حجاز (مکہ) میں یہ عمل کلی طور پر ادا کیا جاتا ہے اور دنیا کے دوسرے مقامات پر انھیں دنوں میں جزئی طور پر۔

عید الاضحی کا مقصد یہ ہے کہ قربانی کی یہ اسپرٹ ہر مسلمان کے اندر مسلسل طور پر باقی رہے۔ ہر اگلی نسل کے مسلمان اپنے زمانہ کے تقاضوں کو سمجھ کر اس کے مطابق، قربانی کے اس عمل کو دہرائیں۔ وہ بار بار اس ابراہیمی سنت کو زندہ کریں تاکہ انسانیت جمود کی شکار نہ ہو۔ یہ عمل ایک طرف ہر دور میں مسلمانوں کے احیائے نو کا ذریعہ ہے اور دوسری طرف وسیع تر انسانیت کی ضرورتوں کی تکمیل بھی۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۸ اپریل ۱۹۹۸ کو نشر کی گئی۔

بند شیر

[illegible] چڑیا گھر کے اندر لوہے کا اونچا اور مضبوط کٹہرا ہے۔ اس کٹہرے کے اندر ایک شیر بند ہوا ہے۔ کٹہرے کے باہر کچھ تماشائی اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں شیر غصہ ہو کر زور زور سے دھاڑنے لگا اس کی دھاڑ کو سن کر ایک بچہ ڈر گیا۔ وہ یہ کہتے ہوئے [illegible] بھاگو۔ لیکن جو بڑے لوگ تھے وہ اپنی جگہ بے خوف کھڑے ہوئے شیر کو دیکھتے رہے۔ انھوں نے شیر کی دھاڑ کی کوئی پروا نہیں کی۔

دونوں کے درمیان اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بچہ کا دھیان شیر کی آواز پر گیا اور بڑوں کا دھیان شیر کی محدودیت پر۔ بچہ نے یہ سمجھا کہ شیر جس طرح ہم لوگوں کو دیکھ کر گرجدار آواز نکال رہا ہے، اسی طرح وہ ہمارے خلاف کچھ کر بھی سکتا ہے۔ اس کے برعکس بڑی عمر کے جو مرد اور عورت وہاں موجود تھے، انھوں نے محسوس کیا کہ شیر خواہ کتنا ہی دھاڑے مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ لوہے کی سلاخوں کو پار کر کے ہم لوگوں تک پہنچ جائے، اس لیے انھوں نے شیر کی خوفناک دھاڑ کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انھوں نے سادہ طور پر اس کو نظر انداز کر دیا۔

اس مثال کی روشنی میں دور جدید کے مسلم رہنماؤں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لیے بھی مذکورہ قسم کی صورت حال پیدا ہوئی۔ بہت سے "شیر" مسلمانوں کے خلاف دھاڑنے لگے۔ تاہم یہ سب کے سب بند شیر تھے نہ کہ کھلے شیر۔ مگر بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما "بچہ" کی مانند ثابت ہوئے۔ وہ اس معاملہ میں بڑے لوگوں والا کردار ادا نہ کر سکے۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو اتنا زیادہ نقصان اٹھانا پڑا جس کا شمار کرنا بھی ممکن نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مشرق سے لے کر مغرب تک تمام ملکوں میں ایسے افراد اٹھے جنھوں نے اسلام یا مسلمان کے خلاف لفظی طوفان برپا کیا ایسے لوگ ہندوؤں میں بھی تھے اور عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی۔ ان لوگوں کے مخالفانہ الفاظ جب پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ پھیلے تو دنیا بھر کے مسلم رہنماؤں نے جوابی تحریکیں شروع کر دیں انھوں نے مسلمانوں کو ڈرایا کہ دیکھو، ساری دنیا میں تمہارے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ یہ دشمن تمہارے تشخص کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ وہ تمہارے ملی وجود کے لیے سنگین خطرہ ہیں۔

مسلم پیشواؤں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو بھڑکا دیا۔ اب دنیا بھر کے مسلمان جہاد کے نام پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ کہیں یہ سرگرمیاں منفی سوچ تک محدود رہیں اور کہیں انھوں نے تشدد کا روپ اختیار کر لیا۔

ان مسلم تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ منفی سوچ ہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی غالب سوچ بن گئی۔ وہ غیر مسلموں کو اپنا دشمن سمجھ کر ان سے نفرت کرنے لگے۔ اس نفرت کا مزید نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں میں جو لوگ عالمی امن اور بین اقوامی رواداری کی بات کرتے تھے یا دوسری قوموں سے خوش گوار تعلقات قائم کرنے پر زور دیتے تھے وہ سب مسلمانوں کی نظر میں معتوب ہو گئے۔ وہ انھیں دشمن قوموں کے ایجنٹ نظر آنے لگے۔

اس طرح موجودہ زمانہ کے مسلمان نہ صرف غیر مسلموں سے لڑنے بھڑنے میں مصروف ہو گئے، بلکہ خود اپنی قوم کے اعتدال پسند لوگوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر ان کے خلاف بھی جنگ چھیڑ دی۔ یہ دو طرفہ جنگ آج دنیا کے ہر حصہ میں کم و بیش جاری ہے۔ کہیں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اور کہیں خود مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان۔

مفروضہ دشمنوں کے خلاف ہونے والی اس نام نہاد لڑائی میں یک طرفہ طور پر خود مسلمانوں ہی کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اب مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ کو ساری دنیا میں ایک نیا مشغلہ ہاتھ آگیا۔ وہ اس کے خلاف شکایت اور احتجاج کا طوفان برپا کرنے لگے۔ دشمنان اسلام کی ظلم و زیادتی کا اعلان کرنا تقریری اور تحریری جہاد کے ہم معنی بن گیا۔

لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس معاملہ کی مکمل ذمہ داری خود نا اہل مسلم رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔ مذکورہ مثال کے مطابق، شیر کی دھاڑ کے مقابلہ میں وہ صرف بچہ ثابت ہوئے، اس معاملے میں وہ بڑے آدمی کا رول ادا نہ کر سکے۔

بطور واقعہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر مسلم قوموں میں کچھ ایسے افراد اٹھے جنھوں نے اسلام یا مسلمانوں کے خلاف تقریریں کیں یا کتابیں لکھیں۔ انھوں نے ایسی تحریکیں چلائیں جن کو بظاہر اینٹی مسلم تحریک کہا جا سکتا تھا۔ مگر ہمارے رہنماؤں کو جاننا چاہیے تھا کہ یہ شخصی بادشاہت کا زمانہ نہیں ہے، یہ آزادی اور جمہوریت اور حقوق انسانی کے عالمی اعتراف کا زمانہ ہے۔ آج کی دنیا ایک گلوبل ولیج ہو چکی ہے،

اب [illegible] طاقت [illegible] قائم ہے۔ جدید [illegible] اور [illegible]
کی طرح [illegible] اور تشدد کو صرف ایک لغو عمل بنا دیا ہے۔ (وغیرہ)
اس طرح کے مختلف عالمی اسباب موجود نہ ہونے کے بعد [illegible] کے لیے [illegible] آہنی ہتھیار بن چکے تھے۔ یہ جدید حالات عملی طور پر اس میں مانع تھے کہ کوئی [illegible] یا گروپ مسلمانوں کو کوئی حقیقی نقصان پہنچا سکے۔ اس قسم کے دشمن اپنی منفی آوازوں سے مسلمانوں کی صرف تخراشی تو کر سکتے تھے مگر وہ ان کے خلاف کسی جارحانہ اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ ایک لفظ میں یہ کہ اس قسم کی تحریکیں مسلمانوں کے لیے صرف ایک بے ضرر ازعاج (nuisance) تھیں نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی واقعی خطرہ۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ کا کام وہ نہ تھا جو انھوں نے کیا۔ ان کا اصل کام یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو بتاتے کہ موجودہ زمانہ مکمل طور پر ایک بدلا ہوا زمانہ ہے اس قسم کے تمام لوگ زیادہ سے زیادہ فضا میں کچھ لفظی کثافت بکھیر سکتے ہیں، وہ تمہارے لیے کوئی حقیقی خطرہ نہیں۔ تم ان کے معاملہ میں اسلامی تعلیم کے مطابق اعراض کا طریقہ اختیار کرو، تم ان کے لفظوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا تعمیری اور دعوتی کام جاری رکھو۔ اپنے آپ کو جدید پہلو سے زیادہ سے زیادہ مستحکم بناؤ۔ تم دوسروں سے الجھے بغیر اپنے ترقیاتی کاموں میں مصروف رہو۔

مگر بدقسمتی سے مسلم رہنما اس صورت حال کی اصل نوعیت کو نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے انتہائی غیر ضروری طور پر مسلمانوں کو ٹکراؤ کے راستہ پر لگا دیا جس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کے لیے کامل طور پر یہ موقع تھا کہ وہ "کٹہرا" سے باہر رہ کر اپنی تعمیر و ترقی کا کام انجام دیں مگر اپنے رہنماؤں کی بے بصیرت رہنمائی کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ وہ پر جوش چھلانگ لگا کر خود کٹہرے کے اندر داخل ہو گئے۔ بند شیر تو ان کے قریب نہیں آسکتا تھا مگر انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو شیر تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا ایک الم ناک صفحہ بن چکا ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وإن تصبروا وتتقوا لا يضركم كيدهم شيئا (آل عمران ۱۲۰)

اس آیت کے مطابق، تقویٰ اور صبر کی روش گویا وہ آہنی روک ہے جو دشمن کو ہم سے دور رکھتی

یہ روش اس بات کی ضمانت ہے کہ ہم دشمن کی سازشوں کی زد میں آنے سے محفوظ رہیں گے۔ مگر جب مسلمان تقویٰ اور صبر کی روش چھوڑ دیں تو اس کے بعد ان کے اور ان کے دشمن کے درمیان کوئی روک باقی نہیں رہتا۔ اس کے بعد ان کی مثال اس انسان جیسی ہو جاتی ہے جو کسی اڈہ میں لوہے کی سلاخوں کو پھلانگ کے اپنے آپ کو شیر کے پاس پہنچا دے۔

اس طرح چھلانگ لگانے والا انسان اگر بعد کو یہ چیخ و پکار بلند کرے کہ یہ شیر بڑا ظالم ہے۔ اس نے مجھے پھاڑ ڈالا تو یہ شکایت صرف اپنی نادانی کا اشتہار ہوگی۔ اس کے برعکس ایسے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی نادانی کا اعتراف کرے نہ کہ شیر کو مجرم قرار دے کر اس کے خلاف بے فائدہ طور پر شکایت اور احتجاج کا طوفان برپا کرنے میں مشغول ہو جائے۔

موجودہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت بنائی گئی ہے اسی امتحان کی بنا پر یہاں ہر ایک کو پوری آزادی بھی دی گئی ہے۔ یہاں بسنے والے ہر شخص کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو چاہے مثبت کام میں استعمال کرے یا منفی کام میں۔

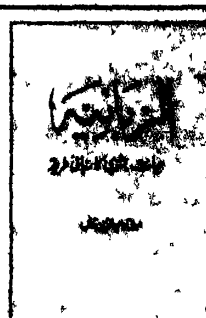
اس صورت حال نے موجودہ دنیا کو ایک قسم کا جنگل بنا دیا ہے۔ ایسی حالت میں اپنے آپ کو دوسروں کی زیادتی سے محفوظ رکھنے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ طریقہ قرآن کے مطابق، تقویٰ اور صبر ہے۔ تقویٰ اور صبر ایک اور دوسرے کے درمیان فطرت کی مقرر کی ہوئی آڑ ہے، جو لوگ اس آڑ کو باقی رکھیں وہ دوسروں کی زیادتیوں سے محفوظ رہیں گے۔ اور جو لوگ اس آڑ کو اپنی نادانی سے توڑ ڈالیں، وہی وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی ظلم و زیادتی کا شکار ہوئے۔



Size 22x14.5cm, pages 200
Rs. 30



Size 22x14.5cm, pages 72
Rs. 35



Size 22x14.5cm, pages 224
Rs. 45

لیک بعد از خرابی بسیار

فارسی شاعر کا ایک شعر ہے کہ —— جو کچھ دانش مند آدمی کرتا ہے وہی بے دانش کا بھی کام ہے۔ فرق یہ ہے کہ دانش مند پہلے کرتا ہے، اور بے دانش آدمی بعد کو اس وقت کرتا ہے جب کہ معاملہ ناقابل اصلاح حد تک بگڑ چکا ہو:

آں چہ دانا کند کند ناداں ‏ ‏ لیک بعد از خرابی بسیار

موجودہ زمانہ میں ہندستان کے لیڈر، ہندو اور مسلمان دونوں مکمل طور پر مذکورہ فارسی شعر کا مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ دونوں ہی نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ معاملات کو پیشگی طور پر نہیں سمجھتے، وہ اس کو صرف اس وقت سمجھتے ہیں جب کہ معاملات بگڑ چکے ہوں اور حالات کو درست کرنے کا موقع بہت کم باقی رہ گیا ہو۔

قیادت، مستقبل کی منصوبہ بندی کا دوسرا نام ہے۔ قائد جب کوئی اقدام کرتا ہے تو اس کا اقدام بظاہر حال کے اندر ہوتا ہے مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ مستقبل میں نکلتا ہے اس لیے قائد کو لازماً دور اندیش اور مستقبل بین ہونا چاہیے۔ جن لوگوں کے اندر دور اندیشی اور مستقبل بینی کی صفت نہ ہو انھیں چاہیے کہ وہ قیادت کے میدان میں نہ اتریں بلکہ اپنی سرگرمیوں کے لیے اس کے سوا کوئی اور میدان تلاش کریں۔ بدقسمتی سے ہندستان کی قیادت، ہندو اور مسلم دونوں، اس اعتبار سے ناکام ثابت ہوئی ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریزوں کا سیاسی غلبہ تھا اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے درمیان ایسے قائد اٹھے جنھوں نے انگریزی راج کے خاتمہ کو ملک کی تمام ترقیوں کا راز بتایا۔ انھوں نے اپنی پرجوش تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ لوگوں کو یہ پیغام دیا کہ سیاسی غلامی تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور سیاسی آزادی تمام خوبیوں کا سرچشمہ۔ انھوں نے قوم کو یہ جذباتی نعرہ دیا کہ —— غلامی یا آزادی دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو:

Slavery or freedom, choose between the two.

پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے سیکڑوں ہندو اور مسلمان لیڈر اس زمانہ

ہندستانی قوم کی تقریریں کیا کرتے تھے مگر بعد کے تجربے نے بتایا کہ یہ فعل درست نہ تھا۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان انگریزوں کی سیاسی غلامی سے آزاد ہو گیا مگر پچاس سال سے زیادہ مدت گزرنے کے باوجود ابھی تک وہ گلزار ہندستان نہ بن سکا جس کا خوش نما نقشہ ان ہندو اور مسلم لیڈروں نے ملک کے لوگوں کو دکھایا تھا۔

آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے ہندستان میں کچھ ایسے اہل فکر تھے جو یہ کہتے تھے کہ ہماری پہلی ضرورت تعلیم ہے۔ پہلے قوم کو تعلیم یافتہ بناؤ، تاکہ وہ آزادی کو صحیح طور پر استعمال کر سکے۔

مسلمانوں میں اس سلسلہ میں ایک معروف نام سر سید احمد خاں کا ہے۔ وہ بھی آزادی چاہتے تھے مگر وہ تعلیم کو آزادی پر مقدم کرتے تھے۔ ان کے نقطہ نظر کو مولانا الطاف حسین حالی نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

سر سید کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایسے کئی لوگ اٹھے جو تعلیم کو مقدم کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں میں مدن موہن مالویہ اور سر تیج بہادر سپرو کا نظریہ یہی تھا۔ مگر نہرو اور آزاد جیسے لوگوں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ ان کو تعلیم کی اہمیت کا اندازہ صرف اس وقت ہوا جب کہ ان کی تحریک اپنی آخری حد تک پہنچ گئی اور ہندستان سیاسی معنوں میں آزاد ہو گیا۔

چنانچہ آزادی کے بعد جب مذکورہ قسم کے لیڈروں نے ملک کا نیا دستور بنایا تو اس کی دفعہ ۴۵ میں یہ درج کیا کہ اسٹیٹ کا یہ فرض ہوگا کہ وہ دس سال کے اندر تمام اہل ملک کو پڑھا لکھا بنا دے۔ مگر یہ ایک رومانی دفعہ تھی نہ کہ کوئی حقیقی دفعہ۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی زمیندار اپنے کھیت میں بونے کے وقت دانہ نہ بوئے اور جب فصل کاٹنے کا وقت آجائے اور اس کو نظر آئے کہ میرا کھیت خالی پڑا ہوا ہے، تو وہ اپنے آدمیوں کو حکم دے کہ تم لوگ دس دن کے اندر یہاں لہلہاتی ہوئی فصل اگا دو۔ ظاہر ہے کہ زمیندار کا یہ حکم کبھی واقعہ نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ہندستانی لیڈروں کا یہ دس سالہ دستوری منصوبہ بھی واقعہ نہ بن سکا۔

آزادی کے بعد ملک کی تعمیر نو کا مسئلہ تھا۔ یہاں ملک کے بے بصیرت قائدین نے دوبارہ ایک اور شدید تر غلطی کر ڈالی۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک کی اقتصادیات کو سوشلزم کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ ۱۹۵۵ء میں مدراس کے کانگریسی اجلاس میں اس فیصلہ کو سوشلسٹ نمونہ کا سماج

(سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی) کا نام دیا گیا۔

عجیب بات ہے کہ ہمارے سیاسی قائدین جس زمانہ میں سوشلزم (اشتراکیت) کو اقتصادی ترقی کی معراج کمال سمجھ رہے تھے اسی زمانہ میں راقم الحروف اپنی وہ کتاب تیار کر رہا تھا جو بعد کو "مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے" کے نام سے شائع ہوئی۔ سوشلزم یا مارکسزم کے بارے میں اول دن سے میری یہ رائے تھی کہ وہ ایک غیر فطری نظریہ ہے۔ موجودہ دنیا میں وہ سرے سے قابل عمل ہی نہیں کیوں کہ اقتصادی ترقی مسابقت کے کھلے ماحول میں ہوتی ہے نہ کہ سیاسی کنٹرول کے بند ماحول میں۔ مگر ہمارے سیاسی قائدین اس نظریہ کے بارے میں خوش خیالی کی حد تک پر امید بنے ہوئے تھے انھوں نے ہندستان میں سوشلسٹ سوسائٹی بنانے کے لیے قومی دولت کا کھربوں ڈالر اقتصادی پلاننگ کے نام پر ضائع کر دیا۔

ان لیڈروں کی آنکھ صرف اس وقت کھلی جب کہ چالیس قیمتی سال بیت گئے اور ملک میں کوئی حقیقی ترقی نہ ہو سکی۔ چنانچہ اب سوشلسٹ اکانومی (صحیح تر لفظ میں کنٹرولڈ اکانومی) کے بجائے لبرل اکانومی کا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ مگر ملک کی اقتصادی حالت اب اتنی زیادہ بگڑ چکی ہے کہ بظاہر طویل مدت تک اس کے درست ہونے کی کوئی امید نہیں۔

اب مسلم لیڈر شپ کی ایک مثال لیجئے۔ ایودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہوا تو راقم الحروف نے مسلسل یہ لکھا کہ اس مسئلہ کو لوکل دائرہ میں محدود رکھا جائے اور پرامن گفت و شنید یا عدالت کے ذریعہ سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جائے مگر نااہل مسلم قیادت نے اس کو دھوم کا مسئلہ بنا لیا۔ ایودھیا کی مسجد کے نام پر سارے ملک میں دھواں دھار تحریک چلا دی گئی اس کے نتیجہ میں ہندوؤں کے جذبات بھڑک اٹھے یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہندوؤں کی ایک بھیڑ ایودھیا میں اکٹھا ہوئی اور اس نے بابری مسجد کو ڈھا کر ایک عارضی مندر بنا دیا۔

اس کے بعد نااہل مسلم لیڈروں نے دوبارہ "مسجد وہیں بناؤ" کے نام پر ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ جگہ جگہ فرقہ وارانہ فساد ہونے لگے پورے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی فصل اگ آئی۔ اس وقت راقم الحروف نے سنگین رسک لے کر یہ اعلان کیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں اب اس مسئلہ پر چپ ہو جائیں، وہ مندر اور مسجد کے سوال کو ایودھیا ہی میں ختم کر دیں۔

اس وقت لوگ اتنے جوش میں تھے کہ انھوں نے میری بات کو نظر انداز کردیا۔ خاص طور پر مسلمانوں کا اردو پریس اس معاملہ میں زرد صحافت کا بدترین نمونہ بن گیا۔ اس نے میرے خلاف جھوٹے بیانات شائع کرکے مجھ کو اتنا زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کی کہ اس کی مثال صحافت کی پوری تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ مگر آج کیا حال ہے۔ آج تمام مسلمان خواہ اصاغر ہوں یا اکابر، خواہ بے ریش طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہوں یا باریش طبقہ سے، ہر ایک وہی کر رہا ہے جس کا مشورہ میں نے دسمبر ۱۹۹۲ میں دیا تھا۔ اب ہر ایک چپ ہے۔ ایک عرصہ تک لفظی دھوم مچانے کے بعد اب ہر ایک نے اس موضوع پر لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے اور بولنا بھی۔

اب ایک اور ورق الٹیے — جنوری ۱۹۹۳ میں ورنداون میں وہاں کے گیتا آشرم میں ایک آل انڈیا سیمنار ہوا۔ اس میں بھارتیہ جنتا پارٹی اور آر ایس ایس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ ان کی دعوت پر میں نے بھی اس سیمنار میں شرکت کی (ملاحظہ ہو سفرنامہ الرسالہ نومبر ۱۹۹۳)

اس موقع پر میں نے ایک مفصل تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر میں ہندستان اور پاکستان کا تقابل کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے بعد پاکستان میں کچھ لوگوں نے اسلامی اسٹیٹ قائم کرنے کے نام پر تحریک چلائی۔ اسی طرح ہندستان میں کچھ لوگوں نے ہندو اسٹیٹ کو اپنا نشانہ بنایا۔ مگر میرے نزدیک یہ دونوں ہی قسم کی تحریکیں صرف وقت اور طاقت کے ضیاع کے ہم معنی ہیں۔ کیوں کہ سادہ طور پر وہ موجودہ حالات میں قابل عمل ہی نہیں۔ یہ دونوں تحریکیں بظاہر مختلف ہونے کے باوجود اسپرٹ آف دی ایج کے خلاف ہیں، اور جو چیز اسپرٹ آف دی ایج کے خلاف ہو اس کو اس وقت تک قائم کرنا ممکن نہیں جب تک کہ خود زمانہ کا مزاج ہی بدل نہ جائے۔ حکومتی نظام عمومی حالات کے تابع ہے نہ کہ کچھ افراد کی خواہشات کے تابع۔ کسی بھی حکومتی نظام کے لیے سب سے پہلے اس کے موافق حالات بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حکومتی نظام شعوری تبدیلی کی زمین پر قائم ہوتا ہے نہ کہ محض حکمرانوں کی تبدیلی کی زمین پر۔

میں نے کہا کہ موجودہ حالت میں صرف سیکولر اسٹیٹ ہی قابل عمل ہے اس لیے آپ لوگوں کو ہندوتو کا نعرہ چھوڑ کر سیکولرازم کا نعرہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر آپ اس کو اپنے ارادی فیصلہ کے تحت نہ کریں تو حالات کے دباؤ کے تحت ایسا کرنا پڑے گا۔ ورنداون کے مذکورہ سیمنار میں

کسی نے میری تائید نہیں کی۔ ایک ہندو پروفیسر نے اپنی تقریر میں شدت کے ساتھ اس کا ذکر کیا

مگر فروری ۱۹۹۸ آیا تو تاریخ بدل چکی تھی۔ ہندستان کے جنرل الکشن (فروری ۔ مارچ ۱۹۹۸) میں ایسے

حالات کا ایسا شدید دباؤ پیش آیا جس کے مقابلہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو پسپا ہونا پڑا [illegible]

۱۹۹۳ میں انھوں نے جس بات کو دلیل کے ذریعہ نہیں مانا تھا، ۱۹۹۸ میں انھوں نے اس کو سیاسی دباؤ کے تحت مان لیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۹۸ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی طرف سے جو نیشنل ایجنڈا شائع کیا گیا ہے اس میں ہندتو کا لفظ حذف کرکے سیکولرزم کا لفظ لکھ دیا گیا ہے۔ اگرچہ شرمندگی مٹانے کے لیے اس میں سیکولرزم کے بجائے جینوئن سیکولرزم تحریر کیا گیا ہے۔

۱۹۹۷ کے آخر میں جب بارھویں لوک سبھا کے الکشن کا چرچا شروع ہوا تو میں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈروں کو یہ پیغام دیا کہ آپ لوگ اپنے الکشن مینی فیسٹو میں تین نزاعی اشوز (کامن سول کوڈ، ایودھیا میں رام مندر کی تعمیر، دفعہ ۳۷۰) کو شامل نہ کیجئے۔ آپ لوگ اپنے مینی فیسٹو میں صرف ان اشوز کو لیجئے جو نیشنل اشوز کی حیثیت رکھتے ہیں مگر اس وقت وہ لوگ اتنے جوش میں تھے کہ میری بات انھیں قابل لحاظ نظر نہ آئی۔ چنانچہ انھوں نے جو طویل مینی فیسٹو شائع کیا اس میں ان تینوں اشوز کو شامل کر دیا۔

مگر جب وہ الکشن کے میدان میں اترے تو انھیں محسوس ہوا کہ وہ تنہا الکشن کو جیت نہیں سکتے۔ چنانچہ انھوں نے دوسری پارٹیوں سے گفت وشنید شروع کی اور ۱۳ پارٹیوں کو ساتھ لے کر ایک متحدہ محاذ بنایا۔ یہ پارٹیاں صرف اس شرط پر اتحاد میں شرکت پر راضی ہوئیں کہ مذکورہ تینوں اشوز کو مینی فیسٹو سے نکال دیا جائے۔ چونکہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے پاس کوئی اور متبادل موجود نہ تھا، وہ اس حذف پر راضی ہوگئی۔ دوبارہ یہی ہوا کہ جن لوگوں کے لیے دلیل کی منطق ناکافی ثابت ہوئی تھی عملی دباؤ کی منطق نے ان کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔

یہ پچھلے تقریباً سو سال کی سیاسی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ ہمارے لیڈر، ہندو اور مسلمان دونوں بار بار سیاسی بصیرت کے میدان میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ پیش بینی اور دور اندیشی کامیاب قیادت کی لازمی صفات ہیں مگر اس امتحان میں ہمارا کوئی بھی لیڈر پورا اترتا نظر نہیں آتا، نہ کوئی ہندو اور نہ کوئی مسلمان۔ یہی وجہ ہے کہ سو سال کی ہنگامہ آرائیوں اور ان گنت قربانیوں کے باوجود ابھی تک وہ ہندستان نہ بن سکا جس کا خواب ملک کے دردمند لوگوں نے دیکھا تھا۔

اس المیہ کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ سیاست کے میدان میں کودے، مگر ان کو سیاست کا یہ ابتدائی اصول معلوم نہ تھا — کہ سیاست ممکنات میں عمل کرنے کا فن ہے :

Politics is the art of the possible.

انسان کے دماغ میں بڑی بڑی آرزوئیں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ذہن میں تخیلات کا ایک فرضی محل تیار کرتا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی آدمی کے الفاظ کبھی تاریخ نہیں بنتے۔ عمل کی دنیا میں صرف وہ چیز واقعہ بنتی ہے جس کے حق میں واقعات کی موافقت موجود ہو۔ ہمارے لیڈر، ہندو اور مسلمان دونوں اپنے تخیلات میں جی رہے تھے۔ وہ خارجی دنیا کے حقائق سے باخبر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی طوفان خیز سرگرمیوں کے باوجود وہ حقیقی معنوں میں کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہ کر سکے۔ موجودہ اسباب کی دنیا میں صرف حقائق واقعہ بن سکتے تھے نہ کہ کسی کے خوش کن تخیلات — یہی وہ مقام ہے جہاں ہماری قومی تاریخ کا ایک باب ختم ہوا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے نئے عنوان کے تحت ہم اپنی قومی تاریخ کا نیا باب شروع کر سکتے ہیں۔

۱۔ نئی دہلی میں لاس اینجلس ٹائمس (امریکی ڈیلی) کے بیورو چیف مسٹر ڈکسٹر فلکنس (Dexter Filkins) نے ۱۱ جنوری ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کی سیاست سے تھا۔ ایک سوال یہ تھا کہ کٹر ہندو جماعت موجودہ الکشن میں اگر برسراقتدار آجائے تو وہ اجودھیا کی بابری مسجد کی طرح دوسری مسجدوں کو بھی گرانا شروع کر سکتی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی سوچ کیا ہے۔ جواب دیا گیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس قسم کا تباہ کن واقعہ تاریخ میں قابل اعادہ نہیں ہوتا۔ آپ ایٹم بم کو بار بار نہیں گرا سکتے۔

۲۔ انورت بھون (نئی دہلی) میں ۲۶ جنوری ۱۹۹۸ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ لوگوں میں روحانیت اور اخلاق کیسے پیدا کیا جائے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔

۳۔ ایک امریکی ادارہ نان وائلنس انٹرنیشنل کے تحت واشنگٹن میں ۶-۷ فروری ۱۹۹۸ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام اور نان وائلنس کے موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۴۔ اسلامک اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (دہلی) کے تحت ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع الکشن اور ہندستانی مسلمان تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ آخر میں سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ یہ جلسہ ۲۱ فروری ۱۹۹۸ کو ہوا۔

۵۔ سنڈے میگزین (کلکتہ) کے نمائندہ مسٹر این وی سبرانیم نے ۶ مارچ ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر موجودہ زمانہ کے مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں کچھ مسلم نوجوانوں میں تشدد کا جو رجحان ابھرا ہے اس کا تعلق اسلامی تعلیمات سے نہیں ہے۔ یہ بعض مسلم رہنماؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔

۶۔ پروائف میگزین (نئی دہلی) کی خاتون نمائندہ مسز انوکما بھٹاچاریہ نے ۱۰ مارچ ۱۹۹۸ء

کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اس سے تھا کہ زندگی کیا ہے اور انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔

۷۔ ہفت روزہ پانچ جنیہ کے سب ایڈیٹر مسٹر شرما نے ۱۷ مارچ ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان کے مسلمان آج بھی دیش کی کمیہ دھارا میں ہیں۔ مگر اخباروں میں چونکہ مثبت خبروں کی رپورٹنگ بہت کم ہوتی ہے اس لیے لوگوں کو اس واقعہ کی خبر نہیں۔ لوگ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اخبار میں چھپتا ہے۔ حالانکہ اخبار میں جو کچھ چھپتا ہے وہ اصل سماجی صورت حال کا بمشکل ایک فیصد ہوتا ہے۔

۸۔ ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) نے مرکز میں نئی پارٹی کی حکومت کے قیام پر مختلف لوگوں کے انٹرویو لیے۔ اس بارے میں اس نے صدر اسلامی مرکز کا بھی انٹرویو لیا۔ یہ اخبار کا شمارہ ۲۲ مارچ ۱۹۹۸ میں اسپشل رپورٹ کے تحت شائع کیا گیا ہے۔ صدر اسلامی مرکز کے ایک جواب کو اخبار نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

Unlike the general impression Maulana Wahiduddin dismisses the suggestion that Muslims are a scared lot under the BJP regime. "The BJP is like a caged lion. It can roar but can do no harm because of historical, political, economic, social and international compulsions. And, more important, because the majority of the majority community is extremely secular" says the Maulana (p. 19)

۹۔ رہتک (دیانند مٹھ) میں ۲۵ مارچ ۱۹۹۸ کو آریہ سماج کی طرف سے ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع ـــــ شراب بندی تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اور وہاں شراب کے بارے میں ایک تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ شراب کو اسلام میں ام الخبائث قرار دیا گیا ہے، یعنی تمام برائیوں کی جڑ۔ کسی سماج کو اگر برائیوں سے پاک کرنا ہے تو اس کے اندر سے شراب نوشی کو ختم کرنا ضروری ہے۔

۱۰۔ ایک نئی کتاب تیار ہوئی ہے۔ یہ سیرت کے موضوع پر ہے اس میں سیرت کا علمی مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ "مطالعۂ سیرت" کے نام سے شائع ہوگی۔ دو اور کتابیں زیر طبع ہیں ـــــ اسلام کیا ہے، سفرنامہ اسپین و فلسطین۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو رسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۰ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

جون ۱۹۹۸ ، شمارہ ۲۵۹

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near ovs Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 8
One year Rs. 90 Two years Rs. 170
Three years Rs. 250. Five years Rs 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi

حکمت کا سرچشمہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ جب بھی کوئی بندہ دنیا سے بے رغبتی اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے دل میں حکمت اُگا دیتا ہے۔ اور اس کی زبان پر حکمت جاری کر دیتا ہے۔ اور اس کو دنیا کا عیب اور اس کا مرض اور اس کا علاج دکھا دیتا ہے، اور اس کو حفاظت کے ساتھ سلامتی کے گھر تک پہنچا دیتا ہے (ما زهد عبدٌ في الدنيا إلا أنبت الله الحكمة في قلبه، وانطق بها لسانه، وبصّره عيب الدنيا وداءها ودواءها، واخرجه منها سالمًا الى دار السلام) البیہقی بحوالہ مشکاۃ المصابیح، صفحہ ۱۴۳۵

حکمت کیا ہے، حکمت دراصل حقیقت پسندی اور دور اندیشی کا دوسرا نام ہے۔ کسی شخص کا ذہنی ارتقاء جب اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ مسائل کا بے لاگ جائزہ لے سکے اور ان کے بارہ میں گہری بنیادوں پر فیصلہ کرنے لگے تو اسی کا نام حکمت ہے۔

اس حکمت کا سرچشمہ دنیا سے بے رغبتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے اوپر دنیا کی کسی چیز کی محبت اتنی غالب آتی ہے کہ وہ اس کو باتوں کی حقیقت سمجھنے کے لیے اندھا بہرا بنا دیتی ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی تجربہ اس کو کچھ لوگوں کے معاملہ میں بغض کی نفسیات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ایسا آدمی اپنے بغض کی بنا پر اس قابل نہیں رہتا کہ وہ معاملہ کو اس کی اصل صورت میں دیکھ سکے۔

جو آدمی اس قسم کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھے جیسا کہ وہ ہیں۔ وہ ان کے بارے میں وہی رائے قائم کرے جو از روئے حقیقت ہونا چاہیے۔ ان کے مقابلہ میں وہ وہی صحیح ترین روش اختیار کرے جو حق اور انصاف کا تقاضا ہے۔

زہد یا دنیا سے بے رغبتی آدمی کو بے پناہ بنا دیتی ہے۔ ایسا آدمی عقلی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ انسان ہوتا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ حقیقت پسند ہوتا ہے اور اپنے اقدام کے بارے میں سنجیدہ اور محتاط۔ جو لوگ اس بلند کردار کے حامل ہوں ان کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ دنیا میں بھی کامیاب ہوں اور آخرت میں بھی کامیاب۔

زہد ترک دنیا نہیں، وہ ذہنی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

حالات کی رعایت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی تو آپ کو خدا کی طرف سے حکم دیا گیا کہ ایک خدا کی عبادت کرو اور خدا کے پیغام کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا کہ فوراً کھلے مقامات پر جائیں، سب کے سامنے نماز پڑھیں یا بلند آواز سے لوگوں کو خدا کی طرف پکارنا شروع کر دیں۔ اس کے برعکس آپ نے ابتدائی چند سال تک چھپ کر نماز پڑھی اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعہ خفیہ انداز میں تبلیغ کی۔

یہ حالات کی رعایت تھی۔ حالات کی رعایت اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ قرآن و حدیث میں کوئی حکم مطلق انداز میں دیا گیا ہو تب بھی یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمارے حالات کے لحاظ سے اس کی تعمیل کا حکیمانہ طریقہ کیا ہے۔ حالات کے اعتبار سے جو قابلِ عمل صورت ہو اسی کے مطابق حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ حالات کو نظر انداز کرتے ہوئے آزادانہ انداز اختیار کرنا نہ اسلام کا طریقہ ہے اور نہ پیغمبر اسلام کی سنت۔

اس طریقہ کو دوسرے الفاظ میں فطری طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس دنیا میں کسی بھی معاملہ میں نتیجہ خیز جدوجہد وہی ہو سکتی ہے جس میں حالات کی پوری رعایت شامل ہو۔ حالات کی رعایت نہ کرنا فطرت سے ٹکرانا ہے اور فطرت سے ٹکرانے کی تعلیم اسلام میں نہیں دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری ۲۳ سال کی پیغمبرانہ مدت میں اسی طرح حالات کی رعایت سے کام کیا۔ آئندہ بھی آپ کے ماننے والوں کے لیے یہی صحیح طریقہ ہے کہ وہ جس ماحول میں ہوں اس کو سمجھیں اور اس کو بخوبی سمجھ کر حالات کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔ اس کے بغیر انھیں خدا کی نصرت نہیں مل سکتی۔

حالات کی رعایت، دوسرے لفظوں میں فطرت کی رعایت ہے۔ اس دنیا کے خالق نے جس قانون کے تحت اپنی دنیا کو بنایا ہے، اس سے مطابقت کرنے کا نام حالات کی رعایت ہے۔ یہ رعایت کسی مقصد میں کامیابی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے، خواہ وہ مقصد دین سے تعلق رکھتا ہو یا دنیا سے۔

نظر انداز کرنا

پیغمبر اسلام مکہ میں ۱۳ سال رہے۔ اس مدت میں وہ تقریباً روزانہ کعبہ میں جاتے تھے۔ وہاں اس وقت ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ یہ عربوں کے مختلف قبائل میں پوجے جانے والے بت تھے۔ مکہ کی مرکزیت قائم کرنے کے لیے اہل مکہ کے سرداروں نے یہ تمام بت کعبہ میں اکٹھا کر دیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ ان کو دیکھتے تھے مگر مکی دور میں کبھی آپ نے ان کو توڑنے یا پھینکنے کی کوشش نہیں کی۔

اس سے اسلام کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ وقت سے پہلے کوئی کام نہ چھیڑا جائے۔ مکی دور میں آپ نے ان بتوں کو نظر انداز کیا۔ مگر بعد کو جب مکہ فتح ہو گیا تو آپ نے فوراً ان کو نکال کر کعبہ کو ان مشرکانہ علامتوں سے پاک کر دیا۔

اسلام میں اقدام کرنا بھی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اسلام میں نظر انداز کرنا بھی ہے۔ اقدام کے وقت اقدام کرنا ضروری ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی انتہائی ضروری ہے کہ جہاں اقدام کا موقع نہ ہو وہاں سختی کے ساتھ نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ خواہ بظاہر وہ کتنا ہی سنگین یا اشتعال انگیز معاملہ کیوں نہ ہو۔

حال میں کسی مسئلہ کو اعراض کے خانہ میں ڈالنا مستقبل میں اس کے حل کا دروازہ کھولنا ہے۔ اور بے وقت اقدام کرنا حال اور مستقبل دونوں میں صرف نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

نظر انداز کرنے کی پالیسی دراصل انتظار کرنے کی پالیسی کا دوسرا نام ہے۔

نظر انداز کرنا ایک دانش مندانہ پالیسی ہے۔ نہ کہ کسی قسم کی بزدلی۔ نظر انداز کرنا دوسرے لفظوں میں نظامِ فطرت سے مطابقت ہے۔ اور نظر انداز نہ کرنا، نظامِ فطرت کے خلاف جنگ۔ کوئی شخص یا گروہ اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ فطرت سے لڑ کر کامیاب ہو سکے۔ اس دنیا میں ہر ایک کے لیے صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ نظامِ فطرت سے مطابقت رکھنا ہے۔ اس کے بغیر موجودہ دنیا میں کسی کے لیے حقیقی کامیابی ممکن نہیں۔

نظر انداز کرنا بے عملی نہیں، نظر انداز کرنا باعمل انسان کا ایک اصول ہے۔

کرائٹیریَن کا مسئلہ

کرائٹیرین (معیار) کا مسئلہ بے حد اہم مسئلہ ہے۔ بیشتر فکری گمراہیاں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں کرائٹیرین واضح نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو صحیح سمجھ رہا ہوتا ہے حالاں کہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو جانچنے کے لیے غلط کرائٹیرین استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی بات کو درست کرائٹیرین پر جانچے تو وہ جان لے گا کہ اس کی سوچ صد فی صد غلط ہے۔

مثال کے طور پر خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت عمر فاروقؓ کو امیر المومنین مقرر کیا تو بیشتر صحابہ اس رائے سے اتفاق نہ کر سکے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ عمر ایک سخت گیر انسان ہیں اور سخت گیر انسان کو امیر المومنین نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ سخت گیر ہیں مگر "سریرتہ خیر من علانیتہ" ان کا اندر ان کے باہر سے بہتر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ عمر فاروق کی امارت کے مخالف تھے وہ اپنی رائے کے حق میں غلط کرائٹیرین استعمال کر رہے تھے۔ امیر کے لیے اصل کرائٹیرین یہ نہیں ہے کہ وہ سخت ہے یا نرم۔ اس کے بجائے اصل کرائٹیرین یہ ہے کہ وہ نیک نیت ہو۔ وہ خدا سے ڈرنے والا ہو۔ وہ اپنے اندر بصیرت کی صفات رکھتا ہو۔ وہ حق اور ناحق میں فرق کرنا جانتا ہو۔

صحیح کرائٹیرین (معیار) کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ خلافت کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کا انتخاب نہایت درست تھا۔ کیوں کہ خلیفہ کی سب سے اہم صفت اس کا مدبر ہونا ہے، اور یہ صفت ان کے اندر پوری طرح موجود تھی۔ اس کے برعکس اگر اس معاملے کو غلط کرائٹیرین سے دیکھا جائے تو ایک شخص کہے گا کہ خلافت کے لیے عمر فاروق کا انتخاب درست نہ تھا کیوں کہ ان کے مزاج میں بہت زیادہ شدت تھی۔ حالاں کہ یہ کرائٹیرین ہی اس معاملے میں بجائے خود درست نہیں۔

جیسا کام ہو ویسی ہی اہلیت درکار ہوتی ہے۔

اقدام کب

اسلامی شریعت کا ایک اہم اصول وہ ہے جس کو سدّ الذرائع کہا جاتا ہے۔ یعنی برائی پیدا ہونے والے اسباب کو روکنا۔ قرآن (الانعام ۱۰۸) کی ہدایت کے تحت علمار اسلام کا اتفاق ہے کہ اگر حالات ایسے ہوں کہ ایک جائز کام کو کرنے سے ایک زیادہ بڑی برائی پیدا ہوتی ہو تو لازم ہے کہ مسلمان ایسے جائز کام سے باز رہیں:

إن المحقّ يكفّ عن حقّه إذا أدى الى ضررٍ
(الجامع لاحكام القرآن ۴/۶۱)

حق دار اپنے حق سے رکا رہے گا جبکہ وہ ایک ضرر پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اقدام صرف اس بنا پر صحیح نہیں ہو جاتا کہ بظاہر وہ حق کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ اس طرح کے معاملے میں یہ دیکھنا لازمی طور پر ضروری ہے کہ اقدام کا عملی نتیجہ کیا نکلے گا۔ جو اقدام عملاً منفی نتیجہ ظاہر کرے۔ وہ ایک غیر مطلوب اقدام ہے، خواہ نظری طور پر وہ کتنا ہی زیادہ مطلوب نظر آتا ہو۔

ایک شخص اسلام کے خلاف گستاخی کرے، لیکن حالات کے اعتبار سے یہ اندیشہ ہو کہ اس کے خلاف کارروائی کرنا شدید تر برائی پیدا کرنے کا سبب بن جائے گا، تو ایسے موقع پر لازم ہوگا کہ گستاخی کے خلاف خاموشی کا رویہ اختیار کیا جائے۔

ایک شخص آپ کو ایک چھوٹا نقصان پہنچائے، اور حالات بتاتے ہوں کہ اس کے خلاف جوابی کارروائی کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زیادہ بڑی برائی کا سامنا پیش آجائے گا، تو ایسی حالت میں چھوٹی برائی کو برداشت کر لیا جائے گا تاکہ زیادہ بڑی برائی کو برداشت کرنے کی نوبت نہ آئے۔

ایک شخص علی الاعلان آپ کے خلاف ہنگامہ کھڑا کرے، اور حالات کے اعتبار سے یقینی نظر آتا ہو کہ اگر آپ نے جوابی کارروائی کی تو ہنگامہ بڑھ کر جان ومال کی تباہی تک پہنچ جائے گا، ایسی حالت میں ضروری ہوگا کہ پرشور کارروائی کا جواب خاموش کارروائی کے ذریعے دیا جائے تاکہ نقصان کو اس کی ابتدائی حد پر روکا جاسکے —— یہ اسلام کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے۔ اسلامی عمل وہی ہے جس میں اس حکمت کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو۔

فرصت عمل

جب بھی زیادہ لوگ ساتھ مل کر زندگی گزاریں گے تو ان کے درمیان شکایت اور اختلاف کے واقعات بھی ضرور پیدا ہوں گے۔ ایسا ایک گھر کے اندر ہوگا، سماج کے اندر ہوگا، پورے ملک میں ہوگا، اور اسی طرح بین اقوامی زندگی میں بھی ہوگا۔ انسان خواہ جس سطح پر بھی ایک دوسرے سے ملیں اور تعلقات قائم کریں، ان کے درمیان ناخوش گوار واقعات کا پیش آنا بالکل لازمی ہے۔

ایسی حالت میں کیا کیا جائے، ٹالرنس اسی سوال کا جواب ہے۔ ایسی حالت میں ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ، رواداری اور برداشت کا معاملہ کرے۔ مل جل کر زندگی گزارنے اور مل جل کر ترقی کرنے کی یہی واحد قابل عمل صورت ہے۔ اس اسپرٹ کے بغیر انسانی تمدن کی تعمیر اور اس کی ترقی ممکن نہیں۔

ٹالرنس کوئی انفعالی رویہ نہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے لیے زیادہ بہتر چوائس لینے کا موقع تھا اور اس نے کمتر چوائس کو اختیار کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کے سوا کوئی اور چوائس ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔ ٹالرنس ہماری ایک پریکٹیکل ضرورت ہے نہ کہ انفعالی پسپائی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک صورت حال کو اپنے لیے ناخوش گوار پاکر اس سے لڑنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری جدوجہد موجودہ صورت حال کو ہٹا کر دوسری زیادہ پسندیدہ صورت کو لانے کی جدوجہد ہے۔ مگر جب موجودہ صورت حال ختم ہوتی ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صورت حال میں بھی دوبارہ اسی قسم کا ناخوش گوار پہلو موجود ہے جس کو برداشت نہ کرنے کی بنا پر وہ اس سے لڑ گیا تھا۔

ٹالرنس کا طریقہ ہم کو فرصت عمل دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہم ناموافق حالات سے ایڈجسٹ کر کے اپنی زندگی کا سفر جاری رکھیں۔ اس کے برعکس اگر ہم ٹالرنس کو چھوڑ دیں اور جو چیز بھی ہم کو ناموافق نظر آئے اس سے لڑنے لگیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ہم ایک چیز کو "برائی" کے نام سے ختم کریں گے، صرف اس لیے کہ اس کے بعد ایک اور شدید تر برائی میں اپنے کو مبتلا کر لیں۔

تغییرِ منکر

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ : من رأى منكم منكرا فليغيره بيده (صحیح البخاری) یعنی تم میں سے جو شخص منکر کو دیکھے تو وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے۔

اب ایک اور حدیث دیکھئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ قریش نے جب کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی تو انھوں نے اس کو ابراہیمی بنیاد سے گھٹا کر بنایا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپ اس کو ابراہیمی بنیاد کی طرف کیوں نہیں لوٹا دیتے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر قریش ابھی نئے نئے مسلمان نہ ہوئے ہوتے تو میں ایسا کر دیتا (فتح الباری ۳/ ۵۱۳)

ان دونوں حدیثوں کا تقابلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تغییرِ منکر کا حکم مطلق معنوں میں نہیں ہے بلکہ وہ ایک مقید حکم ہے۔ اگر وہ کوئی مطلق حکم ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور ایسا کرتے کہ مشرکین مکہ نے کعبہ کی تعمیرِ ثانی میں جو تبدیلی کی تھی اس کو ختم کر کے دوبارہ اس کو حضرت ابراہیمؑ کی ابتدائی اساس پر کھڑا کرتے۔

اس تقابلی مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تغییرِ منکر میں صرف "استطاعت" ہی کی شرط نہیں ہے بلکہ حکمت کی شرط بھی ہے۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے حکمراں ہو چکے تھے۔ آپؐ کو یہ استطاعت حاصل ہو چکی تھی کہ آپؐ کعبہ کو ڈھا کر اسے ابراہیمی بنیاد پر تعمیر کر دیں۔ مگر آپؐ نے استطاعت کے باوجود ایسا نہیں کیا، کیوں کہ، حدیث کے الفاظ میں، ایسا کرنا حکمت کے خلاف ہوتا۔

تغییرِ منکر کے حکم کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی جب کسی منکر کو دیکھے تو فوراً اس کے خلاف اقدام شروع کر دے۔ اجتماعی زندگی میں کوئی اقدام صرف برائی کو دیکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ حالات کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ مومن پر لازم ہے کہ جب وہ کسی منکر کو دیکھے تو اس کے خلاف اقدام سے پہلے یہ سوچے کہ میرے اندر اس کی حقیقی استطاعت ہے یا نہیں، اور اگر بظاہر استطاعت ہو تب بھی ایسا کرنا حکمت کے مطابق ہے یا نہیں۔ استطاعت اور حکمت کی دوگونہ شرط کا لحاظ کیے بغیر تغییرِ منکر کے لیے اٹھنا فساد ہے نہ کہ اسلامی حکم کی تعمیل۔

دو قسمی طرز فکر

بیسویں صدی کے نصف اول میں کمیونسٹ دنیا کا عام طرز فکر یہ تھا کہ جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے۔ اس طرز فکر کو نفسیات کی اصطلاح میں دو قسمی طرز فکر (dichotomous thinking) کہا جاتا ہے۔ یہ طرز فکر ہلاکت خیزی کی حد تک غلط ہے چنانچہ تقریباً پچاس سال تک تمام کمیونسٹ اس حماقت میں مبتلا رہے کہ جہاں انھیں اقتدار حاصل تھا وہاں وہ ہر غیر ساتھی کو تہ تیغ کرتے رہے۔ سابق سوویت یونین میں انھوں نے ۲۵ ملین انسانوں کو ذبح کر ڈالا اور بے شمار خاندانوں کی زندگیاں تباہ کر دیں۔

اس کے علاوہ جن ملکوں میں انھیں اقتدار حاصل نہ تھا وہاں انھوں نے اپنے غیر ساتھیوں کے خلاف لامتناہی قسم کی لفظی جنگ چھیڑ دی۔ تمام غیر ساتھیوں پر جھوٹی تنقیدیں کرنا، ان کی کردارکشی کرنا، ان کے خلاف جھوٹا لٹریچر چھاپنا، ان کے خلاف ہر الزام کو اپنا حق سمجھ لینا، یہ ان کا شیوہ بن گیا۔ اس راہ میں انھوں نے اپنی بہترین صلاحیت اور بہترین اثاثہ کو ضائع کر دیا۔

یہ طرز فکر سراسر غیر فطری ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ انسان کی سوچ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آج وہ ایک ڈھنگ پر سوچتا ہے اور کل وہ دوسرے ڈھنگ پر سوچنے لگتا ہے۔ معلومات میں اضافہ اور نئے دلائل سے واقفیت، اس طرح کے اسباب آدمی کے ذہن کو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ انسان کوئی جامد اسٹیچو نہیں ہے۔ وہ ایک زندہ ہستی ہے۔ وہ بار بار خارجی اثرات کو قبول کرتا ہے۔

کوئی انسان یا کوئی گروہ اگر بظاہر آپ کا مخالف نظر آئے تو آپ اس کو مستقل طور پر اپنا مخالف نہ سمجھ لیجئے بلکہ اس کی مخالفت کو کم علمی یا غلط فہمی پر محمول کیجئے۔ اگر آپ ایسا کریں تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے بارے میں آپ کے اندر ہمدردی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ آپ اس سے دور ہونے کے بجائے اس سے قریب ہونے کی کوشش کریں گے۔ اس کے معاملے پر غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اس کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد، قرآن کے الفاظ میں، آپ دیکھیں گے کہ جو شخص بظاہر آپ کا دشمن نظر آتا تھا وہ آپ کا قریبی دوست بن گیا (فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم)

فطرت کا نظام

کامیابی نام ہے خدا کے مقرر کیے ہوئے فطری نظام سے مطابقت کرنے کا ——— یہی ایک لفظ میں زندگی کا راز ہے۔ خواہ وہ فرد کی زندگی کا معاملہ ہو یا سماج اور ریاست کا معاملہ۔

یہ دنیا جس میں ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں وہ ہم نے خود نہیں بنائی ہے۔ اور نہ اس کو بنانے والے نے ہمارے مشورہ کے مطابق اس کو بنایا ہے۔ یہ دنیا کچھ محکم اصولوں پر بنائی گئی ہے۔ اور وہ انھی اصولوں کے تحت چل رہی ہے، اور اسی طرح وہ ہمیشہ چلتی رہے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہماری حیثیت ثانوی ہے۔ ہمیں یک طرفہ طور پر دنیا کے نظام سے موافقت کرنا ہے۔ موافقت نہ کرنے کی صورت میں، نقصان اٹھانے والا فریق ہم خود ہوں گے نہ کہ بقیہ دنیا۔

ایک کسان اپنے کھیت سے اسی وقت ہری بھری فصل حاصل کرتا ہے جب کہ وہ فطرت کے مقرر کیے ہوئے قانون زراعت کی کامل پابندی کرتا ہے۔ اسی طرح ایک انجینیر اسی وقت کوئی ٹکنیکل کارنامہ انجام دیتا ہے جب کہ وہ فزکس اور کیمسٹری کے قوانین فطرت کو پوری طرح استعمال کرے۔ وغیرہ۔

ٹھیک یہی معاملہ انسانی دنیا کا ہے۔ انسانی دنیا کے لیے بھی اسی طرح فطرت کے مقرر قوانین ہیں۔ یہاں بھی کوئی کامیابی صرف اس فرد یا قوم کے لیے مقدر ہے جو ان اصولوں کی پابندی کرے، جو فطرت نے پیشگی طور پر اس کے لیے قائم کر دیا ہے۔ کوئی بھی انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ فطرت کے قانون کو نظر انداز کر کے اس دنیا میں اپنے لیے ایک کامیاب زندگی کی تشکیل کر سکے۔ فطرت کے نقشہ میں جو چیز محنت سے ملتی ہو اس کو ہم رعایت کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے، جو چیز صبر کا ثبوت دے کر ملتی ہو اس کو ہم عاجلانہ اقدام کے ذریعہ نہیں پا سکتے۔ جس چیز کا ملنا امن کی طاقت کے ساتھ مقدر کیا گیا ہے اس کو ہم تشدد کی طاقت کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ جو چیز تدریج کے ذریعہ ملنے والی ہو اس کو ہم چھلانگ کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔

کائناتی کلچر

میل ملاپ کوئی سادہ بات نہیں۔ وہ ہر قسم کی انسانی ترقی کا زینہ ہے۔ جس سماج میں لوگوں کے درمیان ملنا جلنا نہ ہو وہاں ہر ایک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ کوئی بھی شخص یا گروہ زیادہ آگے بڑھنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔

میل ملاپ (interaction) فطرت کا قانون ہے۔ وہ ساری کائنات میں ہر طرف جاری ہے۔ درخت ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے تو خدا نے ان کے درمیان ہوائیں چلا دیں جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں۔ خلا کے ستارے ایک دوسرے سے بہت دور ہیں، ان کا آپس میں جسمانی طور پر ملنا ممکن نہیں، خدا نے انھیں روشنی دے دی۔ چنانچہ وہ روشنی کے ذریعہ ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے جاری ہونے والے چشمے سمندر سے بہت دور تھے مگر خدا نے ان کے لیے بہاؤ کی صورت پیدا کر دی۔ اس طرح یہ چشمے دریاؤں میں بہتے ہوئے سمندر میں جا کر مل جاتے ہیں۔

میل ملاپ ایک یونیورسل کلچر (کائناتی طریقہ) ہے۔ یہی یونیورسل کلچر انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ جس طرح بقیہ کائنات کا نظام درست طور پر باہمی ہم آہنگی کے ذریعہ چل رہا ہے، ٹھیک اسی طرح انسانی زندگی کا نظام بھی درست طور پر اس وقت چل سکتا ہے جب کہ انسان بھی اس کائناتی کلچر کو اختیار کرے (آل عمران ۸۳)

دو انسان یا زیادہ انسان جب باہم ملتے ہیں تو یہ پتھروں کا باہم ملنا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایسی مخلوق کا ملنا ہوتا ہے جس کے اندر دل اور دماغ والی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کا آپس میں ملنا جلنا مختلف قسم کے عظیم فائدوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اس طرح باہمی محبت بڑھتی ہے۔ یہ عمل ذہنی ارتقاء میں مددگار بنتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے تجربات سے نئی نئی باتیں سیکھتے ہیں۔ ہر فرد انسانیت کے مجموعی خزانے میں حصہ دار بن جاتا ہے۔ میل ملاپ صرف ایک سماجی سلوک نہیں۔ وسیع تر معنیٰ میں، وہ زندگی کی ایک عظیم تر حکمت ہے۔

راستہ تنگ نہیں

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ سے طائف جارہے تھے۔ درمیان میں ایک پہاڑی راستہ ملا جو بظاہر تنگ تھا۔ وہاں پہنچ کر آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے، لوگوں نے بتایا کہ اس کو تنگ راستہ کہا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ یہ آسان راستہ ہے (بل ھی الیسریٰ)

اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ صحیح ہے کہ بطور واقعہ یہ راستہ تنگ ہے۔ اگر ہم پھیل کر اس میں جانا چاہیں تو ہم نہیں جاسکیں گے لیکن ہم اس طرح اس کو آسان بنا سکتے ہیں کہ ہم سمٹ کر قطار کی صورت میں اس سے گزریں۔ ایسی صورت میں راستہ کی تنگی ہمارے لیے رکاوٹ نہیں بنے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبرانہ نگاہ یہ ہے کہ تنگی کو بھی کشادگی کے روپ میں دیکھا جائے۔ تنگی میں بھی کشادگی کا راز دریافت کیا جائے۔ منفی باتوں میں بھی مثبت پہلو تلاش کر لیے جائیں۔

تنگی بذات خود تنگی ہے۔ راستہ کی چٹان ہر حال میں چٹان ہی رہتی ہے۔ جو فرق ہے وہ خود تنگی یا چٹان میں نہیں ہے بلکہ اس میں ہے کہ جب کوئی تنگ راستہ سامنے آجائے یا چٹان حائل ہو تو اس وقت طریق عمل کیا اختیار کرنا چاہیے۔

ایک طریقہ براہ راست مقابلہ کا ہے اور دوسرا اعراض کا۔ براہ راست مقابلہ میں تنگی اور چٹان بدستور تنگی اور چٹان بنے رہتے ہیں مگر اعراض کا طریقہ ان کے وجود کو عملی طور پر غیر موثر بنا دیتا ہے۔

جب بھی ایسا ہو کہ آپ کے سفر میں کوئی رکاوٹ پیش آجائے تو اس سے ٹکرانے پر اپنا ذہن نہ لگائیے بلکہ یہ سوچیے کہ رکاوٹ کو نظر انداز کر کے آپ کون سا ایسا حل پا سکتے ہیں جس کے بعد رکاوٹ اپنی جگہ باقی رہتے ہوئے بھی آپ کے لیے ایک غیر موجود چیز بن جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر راستہ تنگ ہی ہوتا ہے۔ تنگی اور کشادگی دونوں اضافی چیزیں ہیں۔ حقیقی چیز صرف ایک ہے اور وہ تدبیر ہے۔ اور تدبیر مکمل طور پر اور ہمیشہ مسافر کے بس میں ہوتی ہے۔

تھرڈ آپشن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور میں ایک جنگ وہ پیش آئی جس کو جنگ مؤتہ کہا جاتا ہے۔ یہ جنگ شام کی سرحد پر رومیوں اور ان کے حلیفوں کے مقابلہ میں ہوئی تھی۔اس کے آغاز ہی میں صحابہ کی ایک تعداد شہید ہو گئی۔اس کے بعد لوگوں نے حضرت خالد بن الولید کو سردار بنایا۔ حضرت خالدؓ نے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دونوں فریقوں کے درمیان تعداد کے اعتبار سے ناقابل عبور حد تک فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ حکمت کے ساتھ پیچھے ہٹ گئے اور مزید لڑے بغیر مدینہ واپس آگئے۔

اس وقت مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کرتی تھی۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ مقابلہ کو چھوڑ کر پسپائی کا طریقہ اختیار کرنا ہے اور جب انتخاب مقابلہ اور پسپائی کی دو حالتوں کے درمیان ہو تو مسلمان کو چاہیے کہ وہ مقابلہ کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ پسپائی کا۔

یہ معاملہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے حضرت خالدؓ کے حق میں رائے دی۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ، اس کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگ صرف دو حالتوں کے درمیان سوچ رہے ہو —— مقابلہ یا پسپائی۔ مگر یہاں ایک تیسری حالت بھی ہے اور وہ ہے بے فائدہ مقابلہ کے میدان سے ہٹ کر مزید تیاری کے میدان میں واپس آجانا اور اپنے آپ کو اس قابل بنانا کہ آئندہ زیادہ موثر انداز میں فریق مخالف کے چیلنج کا جواب دیا جا سکے۔ اور خالد نے اسی تیسری حالت کا انتخاب کیا ہے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر حالت میں لوگ سیاہ اور سفید کے درمیان سوچتے ہیں۔ وہ سمجھ نہیں پاتے کہ ظاہری دو حالتوں کے علاوہ وہاں ایک تیسری حالت بھی موجود ہے جو زیادہ مفید اور موثر ہے۔ اس تیسری حالت کا نام تھرڈ آپشن ہے اور مذکورہ سنت رسولؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ تھرڈ آپشن کا طریقہ مین اسلام کا طریقہ ہے —— پہلا اور دوسرا آپشن کھلے طور پر موجود ہوتا ہے اس لیے ہر شخص اس کو جان لیتا ہے۔ مگر تیسرا آپشن جو زیادہ بہتر آپشن ہے وہ ہمیشہ چھپا ہوا ہوتا ہے اس لیے اس کو وہی سمجھتا ہے جو عقل والا ہے۔

کامیاب تجارت

صہیبؓ رومی ایک صحابی تھے۔ ہجرت کے موقع پر وہ مکہ سے مدینہ جانے لگے تو ان کے پاس کچھ سونے کا سکہ (دینار) تھا۔ وہ باہر نکلے تو مکہ کے کچھ نوجوان انھیں ملے۔ بات چیت کے بعد انھیں معاملہ کا اندازہ ہوا تو انھوں نے کہا کہ ہم تم کو سونا لے کر مدینہ نہیں جانے دیں گے۔ صہیب رومیؓ نے کہا کہ میں تم کو یہ سونا دے دوں تو کیا تم مجھ کو یہاں سے جانے دو گے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ صہیب رومی نے فوراً سونا نکال کر انھیں دے دیا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔

وہ مدینہ پہنچے تو سب سے پہلے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور مکہ میں پیش آنے والا یہ واقعہ آپ کو بتایا۔ آپ نے اس کو سن کر فرمایا کہ اے صہیبؓ، تمہاری تجارت کامیاب رہی۔

اس واقعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم سنت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی سے نزاع کی صورت پیدا ہو جائے اور کچھ مادی نقصان اٹھا کر نزاع ختم ہو سکتی ہو تو مادی نقصان برداشت کرتے ہوئے فوراً نزاع کو ختم کر دیا جائے۔

یہ طریقہ بظاہر نقصان کا طریقہ دکھائی دیتا ہے۔ مگر حقیقۃً وہ زبردست نفع کا طریقہ ہے۔ اس میں آدمی تھوڑی چیز دے کر زیادہ بڑی چیز پالیتا ہے۔

مذکورہ واقعہ میں ایک طرف چند دینار تھے اور دوسری طرف ایک انسان کا اپنا وجود۔ انسان کا اپنا وجود بہر حال چند دینار سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے چند دینار دے کر اگر ایک انسان کی زندگی محفوظ ہو جائے تو یہ نفع کی تجارت ہے نہ کہ گھاٹے کی تجارت۔

نزاع کو جاری رکھنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پیش قدمی کا عمل رک جاتا ہے۔ اور اگر نزاع کو ختم کر دیا جائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ پیش قدمی کا عمل جاری رہے گا۔ اور پیش قدمی کا جاری رہنا اس سے ہزار گنا زیادہ بہتر ہے کہ ایک نزاع کی خاطر پیش قدمی کا عمل روک دیا جائے۔

انتظار کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو غزوات پیش آئے ان میں سے ایک غزوہ وہ ہے جس کو غزوۂ خندق کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر عرب کے قبائل بڑی تعداد میں اکٹھا ہو کر مدینہ آئے۔ انھوں نے چاہا کہ مدینہ پر حملہ کر کے اس کو تباہ کر دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ مخالف قبائل بڑی تعداد میں مدینہ کی طرف آرہے ہیں تو آپ نے فوراً یہ تدبیر کی کہ مدینہ کے اطراف میں خندق کھودنا شروع کر دیا۔ قبائل کا لشکر جب مدینہ کے پاس پہنچا تو یہاں خندق کھدی ہوئی تھی۔ وہ لوگ آسانی سے خندق کو پار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خندق کے دوسری طرف پڑاؤ ڈال دیا۔

وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے ساتھیوں کو باہر سے للکارتے رہے۔ مگر آپ ان سے جنگ کے لیے نہیں نکلے۔ آپ اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ خندق کے دوسری طرف محفوظ طور پر رہ کر آنے والے وقت کا انتظار کرتے رہے۔

اس طرح تقریباً تین ہفتے گزر گئے۔ آخر کار فطرت کی طاقتیں حرکت میں آئیں۔ ایک دن زبردست آندھی چلی۔ مخالف لشکر کے خیمے اکھڑ گئے۔ ان کے کھانے کی دیگیں اڑ کر دور جا گریں۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ چنانچہ مخالفین کا لشکر گھبرا کر واپس چلا گیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی پالیسیوں میں سے ایک پالیسی یہ ہے کہ کوئی ناموافق صورت حال پیش آئے تو فوری اقدام نہ کیا جائے بلکہ انتظار کی پالیسی اختیار کی جائے۔ عین ممکن ہے کہ انتظار خود ایک حل بن جائے اور آئندہ ایسے حالات پیش آئیں کہ اقدام کے بغیر مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے۔

فطرت کا نظام ایک خدائی نظام ہے۔ فطرت کے نظام کی صورت میں کائنات خود ہر آن فساد کو اصلاح کی صورت میں بدلنے کے لیے سرگرم ہے۔ انسان اگر صبر کی روش اختیار کرے اور ناخوش گوار مواقع پر انتظار کی پالیسی پر قائم رہے تو وہ دیکھے گا کہ فطرت کی طاقتوں نے متحرک ہو کر اس کا وہ کام زیادہ بہتر طور پر انجام دے دیا ہے جس کو وہ اپنے کمتر وسائل کے ذریعہ صرف ناقص طور پر انجام دینا چاہتا تھا۔

میانہ روی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— وہ آدمی تنگ دست نہیں ہوگا جو اعتدال کا طریقہ اختیار کرے (ماعال من اقتصد) تفسیر عثمانی، صفحہ ۳۶۹

اپنی آمدنی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بقدر ضرورت خرچ کرنا اعتدال ہے۔ اور جس آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ آمدنی کی پروا کیے بغیر ہر چیز کے لیے خرچ کرتا رہے، خواہ وہ ضروری ہو یا غیر ضروری تو ایسا شخص بے اعتدالی کے ساتھ خرچ کرنے والا انسان ہے۔ جو آدمی خرچ کے معاملہ میں اعتدال کی روش اختیار کرے وہ ہمیشہ خوش حال رہے گا۔ اور جو آدمی بے اعتدالی میں مبتلا ہو جائے اس کو کوئی چیز تنگ دستی اور محتاجی سے بچانے والی نہیں۔

اس اصول کا تعلق صرف مالیاتی معنوں میں آمد اور خرچ سے نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے تمام معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ آمد و خرچ کی طرح دوسرے معاملات میں بھی ایک اعتدال کا طریقہ ہے اور دوسرا بے اعتدالی کا طریقہ۔ اور اس دنیا میں کامیابی صرف اس کو ملتی ہے جو بے اعتدالی سے بچتے ہوئے اعتدال کی روش اختیار کرے۔

کسی سے آپ کی دوستی ہو تو ضروری ہے کہ آپ دوستی کو اعتدال کے دائرہ میں رکھیں۔ اگر آپ نے اس کا لحاظ نہیں کیا تو عین ممکن ہے کہ آپ کی دوستی آخر کار پشیمانی کا سبب بن جائے۔ اسی طرح کسی سے آپ کا اختلاف ہو جائے تو ضروری ہے کہ آپ اختلاف کو اختلاف کے دائرہ میں رکھیں، اس کو نفرت اور دشمنی کی حد تک نہ لے جائیں۔ اختلاف اگر اختلاف کے دائرہ میں ہو تو وہ کسی وقت ختم ہو سکتا ہے لیکن جب وہ بڑھ کر نفرت اور دشمنی بن جائے تو اس وقت اس کا ختم ہونا انتہائی حد تک دشوار ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کو اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے جدوجہد کرنا پڑتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی ضروری ہے کہ آدمی اعتدال کا انداز اختیار کرے، وہ جب بھی کوئی اقدام کرے تو احتیاط کے ساتھ اقدام کرے، وہ جب بھی کوئی منصوبہ بنائے تو خواہش کے بجائے حقیقت پسندی کی رہنمائی میں بنائے، وہ جلد نتیجہ دیکھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ تدریج کے اصول کے مطابق اپنے کام کو آگے بڑھائے۔

اعتدال کا طریقہ کامیابی کا طریقہ ہے اور بے اعتدالی کا طریقہ ناکامی کا طریقہ۔

اسٹیٹس کوازم

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے —— اسٹیٹس کو پر راضی ہونا۔ یعنی نزاعی معاملات میں حالت موجودہ کو مان لینا، حالت موجودہ پہ راضی رہتے ہوئے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرنا۔ نزاعی معاملات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معاملہ ایک خاص مقام پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔ ایک طرف فریق اول ہوتا ہے اور دوسری طرف فریق ثانی۔ نزاعی لائن کو پار کرنا دونوں میں سے کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ حالات بتا رہے ہوتے ہیں کہ اگر اسٹیٹس کو (حالات موجودہ) کو بدلنے کی کوشش کی گئی تو دونوں کے درمیان سخت ٹکراؤ ہوگا۔ اور اس کے نتیجہ میں شدید تر برائی سامنے آجائے گی۔ ایسی حالت میں دانش مندی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ مقام نزاع پر جو صورت عملاً بن گئی ہے اس کو ویسا کا ویسا باقی رکھا جائے اور اپنی کوششوں کو دوسرے مقامات عمل کی طرف موڑ دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر جب عمرہ کی ادائیگی پر اصرار نہیں کیا اور وہیں سے مدینہ لوٹ آئے تو یہ وقتی طور پر اسٹیٹس کو کو مان لینے کا واقعہ تھا۔ بعض دوسرے واقعات ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مستقل طور پہ اسٹیٹس کو پر راضی ہو گئے۔ اس کی نمایاں مثال کعبہ کو بنائے مشرکین پر باقی رکھنا، اور اس کو دوبارہ بنائے ابراھیمی پر تعمیر نہ کرنا ہے۔

یہ طریقہ نزاعی معاملات میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ آدمی کی طاقت کا ہر جز صرف تعمیری کام میں خرچ ہو۔

ایک آدمی اپنی سواری دوڑاتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سڑک بند ہو۔ تو وہ بند سڑک سے نہیں ٹکراتا بلکہ اپنی سواری کو موڑ کر دوسرے راستے سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ اسی حکمت کا نام اسٹیٹس کوازم ہے۔

حالتِ موجودہ کو مانتے ہی آدمی کو فوراً اپنے عمل کا آغاز مل جاتا ہے۔ اور اپنے عمل کے لیے صحیح نقطۂ آغاز کو پالینے ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

صلح بہتر ہے

قرآن میں عورت اور مرد کے تعلقات کے بارے میں حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی صلح کرلیں اور صلح بہتر ہے۔ اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خدا ترسی سے کام لو۔ تو جو کچھ تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے (النساء ۱۲۸)

صلح بہتر ہے (الصلح خیر) ایک عام فطری اصول ہے۔ اس کا تعلق گھر کے مسائل سے بھی ہے اور بین اقوامی سطح پر پیش آنے والے معاملات سے بھی ہے۔ جب بھی کسی فرد یا گروہ کو دوسرے فرد یا گروہ کی طرف سے کوئی ناخوش گوار تجربہ پیش آئے تو ایسے موقع پر عقل مندی یہ ہے کہ اس کے جواب میں ردعمل کا انداز اختیار نہ کیا جائے۔ ایسے مواقع پر بہتر طریقہ صلح کا ہے نہ کہ نزاع کا۔

نزاعی امور میں صلح کی پالیسی کوئی پسپائی یا بزدلی نہیں ہے۔ اس کا مقصد دراصل یہ ہے کہ اپنے وقت اور قوت کو بے فائدہ طور پر ضائع کرنے سے بچایا جائے اور اس کو مفید استعمال کی طرف موڑ دیا جائے۔

صلح کا الٹا رویہ جنگ ہے۔ جنگ یا ٹکراؤ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں دو فریقوں کے درمیان نزاع کی صورت پیش آئی ہے، دونوں فریق بس وہیں ٹھہر جائیں۔ وہ اپنے سفر کو مقام نزاع پر روک دیں۔ اس کے برعکس ایسے معاملات میں صلح کی پالیسی اختیار کرنا آدمی کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے سفر کو روکے بغیر مسلسل اسے جاری رکھے۔ وہ کسی وقفے کے بغیر چلتا رہے یہاں تک کہ وہ اپنی آخری منزل کو پہنچ جائے۔

صلح کا طریقہ وقتی طور پر کھونے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر حال سے نظر ہٹا کر آنے والے مستقبل کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ مکمل طور پر پانے کا طریقہ ہے۔ آخری نتیجے کے اعتبار سے صلح کی پالیسی ہمیشہ کامیابی کا سبب بنتی ہے، اور ٹکراؤ کی پالیسی ہمیشہ تباہی اور ناکامی کا سبب۔

چھوٹے شر کا انتخاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدنی دور میں ایک سنگین مسئلہ وہ تھا جس کو عبداللہ بن ابی کی صورت میں جانا جاتا ہے۔ وہ قبیلہ خزرج کا بڑا سردار تھا۔ اسلام کے خلاف وہ اتنا زیادہ بڑا مسئلہ تھا کہ خود اس کا مسلمان بیٹا عبداللہ اس کے قتل کے لیے تیار ہو گیا تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قتل نہیں کروایا۔ یہاں تک کہ وہ ۹ھ (۶۳۰ء) میں اپنی طبعی موت مرا۔

عبداللہ بن ابی کے معاملہ میں صبر و برداشت کی اس غیر معمولی پالیسی کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ عبداللہ بن ابی کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں تھا۔ اس وقت کی صورت حال بتا رہی تھی کہ یہ صرف زندہ عبداللہ اور مردہ عبداللہ کے درمیان انتخاب کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ یہاں ایک تیسری شدید تر صورت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر اس کو قتل کروایا گیا تو یقینی طور پر قبائلی عصبیت جاگ اٹھے گی۔ بہت سے لوگ اس کے خون کا انتقام لینے کے درپے ہو جائیں گے۔ اس طرح عبداللہ بن ابی کو قتل کر کے عملاً اس کا خاتمہ نہیں ہو گا بلکہ ایک اور شدید تر برائی جاگ اٹھے گی۔ اور وہ اپنے مقتول سردار کا انتقام ہے۔ اس اندیشہ کی پیشگی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ تھی کہ غزوۂ احد کے موقع پر اس نے جنگ میں عدم شرکت کا فیصلہ کیا تو اس کے قبیلہ کے تین سو آدمیوں نے عبداللہ بن ابی کے ساتھ شریک ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی کے معاملہ میں اس وقت جو انتخاب تھا وہ زندہ دشمن اور مردہ دشمن کے درمیان نہیں تھا بلکہ وہ مردہ دشمن اور اس کے بعد ظاہر ہونے والے انتقامی ردعمل کے درمیان تھا۔ ایسی حالت میں زندہ دشمن چھوٹا شر تھا اور مردہ دشمن انتقامی ردعمل کی صورت میں زیادہ بڑا شر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے شر سے بچنے کے لیے چھوٹے شر کو گوارا کر لیا۔

زندگی خیر و شر کے درمیان انتخاب کا نام نہیں۔ زندگی چھوٹے شر اور بڑے شر کے درمیان انتخاب کا نام ہے۔ کامیاب وہ ہے جو اس حقیقت کو جان لے۔

درمیانی طریقہ

قرآن میں ہے کہ چلنے میں درمیانی چال اختیار کرو (لقمان) حدیث میں ہے کہ معاملات میں سب سے بہتر طریقہ درمیانی طریقہ ہے (خیر الامور اوسطہا)

درمیانی طریقہ اختیار کرنا اسلام کا ایک اہم اصول ہے۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر معاملہ میں ہمیشہ ایسا کیا ہے۔ نمازوں میں آپ اکثر درمیانی سورتیں پڑھتے تھے، نہ زیادہ بڑی اور نہ زیادہ چھوٹی۔ اسی طرح تمام عبادات میں آپ ہمیشہ درمیانی انداز اختیار کرتے تھے۔

گفتگو میں آپ نہ بہت زیادہ مختصر بولتے اور نہ بہت لمبا کلام کرتے۔ بلکہ آپ کا طریقہ دونوں کے درمیان تھا۔ کھانے پینے کے معاملہ میں آپ نہ بہت زیادہ شکم سیر ہو کر کھاتے اور نہ فاقہ کشی کی مشقت اختیار کرتے۔ بلکہ ہلکی خوراک آپ کا طریقہ تھا۔

آپ نے فرمایا کہ کسی سے دوستی کرو تو دوستی میں حد سے نہ گزر جاؤ۔ اسی طرح اگر کسی سے دشمنی ہو جائے تو دشمنی میں بھی ایک حد پر قائم رہو۔ صحابی فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ہم کو تکلف اور غلو سے منع فرمایا ہے۔ اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر قسم کے انسانی تعلقات میں اعتدال اور توسط کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ خاندانی زندگی، سماجی تعلقات اور ملی روابط ہر جگہ یہی مطلوب ہے کہ ہمیشہ درمیانی انداز اختیار کیا جائے۔

اپنے کمائے ہوئے مال کو خرچ کرنے کے معاملہ میں اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اس کو اعتدال کے ساتھ خرچ کرو۔ نہ تو بالکل بخیل بن جاؤ اور نہ بہت زیادہ فیاض۔ کمانے کے معاملہ میں بھی آدمی کو اعتدال کا انداز اختیار کرنا چاہیے اور اسی طرح اس کو چاہیے کہ وہ جو مال کمائے اس کو اعتدال کے ساتھ ضروری مدوں میں خرچ کرے۔

اسی طرح وہ تعلقات جن کو بین اقوامی تعلقات کہا جاتا ہے اس کے بارے میں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا مطلوب ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سرحدی قوتوں کے ساتھ ہمیشہ نارمل تعلق کو برقرار رکھا جائے۔ ہمیشہ یہ کوشش کی جائے کہ ان کے ساتھ تعلق اعتدال کے دائرہ میں رہے، اعتدال کی حد سے باہر نہ جانے پائے۔

مینیمم سے آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی وفات ۶۳۲ء میں مدینہ میں ہوئی۔ پہلی وحی آپ پر ۶۱۰ء میں نازل ہوئی۔

اس وقت مکہ میں بہت سے نہایت سنگین قسم کے مسائل تھے۔ مثلاً مقدس کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اجتماعی معاملات کے فیصلہ کا مرکز دار الندوہ مشرکوں کے قبضہ میں تھا۔ معاشرہ میں بدکاری، شراب، جوا جیسے سخت جرائم پھیلے ہوئے تھے۔ ایرانی ایمپائر اور رومی ایمپائر نے عربوں کو اپنے ماتحت کا درجہ دے رکھا تھا۔ وغیرہ۔

مگر آپ پر جو پہلی وحی اتری اور جس میں حکم دیا گیا کہ آپ ان حالات میں کیا کریں۔ اس میں ان مسائل میں سے کسی مسئلہ کا ذکر نہیں تھا۔ اور ان کے بارہ میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ آپ سے سادہ طور پر صرف یہ کہا گیا: اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاکرم الذی علّم بالقلم۔ علم الانسان ما لم یعلم۔

اس وقت کے مسائل کی نسبت سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ کم سے کم (minimum) کا حکم تھا۔ مذکورہ مسائل کے بارے میں اگر آپ کو حکم دیا جاتا اور آپ اس کے لیے عمل شروع کر دیتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ فوراً گرد و پیش کے لوگوں سے آپ کا شدید ٹکراؤ شروع ہو جاتا۔

مینیمم سے آغاز کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ جب کہ زیادہ سے آغاز کا نتیجہ اکثر حالات میں الٹا برآمد ہوتا ہے۔

کسی بھی معاملے میں کامیاب ہونے کی شرط یہ ہے کہ صحیح مقام سے اُس کا آغاز کیا گیا ہو۔ اور صحیح آغاز وہی ہے جو ممکن ہو۔ ممکن سے آغاز ہی دراصل صحیح آغاز ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مینیمم ہمیشہ ممکن ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں میکسیمم سے آغاز ہمیشہ ناممکن اور ناقابل عمل۔

مینیمم سے آغاز کا مطلب کم سے آغاز نہیں ہے بلکہ ممکن سے آغاز ہے۔ اسی طرح میکسیمم سے آغاز کا مطلب زیادہ سے آغاز نہیں ہے بلکہ ناممکن سے آغاز ہے۔

حکمتِ عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری زمانہ میں مدینہ سے مکہ جا کر حج کیا۔ اس موقع پر آپ نے وہ مشہور خطبہ دیا جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اس خطبہ میں آپ نے اعلان فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں، سوا دین اور تقویٰ کے۔ اس طرح آپ نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق کے قدیم رواج کا خاتمہ کر دیا۔

مگر اسی کے ساتھ آپ نے دوسرے موقع پر یہ بھی فرمایا کہ: الائمۃ من قریش یعنی میرے بعد مسلمانوں کا سیاسی امام قریش میں سے ہوگا۔ یہ دوسرا بیان بظاہر پہلے بیان کے مطابق نہیں مگر یہ عدم مطابقت کی بات نہیں بلکہ عملی تقاضوں کی رعایت کرنے کی بات ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تنہا نماز میں اتنا لمبا قیام فرمایا کہ آپ کے پاؤں میں سوجن آگئی۔ دوسری طرف جماعت کی نماز پڑھاتے ہوئے صف کے پیچھے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی تو آپ نے مختصر سورۃ پڑھا کر نماز جلد ختم کر دی۔ اس فرق سے مذکورہ معاملہ کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب معاملہ تنہا اپنی ذات کا ہو تو مومن کو چاہیے کہ وہ آئیڈیل کو اختیار کرنے کی کوشش کرے مگر جب اجتماعی معاملہ ہو اور دوسروں کے ساتھ نباہ کرنے کی ضرورت ہو تو اس وقت وہ پریکٹیکل بن جائے۔ اس دوسری صورت میں حالات کے اعتبار سے عملی تقاضوں کی رعایت کی جائے گی۔ کیوں کہ صرف وہی قابل عمل ہے۔ ایسے معاملات میں آئیڈیل کو چلانا سرے سے ممکن ہی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ؐ کی ایک سنت یہ ہے کہ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے صرف یہ نہ دیکھا جائے کہ آئیڈیل نقطۂ نظر کیا ہے یا معیاری انصاف کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بجائے یہ دیکھا جائے کہ جن لوگوں کے ساتھ معاملہ پیش آیا ہے وہ کس درجہ کے لوگ ہیں اور حقیقی حالات کا تقاضا کیا ہے۔ اس طرح کا جائزہ لے کر حقیقی صورت حال کے مطابق وہ مسلک اختیار کیا جائے جو عملی طور پر ممکن ہو نہ کہ وہ مسلک جو بظاہر نظریاتی طور پر درست ہو مگر عملی طور پر اس کو اختیار کرنا ممکن نہ ہو۔

حکمتِ حیات

صلح اپنا حق وصول کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ صلح فریق ثانی کے شر سے بچنے کے لیے ہوتی ہے۔ فریق ثانی اگر عادل ہو تو کسی صلح کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ صلح کے بغیر ہی آپ کو آپ کا پورا حق دے دے گا۔ مگر جب فریق ثانی غیر عادل ہو تو وہ آپ کو الجھا کر آپ کو اپنی تعمیر کے راستہ سے ہٹا دینا چاہے گا۔ اس وقت خدا پرست آدمی اپنے حریف سے خود اس کی شرائط پر صلح کر لیتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے دامن کو بے فائدہ الجھاؤ سے بچالے اور اپنے تعمیری عمل میں مصروف ہو جائے۔

جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ صلح کے وقت اپنے حقوق کی فہرست بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اور اصرار کرنے لگتے ہیں کہ ان کے جائز حقوق انھیں لوٹائے جائیں۔ اس قسم کی کوشش صلح کی راہ میں مستقل رکاوٹ ہے۔ اس طرح کی کوشش صرف معاملہ کو الجھاتی ہے وہ صلح کو تکمیل تک پہنچنے نہیں دیتی۔

یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ وہ غیر عادل انسانوں سے اس طرح بھری ہوئی ہے جس طرح کوئی کانٹے دار درخت کانٹوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایسی دنیا میں آدمی کی پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ غیر عادل انسانوں سے معاملاتی الجھاؤ کی نوبت نہ آنے دے۔ ان سے دور کا تعلق رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا راستہ طے کرتا رہے۔

لیکن اگر کبھی کسی وجہ سے کسی غیر عادل انسان سے معاملاتی نزاع پیدا ہو جائے تو پہلی فرصت میں اس سے صلح کر کے آگے بڑھ جانا چاہیے۔ آدمی کی ساری توجہ سفر کو دوبارہ بلا رکاوٹ جاری کرنے سے ہونی چاہیے نہ کہ فریق ثانی سے اپنے حقوق کی وصولیابی پر۔

یہ صلح کوئی پسپائی نہیں، یہ بامقصد انسان کا اصول ہے۔ جس آدمی کے سامنے کوئی مقصد نہ ہو وہی ایسا کر سکتا ہے کہ وہ صلح کو حقوق کی وصولیابی کا عنوان بنائے اور پھر اس ناقابل عمل صلح کے لیے ساری عمر لڑتا رہے ــــــ اسلام میں صلح کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔ صلح کو ہر حال میں خیر بتایا گیا۔ حتیٰ کہ حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخالفین سے اُن کی یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی۔

خدائی نظام

وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر۔ (الشوریٰ ۳۰)

اور جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں ہی سے۔ اور بہت سے قصوروں کو وہ معاف کر دیتا ہے۔

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ آدمی جب بھی دنیا میں کسی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اس کے اپنے ہی کسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کسی دوسرے کی زیادتی کی شکایت کرنا بے معنی ہے۔ جب ہر آدمی خود اپنے کیے کو بھگت رہا ہو تو دوسرے کے خلاف شکایت اور احتجاج کرنا صرف وقت ضائع کرنا ہے۔ کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

یہ قدرت کا بنایا ہوا نظام ہے اور اس نظام میں ہمارے لیے خوش خبری ہے۔ وہ ہمارے لیے عظیم الشان امید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قدرتی نظام نے ہمارے مسائل کے حل کو خود ہمارے اپنے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم کو اس کا محتاج نہیں کیا کہ ہم کسی دوسرے کی مہربانی کا انتظار کریں۔

کوئی آدمی جن مسائل سے دوچار ہوا اگر اس کا سبب کچھ دوسرے لوگ ہوتے تو گویا کہ ہم دوسروں کے اوپر منحصر ہوتے۔ ہمیں دوسروں کی عنایت کا انتظار کرنا پڑتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی دنیا کا نظام اس طرح بنایا کہ یہاں ہر آدمی کا معاملہ اس کے اپنے ہاتھ میں رکھ دیا۔ یعنی ہر آدمی اپنی ہی کوشش سے اپنی زندگی کی تعمیر کر سکے۔ ہر آدمی کا مستقبل خود اس کے اپنے اختیار میں ہو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نادانی کی بنا پر نقصان اٹھاتا ہے، ایسے لوگ دوبارہ دانش مندی کا طریقہ اختیار کر کے اپنے آپ کو نقصان سے بچا سکتے ہیں۔ کبھی کسی کا معاملہ غیر منصوبہ بند انداز میں کام کرنے کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے، اس کے لیے موقع ہے کہ آئندہ وہ منصوبہ بند انداز میں کام کر کے از سر نو اپنے معاملہ کو درست کر لے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بے صبری کی روش کو اپنا کر آدمی مصیبت میں پھنس جاتا ہے، اب اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ صبر کی روش کو اپنا کر دوبارہ اپنے آپ کو مصیبتوں سے بچا لے۔ کبھی کچھ لوگ جذباتی اقدام کر کے اپنے کو بربادی میں ڈال دیتے ہیں، ان کے لیے موقع ہے کہ وہ حقیقت پسندی کے اصول پر چل کر دوبارہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائیں۔

مشکل میں آسانی

مکی دور میں جب کہ مسلمان نہایت سخت حالات سے گزر رہے تھے، اس وقت قرآن میں یہ آیت اتری کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے، مشکل کے ساتھ آسانی ہے (الانشراح) اس قرآنی آیت میں فطرت کا یہ قانون بتایا گیا کہ اس دنیا میں ہمیشہ مشکلات کے ساتھ مواقع موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے بہترین عقل مندی یہ ہے کہ مشکلات سے صرف نظر کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کیا جائے اس طرح زیادہ بہتر طور پر مستقبل کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔

عام طور پر دنیا میں لوگ ایک ہی عمل کو جانتے ہیں، اور وہ ہے مشکلات سے لڑ کر انھیں راستہ سے ہٹانا اور اس طرح اپنے لیے راہ ہموار کرنا، مگر اسلامک ایکٹوزم یہ نہیں ہے۔ اسلامک ایکٹوزم اس کے برعکس ہوتا ہے کہ مشکلات سے ٹکرانے کے بجائے انھیں نظر انداز کرو، اور عین اسی وقت جو مواقع موجود ہیں ان کو استعمال کرو۔ گویا اسلامک ایکٹوزم ایک لفظ میں یہ ہے کہ مشکلات کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو:

Ignore the problems, avail the opportunities.

مشکلات و مسائل کو موجودہ دنیا سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مشکلات و مسائل کا وجود اس دنیا میں اتنا ہی حتمی ہے جتنا کہ پھول کے درخت میں کانٹا۔ اس لیے مشکلات و مسائل سے ٹکرانا فطرت کی اٹل حقیقتوں سے ٹکرانا ہے۔ اور کون ہے جو فطرت کی حقیقتوں سے ٹکرا کر انھیں بدل سکے۔

عقل مند وہ ہے جو مشکلات و مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع اور امکانات کو تلاش کرے۔ زندگی کا کامیاب سفر ہمیشہ امکانی راہوں میں جاری ہوتا ہے نہ کہ مشکلات کی چٹانوں پر اپنا سر ٹکرانے سے۔ جس طرح درخت میں پھول اور کانٹا دونوں ہوتا ہے اسی طرح موجودہ دنیا مشکلات اور مواقع دونوں سے بھری ہوئی ہے۔ آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ مشکلات میں نہ الجھے۔ وہ مواقع کو دریافت کرکے انھیں استعمال کرے۔ وہ شکایت اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ کر صبر و تحمل کے ساتھ اپنا راستہ طے کرتا رہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آخر کار کامیاب ہوں گے۔ جو لوگ اس کے برعکس روش اختیار کریں ان کے لیے خدا کی دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

حکمت کی بات

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے، وہ جہاں اسے پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے (اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ اَیْنَ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا)

اس حدیثِ رسولؐ میں خدا پرست انسان کا مزاج بتایا گیا ہے۔ خدا پرست انسان ہر قسم کے تعصب سے پاک ہوتا ہے، وہ اپنے اور غیر میں فرق نہیں کرتا۔ وہ تمام دنیا کو خدا کی مخلوق کی نظر سے دیکھتا ہے، وہ تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ سمجھتا ہے۔ خدا پرست انسان کا یہ مزاج اس کو آفاقی بنا دیتا ہے

ایسا انسان ہر چیز سے سبق لینے لگتا ہے، وہ ہر کام کی بات کو اپنی بات سمجھتا ہے۔ اس کی آفاقی سوچ اُس کو اِس کمزوری سے بچا لیتی ہے کہ وہ کسی فائدہ کی بات کو دیکھے، تو اس کو غیر کی چیز سمجھ کر چھوڑ دے۔ وہ ہر اچھی بات کو خدا کی بات سمجھتا ہے، اس لیے وہ ہر اچھی بات کو اس طرح لے لیتا ہے جیسا کہ وہ اس کی اپنی ہی بات ہو۔

خدا پرست انسان کا یہ مزاج اس کو بے پناہ بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے ذہنی خزانہ میں نئی نئی باتوں کا اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی کبھی ٹھہراؤ کا شکار نہیں ہوتی، وہ ہر موڑ پر ایسی باتیں پالیتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی زندگی کے سفر کو آگے کی طرف جاری رکھ سکے۔

دنیا میں کامیابی کا تعلق سب سے زیادہ جس چیز سے ہے وہ معلومات ہیں، جتنی زیادہ معلومات اتنی زیادہ کامیابی۔ خدا پرست انسان اپنے دماغ کی تمام کھڑکیاں کھلی رکھتا ہے، اس بنا پر یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ اس کی معلومات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔

خدا پرست انسان کا مزاج اس کو کامل طور پر علم کا طالب بنا دیتا ہے۔ نئی نئی باتوں سے اس کی روح کو غذا ملتی ہے۔ وہ درخت کی مانند ایک اضافہ پذیر وجود بن جاتا ہے۔ اس کی شخصیت مسلسل بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ تکمیل کی آخری حد پر پہنچ جاتا ہے۔

مومن ایک بے تعصب انسان ہوتا ہے۔ وہ آخری حد تک طالب حق ہوتا ہے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ جہاں بھی کوئی اچھی بات ملے وہ فوراً اس کو لے لے۔

عذر نہیں

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارہ میں اکثر لوگ دھوکہ میں رہتے ہیں۔ صحت اور فرصت (نعمتان مغبون فیہما کثیر من الناس: الصحۃ والفراغ) فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۱ صفحہ ۲۳۳

دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے یا کوئی کام کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ یہ دو چیزیں صحت اور فرصت ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بلاشبہ اللہ کی عظیم نعمت ہیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے معاشی کاموں میں مشغول رہتا ہے اور اعلیٰ انسانی مقاصد کے لیے سرگرم نہیں ہو پاتا۔ حالانکہ اعلیٰ انسانی مقاصد کے لیے جینے ہی کا نام انسانیت ہے۔ جو آدمی صرف معاش اور اقتصادیات کے لیے جئے، وہ گویا حیوان جیسی زندگی گزار رہا ہے۔

جب انسانی مقاصد کے لیے کام کرنے کا موقع آتا ہے تو بیشتر لوگ یہ سوچ کر اس کے لیے سرگرم نہیں ہو پاتے کہ جب صحت اور فرصت ملے گی تو اس کے لیے بھی کام کرلیں گے۔ حالانکہ زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ صحت اور فرصت دونوں معیاری صورت میں مل جائیں۔ بیشتر حالات میں یہی ہوتا ہے کہ اگر صحت ہے تو فرصت نہیں اور اگر فرصت ہے تو صحت نہیں۔ اعلیٰ مقاصد کے لیے صحت اور فرصت کی شرط لگانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کبھی کوئی اعلیٰ کام نہ کر سکے، یہاں تک کہ اسی حال میں مرجائے۔

زندگی عذر سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ آدمی کے سامنے کبھی صحت کی خرابی کا عذر ہوتا ہے اور کبھی فرصت نہ ہونے کا عذر۔ دانش مندی یہ ہے کہ کسی بھی حال میں عذر کو عذر نہ بنایا جائے۔ عذر کو ناقابل لحاظ سمجھ کر اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔

زندگی میں کمیاں اس لیے نہیں ہوتیں کہ وہ آدمی کو کمزور کریں، بلکہ وہ آدمی کے لیے طاقت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ فطرت کا نظام ہے کہ کمی کا احساس آدمی کی ذہنی سرگرمیوں کو بڑھاتا ہے۔ کمی کا احساس معمولی آدمی کو غیر معمولی آدمی بنا دیتا ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ عذر کے باوجود کام کرنا سیکھے، عذر کے باوجود وہ اپنے عمل کو جاری رکھے۔ یہی لوگ ہیں جو موجودہ دنیا میں کامیابی اور ترقی کے اعلیٰ مقامات حاصل کرتے ہیں۔

قابل اعتماد کردار

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کے تیرھویں سال مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ وہی سفر ہے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بے حد نازک سفر تھا۔ مکہ کے سردار آپ کو مار ڈالنے پر تلے ہوئے تھے۔ آپ کو نہایت مخفی طور پر مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچنا تھا۔ یہ یقینی تھا کہ جب آپ مکہ سے نکل کر مدینہ کے لیے روانہ ہوں گے تو مکہ کے سردار آپ کے پیچھے اپنے آدمی دوڑائیں گے، وہ ہر کوشش کریں گے کہ آپ کو دوبارہ پکڑ لیں۔

ان حالات میں مختلف قسم کی احتیاط ضروری تھی۔ مثلاً مکہ سے نکل کر الٹی طرف جانا، پہلے غارِ ثور میں قیام کرنا۔ ابتدائی پیدل سفر طے کرنا اور پھر راستہ میں اونٹ کی سواری اختیار کرنا، معلوم اور معروف راستہ کو چھوڑ کر غیر عادی راستہ کا سفر کرنا، وغیرہ۔ قدیم زمانہ میں جب کہ سڑکیں نہیں تھیں، اس طرح کا سفر ایک واقف کار رہنما کی مدد ہی سے ہو سکتا تھا، رہنما کے بغیر ایسا سفر طے کرنا ناممکن تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے اس سفر میں رہنمائی کے لیے مکہ کے ایک شخص کو منتخب کیا جس کا نام عبد اللہ بن ارقط تھا۔ یہ آدمی اس طرح کے لمبے سفروں میں بطور پیشہ رہنمائی کا کام کیا کرتا تھا۔ وہ اگرچہ مشرک تھا، بالفاظ دیگر، اس کا تعلق آپ کی دشمن قوم سے تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اس نازک سفر کے لیے اسی کا انتخاب فرمایا (سیرۃ ابن ہشام ۲ صفحہ ۹۸)

اس انتخاب کا سبب کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبد اللہ بن ارقط اگرچہ مخالف قوم سے تعلق رکھتا تھا مگر اس کے اندر وہ چیز کمال درجہ میں تھی جس کو پروفیشنل دیانت داری کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے کام کے بارے میں وہ پوری طرح مخلص تھا۔ وہ جس خدمت کی ذمہ داری کو قبول کرتا اس کو ٹھیک ٹھیک انجام دیتا تھا۔ کام کے معاملہ میں وہ نہ عقیدہ کو رکاوٹ بناتا اور نہ کسی ذاتی مفاد کو۔

پروفیشنل دیانت داری کی یہ صفت آدمی کو سب کی نظر میں قابل اعتماد بنا دیتی ہے، حتی کہ اس کے مخالفین بھی اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا قول لوگوں کی نظر میں چٹان کی طرح مضبوط بن جاتا ہے، وہ اپنے اور غیر سب کی نظر میں عزت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔

علم کی اہمیت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنے دعوتی کام کا آغاز کیا۔ آپ کی دعوت مکمل طور پر ایک پرامن دعوت تھی مگر مکہ والوں نے آپ کے خلاف یک طرفہ طور پر تشدد شروع کر دیا۔ اس کے بعد آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ اب مدینہ آپ کی دعوت کا مرکز بن گیا۔ تاہم مکہ کے سردار اس پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے آپ کے خلاف مسلح جارحیت کی جس کے نتیجہ میں ۲ھ میں وہ لڑائی پیش آئی جو غزوۂ بدر کے نام سے مشہور ہے۔

اس جنگ میں خدا نے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی اور وہ اپنے مخالفین پر کامیاب ہوئے۔ اس جنگ کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ اس میں مکہ کے ستر آدمی گرفتار ہو کر مدینہ لائے گئے۔ یہ لوگ قدیم معیار کے مطابق پڑھے لکھے تھے۔ جب کہ مدینہ میں پڑھائی کا رواج نہ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کو ان قیدیوں کا فدیہ قرار دے دیا۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ ان میں سے جو آدمی مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے گا تو اس کو ہم قید سے رہائی دے دیں گے۔ چنانچہ کئی قیدیوں نے اس طرح تعلیمی خدمت انجام دے کر رہائی حاصل کی (سیرت ابن کثیر ۲ صفحہ ۵۱۲)

یہ اسلام کی تاریخ میں پہلا مدرسہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مسلم نوجوانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا ایک نظام قائم کیا گیا تھا۔ اس مدرسہ کے تمام کے تمام ٹیچر غیر مسلم تھے بلکہ وہ دشمن قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں تعلیم کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ اس واقعہ کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ——— ہر حال میں تعلیم حاصل کرو، خواہ تم کو اغیار سے تعلیم حاصل کرنا پڑے، خواہ تم کو ایک ایسے ادارہ میں پڑھنا پڑے جس کے تمام ٹیچر تمہاری دشمن قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ انسان پیدائشی طور پر ہر صلاحیت لے کر آتا ہے مگر ان صلاحیتوں کو صحیح طور پر عمل میں لانے کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم آدمی کو باشعور بناتا ہے۔ علم آدمی کو اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال سکھاتا ہے۔ علم آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے واقفیت حاصل کرے۔ علم کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی کتابوں کی صورت میں پچھلے انسانوں کے تجربات پڑھے۔ وہ تاریخ کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے واقف ہو۔

علم کے بغیر آدمی محدود ہے۔ علم حکمت و معرفت کا خزانہ ہے۔

درست کلام

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور درست بات (قول سدید) کہو، وہ تمہارے اعمال سدھارے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی (الاحزاب ۷۱-۷۰)

سدید کے معنی وہی ہیں جس کو اردو میں درست یا ٹھیک کہتے ہیں۔ عربی زبان میں کہا جاتا ہے سَدَّدَ الرُّمحَ، یعنی تیر کو ٹھیک نشانہ کے رخ پر سیدھا کیا۔ اس اعتبار سے قول سدید کے معنی ہوں گے بالکل ٹھیک بات، نشانہ پر لگتی ہوئی بات (ای قولاً قاصداً غیر جائر، حقاً غیر باطل (الطبری) (ای مستقیما لا اعوجاج فیہ ولا انحراف (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ درست کلام سے اصلاح اعمال کا فائدہ ہوتا ہے۔ جس سماج میں لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ کسی بات کو درست انداز میں کہیں اس سماج کے معاملات بھی درست رہتے ہیں۔ درست بات اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ لوگوں کے معاملات بگڑنے سے بچ جائیں۔

مثلاً آپ اپنے عبادت خانہ کے اندر داخل ہوں۔ وہاں آپ دیکھیں کہ فرش پر مقدس کتاب کے کچھ اوراق بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ آپ لوگوں سے یہ کہیں کہ میں عبادت خانہ میں داخل ہوا تو وہاں مقدس کتاب کے کچھ اوراق بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ لوگوں کو یہ بتائیں کہ دوسرے فرقے کے لوگوں نے مقدس کتاب کی بے حرمتی کی، اور اس کے اوراق پھاڑ کر زمین پر پھینک دیے۔

آپ کی پہلی بات قول سدید کی مثال ہے۔ اور دوسری بات قول غیر سدید کی مثال۔ اگر آپ معاملے کو پہلی قسم کے الفاظ میں بیان کریں تو اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اگر آپ مذکورہ مثال کے مطابق، دوسری قسم کے الفاظ بولنے لگیں تو سننے والے بھڑک اٹھیں گے۔ ہر طرف غم و غصے کی لہر دوڑ جائے گی۔ لوگ دوسرے فرقے کے خلاف انتقامی کارروائی شروع کر دیں گے۔ اس کے بعد جوابی انتقام کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اور پھر پوری بستی آگ اور خون کی نذر ہو جائے گی۔

منصوبہ بند عمل

قرآن کی سورہ نمبر ۴۶ میں ارشاد ہوا ہے -- پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی نہ کرو (فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل ولا تستعجل لهم) الاحقاف ۳۵

زندگی مشکلات اور مسائل کے درمیان جینے کا نام ہے۔ خاص طور پر جو آدمی کوئی مقصد یا مشن لے کر اٹھے اس کے لیے تو قدم قدم پر رکاوٹیں اور مخالفتیں پیش آتی ہیں۔ اس کو طوفانوں کے درمیان اپنا سفر طے کرنا ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں زندگی کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ جب کوئی مخالف صورت حال سامنے آئے تو فوری ردعمل کے تحت اس کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مخالف صورت حال پیش آنے کے بعد آدمی اپنے جذبات کو تھامے۔ وہ پورے معاملہ پر ٹھنڈے ذہن کے ساتھ غور و فکر کرے۔ اسی کے ساتھ وہ صاحبِ مشورہ لوگوں سے مشورہ بھی کرے۔ اس کے بعد سوچے سمجھے فیصلہ کے مطابق جوابی کارروائی کرے —— پہلے طریقہ کا نام عجلت ہے اور دوسرے طریقہ کا نام صبر۔

عجلت کے تحت کیا ہوا اقدام ہمیشہ ناکام ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے اقدام میں صورت حال کا پورا جائزہ شامل نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی نہ اپنی طاقت کا صحیح اندازہ کرتا ہے اور نہ فریق ثانی کی طاقت کا۔ وہ نتیجہ کی پروا کیے بغیر فوری طور پر مقابلہ کے میدان میں کود پڑتا ہے۔ اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ اسباب کا لحاظ کیے بغیر اس دنیا میں جو اقدام کیا جائے وہ کبھی کامیابی کے درجہ تک نہ پہنچے۔

صبر کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جو آدمی صبر کا طریقہ اختیار کرے وہ کارروائی سے پہلے اس کے انجام کو سوچتا ہے، وہ جذبات کی رعایت کرنے کے بجائے حقیقت کی رعایت کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں فطرت کے قانون کی حکمرانی ہے، نہ کہ اس کی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کی۔

صبر یہ ہے کہ آدمی جذبات سے اوپر اٹھ کر حقیقت کو دیکھے۔ وہ ذاتی خواہشوں سے غیر متاثر رہ کر فطرت کے نظام کو سمجھے۔ صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ منصوبہ بند عمل کر سکے اور اس دنیا میں کامیاب عمل وہی ہے جو منصوبہ بندی کے ساتھ انجام دیا گیا ہو۔

منفی سوچ نہیں

ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد پیش آیا۔ اس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ یہ غزوہ ہر اعتبار سے مخالفین اسلام کی جارحیت اور زیادتی پر مبنی تھا۔ بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ قرآن میں اس پر مخالفین کے لیے مذمت کی آیتیں اتریں۔ مگر برعکس طور پر قرآن میں وہ آیتیں اتریں جن میں خود مسلمانوں کو نصیحت کی گئی تھی —— قرآن میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ اگر احد کے موقع پر تم کو زخم پہنچا ہے تو اس سے پہلے بدر کے موقع پر فریق ثانی کو زخم پہنچ چکا ہے۔ اور یہ ایام ہم اسی طرح بدلتے رہتے ہیں (فَإِنْ أَصَابَكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ)

قرآن میں یہ انداز کیوں اختیار کیا گیا۔ اس کا راز یہ ہے کہ زندگی کی تمام ترقیاں ان لوگوں کو ملتی ہیں جو مثبت طرز فکر کے حامی ہیں۔ غزوۂ احد کے حادثہ سے اندیشہ تھا کہ مسلمان انتقامی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں گے اور اس طرح وہ مثبت ذہن کو کھو دیں گے۔ اس خطرہ سے بچانے کے لیے قرآن میں مذکورہ قسم کا تبصرہ نازل کیا گیا۔ منفی نفسیات کے طوفان میں انھیں مثبت نفسیات کی طرف موڑ دیا گیا۔

یہی تدبیر دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپانیوں نے اختیار کی۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکا نے جاپان کے صنعتی شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر اسے تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد جاپانیوں میں امریکا کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس وقت جاپان کے دانش وروں نے یہ کہہ کر اپنی قوم کو ٹھنڈا کیا کہ اگر امریکا نے ۱۹۴۵ میں ہمارے ہیروشیما کو تباہ کیا ہے تو اس سے پہلے ۱۹۴۱ میں ہم ان کے پرل ہاربر کو تباہ کر چکے تھے۔ اب معاملہ برابر ہو گیا۔ اب آؤ ہم یکسو ہو کر مستقبل کی تعمیر کریں۔ دانش وروں کی اس صحیح رہنمائی نے جاپانی قوم کے لیے تباہی کے باوجود ترقی کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔

یہی اس دنیا میں ترقی کا راز ہے۔ یہاں وہ لوگ ترقی کرتے ہیں جو منفی تجربہ کے باوجود اپنی مثبت سوچ کو باقی رکھیں، جو مخالف حالات میں بھی اپنے لیے موافق امکانات تلاش کر لیں۔ جو ناکامیوں کے ہجوم میں اپنے لیے کامیابی کا نیا راستہ دریافت کر لیں۔

اس دنیا میں بڑی ترقی صرف ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو خارج سے غیر متاثر رہ کر اپنا راستہ خود اپنی مثبت سوچ کے تحت بنائیں۔

ذہنی ارتقاء

الترمذی نے حضرت سعید الخدری کی ایک روایت نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— مومن خیر کی بات سننے سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ جنت کی منزل تک پہنچ جائے (لن یشبع المومن من خیر یسمعہ، حتیٰ یکون منتہاہ الجنۃ) جامع الاصول فی احادیث الرسول ۸ صفحہ ۹

آدمی کو چاہیے کہ سیکھنے کا جذبہ اس کے اندر مسلسل بیدار رہے۔ وہ ہمیشہ نئی بات سیکھنے کا خواہش مند ہو۔ وہ اپنے تجربہ اور واقفیت میں ہر روز اضافہ کرتا رہے۔ یہاں تک کہ اسی حال میں اس پر موت آجائے۔

معلومات کی دنیا لامتناہی حد تک وسیع ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس لیے ایک سچا انسان کبھی نئی نئی باتیں سیکھنے سے سیر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دماغ کے خزانہ میں ہر صبح و شام اضافہ کرتا رہتا ہے۔

یہی اضافہ انسانی ترقی کا راز ہے۔ اس طرح آدمی کا ذہنی ارتقا مسلسل جاری رہتا ہے۔ وہ سوچنے اور عمل کرنے کے نئے راستے دریافت کرتا رہتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی حقیقت آتی ہے تو وہ فوراً اس کو اس کی گہرائی تک سمجھ لیتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ پڑتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ کامیاب معاملہ کا طریقہ کیا ہے۔ اس کے سامنے ایک راستہ بند ہوتا ہے تو وہ اپنے سفر کو جاری رکھنے کے لیے فوراً ہی دوسرا راستہ پالیتا ہے۔

ایسے آدمی کی بڑھی ہوئی ذہنی استعداد اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ وہ حق کو حق کے روپ میں دیکھے اور باطل کو باطل کے روپ میں پہچان لے۔ وہ چیزوں کو ویسی ہی دیکھتا ہے جیسی کہ وہ ہیں، نہ کہ دکھانے والے جس روپ میں اس کو دکھادیں۔ ایسا آدمی اس پوزیشن میں ہو جاتا ہے کہ وہ شبہات کا پردہ پھاڑ کر سچائی کو دیکھے۔ وہ مغالطہ اور استدلال کے درمیان فرق کر سکے۔ وہ جان لے کہ جذباتی نقطۂ نظر کیا ہے اور عقلی نقطۂ نظر کیا۔ ایسے آدمی کے اندر وہ چیز پرورش پاتی ہے جس کو تخلیقی ذہن کہا جاتا ہے۔ وہ چیزوں کو از سر نو دریافت کرتا ہے، وہ تقلید سے اوپر اٹھ کر مجتہدانہ رائے بنانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ وہ ظواہر کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی زیادہ بہتر طور پر جان لیتا ہے، اور دوسروں کے بارہ میں بھی اس کے اندر زیادہ صحیح پہچان پیدا ہو جاتی ہے۔ عام انسان اگر صرف انسان ہوتا ہے تو ایسا آدمی پورے معنی میں ایک ترقی یافتہ انسان۔

نفع بخشی

قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ: خدا نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق بہ نکلے۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا۔ اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے، جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اس طرح خدا حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے۔ اور جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے، اسی طرح خدا مثالیں بیان کرتا ہے (الرعد ۱۷)

دنیا کے پیدا کرنے والے نے اس کا نظام نفع بخشی کے اصول پر قائم کیا ہے۔ یعنی جو چیز دوسروں کے لیے مفید ہو وہ یہاں باقی رہے اور جو چیز اس اعتبار سے اپنی افادیت کھو دے وہ اسی طرح پھینک دی جائے جس طرح کوڑے کو بے کار سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

نفع بخشی کا آغاز آدمی کے اپنے دماغ سے ہوتا ہے۔ یعنی آدمی دوسروں کا خیر خواہ ہو، وہ اپنے فائدہ کے لیے سوچتے ہوئے یہ بھی اپنے دھیان میں رکھے کہ وہ دوسروں کے لیے کن صورتوں میں فائدہ پہنچانے والا بن سکتا ہے، دوسروں کے بارہ میں اس کے اندر ہمدردی کا جذبہ ہو نہ کہ بے تعلقی کا جذبہ۔

ہر آدمی سماج کے اندر زندگی گزارتا ہے۔ ہر آدمی کی سرگرمیاں سماج کے اندر جاری ہوتی ہیں۔ جس آدمی کا طریقہ یہ ہو کہ وہ اپنا فائدہ چاہے اور صرف اپنے ذاتی تقاضوں کو پورا کرنے میں مشغول رہے، وہ گویا فطرت کے نقشہ کے خلاف کام کر رہا ہے اور جو آدمی فطرت کے نقشہ کے خلاف کام کرے وہ خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کی تعمیر اس طرح کرے کہ اس میں دوسروں کا بھی حصہ ہو۔ فطرت کے نظام کو استعمال کر کے جب وہ کوئی فائدہ حاصل کرے تو اس نے دوسروں کو بھی اس میں ضرور شریک کیا ہو۔ اس کا اصول یہ ہو کہ اس کو لینے کے ساتھ دینا بھی ہے، دوسروں سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ دوسروں کو فائدہ پہنچانا بھی۔

کائنات میں بقا صرف باہمی افادیت کو حاصل ہے۔ خود غرضانہ رویہ کے لیے اس کائنات میں کوئی جگہ نہیں۔ خدا کی اس دنیا میں یہی اصول انسان کے لیے بھی ہے اور بقیہ کائنات کے لیے بھی۔

امید کا نظام

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ امید میری امت کے لیے
(خدا کی) طرف سے ایک رحمت ہے۔ اگر امید نہ ہو تو کوئی پودا لگانے والا پودا نہ لگائے اور نہ کوئی ماں
اپنے بچہ کو دودھ پلائے (الامل رحمة من الله لامتي ولولاه لما غرس غارس شجرا ولا ارضعت
والدة ولدا) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۲۲۴

دنیا کی زندگی میں انسان کو مسلسل تلخ تجربات پیش آتے ہیں۔ اس کو ایسے واقعات کے
درمیان سے گزرنا ہوتا ہے جو بظاہر دل توڑ دینے والے ہیں۔ مگر انسان پھر بھی اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔
اس کی زندگی کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔

اس کا راز امید ہے۔ فطرت نے انسان کے اندر امید کا جذبہ اس طرح رکھ دیا ہے کہ وہ کبھی
ختم نہ ہو، وہ برابر انسان کو سرگرم عمل رکھے۔

اس دنیا میں ہر کام تدریج کے ساتھ ہوتا ہے۔ کسان آج زمین میں بیج ڈالتا ہے اور بہت
دن کے بعد اس کو اس کا پھل حاصل ہوتا ہے۔ ماں مصیبت اٹھا کر اپنے چھوٹے بچے کی پرورش کرتی
ہے حالانکہ وہ وقت ابھی بہت دور ہوتا ہے جب کہ وہ بڑا ہو کر ماں کی خدمت کر سکے۔ لیکن ساری دنیا
کے عورت اور مرد مسلسل اسی طرح متحرک ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر ایک کے دل میں چھپا ہوا امید
کا جذبہ اس کا سہارا بنا رہتا ہے۔ اگر یہ امید نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیاں ٹھٹھر کر رہ جائیں۔

تاہم بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی زیادہ بڑے نقصان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کو کوئی ایسا
تجربہ پیش آجاتا ہے جو بظاہر اس کے سارے منصوبے کو تباہ کر دینے والا ہے۔ یہ انسان کے لیے امتحان کا
ایک لمحہ ہوتا ہے۔ اگر وہ بدستور امید کے اوپر قائم رہے، وہ حال کے بجائے مستقبل پر اپنی نظر جمائے تو
بہت جلد وہ پائے گا کہ حوصلہ شکنی کے سخت حالات میں بھی اس کے لیے امید کا امکان موجود تھا۔ مایوسی کی
آخری حد تک جا کر بھی اس کے امکانات ختم نہیں ہوئے تھے۔ زندگی کے کچھ دروازے اس کے لیے اگرچہ بند
ہو گئے لیکن کچھ اور دروازے پھر بھی اس کے لیے کھلے ہوئے تھے جن میں داخل ہو کر وہ اپنا سفر حیات
کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

انس و محبت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ مومن انس و محبت والا انسان ہوتا ہے۔ اس آدمی میں کوئی خیر نہیں جو نہ دوسروں سے مانوس ہو اور نہ دوسرے اس سے مانوس ہوں۔ لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو نفع پہنچانے والا ہو (المومن آلِفٌ مالوفٌ، ولا خیر فیمن لا یالف ولا یؤلف وخیر الناس انفعهم للناس) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۲۳۰

انسان جب اپنی صحیح فطرت پر قائم ہو تو وہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اس حدیثِ رسولؐ میں بتایا گیا ہے۔ اس کے اندر ایسی صفات ہوتی ہیں جو لوگوں کو اس کی طرف مائل کر دیں۔ اسی طرح وہ خود دوسرے انسانوں سے الفت و محبت کے ساتھ پیش آنے والا انسان ہوتا ہے۔ یہی وہ انسان ہیں جن کے ملنے سے ایک بہتر سماج وجود میں آتا ہے۔ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے والے ہوتے ہیں اور دوسروں سے بھی ان کو فائدہ کا تجربہ ہوتا ہے۔

جو لوگ دنیا میں اس طرح جئیں وہ خود بھی کامیاب ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی کامیابی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وہ پھول کی مانند ہوتے ہیں جو اپنے آپ میں بھی خیر ہوتا ہے اور پورے باغ کے لیے بھی خیر۔

ایسا انسان کینہ و نفرت جیسے جذبات سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے دل میں دوسروں کے لیے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ہر ایک کو اپنا سمجھتا ہے۔ ہر ایک کے لیے اس کے دل میں بہترین تمنائیں ہوتی ہیں۔ جب بھی کوئی شخص اس سے ملتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ پھول سے مل رہا ہے نہ کہ کسی کانٹے سے۔ اس کے پاس بیٹھنا الفت و محبت کے ماحول میں بیٹھنا ہوتا ہے نہ کہ نفرت و وحشت کے ماحول میں بیٹھنا۔

ایسا آدمی جب دوسروں سے ملتا ہے تو وہ اس سے مسکرا کر ملتا ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی رعایت کرتا ہے۔ دوسروں کی خدمت کرنا اس کے لیے خوشی کا ایک تجربہ ہوتا ہے۔ دوسروں کے کام آنا اس کے لیے خود اپنی شخصیت کی تکمیل کے ہم معنی ہوتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اس کی خیر خواہی کا جذبہ اس وقت بھی ختم نہیں ہوتا جبکہ دوسروں کی طرف سے اس کو کوئی ناخوش گوار تجربہ پیش آئے۔

ضرورت نہ کہ حرص

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— جو آدمی بقدرِ ضرورت پر قناعت نہ کرے تو وہ ساری زندگی غیر مطمئن حالت میں رہے گا (من لا یجزیہ من العیش مایکفیہ لم یجد ما عاش مایغنیہ) ادب الدنیا والدین طبری، صفحہ ۲۹۹

مطمئن زندگی کا تعلق زیادہ سے نہیں ہے بلکہ قناعت سے ہے۔ جو آدمی ضرورت کے بقدر پا کر مطمئن ہو جائے، وہی اس نعمت کو پا سکتا ہے جس کو اطمینان کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی ضرورت کے بجائے خواہش کو اپنا معیار بنائے وہ کبھی اطمینان کی زندگی نہیں پا سکتا۔ کیوں کہ ضرورت کی ایک حد ہے، مگر خواہش اور حرص کی کوئی حد نہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ ضرورت اور حرص میں فرق کرے۔ وہ اپنی جدوجہد کا نشانہ ضرورت کی تکمیل کو بنائے نہ کہ خواہش کی تکمیل کو۔ جب ضرورت کو نشانہ بنایا جائے تو ہر چیز اپنی فطری جگہ پر رہتی ہے۔ آدمی ضرورت کی فراہمی کے بعد اس کا وقت پالیتا ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد میں بھی اپنے آپ کو مصروف کر سکے۔ اس کے برعکس جب ضرورت کے بجائے حرص کو نشانہ بنا لیا جائے تو آدمی صرف کمانے والا حیوان بن جاتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسا وقت نہیں بچتا جس میں وہ اعلیٰ انسانی تقاضوں کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔

ضرورت کو نشانہ بنانے کی صورت میں زندگی کا نظام اپنے فطری دائرہ میں ہوتا ہے۔ اس کے بجائے جب ضرورت کی حد سامنے نہ رکھی جائے بلکہ اپنی خواہش کو اپنا رہنما بنا لیا جائے تو زندگی کا فطری نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ اور اس دنیا میں پُر عافیت زندگی وہی ہے جو فطرت کے نقشہ پر گزاری جائے۔

حرص کا معاملہ ہمیشہ مادی چیزوں میں پیش آتا ہے، نہ کہ اعلیٰ اقدار میں۔ ایسی حالت میں جو آدمی اپنی حرص کے پیچھے دوڑے اس نے گویا اپنی آدمیت کو گھٹا لیا۔ کیوں کہ مادی ضروریات آدمی کی زندگی کا جزء ہیں نہ کہ کل۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اعلیٰ انسانی مقاصد کو اپنی زندگی میں پہلی اہمیت کا درجہ دے اور مادی چیزوں کی فراہمی کو دوسرے درجہ میں رکھے۔

زھد کا فائدہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ، تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے۔ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہو جاؤ، تم لوگوں کے محبوب بن جاؤ گے (ازھد فی الدنیا یحبک اللہ و ازھد فیما فی ایدی الناس یحبک الناس) [illegible]

عزت و محبت کا راز بے نیازی ہے۔ آدمی کے اندر جتنا زیادہ بے نیازی کی کیفیت پیدا ہوگی اتنا ہی زیادہ لوگوں کے لیے اس کی کشش بڑھتی چلی جائے گی۔

خدا سے قریب ہونے کا راز دوسروں سے دور ہونا ہے۔ آدمی جتنا زیادہ دوسری چیزوں سے بے رغبت ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ خدا کے بارے میں سوچے گا اور خدائی چیزوں میں مشغول ہوگا۔ اس کے برعکس آدمی جتنا زیادہ دوسری چیزوں میں اپنا دل لگائے گا اتنا ہی وہ خدا کی طرف سے غفلت میں پڑ جائے گا۔ دوسری چیزوں سے تعلق کا بڑھنا خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو گھٹانا ہے۔ اسی طرح خدا سے اپنے تعلق کو بڑھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا قلبی تعلق دوسری چیزوں کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔

لوگ ایسے آدمی کی عزت کرتے ہیں جس کو وہ اپنے سے اونچا سمجھتے ہوں۔ جو آدمی انھیں اپنے برابر یا اپنے سے کم دکھائی دے اس کے لیے لوگوں کے اندر عزت و قدر دانی کا اعلیٰ جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جو آدمی سماج میں اس طرح رہے کہ وہ دوسروں سے بے نیاز بنا ہوا ہو، وہ دوسروں سے کسی چیز کا امیدوار نہ ہو، ایسا انسان اپنے آپ دوسروں کے درمیان اونچا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ کسی کوشش کے بغیر وہ دوسروں کی نظر میں محترم بن جاتا ہے۔

دنیا کی چیزوں سے بے رغبتی آدمی کو بیک وقت دو فائدے دیتی ہے۔ ایک طرف وہ پُرعافیت زندگی کا مالک بن جاتا ہے، وہ اعلیٰ حقیقتوں میں جینے لگتا ہے۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ سماج کے درمیان اپنے آپ عزت و احترام کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی نظر میں بھی باعزت آدمی بن جاتا ہے اور دوسروں کی نظر میں بھی۔

زاہدانہ زندگی نام ہے چھوٹی چیز کو کھو کر زیادہ بڑی چیز کو پالینا۔

علم کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— علم خزانہ کی مانند ہے اور اس کی کنجی سوال ہے۔ اللہ تم پر رحم کرے تم سوال کیا کرو۔ کیونکہ علم میں تین لوگ اجر پاتے ہیں۔ کہنے والا، سننے والا اور لے لینے والا (العلم خزائنٌ ومفتاحه المسألة، فاسألوا رحمكم الله، فانّما يؤجر في العلم ثلاثة، القائلُ والمستمع والآخذُ) ادب الدنیا والدین طبری، صفحہ ۱۱۰

علم کی دنیا ایک لامحدود دنیا ہے۔ یہ دنیا معلومات کے خزانہ سے بھری ہوئی ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جو سارے علوم اور تمام معلومات اپنے دماغ میں بھرے ہوئے ہو۔ کسی کے پاس اس کا کچھ حصہ ہے اور کسی کے پاس اس کا کچھ۔

مختلف انسانوں کے پاس جمع شدہ یہ خزانہ آپ کو کس طرح ملے، اس کی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آپ اس کے طالب بن جائیں۔ آپ کے دل میں ان کو حاصل کرنے کا بے پناہ شوق پیدا ہو جائے۔ جب ایسا ہوگا تو آپ لوگوں سے پوچھنے لگیں گے تاکہ ان کے پاس جمع شدہ معلومات کو لے کر اپنے علمی ذخیرہ کو بڑھائیں۔ آپ اہل علم کی کتابیں پڑھیں گے تاکہ ان کے اندر علم کا جو خزانہ بند ہے، اپنے آپ کو اس کا حصہ دار بنا سکیں۔

انسان کی ساری اہمیت علم کے اعتبار سے ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ علم والا ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ قابل قدر ہوگا۔ زندگی کی ہر ترقی براہ راست طور پر علم سے جڑی ہوتی ہے، جتنا زیادہ علم اتنا ہی زیادہ ترقی۔

علم کے معاملہ میں ہر آدمی کی تین میں سے کوئی ایک حیثیت ہوتی ہے —— قائل، مستمع، آخذ۔ یعنی کہنے والا اور سننے والا اور ماننے والا۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جس حیثیت میں پائے، وہ اس کا پورا حق ادا کرے۔ اگر اس کو بولنے کا موقع مل رہا ہے تو وہ ذمہ دارانہ کلام کرے۔ وہ وہی بولے جو اس کو بولنا چاہیے، وہ ایسا کلام نہ کرے جو حقیقت واقعہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس کا بولنا حقیقت کے اظہار کے لیے ہو نہ کہ خود نمائی کے لیے۔ اسی طرح جو سن رہا ہے اس پر بھی لازم ہے کہ وہ سننے کا حق ادا کرے۔ وہ کہی ہوئی بات کو پورے دھیان کے ساتھ سنے اور اس کو اسی معنی میں لے جس معنی میں لینے والے نے اس کو کہا ہے۔

زہد کا فائدہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ـــــ دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ، تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے۔ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہو جاؤ، تم لوگوں کے محبوب بن جاؤ گے (ازھد فی الدنیا یحبك الله وازھد فیما فی ایدی الناس یحبك الناس) ادب الدنیا والدین ۱۹۰

عزت و محبت کا راز بے نیازی ہے۔ آدمی کے اندر جتنا زیادہ بے نیازی کی کیفیت پیدا ہوگی اتنا ہی زیادہ لوگوں کے لیے اس کی کشش بڑھتی چلی جائے گی۔

خدا سے قریب ہونے کا راز دوسروں سے دور ہونا ہے۔ آدمی جتنا زیادہ دوسری چیزوں سے بے رغبت ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ خدا کے بارے میں سوچے گا اور خدائی چیزوں میں مشغول ہوگا۔ اس کے برعکس آدمی جتنا زیادہ دوسری چیزوں میں اپنا دل لگائے گا اتنا ہی وہ خدا کی طرف سے غفلت میں پڑ جائے گا۔ دوسری چیزوں سے تعلق کا بڑھنا خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو گھٹانا ہے۔ اسی طرح خدا سے اپنے تعلق کو بڑھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا قلبی تعلق دوسری چیزوں کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔

لوگ ایسے آدمی کی عزت کرتے ہیں جس کو وہ اپنے سے اونچا سمجھتے ہوں۔ جو آدمی انھیں اپنے برابر یا اپنے سے کم دکھائی دے اس کے لیے لوگوں کے اندر عزت و قدر دانی کا اعلیٰ جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جو آدمی سماج میں اس طرح رہے کہ وہ دوسروں سے بے نیاز بنا ہوا ہو، وہ دوسروں سے کسی چیز کا امیدوار نہ ہو، ایسا انسان اپنے آپ دوسروں کے درمیان اونچا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ کسی کوشش کے بغیر وہ دوسروں کی نظر میں محترم بن جاتا ہے۔

دنیا کی چیزوں سے بے رغبتی آدمی کو بیک وقت دو فائدے دیتی ہے۔ ایک طرف وہ پُر عافیت زندگی کا مالک بن جاتا ہے، وہ اعلیٰ حقیقتوں میں جینے لگتا ہے۔ دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ سماج کے درمیان اپنے آپ عزت و احترام کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی نظر میں بھی باعزت آدمی بن جاتا ہے اور دوسروں کی نظر میں بھی۔

زاہدانہ زندگی نام ہے چھوٹی چیز کو کھو کر زیادہ بڑی چیز کو پالینا۔

علم کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ــــ علم خزانہ کی مانند ہے اور اس کی کنجی سوال ہے۔ اللہ تم پر رحم کرے تم سوال کیا کرو۔ کیونکہ علم میں تین لوگ اجر پاتے ہیں۔ کہنے والا، سننے والا اور لے لینے والا (العلم خزائنُ ومفتاحه المسألة، فاسألوا رحمكم الله، فانّما يؤجر في العلم ثلاثة، القائلُ والمستمع والآخذُ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۱۰

علم کی دنیا ایک لامحدود دنیا ہے۔ یہ دنیا معلومات کے خزانہ سے بھری ہوئی ہے۔ کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جو سارے علوم اور تمام معلومات اپنے دماغ میں بھرے ہوئے ہو۔ کسی کے پاس اس کا کچھ حصہ ہے اور کسی کے پاس اس کا کچھ۔

مختلف انسانوں کے پاس جمع شدہ یہ خزانہ آپ کو کس طرح ملے، اس کی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آپ اس کے طالب بن جائیں۔ آپ کے دل میں ان کو حاصل کرنے کا بے پناہ شوق پیدا ہو جائے۔ جب ایسا ہوگا تو آپ لوگوں سے پوچھنے لگیں گے تاکہ ان کے پاس جمع شدہ معلومات کو لے کر اپنے علمی ذخیرہ کو بڑھائیں۔ آپ اہل علم کی کتابیں پڑھیں گے تاکہ ان کے اندر علم کا جو خزانہ بند ہے، اپنے آپ کو اس کا حصہ دار بنا سکیں۔

انسان کی ساری اہمیت علم کے اعتبار سے ہے۔ جو انسان جتنا زیادہ علم والا ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ قابل قدر ہوگا۔ زندگی کی ہر ترقی براہ راست طور پر علم سے جڑی ہوتی ہے، جتنا زیادہ علم اتنا ہی زیادہ ترقی۔

علم کے معاملہ میں ہر آدمی کی تین میں سے کوئی ایک حیثیت ہوتی ہے ــــ قائل، مستمع، آخذ۔ یعنی کہنے والا اور سننے والا اور ماننے والا۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جس حیثیت میں پائے، وہ اس کا پورا حق ادا کرے۔ اگر اس کو بولنے کا موقع مل رہا ہے تو وہ ذمہ دارانہ کلام کرے۔ وہ وہی بولے جو اس کو بولنا چاہیے، وہ ایسا کلام نہ کرے جو حقیقتِ واقعہ سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس کا بولنا حقیقت کے اظہار کے لیے ہو نہ کہ خود نمائی کے لیے۔ اسی طرح جو سن رہا ہے اس پر بھی لازم ہے کہ وہ سننے کا حق ادا کرے۔ وہ کہی ہوئی بات کو پورے دھیان کے ساتھ سنے اور اس کو اسی معنی میں لے جس معنی میں لینے والے نے اس کو کہا ہے۔

حقیقت کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— تھوڑا علم زیادہ عبادت سے بہتر ہے (قلیل العلم خیرٌ من کثیر العبادۃ) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۱۱۳

اس حدیث میں جو تقابل ہے وہ حقیقی علم اور ظاہری عبادت کے درمیان ہے نہ کہ سادہ طور پر صرف علم اور عبادت کے درمیان۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اگر ظاہری عبادت بہت زیادہ کرے تو اتنی قابل قدر بات نہیں ہے جتنا یہ بات کہ ایک شخص علم میں محنت کرے اور اس سے حکمت و معرفت کا خزانہ حاصل کر لے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود عبادت کا تعلق علم سے بہت گہرا ہے۔ جو آدمی گہرا علم رکھتا ہو وہ اسی کے ساتھ گہری معرفت والا انسان ہوگا۔ اور یہ گہری معرفت ہی عبادت کی اصل روح ہے۔ عبادت صرف ظاہری مراسم کا نام نہیں ہے بلکہ اس اسپرٹ کا نام ہے جو عبادت کے اندر موجود ہوتی ہے۔ یہ اسپرٹ ہی عبادت کو عبادت بناتی ہے اور یہ اسپرٹ علم کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

علم آدمی کے ذہن کو جگاتا ہے۔ وہ اس کو بے شعوری سے نکال کر شعور کے مرحلہ میں پہنچاتا ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو درست طور پر استعمال کر سکے۔ علم آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھے اور اس کے لیے کامیاب منصوبہ بندی کرے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے اوپر بیک وقت دو ذمہ داریاں ہیں۔ ایک، خدا کی نسبت سے۔ اور دوسرے، انسان کی نسبت سے۔ انہی دونوں ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرنے کا نام کامیابی ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک ذمہ داری بھی اگر چھوٹ جائے تو آدمی کی زندگی ادھوری رہ جائے گی وہ کامل انسان کہلانے کا مستحق نہیں قرار پائے گا۔ علم انہی دونوں ذمہ داریوں کا صحیح شعور دیتا ہے۔ وہ آدمی کو کامل منصوبہ بندی کے قابل بناتا ہے۔

کسی چیز کی اہمیت اس کے باطن سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے خارج سے۔ وہی انسان کامیاب ہے جو باطنی اہمیت والی چیز اپنے اندر رکھتا ہو۔ صرف خارجی ظواہر نہ خدا کی نظر میں قابل قدر ہیں اور نہ انسان کی نظر میں۔

کامیابی کا راز

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ——— تم اپنی پسندیدہ چیز کو صرف اس وقت پا سکتے ہو جب کہ تم اپنی ناپسندیدہ چیز پر صبر کرو۔ اور جو کچھ تم چاہتے ہو اس کو تم اپنی خواہشوں کو چھوڑے بغیر حاصل نہیں کر سکتے (انکم لا تنالون ما تحبون الا بالصبر علی ما تکرھون ولا تبلغون ما تھوون الا بترک ما تشتھون) (ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۸۰)

موجودہ دنیا فطرت کے جس اصول پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ یہاں پانے کے لیے کھونا پڑتا ہے۔ یہاں ایک پسندیدہ چیز کو حاصل کرنے کے لیے کسی دوسری پسندیدہ چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں کامیابی کی منزل پر پہنچنا اس کے لیے مقدر ہے جو راستہ کی ناکامیوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اسی کا نام صبر ہے۔ صبر کی صفت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی مطلوب چیز کو حاصل کرنے کی ضروری قیمت ادا کر سکے۔ صبر آدمی کو حوصلہ مند بناتا ہے۔ صبر کے ذریعہ آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ان ناخوش گواریوں کو پرسکون طور پر جھیل سکے، جن کا پیش آنا ہر معاملہ میں ضروری ہے۔ خواہ وہ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا معاملہ ہو۔

درخت سے پھول لینے کے لیے آدمی کو کانٹوں سے نباہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سماج کے اندر اپنے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان ناخوش گواریوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو لازمی طور پر دوسروں کی طرف سے پیش آتی ہیں۔ آدمی کا مقصد جتنا زیادہ بلند ہو اتنی ہی زیادہ دشواریاں اس کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ آدمی اس قسم کی تمام ناگواریوں کو گوارا کرے تاکہ وہ اپنی پوری قوت کو یکسوئی کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول میں لگا سکے۔

ناخوش گواریوں پر صبر کرنا اپنے اندر ایک مثبت پہلو رکھتا ہے۔ اس سے قوت ارادی بیدار ہوتی ہے۔ وہ آدمی کے عملی جذبہ کو بڑھاتی ہے۔ اس طرح آدمی مزید اضافہ کے ساتھ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

اس دنیا میں ایک چیز کو پانے کے لیے دوسری چیز کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہاں آدمی اپنی ایک خواہش کی تکمیل اس وقت کر پاتا ہے جبکہ وہ اپنی ایک اور خواہش کو اس کی خاطر چھوڑ دے۔

علم کی طلب

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ——— اچھا سوال کرنا آدھا علم ہے (حسن السوال نصف العلم) ادب الدنیا والدین للبصری، صفحہ ۱۱۱

اچھا یا گہرا سوال کون کرتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے، جس کی بابت وہ سوال کر رہا ہے۔ مسئلہ کے بارہ میں اچھی واقفیت کے بغیر کوئی اچھا سوال نہیں کر سکتا۔ اچھا سوال اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی علم کے نصف حصہ کو پا چکا ہے، اور اب جواب دینے والے کا کام یہ ہے کہ وہ بقیہ نصف کے بارہ میں بتا کر اس کی واقفیت کو مکمل کر دے۔

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کے پاس علم کا جو ذخیرہ ہے۔ اس کو اپنے لیے حاصل کریں تو سب سے پہلے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرنا ہوگا۔ اپنی علمی استعداد کو بڑھانے کے بعد ہی آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے سے واقعی استفادہ کر سکے۔ یا کسی کی لکھی ہوئی کتاب کو پڑھ کر اس کی معلومات کو اپنے ذہن میں اتار سکے۔

سوال اور جواب یا سیکھنا اور سکھانا یہ یک طرفہ عمل نہیں ہے بلکہ وہ دوطرفہ عمل ہے۔ یعنی سوال کرنے والا یا سیکھنے والا ذہنی طور پر جتنا زیادہ تیار ہو اتنا ہی زیادہ وہ جواب دینے والے یا سکھانے والے کی بات کو سمجھے گا اور اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ یعنی اگر آپ کے پاس علم کا نصف حصہ موجود ہو تو اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ دوسرا شخص آپ کو علم کا بقیہ نصف حصہ دے سکے۔ یہ دوطرفہ معاملہ ہے نہ کہ یک طرفہ معاملہ۔

دنیا علم سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا ایک دریا اہل علم اور اہلِ دانش لوگ ہیں۔ اس کا دوسرا دریا وہ کتابیں ہیں جو دنیا کے بہترین دماغوں نے لکھی ہیں اور وہ چھپ کر کتب خانوں میں اکٹھا ہو گئی ہیں۔ اس کا تیسرا ذریعہ ہمارے سامنے پھیلی ہوئی کائنات ہے، اس کا ہر جزء اپنے اندر معرفت کا ایک چھپا ہوا خزانہ لیے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم کا طالب ہو وہ کسی بھی لمحہ کسی بھی مقام پر اپنے لیے علم کا ایک کھلا ہوا خزانہ پا لے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی حقیقی معنوں میں علم کا طالب ہو، وہ اپنے اندر پانے کا استحقاق پیدا کر چکا ہو۔

نصیحت پذیری

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ——— سعادت مند وہ ہے جو اپنے سوا دوسرے سے نصیحت حاصل کرے (السعیدُ مَن وُعظ بغیرہ) ادب الدنیا والدین طہری، صفحہ ۵۱

نصیحت حاصل کرنے کا تعلق نصیحت پسند مزاج سے ہے۔ کوئی آدمی جتنا زیادہ نصیحت کو قبول کرنے کا مزاج اپنے اندر رکھتا ہو اتنا ہی زیادہ وہ نصیحت حاصل کرے گا۔ خود اپنے اندر نصیحت پسندی کا مزاج نہ ہو تو وہ کچھ بھی نصیحت نہ حاصل کر سکے گا، خواہ وہ نصیحتوں کے ڈھیر کے درمیان زندگی گزار رہا ہو۔

جس آدمی کے اندر نصیحت لینے کا مزاج بیدار ہو گیا ہو، وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی اس کو بتائے تب اس کو نصیحت ملے۔ بلکہ وہ دوسروں کو دیکھ کر ان سے نصیحت پکڑتا رہتا ہے۔ وہ کسی کو اچھا کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اپنے آپ اس کے اندر اس کی پیروی کا شوق پیدا ہوتا ہے اور وہ خود بھی ویسا ہی کرنے لگتا ہے حتی کہ اگر کوئی شخص اس کے سامنے غلط بات بولے یا غلط کام کرے تو ایسا واقعہ بھی اس کے لیے نصیحت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ اس کو سن کر یا دیکھ کر چوکنا ہو جاتا ہے اور اپنے اندر یہ عزم کر لیتا ہے کہ وہ کبھی ایسی بات نہیں بولے گا اور نہ کبھی ایسا کام کرے گا۔

اس معاملہ میں انسان کی مثال بارش جیسی ہے۔ کسی میدان میں بارش ہو تو وہ چٹانوں پر بھی گرتی ہے اور کھیت کی زرخیز زمینوں پر بھی۔ لیکن چٹان کے اوپر گرنے والا پانی اوپر اوپر بہہ جاتا ہے وہ اس کے اندر داخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس کھلی زمین میں جو پانی گرتا ہے وہ اس کے اندر جذب ہو جاتا ہے اور ہری بھری فصل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

کوئی آدمی بھی کامل نہیں۔ ہر آدمی کی ضرورت ہے کہ اس کو نصیحت ملے تاکہ وہ اپنی اصلاح کرکے اپنی شخصیت کو مکمل کر سکے۔ لیکن یہ عمل نصیحت پذیر ذہن کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ سعادت مند شخص وہ ہے جو اپنے ذہن کو نصیحت سننے اور نصیحت قبول کرنے کے لیے کھلا رکھے۔ کوئی نفسیاتی پیچیدگی اس کے لیے نصیحت کو قبول کرنے میں رکاوٹ نہ بنے۔ وہ ہر حال میں نصیحت سے فائدہ اٹھائے، حتی کہ اس کی نصیحت پذیری اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ وہ بگڑے ہوئے لوگوں سے بھی اصلاح کا سبق حاصل کر لے۔

نصیحت اگرچہ دوسرے سے ملتی ہے لیکن وہ آدمی کا اپنا معاملہ ہے، وہ ہر آدمی کی خود اپنی ضرورت ہے۔

دانش مندی

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— دانش مند سے رہ نمائی حاصل کرو تم راہ یاب ہوگے اور اس کے خلاف نہ کرو ورنہ تم پشیمان ہوگے (استرشدوا العاقل ترشدوا ولا تعصوہ فتندموا) ادب الدنیا والدین للبصری صفحہ ۲۷۵

انسان سب یکساں نہیں ہوتے۔ کسی کے پاس علم کم ہوتا ہے اور کسی کے پاس علم زیادہ، کوئی زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے اور کوئی کم تجربہ کار۔ اسی طرح کوئی شخص فطری طور پر زیادہ سوجھ بوجھ والا ہوتا ہے اور کوئی کم سوجھ بوجھ والا۔ یہ فرق اس لیے ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھائیں۔ ایک آدمی اگر اپنے اندر کمی پائے تو وہ دوسرے کے ذریعہ اپنی اس کمی کو پورا کرے۔

یہ فطرت کا نظام ہے اور جو چیز خود فطرت کے نظام سے تعلق رکھتی ہو، اس سے موافقت کرکے ہی آدمی کامیاب ہوتا ہے۔ فطرت کے نظام کی خلاف ورزی کرنے کا انجام تباہی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو جانے اور اسی کے ساتھ وہ دوسرے سے بھی واقفیت رکھتا ہو جو آدمی اس طرح بے لاگ طور پر اپنے آپ کو اور دوسرے کو جانے گا اس کا مزاج یہی ہوگا کہ ہر موقع پر وہ ان لوگوں سے رہنمائی حاصل کرے گا جو اس سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے ہیں یا علم اور تجربہ میں اس سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور ایسے لوگوں سے اس کو جو رہ نمائی ملے گی اس کو وہ کھلے دل سے قبول کرلے کیونکہ وہ جانے گا کہ ایسے موقع پر کوئی اور عمل کرنا اس کو تباہی کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔

کوئی آدمی جب دانش مند کی بات کو نہیں مانتا تو وہ کیوں ایسا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے معاملہ کو اپنے لیے ساکھ کا مسئلہ بنالیتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے دوسرے کی بات مان لی تو میں اس کے مقابلہ میں نیچا ہو جاؤں گا۔ مگر اس طرح کی سوچ سراسر نادانی کی سوچ ہے، اس طرح کے معاملہ کو ساکھ یا عزت نفس کا مسئلہ بنانا اپنی کامیابی اور ترقی کے دروازہ کو خود اپنے ہاتھوں سے بند کرلینا ہے۔ دانش مند کی بات کو نہ ماننا بظاہر دوسرے کی بات کو نہ ماننا ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ خود اپنا انکار ہے۔ آدمی جب کسی دوسرے کی ایک سچی بات کو نہیں مانتا تو وہ گویا خود اپنی فطرت اور اپنے ضمیر کو رد کر رہا ہے، یہ بلاشبہ سب سے بڑا نقصان ہے۔

انجام کا لحاظ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ —— جب تم کسی کام کا قصد رو تو پہلے اس کے انجام کے بارہ میں سوچو، اگر وہ درست ہو تو اس کو کرو اور اگر وہ درست نہ ہو تو ں سے رک جاؤ (اذا هممت بامر فتفكر في عاقبته، فان كان رشداً فامضه وان كان غياً انته عنه) ادب الدنيا والدين، صفحہ ٥٦٢

کائنات میں صرف خدا کی ہستی ایک ایسی ہستی ہے جس کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ کوئی فعل کرے ر اسے اس کے برے انجام کا کوئی خوف نہ ہو (ولا يخاف عقباها) جہاں تک انسان کا تعلق ہے وہ ایک حدود اور بے زور مخلوق ہے۔ اس کے لیے ایسی کارروائی ممکن نہیں جس میں اس کے انجام پر غور نہ کیا یا ہو، اور اگر کوئی شخص ایسی کارروائی کرے تو اس کا برا نتیجہ سب سے زیادہ اسی کو بھگتنا پڑے گا۔

انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں اس کے جیسے دوسرے بہت سے انسان ہیں۔ ان میں سے ر ایک اپنے اپنے اغراض کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اسی کے ساتھ مختلف قسم کی مادی طاقتیں ہیں جو خود اپنے انون کے تحت عمل کر رہی ہیں۔ اس طرح گویا انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں اس کو مخالفین سے ھرے ہوئے ماحول میں اپنے مقصد کے لیے عمل کرنا ہے۔

ایسی حالت میں انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ آدمی کوئی عمل وع کرنے سے پہلے اس کے ہر پہلو پر غور کرے، وہ ایک طرف اپنی طاقت کا اندازہ کرے اور دوسری اف بے لاگ طور پر یہ دیکھے کہ خارجی دنیا میں کتنے اسباب اس کے موافق ہیں اور کتنے اسباب اس کے ئالف۔ آدمی کو چاہیے کہ اس طرح کے گہرے جائزہ کے بعد وہ اپنے عمل کا منصوبہ بنائے۔

اگر آپ ایسا کریں کہ حالات کے گہرے جائزہ کے بغیر اپنی کارروائی شروع کر دیں تو عین ممکن ہے کہ پ کا عمل الٹا نتیجہ پیدا کرے۔ نہ صرف یہ کہ آپ کو متوقع فائدہ حاصل نہ ہو بلکہ اقدام سے پہلے آپ کو جو کچھ اصل تھا وہ بھی غلط اقدام کے نتیجہ میں تباہ ہو جائے۔ اس طرح کا انجام بھگتنے کے بعد اگر آپ اس کا ہدار دوسروں کو ٹھہرائیں تو یہ ایک غلطی پر دوسری غلطی کا اضافہ ہوگا۔ اس لیے کہ آپ کو جو نقصان ہوا وہ ود آپ کی غلطی کی قیمت تھی جو حالات نے بے رحمانہ طور پر آپ سے وصول کی۔

عقل مند کون

اسلام کے دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق ؓ نے کہا کہ —— عقل مند وہ نہیں ہے جو خیر اور شر کو جانے بلکہ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے خیر کون سا ہے (لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین) العبقریات الاسلامیہ للعقاد، صفحہ ۵۵

زندگی کا معاملہ بے حد نازک معاملہ ہے۔ یہاں ہر انسان کو آزادی ہے۔ ہر انسان اپنی اپنی دوڑ دوڑ رہا ہے۔ ہر انسان اپنے مقصد کے حصول میں مصروف ہے۔ اس لیے یہاں کسی کو بھی اپنے عمل کے لیے کھلا میدان نہیں ملتا۔ ہر ایک کو بھری ہوئی سڑک پر اپنا راستہ طے کرنا ہوتا ہے۔ اس صورت حال نے اس کو ناممکن بنا دیا ہے کہ آدمی اپنی خواہش کے مطابق اپنے لیے کامل معنوں میں ایک معیاری دنیا کو پالے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی آدمی کے لیے جو انتخاب ہے وہ خیر اور شر کے درمیان نہیں۔ بلکہ اس میں ہے کہ دو شر میں سے کمتر شر کون سا ہے۔ اس دنیا میں کمتر شر پر راضی ہونا دانش مندی اور کمتر شر پر راضی نہ ہو کر خیر کامل کے لیے دوڑنا بے دانشی، کیوں کہ ایسا خیر اس دنیا میں کسی کو ملنے والا ہی نہیں۔

کمتر شر پر راضی ہونے والا اپنے لیے عمل کا آغاز پالیتا ہے۔ اس کا تعمیری عمل فوراً ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ کمتر شر پر راضی نہ ہوں وہ غیر ضروری طور پر اس سے لڑ جائیں گے۔ صرف اس لیے کہ ایک کمتر شر کو ہٹا کر دوبارہ دوسرے کمتر شر کو اپنے اوپر مسلط کر لیں اور مزید اس نقصان کو بھگتیں کہ تعمیر کے لیے عمل کرنے کے جو مواقع انھیں حاصل تھے وہ استعمال ہوئے بغیر رہ گئے۔

جو آدمی حقیقت کا گہرا شعور رکھتا ہو وہ یہی کرے گا کہ کمتر شر پر راضی ہو کر اپنی قوتوں کو مثبت تعمیر کے میدان میں لگا دے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ گہری سوجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں وہ خیر کامل کے حصول کے نام پر بے معنی لڑائی چھیڑ دیں گے اور جب اس کا یہ انجام سامنے آئے گا کہ ملے ہوئے مواقع بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے تو وہ اپنے مفروضہ دشمنوں کی مذمت کرنے لگیں گے۔ حالانکہ جو نقصان انھیں پیش آیا ہوگا وہ خود ان کی نادانی کا نتیجہ ہوگا نہ کہ کسی دوسرے کی ظلم و زیادتی کا نتیجہ۔

ملے ہوئے پر راضی ہونا آدمی کے لیے ترقی کا دروازہ کھولتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو جان لیں وہی اس قابل ہیں کہ انھیں دانش مند کہا جائے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فیصد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فیصد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18

تذکیر القرآن

نئی طباعت
ایک جلد میں مکمل

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

نصف رعایت

ھدیہ : ۴۰۰ روپے
باریک کاغذ پر ایک جلد میں مکمل، ۱۶۰۰ صفحات
مساجد اور لائبریری وغیرہ میں تقسیم کرنے کے لیے
نصف رعایت کے ساتھ صرف ۲۰۰ روپے میں دستیاب ہے
کم از کم ۵ کاپیاں منگوانے پر ڈاک خرچ ادارہ کے ذمہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121 766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi

جولائی ۱۹۹۸، شمارہ ۲۶۰

فہرست — صفحہ

النبأ العظیم

قرآن کی سورۃ نمبر ۷۸ اس طرح شروع ہوتی ہے: لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ رہے ہیں، اُس بڑی خبر کے بارے میں، جس میں لوگ مختلف ہیں۔ ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے۔ ہرگز نہیں عنقریب وہ جان لیں گے (النبا ۱-۵)

اس آیت میں النبأ العظیم یا بڑی خبر (great news) سے مراد قیامت کی خبر ہے۔ یعنی وہ وقت جب صور پھونک دیا جائے گا اور قیامت کا عظیم دن لوگوں کے اوپر پھٹ پڑے گا۔ آج لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہر آدمی مختلف انداز میں اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ لیکن جب قیامت کی بڑی خبر واقعہ بنے گی ہر قسم کا اختلاف ختم ہو جائے گا۔ تمام لوگ ایک ہی بات سوچیں گے، تمام لوگ ایک ہی بات بول رہے ہوں گے۔ ایک بڑی خبر تمام چھوٹی خبروں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

اس معاملہ کا ایک چھوٹا سا نمونہ مئی ۱۹۹۸ میں سامنے آیا۔ ۱۱ مئی اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ کو انڈیا کی حکومت نے راجستھان میں پانچ زیر زمین ایٹمی دھماکے کئے۔ یہ دھماکے ہیروشیما اور ناگاساکی (۱۹۴۵) میں گرائے جانے والے ایٹم بموں سے بہت زیادہ طاقتور تھے۔ یہ واقعہ پیش آتے ہی سارے ملک کے لئے سب سے بڑی خبر بن گیا۔ عالمی میڈیا جس میں اس سے پہلے انڈیا کا ذکر بہت کم ہوتا تھا اس میں اب انڈیا ہی سب سے بڑی خبر کے طور پر چھا گیا۔ چند دن کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک بڑی خبر نے تمام چھوٹی خبروں کو نگل لیا ہو۔

یہ واقعہ گویا قیامت کی ایک اطلاع ہے۔ آج ہر آدمی اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ ہر زبان پر الگ الگ باتوں کا چرچا ہے۔ کوئی آدمی نہ چپ ہونے کے لئے تیار ہے اور نہ دوسرے کی بات ماننے کے لئے آمادہ۔ لیکن جب قیامت کی بڑی خبر کا اعلان ہوگا تو اچانک ساری صورت حال بدل جائے گی۔ لوگ دوسری باتوں کو بھول کر ایک ہی بڑی بات کے بارے میں سوچیں گے، وہ یہ کہ قیامت کی ہولناکی سے کس طرح آپ کو بچائیں۔ ایک بڑی خبر تمام چھوٹی خبروں پر چھا جاتی ہے، ایک بڑی خبر تمام چھوٹی خبروں کو مٹا دیتی ہے۔ یہ بات دنیا کے بارے میں بھی درست ہے اور آخرت کے بارے میں بھی مزید اضافہ کے ساتھ درست ہے۔

قیادت کا معیار

قرآن (المائدہ ۳) میں بتایا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم لوگ انسانوں سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو (فلا تخشوھم واخشون) قرآن کی یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اس دنیا میں مسلمانوں کے لئے اصل مسئلہ خشیت انسانی کا نہیں ہے بلکہ خشیت خداوندی کا ہے۔ بظاہر اگر انسانوں کی طرف سے کوئی خطرہ آتا ہوا دکھائی دے تب بھی انہیں خدا ہی کی طرف دوڑنا چاہئے۔ کیونکہ تمام معاملات کا سرا خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی ان کا فیصلہ کسی کے موافق یا کسی کے خلاف کرنے والا ہے۔

قرآن کے اس بیان سے قیادت کا معیار معلوم ہوتا ہے۔ یہی وہ معیار ہے جو یہ طے کرتا ہے کہ کون سی قیادت اسلامی قیادت ہے اور کون سی قیادت جاہلی قیادت۔ جو قائد لوگوں کو اللہ سے ڈرائے، جو ففروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین (الذاریات ۵۰) کی زبان میں کلام کرے، وہ اسلامی قائد ہے۔ یہی وہ قائد ہے جس کی سرگرمیاں دین اور اہل دین کے لئے خیر کا باعث ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس دوسرا قائد وہ ہے جو لوگوں کو انسانی خطروں سے ڈرائے۔ جس کی تحریروں اور تقریروں کا خلاصہ یہ ہو کہ وہ انسانی سازشوں کا انکشاف کر کے لوگوں کو ان کے خلاف لڑنے کے لئے ابھارتا ہو۔ اس قسم کی قیادت بلاشبہ جاہلی قیادت ہے۔ اس سے دین اور اہل دین کے لئے کوئی خیر برآمد ہونے والا نہیں۔

ایسے جاہلی قائدین کے مقابلہ میں اہل اسلام کا رویہ وہ ہونا چاہئے جو قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے ------ جن سے کہنے والوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے خلاف اسباب اکٹھا کر لئے ہیں ان سے ڈرو۔ لیکن اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے (آل عمران ۱۷۳)۔

جاہلی قائدین ایک فتنہ ہیں۔ اس لئے وہ کبھی دنیا سے ختم نہ ہوں گے۔ کامیاب وہ ہے جو ان کی جاہلی باتوں کے فریب میں نہ آئے اور خشیت الٰہی کی بنیاد پر اپنے فکر و عمل کی تعمیر کرے۔

وحدتِ انسانیت

۵ اپریل ۱۹۹۸ کو میں رشی کیش میں تھا۔ اس وقت یہاں ایک پروگرام کے تحت مختلف ملکوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر ایک مجلس میں چند تعلیم یافتہ ہندوؤں سے ایک مفید گفتگو ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ انسانی سماج میں باہمی رواداری (ٹالرنس) اور احترام (رسپکٹ) کا ماحول کس طرح پیدا کیا جائے۔ انھوں نے اس کا حل یہ بتایا کہ لوگوں کے اندر وحدت حقیقت (oneness of reality) کا عقیدہ بٹھایا جائے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ سچائی ایک ہے مگر اس کے راستے مختلف ہیں۔ آدمی جس مذہبی طریقہ پر بھی چلے، آخرکار وہ خدا تک پہنچ جائے گا۔

یہ ایک قدیم نظریہ ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے جو دلیلیں دی جاتی ہیں سب کی سب تمثیل پر مبنی ہیں۔ مثلاً مذکورہ مجلس میں ایک ہندو اسکالر نے کہا کہ اگر آپ ایک پہاڑی کے نیچے کھڑے ہوں تو وہاں آپ کو ایک ہی راستہ دکھائی دے گا جو پہاڑی کے اوپر جا رہا ہوگا۔ لیکن اگر آپ پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ جائیں اور اس کے چاروں طرف دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ پہاڑ کے ہر طرف راستے ہیں اور وہ سب الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہی بلندی پر پہنچ رہے ہیں۔

اس قسم کی تمثیل علمی اعتبار سے کوئی وزن نہیں رکھتی اس کو نہایت آسانی کے ساتھ دوسری تمثیل سے رد کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بمبئی یا دہلی جیسے ریلوے اسٹیشن پر کوئی شخص کھڑا ہو تو اس کو سیکڑوں گاڑیاں چلتی ہوئی نظر آئیں گی مگر یہ سمجھنا یقینی طور پر درست نہ ہوگا کہ ان میں سے ہر گاڑی ایک ہی آخری اسٹیشن کی طرف جا رہی ہے۔ مذکورہ تمثیل میں تمام راستے اگر ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہیں تو اس قسم کی دوسری تمثیل میں ہر راستہ الگ الگ منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی سماج میں احترام اور رواداری کا ماحول پیدا کرنے کے مسئلہ سے مذکورہ نظریہ کا کوئی تعلق نہیں حتیٰ کہ اگر تمام لوگ اس عقیدہ کو مان لیں تب بھی وہ مطلوب سماجی مقصد کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ایک مذہب کو ماننے والے گروہ کے درمیان باہمی طور پر ہر زمانہ میں لڑائیاں جاری رہی ہیں اور آج بھی جاری ہیں۔ پھر جو نظریۂ اتحاد ایک مذہب کے

درمیان کارآمد نہ ہوسکا، وہ مختلف مذاہب کے درمیان کس طرح کارآمد بن جائے گا۔

"وحدتِ دین سماجی اتحاد پیدا کرتا ہے" ---- یہ نظریہ بظاہر یہ فرض کرتا ہے کہ 'وحدت دین' کے اصول کو ابھی تک عمل میں نہیں لایا گیا ہے، اب اس کا عملی تجربہ کرنا ہے۔ حالانکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نہایت اعلیٰ سطح پر اس نظریہ کا تجربہ کیا گیا مگر وہ سراسر ناکام ثابت ہوا۔ شہنشاہ اکبر کی حکومتی طاقت، ڈاکٹر بھگوان داس کا انسائیکلوپیڈیائی علم اور مہاتما گاندھی کی مقبول لیڈرشپ، اس قسم کے بہت سے نام ہیں جو اس ناکام تجربہ میں نمایاں طور پر شامل ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج ہمارے سامنے جو اصل مسئلہ ہے وہ وحدت دین کے نظریہ کے تجربہ کا نہیں ہے بلکہ اس کے لمبے تجربہ کے باوجود مطلوب نتیجہ نہ نکلنے کا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو چیز مفقود ہے وہ نظریہ کی موجودگی نہیں ہے بلکہ نظریہ کے موجود ہوتے ہوئے نتیجہ کا حاصل نہ ہونا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں اس نظریہ کے سوا ایک اور حل تلاش کرنا ہے نہ کہ اسی ناکام تجربہ کو مزید دہرانا۔

اس معاملہ میں زیادہ صحیح اور قابل عمل نقطۂ نظر وہ ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ اس معاملہ میں قرآن نے جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان نفس واحدہ سے پیدا کیے گئے ہیں (النساء-۱) یعنی تمام انسانوں کی اصل ایک ہے۔ تمام انسان ایک ہی جوڑے کی اولاد ہیں۔ اس لحاظ سے تمام انسان آپس میں بہن بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب کے سب آپس میں بلڈ سسٹرز اور بلڈ برادرز ہیں۔

اس تصور کے مطابق، سماج میں اتحاد و احترام کا ماحول پیدا کرنے کی بنیاد وحدت انسانیت ہے۔ یعنی یہ کہ تمام لوگ اس حقیقت کو مانیں کہ ظاہری اختلاف کے باوجود سب کے سب اصل ایک انسانی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے اعتبارات سے بظاہر مختلف ہونے کے باوجود وہ انسانی اعتبار سے ایک ہیں۔

سماج میں اتحاد و احترام کی فضا پیدا کرنے کے لیے یہی واحد فارمولا ہے جو قابلِ عمل ہے اور اسی کے ساتھ فطرت کے مطابق بھی۔

نکاح کا معاملہ

عام طور پر مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی (نکاح میری سنت سے ہے، پس جو شخص میری سنت سے انحراف کرے تو وہ مجھ سے نہیں) یہ پورا جملہ اس صورت میں حدیث نہیں ہے۔ ابن ماجہ (کتاب النکاح) کی روایت کے مطابق، حدیث کے اصل الفاظ صرف یہ ہیں: النکاح من سنتی۔

البتہ ایک اور روایت میں بقیہ الفاظ آئے ہیں۔ ایک تفصیلی روایت میں آیا ہے کہ تین صحابیؓ نے آپ کی عبادات کے بارے میں حضرت عائشہ سے پوچھا۔ حضرت عائشہ نے آپ کی عبادات کے بارے میں جو بتایا وہ انہیں کم دکھائی دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ کے برابر نہیں اس لئے ہمیں زیادہ عمل کرنا چاہئے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ کے لئے ازدواجی زندگی کو ترک کر دوں گا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔ لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور عورتوں سے ازدواجی تعلق بھی قائم کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔ (فتح الباری ۹/۶)

جیسا کہ متن سے واضح ہے، حدیث میں فمن رعب عن سنتي کا تعلق تمام شرعی اعمال سے ہے نہ کہ مخصوص طور پر نکاح سے۔ دوسری بات یہ کہ اس حدیث کا تعلق سادہ طور پر صرف نکاح نہ کرنے سے نہیں ہے۔ بلکہ اعتقادی طور پر نکاح کو قابل ترک سمجھنے سے ہے۔ (فتح الباری ۹/۸)

اصل یہ ہے کہ نکاح کی حیثیت نماز کی طرح کسی لازمی فریضہ کی نہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ جو شخص نکاح نہ کرے وہ تارک صلاۃ کی طرح گنہگار ہو جائے۔ یا اس کا ایمان مکمل نہ ہو۔ اس معاملہ میں اصل مطلوب چیز باعفت زندگی ہے نہ کہ ہر حال میں اور لازمی طور پر نکاح کرنا۔ کوئی گروہ اگر اجتماعی طور پر نکاح کا طریقہ چھوڑ دے تو یہ یقیناً درست نہ ہوگا کیوں کہ ایسی صورت میں بقاء نسل خطرہ میں پڑ جائے گی۔ لیکن اگر

انفرادی طور پر کوئی شخص اپنے حالات کے اعتبار سے نکاح نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو ایسا کرنا اس کے لئے عین جائز ہوگا، بشرطیکہ وہ اپنی عفت کو محفوظ رکھے۔

تاریخ میں بہت سی ایسی دینی شخصیتیں پائی جاتی ہیں جنہوں نے نکاح نہیں کیا اور پوری زندگی غیر ازدواجی حالت میں گذار دی۔ پیغمبروں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کی ایک مثال ہیں۔ امت محمدی میں بھی کئی ایسے ممتاز بزرگ پائے جاتے ہیں جنہوں نے ساری عمر نکاح نہیں کیا، مثال کے طور پر امام نووی (وفات ۶۷۶) اور امام ابن تیمیہ (وفات ۷۲۸)۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں سید جمال الدین افغانی، وغیرہ۔ اگر نکاح مطلق طور پر مطلوب ہوتا اور نکاح سے اعراض دین سے اعراض کے ہم معنی ہوتا تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ مذکورہ قسم کی شخصیتیں نکاح کے بغیر زندگی گذاریں اور اسی حال میں دنیا سے چلی جائیں۔

فقہ کی زبان میں، نکاح حسن لذاتہ نہیں ہے بلکہ حسن لغیرہ ہے۔ یعنی وہ بذات خود مطلوب نہیں ہے بلکہ ایک اور ضرورت کے تحت مطلوب ہے اور وہ بقاء نسل ہے۔ چونکہ مرد اور عورت کے درمیان ازدواجی تعلق کے بغیر نسل انسانی کا باقی رہنا ممکن نہیں اس لئے نکاح کی حیثیت ایک اجتماعی فریضہ کی ہے۔ لیکن وہ ہر فرد پر لازم نہیں۔ کوئی فرد اگر اپنے ذاتی مصالح کی بنا پر غیر ازدواجی زندگی گذارنے کا فیصلہ کرے تو ایسا کرنا اس کے لئے عین جائز ہوگا۔ ایسی حالت میں شریعت اس سے پاکدامنی کا تقاضا کرے گی نہ کہ جبری ازدواج کا۔

نکاح کی دینی اہمیت اصلاً اس اعتبار سے ہے کہ وہ بقاء نسل کے مقصد کو حاصل کرنے کا جائز طریقہ ہے۔ مرد اور عورت اگر نکاح کے بغیر باہم ملیں تو اس کے ذریعہ سے بھی نسل انسانی کا سلسلہ باقی رہ سکتا ہے۔ مگر یہ طریقہ اسلام میں قطعی طور پر حرام ہے۔ اسلام میں بقاء نسل مطلوب ہے مگر یہ بقاء نسل نکاح کی صورت میں ہونا چاہئے نہ کہ اس کے بغیر۔

بعض افراد ایسے ہو سکتے ہیں جو یہ محسوس کریں کہ اگر وہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے اپنے کو آزاد رکھیں تو وہ عفیف بھی رہیں گے اور اسی کے ساتھ اعلیٰ انسانی مقاصد کے لئے زیادہ خدمات انجام دے سکیں گے۔ ان افراد کے لئے ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مخصوص حالات میں باعث ثواب بھی ہے۔

حکمت حیات

مشین، مثلاً گھڑی کے اندر دندانہ دار پہیہ (cog wheel) ہوتا ہے۔ ایک پہیہ کے چلنے سے دوسرا پہیہ چلتا ہے۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک پہیہ ساتھ نہ دے تو نہ کانٹا نہیں چلے گا اور نہ مشین حرکت میں آئے گی۔

یہی معاملہ موجودہ دنیا میں انسانی منصوبوں کا بھی ہے۔ یہاں بھی دو کاگ ہیں اور زندگی کے نظام کا چلنا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ دونوں کاگ ایک دوسرے سے مل کر چل رہے ہوں۔

اس دنیا میں ایک پہیہ انسان کا ہے اور دوسرا پہیہ خارجی حالات کا۔ یہاں آدمی اتنا ہی کر سکتا ہے جتنا کہ خارجی حالات اس کے لیے ہم آہنگ ہوں۔ ایسی حالت میں آدمی کی بہترین عقل مندی یہ ہے کہ وہ یہ جانے کہ حالات کے اعتبار سے وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔

یہاں ممکن کے دائرہ میں عمل کرنے والا مثبت نتیجہ حاصل کرے گا۔ اور جو شخص ناممکن کے دائرہ میں دوڑے اس کے حصہ میں آخر کار تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔ یہ اصول فرد کے لئے بھی درست ہے اور قوم کے لئے بھی درست۔

کسی شخص سے آپ کی نزاع ہو جائے تو ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہوتا کہ انصاف کے مطابق کیا ہونا چاہئے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقی صورت حال کے مطابق، عملی طور پر کیا ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے مواقع پر آپ کو چاہئے کہ آپ ممکن پر راضی ہو جائیں نہ کہ نظری انصاف کو لے کر بے فائدہ طور پر لڑتے رہیں جس کا نتیجہ مزید نقصان کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ یہاں بھی قومی لیڈروں کو یہ دیکھنا چاہئے کہ حقیقی حالات کے اعتبار سے کیا چیز قابل حصول ہے اور کیا چیز قابل حصول نہیں۔ موجودہ زمانہ میں اس کی ایک سبق آموز مثال یہ ہے کہ امریکہ سو سال سے بلا انقطاع ترقی کرتے کرتے دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور ملک بن گیا۔ دوسری طرف اسی دنیا میں روس کسی مستحکم ترقی سے محروم رہا۔ اسی طرح ہندستان اور پاکستان بڑے بڑے قیادتی ہنگاموں کے

باوجود کوئی حقیقی ترقی حاصل نہ کر سکے۔

میں نے تقریباً ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔ میں نے اس معاملہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک اس کا سبب وہی کاگ وہیل کا قانون ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔

امریکہ کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو اپنی جدید تاریخ کی ابتداہی سے ایسے لیڈر مل گئے جو نظریہ سازی کے فریب سے آزاد تھے۔ انہوں نے فطرت کے قوانین کو سمجھا اور اس کی مطابقت کرتے ہوئے اپنا قومی سفر طے کرنا شروع کیا۔

فطرت کا یہ اصول ایک لفظ میں صحت مند مقابلہ (healthy competition) ہے۔ انہوں نے ملک میں ہر ایک کو آزادی دے دی اور ہر ایک کے لئے یہ موقع کھول دیا کہ وہ مقابلہ و مسابقت کے میدان میں اپنی اہلیت کا ثبوت دے کر اپنی مطلوب ترقی حاصل کر سکے۔ انہوں نے حکومت کو لا اینڈ آرڈر (نظم و نسق) کے دائرہ تک محدود رکھا اور تمام لوگوں کو عمل کی کھلی آزادی دے دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں کے استعمال کا بے روک ٹوک موقع مل گیا۔

ایک لفظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ کے رہنماؤں نے کسی خود ساختہ نظریہ کو اصل قرار دے کر اس کے تحت اپنے سماج کو ڈھالنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ صرف یہ دیکھا کہ فطری طور پر کیا چیز قابل بقا (sustainable) ہے، اور جو چیز فطری طور پر قابل بقا تھی اس کو اختیار کر لیا۔

اس کے برعکس روس (سوویت یونین) میں یہ ہوا کہ کچھ نظریہ سازوں نے اپنے خود ساختہ تخیلات کو اصل قرار دے کر اس کے مطابق پورے سماج کو ڈھالنے کی کوشش کی اور جب سماج کی طرف سے مزاحمت ہوئی تو کروروں لوگوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح مار ڈالا۔ یہ اسکیم فطرت کے خلاف تھی، اس لئے پچھتر سالہ پرشور کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکی۔

یہی معاملہ ہندستان اور پاکستان میں پیش آیا۔ یہاں بھی کچھ رہنماؤں نے اپنے خود ساختہ نظریات کو اصل قرار دے دیا اور یہ چاہنے لگے کہ پورے ملک کو اسی ذاتی نظریہ کے تحت ڈھال دیں۔ یہ زبردستی کا نفاذ نظام بھی مکمل طور پر ناکام رہا۔ اور پچاس سال کی قیمتی مدت نہایت بیدردی کے ساتھ ضائع ہو گئی۔

ہندستان اور پاکستان کے رہنماؤں کو بھی یہی کرنا تھا کہ وہ اس اصول کو اختیار کرتے جس کو فطرت پانی کے معاملہ میں اختیار کرتی ہے۔ پانی جب پہاڑ کی چوٹی سے بہنا شروع ہوتا ہے تو فطرت اس کو خود اپنے کورس پر بہنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ قدرتی نشیب و فراز سے گزرتا ہوا سمندر تک پہنچ جاتا ہے۔

ہندستان اور پاکستان کے رہنماؤں کو بھی یہی کرنا تھا۔ وہ حقیقی حالات کو سمجھتے اور سماج کو فطرت کی شاہراہ پر آزادانہ چلنے دیتے۔ اس طرح اپنے آپ صحت مند مسابقت کا ماحول بنتا اور ہر ایک کی صلاحیتیں ظاہر ہو کر ترقیاتی عمل میں اپنا حصہ ادا کرتیں۔ مگر نظریاتی جنون نے زبردستی کی منطق پیدا کی اور زبردستی کی منطق نے ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

موجودہ دنیا میں کام کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ زندگی کو فطرت کی شاہراہ پر آزادانہ چلنے دیا جائے اور اگر کسی کے ذہن میں اپنا کوئی علاحدہ نقشہ ہے تو اس کو وہ ترغیب (persuasion) کے دائرہ میں محدود رکھتے ہوئے پرامن طور پر اس کی اشاعت کرے اور اس وقت کا انتظار کرے جب کہ لوگوں کی سوچ بدل جائے اور خود فطرت ہی کے قانون کے مطابق اس کا عملی قیام ممکن ہو جائے۔

سماجی نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں اصل قابل لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ کسی رہنما کے دماغ میں اس کا نظریاتی نقشہ کیا ہے۔ بلکہ اصل قابل لحاظ بات یہ ہے کہ عملی حالات کے لحاظ سے کیا چیز قابل حصول ہے۔ سماجی نظام کی تشکیل میں رہنما کا حصہ صرف پچاس فی صد ہے۔ بقیہ پچاس فی صد خارجی حالات کا ہے۔ رہنما اگر اس حقیقت کو نہ سمجھے اور اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ پورا ملک صد فی صد اس کے اپنے نام الاٹ ہو چکا ہے تو یہ دیوانگی کی حد تک ایک مہلک غلط فہمی ہوگی۔ اس غلط فہمی کے تحت وہ جو بھی کام کرے گا اس کا نتیجہ صرف تخریب ہوگا نہ کہ تعمیر۔

آئیڈیلسٹ بننا اچھا ہے۔ مگر عملی حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں آئیڈیل کا حصول ممکن نہیں اجتماعی زندگی میں کسی کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی فکری اعتبار سے آئیڈیلسٹ ہونے کے باوجود عملی اعتبار سے پریکٹیکل بن جائے۔

ایمان کا کرشمہ

ابن تیمیہ مشہور حنبلی عالم ہیں وہ شام میں ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ھ میں وفات پائی۔ ان کی قبر دمشق میں ہے۔ ان کی کتابوں کی تعداد تین سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔

اپنے غیر مقلدانہ خیالات کی وجہ سے وہ اکثر حکومت اور علماء کے عتاب کا شکار ہوئے۔ ان کو جلاوطنی اور قید کا سامنا کرنا پڑا ان کی وفات بھی دمشق کے قید خانہ میں ہوئی۔

انھوں نے اپنے بارے میں ایک بار کہا کہ : جنتی في صدري ان رحت فهي معي لاتفارقني إن حبسي خلوة وقتلي شهادة و اخراجي من بلدي سياحة - یعنی میری جنت میرے سینے میں ہے جب میں چلتا ہوں تو وہ میرے ساتھ ہوتی ہے وہ کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوتی۔ میری قید میرے لیے تنہائی ہے اور جلاوطنی میرے لیے سیاحت ہے۔ اگر کوئی مجھے قتل کر دے تو وہ بھی میرے لیے شہادت ہوگی۔

ایمان ایک فکری انقلاب ہے۔ وہ آدمی کے طرز فکر کو پوری طرح بدل دیتا ہے۔ اس تبدیلی کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ ایسا آدمی اپنے آپ میں جینے لگتا ہے۔ حق کی دریافت اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ دنیا کا کھونا اور دنیا کا پانا اس کے لیے ایک اضافی چیز بن جائے۔ ایسے آدمی کے لیے قید ایک ایسی تنہائی ہوتی ہے جہاں وہ زیادہ غور و فکر کا موقع پالے اگر اس کو اپنے وطن سے باہر نکلنا پڑے تو وہ اس کے لیے مطالعہ اور مشاہدہ میں توسیع کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اگر اس کو جان و مال کے نقصان سے دوچار ہونا پڑے تو وہ بھی اس کی روحانیت میں اضافہ کا سبب بن جاتا ہے۔

ایمان آدمی کی روحانیت کو جگاتا ہے، وہ اس کے اندر سوچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ایک صاحب ایمان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ مادی سہاروں سے اوپر اٹھ جائے، وہ ایک بلند تر ربانی سطح میں سانس لینے لگے ایسے آدمی کے لیے کوئی محرومی محرومی نہیں کیونکہ جو اعلیٰ حقیقت اس نے پائی ہے وہ اس وقت بھی بھرپور طور پر اس کو حاصل رہتی ہے۔ جب کہ بظاہر تمام دنیوی چیزیں اس سے چھن چکی ہوں وہ اس وقت بھی اپنے آپ کو خدائی جنت میں پاتا ہے جب کہ انسانوں نے اپنی بنائی ہوئی جنت سے اس کو باہر نکال دیا ہو۔

ایمان ایک طاقت ہے، بلکہ تمام طاقتوں سے زیادہ بڑی طاقت۔

سیکھنے کا مزاج

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضؓ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھتے تھے (کان یتعلّم من کل احد) اس معاملہ کی ایک مثال روایات میں اس طرح آئی ہے کہ ایک بار انھوں نے ایک صحابی سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے امیرالمومنین کیا آپ کبھی ایسے راستہ سے گزرے ہیں جس کے دونوں طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے پوچھا کہ پھر ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ میں نے اپنے دامن سمیٹ لیے اور بچتا ہوا نکل گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہی تقویٰ ہے (ذلك التقوىٰ)

حضرت عمر کا یہی طریقہ عام معاملات میں بھی تھا۔ وہ اونٹ والوں سے اونٹ کی بات پوچھتے تھے اور بکری والوں سے بکری کی بات۔ اسی طرح ان کو جو شخص بھی ملتا اس سے اسی کے میدان کی بات دریافت کرتے۔ اس طرح وہ ہر ایک سے اس کے معلومات کے دائرہ میں سوالات کرتے اور اس سے نئی نئی باتیں دریافت کرتے۔

موجودہ زمانہ میں اسی کو اسپرٹ آف انکوائری کہا جاتا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے اس کی بے حد اہمیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی لوگ زیادہ بڑے عالم بنتے ہیں جن کے اندر یہ متجسسانہ اسپرٹ موجود ہو۔ اس قسم کی اسپرٹ ہر ایک کے لیے انتہائی ضروری ہے، خواہ وہ ایک عام آدمی ہو یا کوئی اونچے سطح کا آدمی۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ سننے سے زیادہ سنانے کے شوقین ہوتے ہیں۔ مگر اس قسم کا مزاج علم کی ترقی میں ایک مستقل رکاوٹ ہے۔ ایسے لوگ کبھی زیادہ بڑی علمی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ جب آپ بولتے ہیں تو آپ وہیں رہتے ہیں جہاں کہ آپ ہیں۔ مگر جب آپ سنتے ہیں تو آپ اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ صحیح علمی مزاج یہ ہے کہ آدمی بولنے سے زیادہ سنے، وہ جب بھی کسی سے ملے تو سوالات کرکے اس سے معلومات لینے کی کوشش کرے۔

معلومات کا خزانہ ہر طرف اور ہر جگہ موجود ہے۔ مگر وہ صرف اس شخص کے حصہ میں آتا ہے جو اس کو لینے کے آداب کو جانتا ہو۔

فطرت کے خلاف

شری گرو گولوالکر آر ایس ایس کے دماغ سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے یکساں سول کوڈ کے تصور کی مکمل مخالفت کی ہے۔ ان کی یہ مخالفت مذہب کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ فطرت کی بنیاد پر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یکساں سول کوڈ سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک غیر فطری اسکیم ہے۔ انھوں نے کہا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے :

Nature abhors uniformity

اس بات کا تعلق صرف یکساں سول کوڈ سے نہیں ہے بلکہ پوری زندگی سے ہے۔ زندگی کا نظام پورا کا پورا فطرت کے اصولوں پر قائم ہے۔ یہ فطری اصول خود اپنے زور پر قائم ہیں اور وہ ابد تک قائم رہیں گے۔ کسی بھی شخص یا حکومت کے لیے صرف یہ موقع ہے کہ وہ فطرت سے موافقت کرے۔ وہ کسی بھی حال میں اس سے لڑ نہیں سکتا۔ فطرت سے لڑنا ایسا ہی ہے جیسے بھونچال سے لڑنا، اور کون ہے جو بھونچال سے لڑ کر کامیابی کی امید کر سکے۔

تاریخ میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو اقتدار مل گیا تو اس نے سمجھا کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اس بھرم کے تحت انھوں نے بڑے بڑے اقدامات شروع کر دیے۔ انھوں نے چاہا کہ زندگی کے مروجہ نقشہ کو توڑ کر خود اپنی پسند کے مطابق اس کا ایک نقشہ بنائیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی ہر طاقت کے حصہ میں صرف ناکامی آئی۔ فطرت کا نظام جس طرح پہلے قائم تھا اسی طرح وہ بعد کو بھی قائم رہا۔ چنگیز خان سے لے کر نادر خان تک، اور ہٹلر سے لے کر اسٹالن تک، اور پھر موجودہ زمانہ کے آمروں اور ڈکٹیٹروں تک ہر ایک اسی کا مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں پوری تاریخ انسانی میں کسی کا کوئی استثنار نہیں۔

انھیں فطری اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ اس دنیا میں امن کے لیے بقا ہے جنگ کے لیے بقا نہیں۔ یہاں عدل کو جماؤ ملتا ہے ظلم کو نہیں۔ یہاں تواضع کو جگہ ملتی ہے گھمنڈ کو نہیں۔ یہ دنیا فراخدلی کو قبول کرتی ہے تنگ نظری کو نہیں۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس قانون سے کسی کا ٹکرانا ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ پتھر کی چٹان سے اپنا سر ٹکرانے لگے۔

اظہارِ حق

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے : پس ابجمے رہو جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی جنھوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو بے شک وہ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے (ھود ۱۱۲-۱۱۳) نیز (بنی اسرائیل ۷۳-۷۴-۷۵)

سچا داعی اپنے مدعو کا آخری حد تک خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ حرص کی حد تک یہ چاہتا ہے کہ لوگ دین حق کو اختیار کر لیں ایک طرف داعی کا یہ جذبہ ہے اور دوسری طرف وہ یہ دیکھتا ہے کہ دعوت کو جب کھلے طور پر بیان کیا جائے تو لوگ اس سے بھڑکتے ہیں قریب ہونے کے بجائے وہ اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ داعی جب تنہا ایک خدا کی بڑائی بیان کرتا ہے تو یہ چیز ان لوگوں کو ناگوار ہوتی ہے جو خدا کے سوا کچھ اور لوگوں کی بڑائی اپنے سینے میں لیے ہوئے ہوں وہ جب برائی کی مذمت کرتا ہے تو اس کا یہ اسلوب ان لوگوں کو سخت ناگوار ہوتا ہے جو ان برائیوں میں ملوث ہوں۔

یہ صورت حال دیکھ کر داعی کبھی یہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ اپنے اسلوب میں کچھ اعتدال پیدا کرے وہ حق کی دعوت کو ایسے انداز میں بیان کرے جو لوگوں کو اس کے قریب لانے والا ہو۔

مگر اس قسم کا مصالحانہ انداز اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اللہ کے نزدیک اصل اہمیت اعلان حق کی ہے نہ کہ رعایتِ عوام کی۔ داعی اگر اپنے اسلوب دعوت میں اس قسم کا مصالحانہ انداز اختیار کرے تو اس کا یہ فائدہ تو ہو سکتا ہے کہ اس کی شخصی مقبولیت میں اضافہ ہو جائے۔ مگر یہ فائدہ اس نقصان کی قیمت پر ہو گا کہ حق غیر واضح ہو کر رہ جائے۔ اور اللہ کی نظر میں اصل اہمیت وضاحتِ حق کی ہے نہ کہ مقبولیت عوام کی۔

اگر مدعو پر یہی بات واضح نہ ہو کہ حق واقعۃً کیا ہے تو دعوتی عمل کا سرے سے کوئی فائدہ ہی نہیں۔

دو نمونے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس شخص کے سامنے بھی اسلام کو پیش کیا اس نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ تردد کا اظہار کیا۔ مگر ابوبکر کا معاملہ مختلف تھا۔ ان کے سامنے جب میں نے اسلام کی دعوت پیش کی تو انھوں نے کسی شبہ یا تردد کا اظہار نہیں کیا بلکہ فوراً ہی اسلام قبول کر لیا (حیاۃ الصحابہ ۱/۶۸) حضرت ابوبکر اپنی اسی صفت کی بنا پر الصدیق کہے گئے۔

اسلام کے دور اول کی تاریخ میں ایک نمونہ حضرت ابوبکر صدیق کا ہے۔ دوسرا نمونہ وہ ہے جو حضرت عمر فاروق کی زندگی میں ملتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، حضرت عمر نے پہلے اسلام کی سخت مخالفت کی اس کے بعد ایک وقت آیا جب کہ انھوں نے قرآن کے کچھ حصہ کو پڑھا اور اس پر غور کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے رویہ کو بدلنے کا فیصلہ کیا اور شرح صدر کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔

یہ دو علامتی نمونے ہیں۔ یہ دونوں رہنما نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حق کے معاملہ میں انسان کو ان دو میں سے کسی ایک کی مانند ہونا چاہیے۔ ان دو کے بعد کوئی تیسرا نمونہ مطلوب نمونہ نہیں۔

پہلے نمونہ کے مطابق، آدمی کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ گہرے غور و فکر کے ذریعہ اپنے ذہن کو اتنا پختہ بنائے کہ وہ خود ہی حقیقت کو اس کی گہرائی تک سمجھ جائے۔ وہ فکری اعتبار سے خود یہ اہلیت رکھتا ہو کہ شکوک و شبہات کے پردے کو پھاڑ سکے اور غیر متعلق بحثوں میں الجھے بغیر چیزوں کو ان کی اصل صورت میں دیکھ لے۔ یہ فکری پختگی کا اعلیٰ درجہ ہے اور حضرت ابوبکر صدیق اسی درجہ کی آخری تکمیلی مثال ہیں۔

دوسرے نمونہ کے مطابق، آدمی کو متعصبانہ فکر اور بے اعترافی سے آخری حد تک پاک ہونا چاہیے۔ اس کو نفسیاتی پیچیدگیوں سے اتنا زیادہ خالی ہونا چاہیے کہ جب بھی دلیل کی زبان میں اس کی کسی کوتاہی کی نشاندہی کی جائے تو وہ فی الفور اس سے باخبر ہو جائے اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنی غلطی کا اعتراف کر لے۔ حضرت عمر فاروق اس دوسرے نمونہ کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ نے ایک ایسا فیصلہ فرمایا جو درست نہ تھا اس کے بعد کسی شخص نے دلیل کی زبان میں اس کی وضاحت کی تو آپ نے فوراً ہی اس کو مان لیا اور شدت اعتراف کے تحت آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

لولا فلان لہلك عمر۔

اسلام تغیر پزیر دنیا میں

اسلام کا ظہور چودہ سو سال پہلے ہوا۔ پھر آج کی دنیا میں وہ کس طرح قابل عمل ہو سکتا ہے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ پھر اسلام جیسا ایک غیر متغیر دین بعد کے زمانہ کے لوگوں کو کس طرح رہنمائی دے سکتا ہے۔ ایک نہ بدلتی ہوئی حقیقت بدلتے ہوئے حالات سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔

یہ سوال تمام تر مفروضات پر قائم ہے۔ اس کے پیچھے غلط فہمی کے سوااو کچھ نہیں۔ اسلام نہ کلی معنوں میں غیر متغیر حقیقت ہے اور نہ زمانہ کلی معنوں میں متغیر حقیقت۔ اصل یہ ہے کہ اسلام فطرت کا ایک قانون ہے۔ اسلام کا ایک حصہ وہ ہے جو اسی طرح ابدی ہے جس طرح فطری حقیقتیں ابدی ہوتی ہیں۔ اسلام کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں بدلتے ہوئے حالات کی رعایت پہلے ہی سے موجود ہے۔

خود زمانہ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ زمانی حالات کی نوعیت بھی یہی ہے کہ اس میں کچھ چیزیں ابدی طور پر یکساں رہتی ہیں۔ مثلاً سورج سے روشنی لینااور ہوا سے آکسیجن حاصل کرنا۔ ان کے علاوہ کچھ چیزیں وہ ہیں جو ظاہری طور پر، نہ کہ حقیقی طور پر، بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً سواری یا طرز تعمیر وغیرہ۔ ان دوسرے قسم کے معاملات میں اسلام نے پیشگی طور پر ایسی رعایتیں اور گنجائشیں رکھ دی ہیں جو ہر بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہوں اور اس طرح اسلام ہمیشہ اپنی قابل عمل ہونے کی حیثیت کو بر قرار رکھے۔ یہاں اس مسئلہ کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ إن هذا الدين يسر (البخاری، کتاب الایمان) یعنی دین آسان ہے۔ اس مطلب یہ نہیں ہے کہ دین میں سب آسانی اور سہولت والے احکام ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین نظام ایسے فطری انداز میں بنایا گیا ہے کہ وہ ہر صورت حال میں قابل عمل رہے۔ اہل اسلام کا سفر حیات بھی کسی ایسے مرحلہ سے دوچار نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو بند گلی (impasse) میں محسوس کرنے لگیں۔

یہاں اس سلسلہ میں اسلام کے چند اصول درج کئے جاتے ہیں جن سے یہ بات بخوبی طور پر واضح ہے کہ حالات کی کوئی بھی تبدیلی اسلام کے لئے مسئلہ نہیں۔ ہر صورت حال میں اسلام اپنی فعالیت کو یک

طور پر باقی رکھتا ہے۔

۱۔ اسلام کے کچھ احکام وہ ہیں جو بنیادی احکام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اسی طرح ابدی ہیں جس طرح فطرت کے قوانین ابدی ہیں۔ اسلام کے اسی حصہ کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ "لا مبدل لکلمات اللہ (الانعام ۳۴) یعنی اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ اسلام کا وہ حصہ ہے جس میں عقیدہ، اخلاقی اقدار اور بنیادی اصول حیات شامل ہیں۔ یہ تعلیمات سب کی سب ابدی ہیں۔ حالات میں کوئی بھی تبدیلی ان کی قدر و قیمت کو بدلنے والی نہیں۔ مثلاً خدا کو ایک جاننا یا سچ بولنا یا تمام انسانوں کو خون شریک بھائی (blood brothers) سمجھنا وغیرہ۔

تاہم یہاں بھی حالات کی ایک رعایت پیشگی طور پر رکھ دی گئی ہے اور وہ قانون اضطرار ہے۔ اس قانون کے مطابق انسان بس اتنے ہی کا مکلف ہے جتنا اس کے بس میں ہو (البقرہ ۲۸۶) مثلاً اگر حالات کا شدید تقاضا ہو تو اجازت ہے کہ آدمی توحید کو صرف دل سے مانے، وہ زبان سے اس کا اعلان و اظہار نہ کرے۔ تکلیف بقدر وسع کا اصول ایک عام اصول ہے اور وہ عقیدہ سے لے کر عمل تک ہر چیز پر محیط ہے۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسرا اصول وہ ہے جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ **انتم اعلم بامور دنیاکم** (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵/۱۱۸) یعنی تم اپنے دنیا کے معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ یہ حدیث ابتدائی طور پر تأبیر نخل، بالفاظ دیگر، باغبانی (horticulture) کے بارے میں آئی ہے مگر توسیعی مفہوم کے اعتبار سے اس میں وہ تمام امور شامل ہو جاتے ہیں جن کا تعلق تعمیر دنیا سے ہے نہ کہ نجات آخرت سے۔ یہ اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم رہنما اصول ہے۔ اس نے نجات آخرت کے امور اور تعمیر دنیا کے امور کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اس کے مطابق، اہل اسلام کو اخروی نجات والے معاملات میں قرآن و سنت سے ہدایت لینا ہے۔ اور جو امور معاملات دنیا کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بارے میں اپنی تحقیق و ریسرچ کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہے۔ اس میں صنعت و زراعت کے تمام شعبے اور سائنس اور ٹکنالوجی کی تمام شاخیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اہل اسلام کو یہ آزادی مل جاتی ہے کہ کسی اعتقادی بندش کے بغیر خالص علمی ریسرچ کی روشنی میں اپنے معاملات کا انتظام و انصرام کرتے رہیں۔

ان معاملات میں اسلام صرف وہاں دخل دے گا جہاں کوئی بات صراحۃً اسلامی تعلیمات کے خلاف
۔ مثلاً ہوائی جہاز کی انڈسٹری کیسے قائم کی جائے اس میں اسلام کی طرف سے مکمل آزادی حاصل ہو گی۔
تہ اگر یہ سوال ہو کہ ہوائی جہاز کے مسافروں کو سافٹ ڈرنک دیا جائے یا شراب تو یہاں اسلام یہ کہے گا کہ
یں شراب کے بجائے سافٹ ڈرنک دینا چاہئے۔

۳۔ اس سلسلہ کی تیسری اہم تعلیم وہ ہے جو پیغمبر اسلام کے ایک اسوہ سے نکلتی ہے۔ مدنی دور میں
ب شخص (مسیلمہ) نے یہ اعلان کیا کہ میں بھی خدا کا پیغمبر ہوں اور مجھ کو محمد کے ساتھ پیغمبری میں شریک کیا
ا ہے (سیرت ابن ہشام ۴/۲۴۴)۔ اس مدعی نبوت کے دو سفیر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ
نے ان سے پوچھا کہ اس معاملہ میں تمہاری رائے کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جو ہمارے صاحب کی رائے ہے
ں ہماری رائے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ دستور نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہ کیا جائے تو میں تم دونوں کو
ل کر دیتا (سیرۃ ابن کثیر ۴/۹۸) یہ کہہ کر آپ نے انہیں واپس بھیج دیا۔

اس سے ایک اہم اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملات جو اپنی نوعیت میں بین اقوامی (انٹر نیشنل)
ں اور جن کے بارے میں واضح بین اقوامی روایات قائم ہو چکی ہوں ان میں اسلام کا بھی وہی اصول ہو گا جو
لف قوموں کے درمیان عالمی سطح پر مان لیا گیا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں عام طور پر جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج تھا چنانچہ اسلام
ں بھی ایک مدت تک وہ اسی طرح رائج رہا مگر اب چونکہ اس معاملہ میں عالمی دستور بدل چکا ہے اس لئے
ب اس پر عمل بھی نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ عراق-ایران جنگ ۸۸-۱۹۸۰ میں دونوں طرف ہزاروں کی
داد میں جنگی قیدی پکڑے گئے۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی غلام نہیں بنایا گیا۔ بلکہ ایک مدت تک قید میں
کھنے کے بعد تبادلہ کی بنیاد پر انہیں رہا کر دیا گیا۔

۴۔ کچھ امور وہ ہیں جن میں کچھ پہلو اتفاق کے ہوں، کچھ پہلو اختلاف کے۔ ایسے امور میں اسلام
موقف بالکل واضح ہے۔ حالات کے مطابق، اس طرح کے معاملات میں بقدر ضرورت ہم آہنگی کا طریقہ
ختیار کیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایسے مواقع پر آئیڈیل اپروچ کے بجائے پریکٹیکل اپروچ

اسلام کا طریقہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں سیکولرزم اور ڈیماکریسی اس کی واضح مثالیں ہیں۔ سیکولرزم کا مطلب ہے مذہب کو ذاتی دائرے میں رکھ کر بقیہ معاملات میں وہ طریقہ اختیار کرنا جس میں سماج کا مجموعی مفاد شامل ہو۔ مخصوص حالات میں اس کو اسلام میں بھی اختیار کیا جائے گا۔ اس کی ایک مثال خود پیغمبر کی زندگی میں مدنی دور کا ابتدائی نصف زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں مدینہ کی ابتدائی اسٹیٹ میں جو نظام اختیار کیا گیا وہ اپنے عملی ڈھانچہ کے اعتبار سے کم و بیش وہی تھا جس کو موجودہ زمانہ میں سیکولرزم کہا جاتا ہے۔

۵۔ ان سب کے باوجود ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ امور ایسے ہوں جن میں اسلام کا اور بدلی ہوئی دنیا کا اختلاف باقی رہے۔ ایسے معاملات کے لئے اسلام میں کیا ہدایت ہے اس کا جواب قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے کہ تم لوگوں کو نصیحت کرتے رہو، کیوں کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو، تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو (الغاشیہ)۔

اس سے یہ اصول ملتا ہے کہ اس قسم کے اختلافی امور میں دونوں فریقوں کے درمیان ڈائیلاگ ہوگا۔ اہل اسلام دوسروں کو اپنی پوزیشن بتانے کی کوشش کریں گے۔ خالص پرامن انداز میں یہ کوشش جاری رہے گی کہ حق واضح ہو، اور لوگ دلیل کی زبان سے مطمئن ہو کر حق کو قبول کر لیں۔

تاہم یہ سارا کام صرف پرامن ترغیب کے دائرہ میں ہوگا، کسی بھی حال میں کوئی متشددانہ طریقہ استعمال نہیں کیا جائے گا خواہ یہ اختلافات ختم ہو جائیں یا بدستور لمبی مدت تک باقی رہیں۔ یہ اصول اس بات کا ضامن ہے کہ اسلام کی پوزیشن فکری طور پر لوگوں کے اوپر واضح ہو جائے۔ اہل اسلام اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کو اس سے پوری طرح باخبر کر دیں۔

اس کی ایک مثال مرد اور عورت کی صنفی مساوات (gender equality) کا مسئلہ ہے، اس معاملہ میں اسلام اور جدید مغرب کے نقطۂ نظر میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ جدید مغرب کا یہ کہنا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کا ورک پلیس (مقام کار) ایک ہے۔ مگر اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جہاں تک عزت، احترام اور انسانی حقوق کا سوال ہے، دونوں کے درمیان مکمل مساوات ضروری ہے۔ لیکن جہاں تک ورک پلیس کا تعلق ہے

دونوں کا ورک پلیس بنیادی طور پر الگ ہوگا۔ کیونکہ حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف کے سوال پر اسلام اور مغرب کے درمیان پچھلے سو سال سے رسمی اور غیر رسمی سطح پر ڈائیلاگ جاری ہے اگرچہ ابھی تک اس معاملہ میں دونوں کے درمیان کوئی اتفاق رائے ممکن نہ ہو سکا۔

اسلام کا رول

بہتر دنیا کی تعمیر میں اسلام کا ایک مستقل رول ہے۔ یہ رول اسلام کے ابتدائی زمانہ سے لے کر بعد کے زمانوں تک جاری رہا ہے اور مسلسل جاری رہیگا۔ یہاں مختصر طور پر اس کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو قدیم عرب میں قبائلی نظام تھا۔ ان کا کلچر انتقام کے اصول پر قائم تھا۔ ان کے یہاں جب اس قسم کا کوئی ایک واقعہ پیش آتا تو فریق ثانی کے لئے ضروری ہو جاتا کہ وہ اس کا انتقام لے۔ اس کے بعد انتقام کا انتقام لینے کی صورت میں یہ تباہ کن سلسلہ برابر جاری رہتا۔ یہ صورت حال قدیم عربوں کی ترقی میں مستقل رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ اسلام نے انتقام کلچر کی جگہ معافی کلچر کو رواج دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کے لئے ہر قسم کی ترقی کا دروازہ کھل گیا۔

۲۔ موجودہ زمانہ میں بھی اس قسم کی کئی چیزیں ہیں جہاں اسلام اپنا مثبت رول ادا کر سکتا ہے۔ مثلاً انفرادی آزادی بہت قیمتی چیز ہے مگر جدید مغربی تہذیب نے آزادی کو خیر مطلق (summum bonum) قرار دے کر اس کو لامحدود حد تک وسیع کر دیا۔ اس لامحدود آزادی کے بے شمار نقصانات ہیں جن کو آج دنیا مختلف صورتوں میں بھگت رہی ہے۔

تمام اہل دانش یہ مانتے ہیں کہ آزادی بلاشبہ ایک خیر ہے مگر لامحدود آزادی شر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جدید تہذیب یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ آزادی کو محدود کس طرح کیا جائے اور کس کے مقابلہ میں کیا جائے۔ یہاں اسلام یہ رہنمائی دیتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی آزادی کو خدا کے مقابلہ میں محدود بنائے۔ انسان کے مقابلہ میں آزادی کو محدود کرنا بظاہر ناقابل فہم ہے مگر خدا کے مقابلہ میں آزادی کا تصور فوراً قابل فہم ہو جاتا ہے۔

اس نوعیت کی ایک کامیاب مثال اس سے پہلے سامنے آچکی ہے۔ پچھلے پانچ ہزار سال سے یورپ فلسفیوں کے اس تصور سے مسحور تھا کہ انسانی عقل حقیقت کلی تک پہنچ سکتی ہے۔ مگر اس رخ پر ہزاروں سال کی کوشش کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچ سکی۔

اسلام نے اس معاملہ میں یہ رہنمائی دی کہ عقل انسانی صرف جزئی حقیقت کا احاطہ کر سکتی ہے، وہ کلی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی (وما اوتیتم من العلم الا قلیلا)۔ اس محدودیت کی بنا پر حقیقت کلی کو عقل کے ذریعہ دریافت کرنے کی کوشش ایک بے فائدہ کوشش ہے جو کبھی کسی واقعی نتیجہ تک پہنچنے والی نہیں۔

قرون وسطی میں جب اسلامی فکر یورپ میں پھیلا تو اس نے تاریخ میں پہلی بار یہ ذہن بنایا کہ سائنسی ریسرچ کے دائرہ کو محدود رہنا چاہئے۔ اب یورپ کے اہل علم نے اشیاء کے معنوی پہلو کو اس کے مادی پہلو سے الگ کر دیا۔ وہ معنوی پہلو کو چھوڑ کر چیزوں کے مادی پہلو پر ریسرچ کرنے لگے۔ اس طرح اچانک سائنسی تحقیق بے فائدہ کوشش کے میدان سے نکل کر نتیجہ خیز عمل کے میدان میں داخل ہو گئی۔ ''علم کثیر'' کو چھوڑ کر ''علم قلیل'' پر راضی ہونے کا یہی اصول تھا جو جدید سائنسی تہذیب کو وجود میں لانے کا سبب بنا۔

اسی طرح جدید مغرب ایک اور سحر میں مبتلا ہے۔ یہ لامحدود آزادی کا سحر ہے۔ مگر دوبارہ فطرت کا قانون اس کے لئے ایک مستقل رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ لامحدود آزادی کے تصور کے تحت کبھی کوئی بہتر سماج نہیں بنایا جا سکتا۔ یہاں دوبارہ اسلام ایک عظیم رہنمائی دے رہا ہے۔ وہ یہ کہ انسان محدود آزادی پر راضی ہو جائے۔ کیونکہ موجودہ دنیا میں صرف یہی ممکن ہے۔

لامحدود آزادی کے تصور نے دنیا کو انارکی کا جنگل بنا دیا ہے۔ محدود آزادی کا اصول دنیا کو امن اور سکون کا سماج بنا سکتا ہے۔ یہ دوسرا اصول اسی طرح جدید دنیا میں ایک نیا انقلاب لا سکتا ہے جس طرح پہلا اصول قدیم دنیا میں ایک عظیم انقلاب لایا تھا۔

قوت مرحبہ

قرآن میں صبر کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ تم لوگ اپنے بچاؤ کا
نظام رکھو (النساء ۷۱)۔ قرآن میں فرمایا کہ صلح بہتر ہے (النساء ۱۲۸) اسی کے ساتھ قرآن میں یہ حکم بھی
اگیا ہے کہ اپنے دشمنوں کے لئے قوت مرحبہ فراہم کرو (الانفال ۶۰)۔

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی میں بیک وقت دو قسم کی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ایک طرف یہ کہ
دمی لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کرے، وہ نزاع کے موقع پر صلح اور مفاہمت کے لئے تیار رہے دوسری طرف
کہ آدمی لوگوں کے شر سے بچنے کی تدبیر کرے، وہ اپنے ساتھ ایسی قوت جمع کرے جو لوگوں کو اس کے
رے میں خوف زدہ کرنے والی ہو۔

تاہم ان دونوں قسم کی چیزوں کی اہمیت یکساں نہیں۔ ان میں سے ایک کی حیثیت اصل لی ہے اور
وسری کی حیثیت وقتی ضرورت کی۔ آدمی کو چاہئے کہ اس کی زندگی کا اصل اصول تو یہی ہو کہ وہ صبر
عراض کی نفسیات کے ساتھ دنیا میں رہے۔ اگر کسی سے اس کو تکلیف پہنچ جائے تو وہ اس کو معاف کر دے
ر پہلے ہی مرحلے میں مصالحت کر کے معاملے کو ختم کر دے۔

مگر یہ دنیا آزادی کی دنیا ہے۔ یہ آزادی جو برائے امتحان دی گئی ہے وہ اکثر لوگوں کو سرکش بنا دیتی ہے۔
دمی اپنی انانیت اور سرکشی کی بنا پر وہ چیز چاہنے لگتا ہے جو از روئے انصاف اس کا حق نہیں، ایسے لوگ موقع
تے ہی دوسروں کو اپنی سرکشی کا نشانہ بنانے لگتے ہیں۔ وہ دلیل کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، البتہ
ر طاقت کا سامنا ہو تو وہ جھک جائیں گے۔

یہی وہ دوسری ضرورت ہے جس کے لئے اہل ایمان کو قوت مرحبہ فراہم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا
طلب یہ ہے کہ مومن کو صابر اور صلح پسند ہونے کے ساتھ یہ بھی کرنا چاہئے کہ وہ اپنے ارد گرد ایسے
سباب جمع رکھے جو سرکش انسانوں کے لئے روک کا کام دیں۔ جن کو دیکھ کر شریر لوگ اس طرح خوف زدہ
د جائیں کہ وہ اپنے آپ مومن کو اپنی سرکشی کا نشانہ بنانے سے باز رہیں۔

جھوٹ کی اشاعت

نوائے وقت پاکستان کا مشہور اردو روزنامہ ہے جو تقریباً ۶۰ سال سے جاری ہے۔ وہ پاکستان کے پانچ شہر (لاہور، کراچی، راولپنڈی، اسلام آباد، ملتان) سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ اس کی لاہور کی اشاعت مورخہ ۷ اپریل ۱۹۹۸ (۹ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ) میں ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ یہ اس کے صفحہ آخر سے شروع ہوتی ہے اور صفحہ ۱۱ پر مکمل ہوئی ہے۔ نوائے وقت کی یہ خبر اس کے عنوان کے ساتھ بجنسہ یہاں درج کی جاتی ہے :

مولانا وحید الدین خان پر نئی دہلی میں قاتلانہ حملہ

نئی دہلی (جی این این) بھارت کے متنازعہ مصنف اور اسکالر وحید الدین خان صبح ایک قاتلانہ حملہ میں بال بال بچ گئے۔ حملے کے باعث ان کی کار کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ وحید الدین خان اپنے دفتر واقع نیو دہلی میں داخل ہو رہے تھے کہ نامعلوم افراد نے لاٹھیوں اور ہاکیوں سے ان پر حملہ کر دیا۔ پولیس نے چھ افراد کو گرفتار کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔ متنازعہ مصنف نے حال ہی میں بدنام زمانہ مصنف اور گستاخ رسول سلمان رشدی کے دفاع میں ایک متنازعہ کتاب لکھی ہے۔ کتاب میں ایرانی پیشوا آیت اللہ خمینی کی طرف سے سلمان رشدی کے قتل کے فتوی کی مذمت کی گئی۔ سلمان رشدی کے حامی مصنف کے بیٹے نے کہا کہ یہ کارروائی حکومت ایران کے ایما پر کی گئی ہے۔

(ختم)

۱۔ یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے۔ ایسا کوئی واقعہ خدا کے فضل سے میری زندگی میں کبھی پیش نہیں آیا نہ دہلی میں اور نہ کہیں اور۔ مجھے تعجب ہے کہ اتنی زیادہ بے اصل خبر کیسے وضع کی گئی اور کیسے وہ ایک موقر مسلم اخبار میں شائع ہوئی۔

۲۔ خبر میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ فرضی واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا۔ جس نیوز ایجنسی کے حوالے سے یہ خبر شائع کی گئی اس کا نام جی این این درج ہے۔ میرے علم کے مطابق یہ کوئی نیوز ایجنسی نہیں ہے، وہ صرف ایک فرضی نام ہے۔ اور نہ اس قسم کی کوئی خبر مقامی پولیس کے دفتر میں درج ہے۔

۳۔ خبر میں راقم الحروف کو متنازعہ شخصیت بتایا گیا ہے۔ یہ ایک لغو بات ہے۔ متنازعہ مسلم شخصیت

وہ ہے جو اسلام کے مسلّمہ اصولوں سے انحراف کرے۔ میں خدا کے فضل سے مکمل طور پر اہل سنت والجماعت کے عقیدہ اور مسلک پر ہوں۔ میں نے اس سے نہ کلی انحراف کیا ہے اور نہ جزئی انحراف۔ ایسی حالت میں مجھ کو متنازعہ شخصیت کہنا بلا شبہہ ایک شرانگیز بات ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض لوگوں نے کسی معاملہ میں مجھ سے اختلاف کیا ہے۔ مگر اس قسم کا اختلاف ایک فطری چیز ہے۔ اسلامی تاریخ کی تمام بڑی بڑی شخصیتوں سے کسی نہ کسی نے بعض معاملات میں اختلاف کیا ہے۔ مگر محض اس بنا پر یہ لوگ متنازعہ شخصیت نہیں بن جاتے۔

موجودہ زمانہ میں مسٹر محمد علی جناح سے کانگریسی مسلمانوں اور جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ علماء نے اختلاف کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے مسلم لیگی قائدین نے اختلاف کیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ہند و پاک کے بہت سے علماء نے اختلاف کیا۔ مگر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اس اختلاف کی بنا پر مسٹر محمد علی جناح، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی متنازعہ شخصیت تھے۔ ایسی حالت میں صرف بعض اختلاف کی بنا پر مجھ کو متنازعہ شخصیت کہنا غیر علمی بھی ہے اور غیر اسلامی بھی۔

۴۔ راقم الحروف کی کتاب "شتمِ رسول کا مسئلہ" کوئی حالیہ کتاب نہیں۔ وہ بہت پہلے شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب نہ امام خمینی کے فتوے کی مذمت میں لکھی گئی ہے اور نہ سلمان رشدی کی حمایت و مدافعت میں۔ وہ شتمِ رسول کے مسئلہ کا خالص علمی اور تاریخی تجزیہ ہے۔ مزید یہ کہ اس کتاب میں مسئلہ کے بارے میں جو نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے وہ مصنف کا محض انفرادی نقطۂ نظر نہیں۔ دوسرے ایسے علماء بھی موجود ہیں جو ٹھیک اسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف سعودی عرب کے مشہور عالم ہیں۔ اس مسئلہ میں ان کی عین وہی رائے ہے جس کا اظہار راقم الحروف نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو شتمِ رسول کا مسئلہ، صفحہ ۱۸۹۔

۵۔ مسلم صحافت، خاص طور پر اردو صحافت میں اس قسم کی خبروں کی اشاعت کوئی انوکھی بات نہیں۔ تقریباً ہر روز ان اخباروں میں اس قسم کے بے بنیاد قصے چھپتے رہتے ہیں۔ مگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو یہ کوئی سادہ بات نہیں، یہ بے حد سنگین بات ہے۔

مشہور لبنانی مفکر خلیل جبران (۱۹۳۱-۱۸۸۳) نے کہا تھا کہ ——— درخت کا ایک

پتہ بھی پورے درخت کی خاموش رضامندی کے بغیر زمین پر نہیں گرتا :

Not a single leaf falls down without the silent consent of the whole tree.

یہ بات عقل اور اسلام دونوں اعتبار سے بالکل درست ہے۔ اسی لیے اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی معاشرہ میں جب ایک شخص برائی کرے تو پورے معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ برائی کرنے والے کا ہاتھ پکڑے۔ اگر معاشرہ ایسا نہ کرے تو دونوں ہی اس برائی کے ذمہ دار ٹھہریں گے، برائی کرنے والا براہ راست طور پر اور معاشرہ بالواسطہ طور پر۔

دہلی کے مسلم ہفت روزہ الجمعیۃ کا شمارہ ۲۴-۳۰ اپریل ۱۹۹۸ کو دیکھئے۔ اس کے صفحۂ اول پر جلی حرفوں میں یہ عنوان درج ہے: سنگھ (آر ایس ایس) کی مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش۔

یہی حال دنیا بھر کے تمام مسلم اخبارات و رسائل کا ہے۔ ان اخبارات میں ہر روز اسی طرح غیر مسلموں کی زیادتیوں اور سازشوں کی مذمت درج ہوگی مگر مسلمانوں کی زیادتیوں کی مذمت کبھی کسی اخبار میں نہیں چھپتی۔ موجودہ زمانہ میں مسلم معاشرہ کا حال یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی کردار کشی کرتا ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عزت و آبرو پر حملہ کرتا ہے۔ یہ سب کچھ بہت بڑے پیمانہ پر ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ ان واقعات کی مذمت نہیں کرتے، نہ قلمی اور نہ زبانی۔ ایک دوسرے کی غیبت کی آوازوں سے تو مسلمانوں کی مجلسیں بھری ہوئی ہیں۔ مگر غلط کاروں کی کھلی مذمت کے لیے نہ کسی کے پاس زبان ہے اور نہ قلم۔

یہی وہ کمی ہے جس نے موجودہ صورت حال پیدا کی ہے۔ اگر ہمارا معاشرہ ایک زندہ معاشرہ ہو، اگر اس کے افراد میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی روح موجود ہو، اگر ملت کے افراد میں یہ تڑپ ہو کہ وہ برائی کو دیکھ کر چپ نہ رہ سکیں تو ساری صورت حال یکسر بدل جائے گی۔ اس کے بعد کسی کو مذکورہ قسم کی جھوٹی خبر وضع کرنے کی ہمت ہی نہ ہوگی۔ کوئی مسلمان اس کی جرأت نہیں کرے گا کہ وہ دوسرے مسلمان کو بدنام کرنے کی کوشش کرے۔

موجودہ مسلم معاشرہ میں کوئی شخص ایسا نہیں کرتا کہ وہ کعبہ کے بارہ میں توہین آمیز الفاظ بولے۔

یا کعبہ کی توہین میں کوئی بیان اخبار میں چھپوائے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کعبہ کے بارہ میں مسلم معاشرہ انتہائی حد تک حساس ہے۔ کوئی شخص کعبہ کے خلاف بے ہودہ بات کہے تو فوراً سیکڑوں آدمی اس کے مواخذہ کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔ معاشرہ کا یہ خوف لوگوں کو کعبہ کے خلاف لکھنے اور بولنے میں طاقت ور رکاوٹ بن گیا ہے۔ مگر جہاں تک مسلم افراد کا تعلق ہے، کوئی بھی مسلمان کسی بھی مسلمان کے خلاف لغو باتیں کرنے لگتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کعبہ کی حرمت کے بارہ میں جو حساسیت مسلم معاشرہ میں پائی جاتی ہے، وہی حساسیت مسلمان کے بارہ میں موجود نہیں۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ مومن کی حرمت کعبہ کی حرمت سے زیادہ ہے (حرمة المؤمن اكرم حرمة من الكعبة) ایک صحابی کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے کعبہ کو دیکھ کر کہا کہ تیری حرمت بہت زیادہ ہے مگر مومن کی حرمت تجھ سے بھی زیادہ ہے (المومن اعظم حرمة عند الله منك) الترمذی کتاب البر، ابن ماجہ کتاب الفتن، الدارمی کتاب المناسک۔

۶۔ مذکورہ جھوٹی خبر میں راقم الحروف کی کتاب "شتم رسول کا مسئلہ" کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ سلمان رشدی کے دفاع میں لکھی گئی ہے۔ یہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم دانشوروں کی اس مجرمانہ کمزوری کی ایک مثال ہے جو عام طور سے اس طبقہ میں پائی جاتی ہے۔ وہ ہے کسی کی تصویر بگاڑنے کے لیے اس کی بات کو منحرف صورت میں پیش کرنا۔ راقم الحروف کی کتاب سلمان رشدی کے دفاع سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ وہ مسئلہ شتم کا علمی جائزہ ہے۔ مگر اس کو غلط طور پر رشدی کے دفاع کا نام دے دیا گیا ہے تاکہ مصنف کو بدنام کیا جا سکے۔ کوئی بھی شخص اصل کتاب کو پڑھ کر اس حقیقت کو جان سکتا ہے۔ یہاں اس معاملہ کی وضاحت کے لیے کتاب کے کچھ متعلق حصے نقل کیے جاتے ہیں:

"سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) میں نے خود پڑھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک انتہائی لغو کتاب ہے۔ اس کتاب کی لغویت کے بارہ میں میری وہی رائے ہے جو دوسروں کی رائے ہے (صفحہ ۵۰)... مسلم رہنما اگر اس معاملہ کی تحقیق کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ سلمان رشدی کی کتاب اگرچہ نہایت بے ہودہ ہے، مگر اسی کے ساتھ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ ناقابل مطالعہ

بھی ہے۔ وہ کوئی تخلیقی ناول نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فنی اعتبار سے وہ اتنی پست اور اتنی غیر دلچسپ ہے کہ وہ سرے سے اس لائق ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کو شروع سے آخر تک پڑھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی موت آپ مرجاتی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی زندگی نہیں۔ یہ صرف مسلمانوں کا احمقانہ شور وغل ہے جس نے اس کو غیر ضروری طور پر زندہ کر دیا۔ (صفحہ ۹۰) واقعہ یہ ہے کہ سب وشتم اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام اور پیغمبر اسلام پر ایک اعتراض ہے۔ اور جو شخص اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراض کرے اس کی زیادہ بڑی سزا یہ ہے کہ اس کی بات کو دلیل کے ذریعہ رد کر دیا جائے۔ اس کو گولی مارنا اگر اس کا جسمانی قتل ہے تو اس کے اعتراض کو رد کرنا اس کا ذہنی قتل۔ اور جسمانی قتل کے مقابلہ میں ذہنی قتل بلاشبہ زیادہ سخت ہے اور زیادہ کارگر بھی (صفحہ ۸)

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب فتویٰ دینے والوں کی غیر عاقلانہ روش کا تجزیہ ہے، وہ کسی بھی درجہ میں سلمان رشدی کی مدافعت یا حمایت نہیں۔

۷۔ راقم الحروف کی کتاب "شتم رسول کا مسئلہ" ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ذیلی ٹائٹل ان الفاظ میں دیا گیا ہے —— قرآن وحدیث اور فقہ وتاریخ کی روشنی میں۔ راقم الحروف نے یہ کتاب لمبی تحقیق کے بعد مرتب کی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص نے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ان الفاظ میں اس پر تبصرہ کیا کہ یہ کتاب سلمان رشدی (یا اس کے جیسے دوسرے افراد) کا گویا علمی ذبیحہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس کتاب کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وقت کے مسلّم ہتھیار کو اسلام دشمنوں کے خلاف کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ آج کا ذہن تشدد کے بجائے سائنٹفک دلیل کو وزن دیتا ہے اور آپ نے اسی وزن دار ہتھیار کو اسلام دشمن کے خلاف کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اگر کھلے ذہن کے تحت اس کتاب کو پڑھے تو وہ اس تبصرہ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوگا۔ وہ کہے گا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ اسلام دشمنوں کا جواب دینے کے لیے ہمارے پاس دلائل کا بم موجود ہے مگر ہم مناظروں اور فتووں کی کنکریاں ان کی طرف پھینک رہے ہیں۔

۸۔ مذکورہ قسم کی ایک خبر کا اخبار میں چھپنا اور شائع ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کو پہلے ایک یا چند انسانوں نے سوچا اور لکھا۔ پھر وہ اخبار کے دفتر میں نیوز ایڈیٹر کے میز پر پہنچی۔ اس کے بعد کسی نے اس کی کتابت کی یا اس کو ٹائپ کیا۔ پھر کسی مصحح نے اس کو پڑھا اور پھر کسی سٹ کرنے والے نے اس کو سٹ کیا۔ اس طرح یہ خبر بہت سی آنکھوں کے سامنے سے گذری جن میں سے ہر ایک بلاشبہ مسلمان تھا۔

ان تمام لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو بھی اگر اس خبر کے بارہ میں کھٹک پیدا ہوتی تو وہ اس کو روک دیتا یا راقم الحروف کے دفتر میں ٹیلی فون کر کے تحقیق کرتا۔ مگر اس خبر کا چھپ کر شائع ہو جانا بتاتا ہے کہ ان بہت سے مسلمانوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کے بارہ میں کھٹک پیدا نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ خبر آخری انجام تک پہنچ گئی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ مسلم معاشرہ کی اخلاقی حساسیت کا عالم کیا ہے۔ اس معاشرہ میں وہ مزاج غالب ہے جس کو قرآن میں اشاعت فاحشہ (النور ۱۹) کا مزاج کہا گیا ہے۔ ایسے معاشرہ پر سوء ظن کا مزاج اتنا زیادہ غالب ہو جاتا ہے کہ حسن ظن کے بارہ میں وہ اپنی حساسیت کھو دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ حسن ظن اور سوء ظن کے درمیان زیادہ فرق نہیں کرتے۔ وہ جھوٹی خبر کو بھی اسی طرح بیان کرنے لگتے ہیں جس طرح سچی خبر کو۔ وہ الزام تراشی اور بیان واقع کو یکساں درجہ دیتے ہیں، حالانکہ ان میں سے ایک جائز ہے اور دوسرا ناجائز۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ کسی کے بارہ میں کوئی بری بات سنتے ہیں تو بلا تحقیق اس کو درست مان لیتے ہیں اور اس کو پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے وہ غلط بات کی اشاعت بھی اسی طرح کرنے لگتے ہیں جس طرح صحیح بات کی اشاعت کی جانی چاہئے۔ تنقید کے وقت وہ الزام تراشی کی زبان بھی اسی طرح اطمینان کے ساتھ بولتے ہیں جیسے کہ دلیل اور ثبوت کی زبان بولی جاتی ہے۔

موجودہ مسلم معاشرہ بدقسمتی سے سوء ظن کا معاشرہ بن گیا ہے۔ اس لئے اب اس کا حال یہ ہے کہ سوء ظن کی بات فوراً اس کے درمیان قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے برعکس حسن ظن کی بات کو قبول کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے۔

سفرنامہ امریکہ

امریکہ میں پچھلے ۲۵ سال کے درمیان تقریباً ایک ہزار اسلامک سنٹر بنائے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک مذکورہ سنٹر ہے جو ماؤنٹ ہالی (Mount Holly) میں واقع ہے۔ اس کے صدر مولانا ذکی الدین الشرفی ہیں (Tel. 609-2659370) اس سنٹر کی دعوت پر امریکہ کا سفر ہوا۔ اس سلسلہ میں وہاں کے مختلف مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ذیل میں اس سفر کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۹۶ کی رات کو ۱۰ بجے دہلی سے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک جگہ ریڈ لائٹ پر ہماری گاڑی رکی۔ اتنے میں ایک اور گاڑی آکر وہاں کھڑی ہو گئی۔ اس کے اندر تیز آواز میں گانے اور باجے کا کیسٹ بج رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ لوگ خارجی چیزوں میں اتنا محو ہیں کہ انھیں اندرونی حقیقتوں کے بارہ میں سوچنے کا موقع نہیں۔ لوگ پُرشور آوازوں کے درمیان جیتے ہیں، پھر کیوں کر انھیں فطرت کی خاموش آوازیں سنائی دیں گی۔ لوگ مخلوق کے کثیف نغموں میں بدمست ہو رہے ہیں، پھر وہ خالق کے لطیف نغموں کا ادراک کس طرح کر سکتے ہیں۔

برٹش ایرویز کی فلائٹ ۱۴۴ کے ذریعہ دہلی سے لندن کے لیے روانگی ہوئی۔ دہلی میں نواب ظفر جنگ صاحب نے کہا تھا کہ "آپ ایک آتھر ہیں۔ آپ اپنی کوئی انگریزی کتاب ساتھ لے جائیے اور اس کو فلائٹ کیپٹن کو بطور گفٹ دیجئے۔ ان لوگوں کی نفسیات کے اعتبار سے میں کہتا ہوں کہ وہ اس کو اپنے لیے آنر سمجھیں گے اور خوش ہو کر اس کو پڑھیں گے۔

اس مشورہ کے مطابق، میں ایک پیکٹ میں ایک انگریزی کتاب اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ دوران پرواز اس کو فلائٹ کیپٹن کو دیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کا نام کیپٹن ٹونی (Tony Gepaian) تھا۔ اس نے کہا کہ پرواز کے دوران تو میں مصروف رہوں گا۔ اس لیے ابھی فوراً نہیں پڑھ سکتا۔ مگر ٹھکانے پر پہنچ کر میں ضرور اس کو پڑھوں گا۔

برا نہیں مانتے، بلکہ اس کو ویلکم کرتے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں کا فکری ارتقا مسلسل جاری رہتا ہے۔ اور ان کا مائنس پوائنٹ یہ ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زندگی تو بس ایک کھیل تماشا ہے :

Life is just a fun

نیویارک میں میرا پہلا قیام خواجہ کلیم الدین صاحب کے مکان پر تھا۔ عشار کی نماز کے بعد گھر کے تمام لوگ ایک کمرہ میں اکٹھا ہوئے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں انھیں کچھ دین کی باتیں بتاؤں۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک یہ مجلس رہی، نئی جنریشن کی رعایت سے میں نے انگریزی میں گفتگو کی۔ آخر میں سوال و جواب ہوا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اسلام اپنے احکام کے اعتبار سے ایک واحد مجموعہ ہے۔ مگر انطباق کے اعتبار سے اس کے تین مرحلے ہیں۔ اور پھر اس کے کئی مرحلے بن جاتے ہیں اور بنتے رہیں گے۔

۲۲ اگست کی صبح کو فجر کے بعد خواجہ کلیم الدین صاحب کے ساتھ نیویارک میں ٹہلنے کے لیے نکلا۔ ہم لوگوں نے تقریباً دو کیلومیٹر کا چکر لگایا۔ یہ علاقہ جس سے ہم لوگ گزرے وہ ایک یہودی علاقہ تھا۔ ہر گھر اور اس کا ماحول نہایت صاف ستھرا نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ یہودی علاقوں کے مکان نسبتاً مہنگے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ صاف ستھرے علاقہ میں ہوتے ہیں اور اس بنا پر ان کا ٹیکس بھی زیادہ ہوتا ہے۔

امریکہ کے جس شہر میں بھی میں گیا۔ ہر جگہ میں نے پایا کہ فوٹ پاتھ نہایت اچھی حالت میں ہیں۔ کہیں بھی ہندستانی شہروں جیسے ناہموار فوٹ پاتھ دکھائی نہیں دیے۔ کلیم الدین صاحب نے بتایا کہ اس معاملہ میں یہاں سخت قوانین ہیں۔ اور فوٹ پاتھ کو بنانے اور اس کو درست رکھنے کی ذمہ داری سامنے والے گھر کی ہوتی ہے۔ اگر فوٹ پاتھ ٹوٹا ہوا یا ہموار نہ ہو اور کوئی راہ گیر وہاں چلتا ہوا پھسل کر یا ٹھوکر کھا کر گر جائے اور اس کو جسمانی تکلیف پہنچ جائے تو فوراً وہ عدالت میں مقدمہ (sue) کر دے گا۔ اور پھر گھر والوں کو بہت مہنگا معاوضہ اس کو دینا پڑے گا۔ اس بنا پر گھر والے فوٹ پاتھ کو درست

رکھنے کے معاملہ میں بہت مستعد رہتے ہیں۔

ٹہلتے ہوئے ایک جگہ سڑک کے کنارے ریلوے ویگن کی مانند ایک گاڑی نظر آئی جس میں کوڑا بھرا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں قاعدہ ہے کہ کوئی شخص گھر کی تعمیر یا مرمت کرا رہا ہو تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کا ویگن کمپنی سے کرایہ پر حاصل کرے۔ اس کو ڈمپسٹر (dumpster) کہا جاتا ہے۔ سارا ملبہ اس کے اندر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور جب وہ بھر جاتا ہے تو اس کو کمپنی والے اٹھالے جاتے ہیں۔ پھر اس کو خالی کرنے کے بعد اسے لاکر دوبارہ اسی مقام پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص گھر کا ملبہ سڑک پر لاکر ڈال دے تو اس کو بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ وغیرہ۔

ایک بار میں کلیم الدین صاحب کے ساتھ تھا۔ ہم لوگوں نے ایک لفٹ استعمال کی۔ اس کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ لفٹ رُکی تو کلیم الدین صاحب نے دروازہ کھولا۔ اتفاق سے باہر کی طرف ایک سفید فام نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ لفٹ کا دروازہ اس سے ٹکرا گیا۔ کلیم الدین صاحب نے کہا کہ معاف کیجئے (sorry) اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں (no problem) اور فوراً بات ختم ہو گئی۔

یہ مغربی کلچر ہے۔ بڑے سے بڑا مسئلہ بھی یہاں اسی طرح دو لفظوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ برصغیر ہند میں جو رہنما اٹھے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں روایات کی اہمیت ہی معلوم نہ تھی۔ وہ صرف آزادی اور غلامی، حاکمیت اور محکومیت کی اصطلاحوں میں سوچنا جانتے تھے۔ اس لیے وہ صرف اس قسم کی باتوں پر جذباتی دھوم مچاتے رہے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں ساری روایتیں ٹوٹ جائیں۔

کوئی سماج سب سے زیادہ جس چیز پر چلتا ہے وہ صحت مند روایات ہیں۔ مگر غالباً ان رہنماؤں کو نہ تو روایات کی اہمیت معلوم تھی اور نہ انھوں نے ایسی روایت کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج برصغیر میں تین آزاد ملک بن گئے ہیں۔ مگر صحت مند روایات سے تینوں محروم ہیں۔ اس محرومی اور تباہی کی آخری حد یہ ہے کہ ان آزاد ملکوں کے لوگ دوبارہ اپنے سابق حکمرانوں کے دیس میں بھاگ بھاگ کر پہنچ رہے ہیں۔ دہلی

میں میرا ویزا لینے کے لیے جو صاحب امریکی سفارت خانہ گئے، ان کو وہاں کھڑکی کے سامنے چار گھنٹہ تک کھڑا رہنا پڑا۔ کیوں کہ وہاں سڑک تک لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔

ایک پاکستانی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ اس کفرستان میں ہم اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ برصغیر ہند کے "کفرستان" میں آپ کو یہی موقع زیادہ بہتر طور پر حاصل تھا۔ وہاں تو آپ نے یہ کام نہیں کیا بلکہ تقسیم کرکے اپنے اور اس کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرلی۔ اور اب آپ نصف کرۂ ارض طے کرکے اس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں، یہ کیسا عجیب ہے۔

فلاڈلفیا میں ایک کتاب دیکھی۔ ۲۸۰ صفحہ کی یہ کتاب اسلامک کونسل آف یورپ (لندن) سے ۱۹۷۶ میں شائع کی گئی ہے۔ اس میں مختلف ممتاز شخصیتوں کے مضامین ہیں۔ اس کا نام ہے:

Islam: Its Meaning and Message

اس کے ایک مضمون میں کہا گیا تھا کہ:

> Contemporary Muslims should be realist enough to understand that they must begin their journey from where they are. A famous Chinese proverb asserts that the journey of a thousand miles begins with a single step. (p. 237)

یہ نہایت درست بات ہے کہ مسلمان جہاں بالفعل ہیں وہیں سے وہ اپنا سفر شروع کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کتاب کو پڑھیں تو اس سے واضح طور پر آپ معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ پہلا قدم کیا ہے جو مسلمانوں کو اپنی موجودہ حالت کے اعتبار سے اٹھانا چاہیے۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا حال یہی ہے۔

۲۲ اگست کو دوپہر بعد ہم لوگ نیویارک کا ورلڈ ٹریڈ سنٹر دیکھنے کے لیے نکلے۔ رہائش گاہ سے ٹریڈ سنٹر تک کا سفر زمین دوز ٹرین کے ذریعہ کیا گیا۔ اس کو یہاں سب وے کہا جاتا ہے اور لندن میں اس کا نام ٹیوب ہے۔ یہاں کی زمین دوز ٹرین دنیا میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کو (rapid transit) بھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ کار سے بھی زیادہ کم وقت میں

پ کو منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ کار میں سب سے بڑا مسئلہ پارکنگ کا ہے۔ جبکہ سب وے میں اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کئی عمارتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان میں سے دو عمارتیں زیادہ اونچی ہیں، دونوں کی ۱۱۰ منزلیں ہیں۔ یہ بلندی تیز رفتار لفٹ کے ذریعہ صرف ایک منٹ میں طے ہوتی ہے۔ ہم لوگ آخری منزل پر گئے اور اوپر کی چھت پر کچھ وقت گزارا۔ یہ وہی عمارت ہے جس میں مشہور بم دھماکہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی دو منزلوں کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ مگر جلد ہی اس کو اس طرح بنا لیا گیا کہ اب دیکھنے والوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ہم لوگ ۱۱۰ ویں منزل سے دیر تک شہر اور سمندر کا منظر دیکھتے رہے۔

ہر طرف نیم برہنہ عورتیں چل پھر رہی تھیں۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ عورتیں آخر اس طرح کیوں رہتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان لوگوں کو مسلسل یہ بتایا گیا ہے کہ تمہارا جسم تمہارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس کو چھپانا اپنی شخصیت کے اہم ترین پہلو کو چھپانا ہے۔ اس طرح عورتوں میں اپنے جسم کی نمائش کا ذہن پیدا ہو گیا۔

بعض مسلم ملکوں سے آئے ہوئے نوجوانوں نے کہا کہ جب تک ہم اپنے ملک میں تھے تو ہم اسلام پر فخر کرتے تھے۔ مگر یہاں آکر ہمارا فخر ٹوٹ گیا۔ کیوں کہ اب غیر مسلم قوموں کے مقابلہ میں اسلام اور مسلمان ہم کو بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ خوش قسمتی سے عین اس موقع پر مجھے الرسالہ مل گیا۔ اس نے مجھے مایوسی میں گرنے سے بچا لیا۔

۲۲ اگست کی شام کو کناڈا (مانٹریل) سے ریاض احمد صاحب (ایک نوجوان طالب علم) کا ٹیلی فون آیا، وہ بہت دیر تک بات کرتے رہے۔ ان کو حال میں الرسالہ ملا ہے وہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ اب خدا کے فضل سے اکثر ملکوں میں الرسالہ مشن کی آواز پہنچ چکی ہے۔ ہر جگہ ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو محسوس کر رہے ہیں کہ وہی فکر درست ہے جو الرسالہ میں پیش کی جا رہی ہے۔

۲۲ اگست کی رات کو میں کچھ ویڈیو کیسٹ دیکھ رہا تھا۔ یہ امریکی نومسلموں کے پروگراموں

پر مشتمل تھا۔ کہیں ایک سفید فام شخص اپنے لہجہ میں "شہادۃ" ادا کر کے اسلام میں داخل ہو رہا ہے۔ کہیں اسلام کے تعارف پر کوئی نو مسلم تقریر کر رہا ہے۔ کہیں بہت سے نو مسلم بتا رہے ہیں کہ میں کیسے اسلام میں داخل ہوا۔ کہیں کوئی اپنے مخصوص لہجہ میں اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کر اذان دے رہا ہے۔ کہیں کوئی کہہ رہا ہے کہ ان شاء اللہ... ۲ تک امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے بڑھ جائے گی۔

اس کو دیکھتے ہوئے بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک دعوہ اکسپلوزن ہے جو براہ راست خدا کی مدد سے ہو رہا ہے۔ موجودہ دور میں اللہ تعالیٰ نے مذہبی آزادی، کمیونی کیشن اور دوسرے موافق ذرائع پیدا کیے۔ یہ اس لیے تھے کہ مسلمان ان کو استعمال کر کے سارے عالم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیں۔ مگر مسلمان اس میں ناکام ہو گئے۔ ان میں جو لوگ "دعوت" کے نام پر کام کرنے کے لیے اٹھے وہ بھی قومی نفرت اور سیاسی سوچ کی بنا پر صحیح دعوتی اسلوب میں دعوت کو پیش کرنے کا کام نہیں کر رہے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود امریکیوں اور دوسری غیر مسلم قوموں میں اسلام کو داخل کر دیا۔ یہ لوگ صاف ذہن کے تھے، چنانچہ انھوں نے اب زیادہ صحیح اسلوب میں دعوت کا کام شروع کر دیا ہے۔

اس قسم کے نو مسلم داعی آج کل بہت سے پیدا ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں یوسف اسلام، امریکہ میں پروفیسر لینگ (Jeftry Lang) اور امینہ اسلمی (Ameena Assilmi) وغیرہ۔ امینہ اسلمی پہلے ڈانسر تھیں۔ دس سال پہلے انھوں نے اسلام قبول کیا، اب وہ بوڑھی ہو چکی ہیں۔ میں نے ویڈیو کے ذریعہ نیویارک میں ان کی تقریر سنی۔ تقریر کا انداز بہت جاذب تھا۔

۲۳ اگست کی صبح کو ہم لوگ مکی مسجد میں گئے اور وہاں فجر کی نماز پڑھی۔ جماعت میں تقریباً ۳۵ آدمی تھے۔ بیشتر پاکستانی اور بنگلہ دیشی دکھائی دیے۔ میں نے سوچا کہ پاکستانی اور بنگلہ دیشی مسلمان "مسلم لینڈ" میں باہم مل کر نہ رہ سکے۔ اور یہاں "غیر مسلم لینڈ" میں دونوں مل کر پر امن طور پر رہ رہے ہیں۔ کیسا عجیب ہے یہ اسلام اور کیسی عجیب ہے یہ اسلامی سیاست۔

امریکہ کے شہروں میں گاڑی کو پارک کرنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ نیو یارک کی انتظامیہ نے استثنائی طور پر مسجد کے نمازیوں کو اجازت دی ہے کہ وہ نماز کے دوران دو گھنٹہ تک سامنے کی سڑک پر ڈبل پارکنگ کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ یہاں ڈبل پارکنگ سخت جرم ہے اور اس کے لیے بہت بڑا جرمانہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جمعہ کے دن خصوصی طور پر اجازت دی گئی ہے کہ مسجد کے سامنے فٹ پاتھ پر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ اس طرح کی مختلف رعایتیں یہاں کے مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ حالاں کہ نیو یارک کا میئر ایک یہودی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ وہ کٹر یہودی ہے۔

ایک مجلس میں ایک پاکستانی بزرگ نے سوال کیا کہ پاکستانی مہاجرین کی حالت زار کیوں ہے۔ جب کہ ہندستان میں شرنارتھیوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ حقیقت سننا چاہتے ہیں یا آپ کو اپنی پسند کا جواب چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے نزدیک جو حقیقت ہو وہی بتائیے۔ میں نے کہا کہ ہمارے مسلم لیڈروں نے سیاست بازی تو خوب کی مگر انھوں نے مسلمانوں کو جینا نہیں سکھایا۔ ہماری موجودہ نسل اپنے لیڈروں کی اسی غلطی کی قیمت چکا رہی ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ پاکستان سے جو ہندو انڈیا میں گئے وہ اپنے کو شرنارتھی (پناہ گزیں) سمجھ کر گئے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر وہ وہاں ایڈجسٹ کر کے رہنے لگے۔

اس کے برعکس ہندستان سے جو مسلمان آئے وہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جنھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے پاکستان کے نام پر دھوم مچائی تھی۔ چنانچہ وہ اس ذہن کے ساتھ پاکستان گئے کہ ہم اس کے بانی ہیں، ہم فاتحِ پاکستان ہیں۔ اس بنا پر ان کے اندر برتری کی نفسیات بیدار ہو گئی۔ انھوں نے چاہا کہ وہ دوسروں کے اوپر بڑے بن کر رہیں۔ اسی مزاج نے سارے مسئلے پیدا کیے۔

امریکہ کے چیف آف آرمی اسٹاف کولن پاویل (Gen Collin Powell) کا تعلق سیاہ فام طبقے سے ہے۔ مگر اپنی صلاحیت کی بنا پر وہ ترقی کر کے اعلیٰ ترین فوجی عہدہ پر پہنچ گیا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد مشہور ہوا کہ وہ صدارت کے عہدہ کے الکشن میں کھڑا ہونا چاہتا

ہے۔ اس کے بعد میڈیا میں اس کا چرچا ہوئے لگا۔ فروری ۱۹۹۶ میں امریکی ٹیلی وژن کی تنظیم اے بی سی کی نمائندہ باربرا والٹر (Barbara Walter) نے ایک انٹرویو کے درمیان کولن پاویل سے پوچھا کہ امریکہ میں سفید فام لوگ سیاہ فام لوگوں کے ساتھ امتیاز (discrimination) برتتے ہیں، اس کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں۔ جنرل پاویل نے جواب دیا کہ یہ میرا مسئلہ نہیں، یہ تو ان کا مسئلہ ہے:

Its not my problem, its their problem.

امتیاز اور تعصب کے معاملہ میں یہ بلاشبہ سب سے بہتر جواب ہے جو کوئی زیر تعصب شخص دے سکتا ہے۔

کراچی سے آئے ہوئے ایک مسلمان نے ایک مجلس میں بتایا کہ وہاں شادیوں میں کس طرح بہت زیادہ دھوم مچائی جاتی ہے اور بے پناہ دولت خرچ کی جاتی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آخر یہ لوگ اپنی کمائی کو شادیوں میں کیوں اتنا زیادہ برباد کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ مڈل کلاس یا لوور کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر انھوں نے کافی پیسہ کما لیا۔ اب وہ شادیوں میں نمائش کرکے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اب میں کوئی غریب آدمی نہیں ہوں۔ اب میں ایک باعزت شخص کی حیثیت رکھتا ہوں:

I am no longer a poor man. I am a very respectable person.

پاکستان سے انگریزی میں ایک کوارٹرلی قرآنک ہورائزن (The Quranic Horizons) کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کا شمارہ جنوری - مارچ ۱۹۹۶ یہاں دیکھا۔ ایک پاکستانی دانش ور کا مضمون تھا۔ اس میں انھوں نے پاکستان کی موجودہ حالت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا کہ غیر ملکی ریڈیو، ناول، میگزین وغیرہ کی آسان دستیابی (easy availability) کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں تیزی سے ویسٹرنائزیشن کا عمل ہو رہا ہے۔ بظاہر ان کا مطلب یہ تھا کہ اس کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ ان کے خیال کے مطابق، حکومت اگر ان چیزوں کی آمد پر پابندی لگا دے تو پاکستانی معاشرہ ان کی برائیوں سے محفوظ ہو جائے گا۔

یہ بالکل بے معنی بات ہے۔ کسی ملک میں ان چیزوں کی آمد دراصل زمانہ کا تقاضا ہے

نہ کہ حکومت کی پالیسی کا نتیجہ۔ موجودہ دنیا ایک گلوبل ویلیج بن چکی ہے۔ آج کسی بھی قوم کے لیے ممکن نہیں کہ وہ دنیا سے الگ اپنا جزیرہ بنا سکے۔ پاکستان میں ضیاء الحق صاحب نے اس قسم کا جزیرہ بنانا چاہا تو پہلے ہی الکشن میں ضیاء الحق کی ٹیم کو عوام نے رد کر دیا ایسی حالت میں نہ تو علاحدہ جزیرہ بنانا ممکن ہے، اور اگر کوئی ایسا جزیرہ بنانے کی کوشش کرے تو جمہوری دور میں اس کا بقا ممکن نہ ہوگا۔

۲۳ اگست کو جمعہ کا دن تھا۔ پروگرام کے مطابق، جمعہ کی نماز یہاں کی مسجد العابدین میں پڑھی۔ جمعہ کا خطبہ اور امامت دونوں میرے ذمہ تھا۔ میں نے خطبہ کے ساتھ انگریزی میں کچھ جمعہ کے بارے میں کہا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں نے سورہ الجمعہ کا آخری رکوع پڑھا اور پھر انگریزی میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ دینی زندگی کے تقاضے اور معاشی زندگی کے تقاضے دونوں کو کس طرح پورا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں آیات سے اخذ کر کے تین اصول بیان کیے (اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

نماز کے بعد کچھ لوگ مسجد میں ٹھہر گئے ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ : دوسری قومیں ہمارے لئے مدعو ہیں نہ کہ حریف اور رقیب۔

مسجد العابدین کے امام ضمیر ستار صاحب ہیں۔ ان کا تعلق گیانا سے ہے۔ انھوں نے مدینہ کی الجامعۃ الاسلامیہ میں تعلیم حاصل کی۔ اب یہاں بطور امام خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ انگریزی اور عربی دونوں زبان روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔

مسجد میں جناب سید نایاب حسن رضوی (۵۰ سال) سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا : کوئی کہتا ہے کہ امریکہ ہمارا دشمن ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہودی دشمن ہیں۔ کوئی کسی اور کو دشمن بتاتا ہے۔ یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم خود ہی اپنے دشمن ہیں۔

ایک صاحب ہم لوگوں کو اپنے فلیٹ پر لے گئے۔ وہاں ان سے ملا ہوا ایک اور فلیٹ تھا۔ اس کے دروازہ پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ میں بنگلہ دیش سے محبت کرتا ہوں :

I love Bangladesh

مجھے نہیں معلوم کہ امریکہ میں مقیم بنگلا دیشی بھائی نے یہ جملہ کس معنی میں لکھا تھا۔ لیکن مجھے اگر اپنے وطن سے محبت ہے تو میرے لیے میری حب الوطنی کا تقاضا یہ ہوگا کہ میں اپنے وطن میں رہ کر اس کی خدمت کروں، نہ کہ اس کو چھوڑ کر باہر چلا جاؤں۔ چنانچہ یہاں کچھ لوگوں نے پیش کش کی کہ آپ امریکہ میں رہ جائیے، آپ کی زیادہ ضرورت یہاں ہے۔ مگر میرے دل نے کہا کہ ابھی میں اپنے وطن کا حق ادا نہ کر سکا۔ پھر میں اس کو چھوڑ کر یہاں کیسے آسکتا ہوں۔

——— یہ سورہ الجمعہ کی آیتیں ہیں جو قرآن کی ۶۲ ویں سورہ ہے۔ اس میں مختصر طور پر بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں دین اور معاش کے دوطرفہ تقاضے کے درمیان توازن کس طرح رہنا چاہیے۔

معاشی سرگرمی آدمی کی فطری ضرورت ہے۔ اس لیے اسلام میں اس کی مکمل اجازت دی گئی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ معاشی سرگرمیاں دینی تقاضے کے تحت ہوں نہ کہ اس سے آزاد۔ ہر آدمی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی معاش کے لیے دوڑ دھوپ کرے۔

البتہ اس کی چند شرطیں ہیں (۱) اس کو جو کچھ ملے اس کو وہ سراسر اللہ کا فضل سمجھے (۲) معاشی سرگرمیوں کے درمیان وہ خدا کو برابر یاد کرتا رہے (۳) وہ اپنی معاشی سرگرمیوں کو جائز حدود کے باہر نہ جانے دے۔

معاشی سرگرمی اور دینی تقاضے میں توازن کی صورت یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اور ہر حال میں تیار رہے کہ جب بھی دین کی کوئی پکار سامنے آئے گی وہ معاشی تقاضے کے مقابلہ میں دینی تقاضے کو ترجیح دے گا۔ دینی مطالبہ کو پورا کرنے کے بعد اسے حق ہے کہ وہ دوبارہ اپنی معاشی سرگرمی کی طرف واپس چلا جائے (الجمعہ ۹ - ۱۱)

امریکہ میں مقیم پاکستانی مسلمان ہر سال نہایت اہتمام کے ساتھ یہاں اپنا " قومی میلہ " مناتے ہیں۔ یہ میلہ امریکہ کے مختلف مقامات پر ہوتا ہے۔ نیویارک سے اردو۔ انگریزی میں پاکستانی مسلمان ایک اخبار نکالتے ہیں۔ اس کا نام ہے ——— وطن امریکہ۔ اس کے شمارہ ۲۶ جولائی ۱۹۹۶ میں پورے صفحہ کا ایک اعلان تھا۔ بروکلین میلہ کمیٹی کے زیر اہتمام ساتواں بروکلین میلہ کا اشتہار تھا۔ یہ میلہ ۱۸ اگست ۱۹۹۶ کو ہوا۔ اس کی تفصیل دیتے ہوئے اس میں لکھا تھا:

یاد رکھئے ، بروکلین میں کوئی آئرلینڈ ایونیو کا یہ میلہ ہماری قومی شناخت ہے۔

ہندستانی مسلمان اگر ہندستان میں اپنی مسلم شناخت کی دھوم مچائیں، یا پاکستان کے ہندو وہاں اپنی قومی شناخت کا مظاہرہ کریں تو دونوں ملکوں میں اس کا مخالفانہ ردعمل یقینی ہے۔ مگر امریکہ میں ہر ملک کے لوگ اس طرح کی تقریبیں کرتے ہیں اور یہاں کوئی بھی اس کے خلاف کچھ نہیں بولتا ـــــ اسی فرق میں ہندستان اور پاکستان کی بربادی اور امریکہ کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

امریکہ میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ پاکستان پاک لینڈ کے نام پر بنایا گیا اور بنگلہ دیش سونار بنگلہ کے نام پر۔ مگر جب وہ بن گیا تو لوگ اپنے پاک ملک اور اپنے سنہرے ملک کو چھوڑ کر امریکہ بھاگے چلے آرہے ہیں، ایسا کیوں ہے۔ انھوں نے کہا: یہاں انسان کی قدر ہے۔ اپنے یہاں تو یہ حال ہے کہ کوئی کسی کو بڑھتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر پاک دنیا اور سنہری دنیا کا نعرہ لگانے والوں کو سب سے پہلے انسان بنانے کی تحریک چلانا چاہیے تھا۔

نیویارک میں امان اللہ خان صاحب حیدرآبادی (پیدائش ۱۹۲۰) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پی وی نرسمہاراؤ کے کلاس فیلو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نرسمہاراؤ ہمارے اسکول میں ہمیشہ اول رہتے تھے۔ انھوں نے بہت سے واقعات بتائے مثلاً ایک بار انھیں میتھمیٹکس کے دس سوال دیے گئے اور کہا کہ ان میں سے سات کو حل کیجیے۔ نرسمہاراؤ نے کہا آپ خود ان میں سات کو چن کر مجھے بتا دیجئے (select any seven) میں نے کہا کہ وہ اچھے پرائم منسٹر ثابت نہ ہو سکے۔ انھوں نے کہا:

· He is only a scholar. He is not a good administrator.

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران ایک لطیفہ بتایا کہ ایک بار ٹرین کے فرسٹ کلاس ڈبہ میں ایک شیعہ عالم سفر کر رہے تھے۔ اس میں عیسائی عالم بھی موجود تھے۔ تعارف کے بعد عیسائی عالم نے ان سے کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ خدا کے محبوب تھے۔ اور محمدؐ غیب کی باتیں

بھی جانتے تھے۔ محمدؐ کو پتہ ہونا چاہیے کہ میرا نواسہ حسین بے دردی کے ساتھ قتل کیا جانے والا ہے۔ پھر محمدؐ نے اپنے خدا سے کیوں نہ کہا کہ اے خدا، میرے نواسے کو قاتلوں کے ہاتھ سے بچالے۔ شیعہ عالم نے کہا: اصل یہ ہے کہ محمدؐ نے خدا سے یہ بات کہی تھی۔ مگر خدا نے جواب دیا کہ اے محمدؐ، میں اپنے بیٹے کو سولی پر چڑھائے جانے سے نہ بچا سکا، پھر تمہارے نواسے کو میں کیسے بچاؤں گا۔

جناب افتخار محمد صاحب (۴۴ سال) نے میری کتابیں پڑھی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ سیاسی اقتدار سے ٹکرانا اور مکمل نظام قائم کرنا امتِ مسلم کا نصب العین نہیں۔ حالاں کہ قرآن میں ہے کہ: هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (الصف)

میں نے کہا کہ اس آیت کا حکومت اور اقتدار سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ اس کے الفاظ پر غور کیجیے۔ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ دین توحید کو دوسرے دینوں پر غالب کردو۔ اب دیکھئے کہ یہ دوسرے جو ادیان ہیں ان کی نوعیت کیا تھی۔ ان میں سے کوئی بھی مذہب سیاسی اقتدار یا سیاسی نظام کی حیثیت نہیں رکھتا تھا، نہ پہلے اور نہ اب ۔ ان میں سے ہر ایک مذہب کی حیثیت صرف اعتقادی یا عبادتی نظام کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان میں سے ہر مذہب الٰہیاتی نظام (theological system) ہے نہ کہ کوئی سیاسی نظام۔

اگر آپ خود ساختہ الفاظ کو آیت میں شامل نہ کریں بلکہ صرف آیت کے الفاظ کی روشنی میں اس کا مفہوم متعین کریں تو وہ یہ ہوگا کہ —— توحید پر مبنی نظریہ کو شرک پر مبنی نظریہ کے اوپر غالب کردو۔

میں نے کہا کہ یہ واقعہ پورے معنی میں ظہور میں آچکا ہے۔ تمام دوسرے ادیان نظری اور فکری اعتبار سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ اب صرف توحید ہے جس کو عالمی سطح پر آئیڈیولاجیکل سپر پاور کی حیثیت حاصل ہے۔

محمد ابراہیم خان صاحب (۴۹ سال) کا ۸ اگست کو دل کا آپریشن (بائی پاس سرجری) ہوا ہے۔ انھوں نے کپڑا ہٹا کر دکھایا۔ پاؤں میں پنڈلی کے مقام سے کھال کو چیر کر آرٹری

نکالی گئی اور اس کو دل کے ساتھ جوڑ دیا۔ سینہ میں بالکل بیچ میں لمبا نشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس آپریشن پر ۳۰ ہزار ڈالر خرچ ہوئے۔ اور اس کو کرنے والے ڈاکٹر سبرانیم تھے۔ انھوں نے بتایا کہ چالیس ہزار ڈالر صرف ڈاکٹر سبرانیم کی فیس تھی۔ وہ اتنے اکسپرٹ ہیں کہ آج امریکہ میں ان کی دھوم مچی ہوئی ہے۔

اس بار میرا امریکہ کا سفر بہت لمبا تھا۔ ۱۹ اگست ۱۹۹۶ کی شام کو دہلی سے روانہ ہوا۔ اور دوبارہ ۲۱ ستمبر کو دہلی واپسی ہوئی۔ بعض دوستوں نے اخلاص کے تحت اتنا لمبا پروگرام بنا دیا۔ حالانکہ میرے جیسے کمزور آدمی کے لیے اس قسم کا پروگرام بہت زیادہ خلاف مزاج تھا۔

امریکہ میں مجھے ہر قسم کی اعلیٰ سہولت حاصل تھی۔ بظاہر ہر قسم کا آرام تھا۔ مگر میں مسلسل پریشان رہتا تھا۔ ایک دن بھی ایسا نہیں تھا جو چین کے ساتھ گزرا ہو۔ ایک روز بے قراری کے عالم میں بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے کہا: خدایا، دنیا میں مجھ کو آرام بھی برداشت نہ ہو سکا۔ پھر آخرت کی تکلیف کو میں کس طرح برداشت کروں گا۔

موجودہ سفر سمیت، امریکہ کے لیے میرے سفروں کی تفصیل یہ ہے:

پہلا سفر	نومبر	۱۹۸۵
دوسرا سفر	دسمبر	۱۹۸۸
تیسرا سفر	نومبر	۱۹۹۰
چوتھا سفر	جنوری	۱۹۹۴
پانچواں سفر	اگست	۱۹۹۶

۲۳ اگست کی شام کو ہم لوگ بذریعہ روڈ پنسلوانیا گئے۔ یہ نیویارک سے ۶۵ میل کا سفر تھا۔ یہ سفر جناب قطب الدین حسین انجینیر کی دعوت پر ہوا۔ خواجہ کلیم الدین صاحب، ان کے صاحبزادے بلال اور میں، ہم تین آدمیوں نے رات ان کے مکان پر گزاری۔ صبح کو ہم لوگ ٹرنٹن (Trenton) گئے۔ یہاں کی خوب صورت مسجد میں فجر کی نماز پڑھی گئی۔

فجر کی نماز کے بعد میں نے انگریزی میں درس دیا۔ اس کے بعد چائے سے فارغ ہو کر دوبارہ مسجد کے وسیع بیسمنٹ میں لمبی نشست ہوئی۔ اس میں عرب اور نو مسلم امریکی بھی شریک

تھے، اس لیے یہاں بھی انگریزی میں تقریر کرنا پڑا۔ تقریر کے بعد دیر تک سوال وجواب کی صورت میں یہ مجلس جاری رہی۔ درس کا خلاصہ صفحو کے نیچے درج ہے۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ مرنے کے بعد آنکھ کا عطیہ دینا اسلام میں جائز ہے اور اس کے شرعی دلائل پیش کیے۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ حدیث میں ہے کہ آنکھ اور دوسرے اعضا سے حشر میں سوال کیا جائے گا۔ پھر ان کا عطیہ ہم کیسے دے سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مردہ کو دفن کرنے کے کچھ دنوں بعد اگر آپ قبر کھود کر دیکھیں تو وہاں صرف ہڈیاں ہڈیاں پڑی ہوئی ہوں گی۔ اب سوال یہ ہے کہ آدمی کا سارا جسم (بشمول آنکھ) کہاں چلا گیا۔ وہ کیڑے مکوڑوں کی نذر ہو گیا۔ جو انھوں نے جبری عطیہ کے طور پر لے لیا۔

۲۴ اگست کی صبح کو دوبارہ ہم لوگ نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں جناب خواجہ کلیم الدین صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے پوچھا کہ ہمارے یہاں سے جو انگریزی کتابیں چھپی ہیں، ان کی زبان کے بارے میں یہاں کے اہل زبان لوگوں کا تاثر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس کی زبان کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں امریکہ میں لکھی گئی ہیں۔

ایک واقعہ پیش آیا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ یہاں جب تک آدمی غلطی نہ کرے لوگ مداخلت نہیں کرتے۔

۲۴ اگست کی شام کو جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے دو نوجوانوں کے نام تھے ——— مسٹر مشتاق گوہر، مسٹر عامر صدیقی۔ دونوں ذہین ہیں اور اسی کے ساتھ اسلام پسند بھی۔ ان سے موجودہ مسلم دنیا کے حالات پر گفتگو ہوئی۔ دونوں ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ مشتاق گوہر صاحب نے کہا کہ آپ کی کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ مجھے آپ کی باتوں سے اتفاق ہے۔ مگر یہ بتائیے کہ کیا یہ تحریک کی صورت میں بھی کہیں چل رہی ہے۔ میں نے کہا کہ تحریک تو ہر جگہ چل رہی ہے۔ اور آپ خود بھی اسی تحریک کی ایک مثال ہیں۔

ایک صاحب نے پہلے حبیب اور خلیل کے لغوی معنی پوچھا۔ پھر پوچھا کہ دونوں میں

زیادہ اہم کون ہے۔ اس کے بعد خود ہی کہا کہ ابراہیم خلیل اللہ تھے، اور ہمارے پیغمبر حبیب اللہ تھے۔ اور حبیب اللہ کا درجہ بلاشبہ خلیل اللہ سے بہت زیادہ ہے۔

امریکی کلچر میں بچوں کے اندر خود تعظیمی (self-esteem) کی صلاحیت پیدا کرنے کی بہت زیادہ کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بڑھتے بڑھتے وہاں تک جا پہنچی ہے جس کو جرم کہا جاتا ہے۔ نیویارک ٹائمس میں اس رجحان کے خلاف ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک قصہ بتایا گیا تھا کہ ریاضی کا ایک سوال ایک امریکی بچہ کو دے کر پوچھا گیا کہ کیا تم اس کو کر دوگے۔ اس نے فوراً کہا کہ ضرور (Oh. sure) پھر اسی سوال کو ایک جاپانی بچہ کو دے کر یہی سوال کیا گیا تو اس کا جواب یہ تھا کہ میں کوشش کروں گا (I will try) اس کے بعد جب دونوں سے کہا گیا کہ سوال کو حل کرو تو جاپانی بچہ نے تو ٹاپ کیا اور امریکی بچہ صرف ایوریج نمبر لاسکا۔

۲۵ اگست کو ظہر کی نماز فلشنگ کی مسجد میں پڑھی۔ نماز کے بعد مسجد میں تقریر کا پروگرام تھا۔ یہ مسجد تقریباً ۲۰ سال سے مسلمانوں کے پاس تھی۔ اب اسی سال اس کو شاندار اسلامک سنٹر کی صورت میں تعمیر کرایا گیا ہے۔ اندر اور باہر دونوں طرف سے نہایت خوب صورت ہے اور بالکل جدید طرز پر اس کو بنایا گیا ہے۔

۲۵ اگست کی شام کو ہم لوگ دوبارہ مسجد العابدین پہنچے۔ یہاں کے امام شیخ ضمیر ستار (گیانا) نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں دوبارہ یہاں آؤں اور نماز مغرب کے بعد لوگوں کو ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں بتاؤں۔

میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے کہ: کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله۔

سلفی حضرات اپنے کو صحیح العقیدہ کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ مطلوب عقیدہ پر قائم ہیں۔ مگر میرا بار بار کا تجربہ ہے اور دوسروں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ ان لوگوں کے اندر مطلوب عقیدہ والے اوصاف نہیں ہوتے۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلوب عقیدہ اگر کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کے بعد لازمی طور پر اس کے اندر خشوع اور تواضع کی صفت پیدا ہونی چاہیے۔ مگر ان لوگوں کے اندر برعکس طور پر قساوت اور کبر کا مزاج دکھائی دیتا ہے۔

خبر نامہ اسلامی مرکز-۱۳۴

۱۔ اردو اکیڈمی کی طرف سے ۲۸ مارچ ۱۹۹۸ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سیمنار ہوا۔ یہ سیمنار مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مولانا آزاد کی شخصیت پر تقریر کی۔ یہ تقریر انشاءاللہ الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

۲۔ سہارا میگزین (انگریزی) کے نمائندہ نے ۶ اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ موجودہ سیاسی حالات کی نسبت سے مسلمانوں کا موقف کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔

۳۔ راشٹریہ سہارا میگزین کے نمائندہ مسٹر ایم جے انصاری نے ۱۰ اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر نئے سیاسی حالات میں مسلمانوں کے مستقبل سے تھا۔ اس سلسلہ میں ان کو اسلام کا نقطۂ نظر بتایا گیا۔

۴۔ آؤٹ لک کے نمائندہ رنجیت بھوشن نے ۱۵ اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس بات سے تھا کہ ہندستان کے نئے سیاسی نقشہ میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ کوئی بھی سیاسی نقشہ صرف وقتی طور پر اور محدود طور پر ہی کام کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ مسلمانوں کے لئے کوئی حقیقی مسئلہ نہیں۔ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ابھی تک ان میں مثبت طرز فکر پوری طرح نہ آسکا۔ میری نظر میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ خود مسلمانوں کے اندر حقیقت پسندانہ سوچ کی غیر موجودگی ہے نہ کہ کسی خارجی خطرہ کی موجودگی۔

۵۔ آؤٹ لک ویکلی نیوز میگزین کے نمائندہ رنجیت بھوشن نے ۱۵ اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر "ہندو فرقہ پرستی اور مسلمان" کے مسئلہ سے تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ قرآن کے مطابق مسلمان کے لئے خطرہ صرف ان کی کمزوری ہو سکتی ہے۔ باہر سے ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔

انگریزی اخبار ٹیلی گراف (نئی دہلی) کی نمائندہ غزالہ وہاب نے ۱۶ اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مذہب سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مذہب کو لوگ اس لئے نہیں چھوڑپاتے کہ مذہب انسانی فطرت میں پیوست ہے۔ ہر آدمی خدا اور مذہب کا احساس لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ مادی محرکات لوگوں کو پوری طرح مذہب کو لینے میں مانع بن جاتے ہیں مگر اس کی فطرت اس سے انکار کرتی ہے کہ وہ مذہب کو پوری طرح چھوڑ دے۔

کستور باگرام اندور میں اپریل ۱۹۹۸ کے آخری ہفتہ میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع ۲۱ویں صدی کے لئے نئی قیادت کی تشکیل تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ۲۵-۲۶ اپریل کو دو تقریروں میں موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اکھل بھارت رچناتمک سماج کی طرف سے ۲۸-۲۹ اپریل ۱۹۹۸ کو رشی کیش میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع مذاہب کا اتحاد تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور زیر بحث موضوع پر اسلام کی روشنی میں ایک تقریر کی۔

نئی دہلی کے فادر والسن تھمپو (Rev. Valson Thampu) مسلم۔ مسیحی تعلقات پر ایک جامع رپورٹ تیار کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دونوں فرقوں کے درمیان بہت سارے پہلوؤں سے مشابہت کے باوجود باہمی تعلقات بہت کم ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس دوری کو ختم کیا جائے۔ اور دونوں کے درمیان اختلاط کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔

ا۔ کشمیر ویلفیر سنٹر، ایک فلاحی اور رضاکار ادارہ ہے، جو کشمیر میں ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لئے تعمیری سوچ اور نیا مزاج پیدا کرنے کی نتیجہ خیز کاوشوں میں سرگرم عمل ہے۔ ہم وادی کے باشعور اور پردرد عوام کے تعاون کے متمنی ہیں۔

حمیداللہ حمید ..چیرمین

کشمیر ویلفیر سنٹر کیمپ آفس بیروہ کشمیر ۱۹۳۲۱۱



بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near DVA Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 460
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: caleem@juno.com

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi, Printed at Nice Printing Press, Delhi.

ستمبر ۱۹۹۸، شمارہ ۲۶۳

فہرست	صفحہ

ایک آیت

ویوم یعرض الذین کفروا علی النار اذہبتم
طیبٰتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم
بہا فالیوم تجزون عذاب الہون بما
کنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق وبما
کنتم تفسقون (الاحقاف ۲۰)

اور جس دن انکار کرنے والے آگ کے سامنے لائے
جائیں گے تم اپنی اچھی چیزیں دنیا کی زندگی میں لے
چکے اور ان کو برت چکے تو آج تم کو ذلت کی سزا دی
جائے گی، اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کرتے
تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانی کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کے بعد انسان کو زمین پر بسایا گیا اور اس کو مختلف قسم کے سازو سامان دیے گئے۔ اس طرح انسان کو یہ موقع دیا گیا کہ وہ کائنات کے اس حصہ میں آباد ہو اور یہاں اپنی ایک زندگی بنائے۔ انسان کو یہ موقع ذاتی عطیہ کے طور پر نہیں دیا گیا ہے بلکہ اس کا مقصد صرف ایک ہے، اور وہ آزمائش ہے۔ انسان کو زمین پر بساکر ہر ایک کا ٹیسٹ لیا جا رہا ہے اور یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اس ٹیسٹ میں اپنے کو اچھا ثابت کرتا ہے اور کون برا۔

اس آزمائشی صورت حال نے ہر ایک کے لیے دو میں سے ایک کے انتخاب کا موقع دے دیا ہے۔ اب کوئی اقرار کرنے والا ہے اور کوئی انکار کرنے والا، کوئی متکبر بن کر رہتا ہے اور کوئی متواضع بن کر، کوئی فرماں بردار ثابت ہوتا ہے اور کوئی نافرمان، کوئی مادی روش اختیار کرتا ہے اور کوئی ربانی روش۔

اس امتحان کی حالت نے ہر شخص کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا ہے جہاں اس کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے —— دنیا کا یا آخرت کا۔ دنیا کے فائدے دکھائی دیتے ہیں اور آدمی کو فوراً حاصل ہو جاتے ہیں، اس کے برعکس آخرت کا فائدہ دکھائی نہیں دیتا اور وہ موت کے بعد کسی آدمی کو ملے گا۔ اب ایک انسان وہ ہے جو خدا کو اپنا مرکزِ توجہ بنائے جس کا مقصود بعد کو آنے والی آخرت ہو، جو آج کی طیبات کو چھوڑے اور آخرت کی طیبات کو وہ اپنی تمناؤں کا مرکز بنائے۔ ایسا انسان خواہ دنیا میں بظاہر کامیاب نہ ہو مگر آخرت کی کامیابی یقینی طور پر اسے حاصل ہوگی۔ دوسرا انسان وہ ہے جو اپنے مواقع کو دنیا کی دولت اور عزت کے حصول میں لگا دے۔ ایسے لوگ آخرت کی خوشیوں اور لذتوں میں کوئی حصہ نہیں پائیں گے۔

پڑوسی کا حق

قرآن و حدیث میں پڑوسی کا بہت حق بتایا گیا ہے۔ امام بخاری نے ابو رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پڑوسی قریب ہونے سے شفع کا زیادہ حق دار ہے (الجارُ احقُّ بسقَبِہ) مشکاۃ المصابیح ۸۹۳/۲

حضرت ابو رافع کے واقعات کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ مدینہ میں ان کے دو مکانات تھے۔ ں سے ایک مکان وہ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ ایک شخص نے اس مکان کو پانچ سو دینار نقد کر خریدنا چاہا مگر ساتھ ہی اس مکان کے ایک اور خواہش مند تھے اور وہ حضرت سعد بن وقاص جو حضرت ابو رافع کے پڑوسی تھے۔ انھوں نے اپنے مکان کو حضرت سعد کے ہاتھ فروخت کر دیا اپنی پیش کش کے مطابق، انھوں نے صرف چار سو دینار ادا کیے اور وہ بھی قسطوں میں۔ اس ح پر حضرت ابو رافع نے کہا کہ پڑوسی ہونے کے اعتبار سے سعد بن وقاص اس مکان کے زیادہ دار ہیں۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک ایک بہت بڑا دینی عمل ہے۔ آدمی کو اس عمل کا بہترین بدلہ ت میں ملے گا۔ تاہم دنیا کے اعتبار سے بھی اس اسلامی تعلیم کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس دنیوی حکمت کے بے شمار پہلو چھپے ہوئے ہیں۔

ایک شخص جو آپ کے پڑوس میں ہے وہ آپ کا صبح و شام کا ساتھی ہے۔ اس سے بار بار سابقہ آتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کا پڑوسی اگر آپ سے ناراض ہو تو وہ بے شمار طریقوں سے آپ کو مان پہنچا سکتا ہے۔ حتی کہ اگر وہ آپ کے معاملات میں غیر جانب دار ہو جائے تب بھی اس کی پانبداری آپ کے لیے سخت مضر ثابت ہوگی۔

آپ کے حسنِ سلوک نے اگر آپ کے پڑوسی کو آپ کا دوست بنا رکھا ہو۔ آپ کے سانات کی بنا پر اس کی فطرت یہ کہہ رہی ہو کہ مجھے بھی احسان کا بدلہ احسان سے دینا چاہیے، ایسا پڑوسی آپ کے لیے تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ اس کو جتنا فائدہ پہنچائیں گے سے کہیں زیادہ فائدہ آپ کو اس کی طرف سے ملے گا۔

جنت والے

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کیا چیز ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ جنت میں لے جائے گی۔ آپ نے جواب دیا کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا اور بہتر اخلاق (سئل رسول اللہ ﷺ عن اکثر ما یدخل الناس الجنۃ— قال تقوی اللہ وحسن الخلق) الترمذی۔

کسی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ دنیا میں ایسی زندگی گذارے کہ جب وہ مر کر اگلی دنیا میں پہنچے تو وہاں اس کو جنت میں رہنا نصیب ہو، وہ وہاں ابدی خوشیوں کی زندگی پاسکے۔ اسی کامیاب زندگی کا راز اس حدیث میں بتایا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز تقویٰ کی روش ہے۔ یعنی خدا کو بڑا مان کر اس سے ڈرتے رہنا۔ اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھنا۔ یہ یقین کرنا کہ میں کسی بھی حال میں خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ میرے کھلے اور چھپے تمام احوال خدا کے علم میں ہیں۔ میری کوئی بھی تدبیر مجھ کو خدا سے بچانے والی نہیں۔

یہ یقین جس آدمی کے دل میں آجائے اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ آزاد زندگی کو چھوڑ کر پابند زندگی اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنے آپ کو غیر ذمہ دارانہ روش سے بچاتا ہے۔ اور ذمہ دارانہ روش کو اختیار کرتا ہے۔ یہ عقیدہ اس سے گھمنڈ اور انانیت جیسے جذبات کو چھین لیتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کا فرماں بردار بندہ بن جاتا ہے۔

جنتی انسان کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس کا کردار جنتی کردار بن جاتا ہے۔ لوگوں کے درمیان وہ اسی دنیا میں اس طرح رہنے لگتا ہے جس طرح آخرت میں جنت کے باشندے آپس میں رہیں گے۔ اس کے دل میں لوگوں کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی زبان میٹھے بول سے تر رہتی ہے۔ وہ لوگوں سے اس طرح ملتا ہے جیسے ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی سے ملے۔ دوسروں سے معاملہ کرنے میں وہ ہمیشہ انصاف پر قائم رہتا ہے۔ جب بھی وہ لوگوں سے کوئی معاملہ کرتا ہے تو اس وقت اخلاقی اور انسانی اصول اس کے رہنما ہوتے ہیں نہ کہ محض ذاتی مفادات۔

نیکی کرنا

قرآن میں زندگی کے جو اصولی احکام بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی کو چاہئے
نیک کام کرے کیوں کہ نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاددہانی ہے یاددہانی حاصل کرنے
کے لئے ﴿إن الحسنٰت یذھبن السیأت ذٰلك ذکریٰ للذاکرین﴾ ہود ال۔

موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے انسان سے بار بار کوئی غلطی یا برائی ہو جاتی ہے کبھی خدا کی نسبت سے
انسان کی نسبت سے۔ آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ جو غلطی یا برائی اس سے ہوئی ہے وہ اس
ختم کردے۔ ایسی حالت میں انسان کو کیا کرنا چاہئے، اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

وہ جواب یہ ہے کہ آدمی سے جب کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد وہ نیکی کا کوئی کام
۔ اس طرح اس کی غلطی کی تلافی ہو جائیگی۔ اس کا اچھا عمل اس کے برے عمل کو ڈھانپ لے
اس کو ایسا کردے گا گویا کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ خدا کی عبادت میں اگر کمی ہو جائے تو
کو چاہئے کہ وہ مزید عبادت کر کے اس کی تلافی کرے۔ وہ خدا کے لئے مزید بندگی اور وفاداری کا
نجام دے کر خدا کی رحمت کو دوبارہ اپنی طرف متوجہ کرلے۔ اس طرح وہ دوبارہ اطمینان قلب کا
حاصل کرلے گا۔

انسان کی نسبت سے اگر کوئی غلطی واقع ہو تو اس کی تلافی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً اگر آپ
ی کو برا کہہ دیا یا اس کو گالی دیدی تو آپ کو چاہئے کہ اس سے مل کر اس سے معافی مانگیں اور تعلقات
رہ معتدل بنائیں۔ غلطی پر معافی مانگنا بیک وقت اپنے اندر دو فائدے رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ ایسا
، آدمی اپنے آپ کو احساس گناہ کی شرمندگی سے بچالیتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آپ نے جس
کے دل کو تکلیف پہنچائی ہے اس کی شکایت کو رفع کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔

اسی طرح برائی کے بعد نیکی کرنے کی ایک اور صورت یہ ہے کہ اس کے لئے مال خرچ کیا
۔ جس آدمی کے ساتھ برائی کا فعل ہوا ہے اس کو تحفہ دینا یا مالی مدد پہنچانا۔ اس کے نام پر مال کا
کرنا۔ اگر آپ نے کسی کو مالی نقصان پہنچایا ہے تو نقصان کے بقدر اس کی تلافی کرنا، وغیرہ۔

غیبت کا کفارہ

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ تم اس کے حق میں بخشش کی دعا کرو جس کی تم نے غیبت کی ہے۔ تم یہ کہو کہ اے اللہ، تو مجھ کو اور اس کو بخش دے (ان من کفارة الغيبة ان تستغفر لمن اغتبته تقول اللهم اغفر لنا وله) البیہقی۔

اجتماعی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی زبان سے دوسرے کے لئے کچھ برے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ جو غیبت کی تعریف میں آتے ہیں، جس کو اگر صاحب معاملہ سنے تو اس کو سخت تکلیف ہو گی۔ غیبت کو خدا کے دین میں گناہ بتایا گیا ہے۔ ایسی حالت میں وہ شخص کیا کرے جس کی زبان سے اپنے بھائی کے لئے غیبت والے الفاظ نکل گئے ہیں۔ اس نے اپنے بھائی کے حق میں اس کی غیر موجودگی میں ایسے کلمات کہہ دئے ہیں کہ اگر وہ اس کو سنے تو اس کے دل کو تکلیف پہنچے گی۔

اس کا حل دین میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی اس کے حق میں دعا کرے جس کے خلاف غیبت کے الفاظ اس کی زبان سے نکل گئے ہیں۔ وہ اپنے لئے خدا سے بھلائی مانگے اور اپنے بھائی کے لئے بھی خدا سے بھلائی کی درخواست کرے۔ وہ اپنی اصلاح کا طالب بھی ہو اور اپنے بھائی کی اصلاح کا طالب بھی۔ اس قسم کی دعا سادہ طور پر کچھ الفاظ بولنے کا نام نہیں۔ وہ اس شخص کے حق میں خیر خواہی کا اظہار ہے جس کے خلاف غیبت کا فعل ہوا تھا۔ غیبت اپنی حقیقت کے اعتبار سے نفرت اور بد خواہی کا عمل ہے۔ اگر کسی سے اس قسم کا عمل سرزد ہو جائے تو آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے دل سے نفرت اور بد خواہی کے جذبات کو نکالے اور اس کی جگہ متعلق شخص کے حق میں محبت اور خیر خواہی کے جذبات پیدا کرے۔ اسی محبت اور خیر خواہی کا ایک اعلیٰ اظہار وہ ہے جس کو اس حدیث میں دعا کہا گیا ہے۔

جس سماج میں غیبت عام ہو جائے وہ سماج نفرت اور بے اعتمادی کا سماج بن جائے گا۔ کسی سماج کو اس بگاڑ سے بچانے کی تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ اسپرٹ پیدا کی جائے کہ جب کبھی ان کی زبان سے غیبت کے الفاظ نکل جائیں تو اس کے بعد وہ نیک دعاؤں سے دوبارہ اس برائی کو دھو دیں۔

بد گمانی

صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں یہ روایت آئی ہے کہ پیغمبر اسلام نے لوگوں کو ہدایت ہوئے کہا کہ تم لوگ گمان سے بہت زیادہ بچو، کیوں کہ گمان سب سے بڑا جھوٹ ہے (ایاکم ن فان الظن اکذب الحدیث) متفق علیہ۔

گمان یہ ہے کہ آدمی پوری معلومات کے بغیر کسی کے بارے میں ایک رائے قائم کر لے۔ ہر کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ ہر آدمی کا عمل بہت سے اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں تحقیق کے بغیر کسی کے عمل کی حقیقت کو جاننا ممکن نہیں۔ کوئی شخص کسی کا صرف ایک عمل کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لے تو یہ گمان ہوگا۔ اور گمان کسی کے لئے بھی جائز ہے۔

آدمی کے ہر عمل کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں، اس لئے اس کی توجیہات بھی متنوع اور ہوتی ہیں۔ دوسروں کے بارے میں آدمی کا مشاہدہ یا تجربہ ہمیشہ جزئی مشاہدہ اور تجربہ ہوتا ایسی حالت میں کسی کی ایک روش کو دیکھ کر اس کے خلاف برا گمان کرنا گویا جزئی علم کو کلی علم لینا ہے۔ ناقص معلومات پر کامل واقفیت کا دعوی کرنا ہے۔ اس لئے کسی کے خلاف بد گمانی عین نم کی ایک چیز بن جاتی ہے جیسا کہ جھوٹ۔

جھوٹ اخلاقی حیثیت سے انتہائی معیوب کلام ہے۔ وہ خدائی شریعت کے اعتبار سے سراسر ہے۔ ایسی حالت میں جو آدمی کسی کے خلاف بد گمانی کرتا ہے تو وہ ایک بے حد سنگین جرم کا ب کرتا ہے۔ ایسا کر کے وہ خدا کی نظر میں اپنے آپ کو ایک غیر مطلوب بندہ بنالیتا ہے۔ اور ں کی نظر میں وہ ایک ایسا شخص بن جاتا ہے جس سے تمام لوگ نفرت کریں۔ جس کو سماج میں ت درجہ نہ ملے۔

گمان کی بنیاد پر کسی کے خلاف رائے قائم کرنے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی کوئی رائے ہی قائم نہ ہ۔ آدمی رائے قائم نہ کرنے کے لئے آزاد ہے۔ مگر رائے قائم کرتے ہی وہ قابل مواخذہ ہو جاتا ہے۔

اچھا گمان کرنا جائز ہے۔ اور برا گمان کرنا بلاشبہ ناجائز

غیبت کا کفارہ

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ تم اس کے حق میں بخشش کی دعا کرو جس کی تم نے غیبت کی ہے۔ تم یہ کہو کہ اے اللہ، تو مجھ کو اور اس کو بخش دے (ان من کفارۃ الغیبۃ ان تستغفر لمن اغتبتہ تقول اللھم اغفر لنا ولہ) البیہقی۔

اجتماعی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی زبان سے دوسرے کے لئے کچھ برے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ جو غیبت کی تعریف میں آتے ہیں، جس کو اگر صاحب معاملہ سنے تو اس کو سخت تکلیف ہو گی۔ غیبت کو خدا کے دین میں گناہ بتایا گیا ہے۔ ایسی حالت میں وہ شخص کیا کرے جس کی زبان سے اپنے بھائی کے لئے غیبت والے الفاظ نکل گئے ہیں۔ اس نے اپنے بھائی کے حق میں اس کی غیر موجودگی میں ایسے کلمات کہہ دئے ہیں کہ اگر وہ اس کو سنے تو اس کے دل کو تکلیف پہنچے گی۔

اس کا حل دین میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی اس کے حق میں دعا کرے جس کے خلاف غیبت کے الفاظ اس کی زبان سے نکل گئے ہیں۔ وہ اپنے لئے خدا سے بھلائی مانگے اور اپنے بھائی کے لئے بھی خدا سے بھلائی کی درخواست کرے۔ وہ اپنی اصلاح کا طالب بھی ہو اور اپنے بھائی کی اصلاح کا طالب بھی۔ اس قسم کی دعا سادہ طور پر کچھ الفاظ بولنے کا نام نہیں۔ وہ اس شخص کے حق میں خیر خواہی کا اظہار ہے جس کے خلاف غیبت کا فعل ہوا تھا۔ غیبت اپنی حقیقت کے اعتبار سے نفرت اور بد خواہی کا عمل ہے۔ اگر کسی سے اس قسم کا عمل سرزد ہو جائے تو آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے دل سے نفرت اور بد خواہی کے جذبات کو نکالے اور اس کی جگہ متعلق شخص کے حق میں محبت اور خیر خواہی کے جذبات پیدا کرے۔ اسی محبت اور خیر خواہی کا ایک اعلے اظہار وہ ہے جس کو اس حدیث میں دعا کہا گیا ہے۔

جس سماج میں غیبت عام ہو جائے وہ سماج نفرت اور بے اعتمادی کا سماج بن جائے گا۔ کسی سماج کو اس بگاڑ سے بچانے کی تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ اسپرٹ پیدا کی جائے کہ جب کبھی ان کی زبان سے غیبت کے الفاظ نکل جائیں تو اس کے بعد وہ نیک دعاؤں سے دوبارہ اس برائی کو دھودیں۔

بد گمانی

لح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں یہ روایت آئی ہے کہ پیغمبر اسلام نے لوگوں کو ہدایت
ۓ کہا کہ تم لوگ گمان سے بہت زیادہ بچو، کیوں کہ گمان سب سے بڑا جھوٹ ہے (ایاکم
؛ الظن اکذب الحدیث) متفق علیہ۔
ان یہ ہے کہ آدمی پوری معلومات کے بغیر کسی کے بارے میں ایک رائے قائم کر لے۔ ہر
ی ایک دنیا ہوتی ہے۔ ہر آدمی کا عمل بہت سے اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں
ت کے بغیر کسی کے عمل کی حقیقت کو جاننا ممکن نہیں۔ کوئی شخص کسی کا صرف ایک عمل
ں کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لے تو یہ گمان ہوگا۔ اور گمان کسی کے لئے بھی جائز

آدمی کے ہر عمل کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں، اس لئے اس کی توجیہات بھی متنوع اور
رتی ہیں۔ دوسروں کے بارے میں آدمی کا مشاہدہ یا تجربہ ہمیشہ جزئی مشاہدہ اور تجربہ ہوتا
ں حالت میں کسی کی ایک روش کو دیکھ کر اس کے خلاف برا گمان کرنا گویا جزئی علم کو کلی علم
ہے۔ ناقص معلومات پر کامل واقفیت کا دعوی کرنا ہے۔ اس لئے کسی کے خلاف بدگمانی عین
ی ایک چیز بن جاتی ہے جیسا کہ جھوٹ
جھوٹ اخلاقی حیثیت سے انتہائی معیوب کلام ہے۔ وہ خدائی شریعت کے اعتبار سے سراسر
ہے۔ ایسی حالت میں جو آدمی کسی کے خلاف بدگمانی کرتا ہے تو وہ ایک بے حد سنگین جرم کا
، کرتا ہے۔ ایسا کر کے وہ خدا کی نظر میں اپنے آپ کو ایک غیر مطلوب بندہ بنالیتا ہے۔ اور
، کی نظر میں وہ ایک ایسا شخص بن جاتا ہے جس سے تمام لوگ نفرت کریں۔ جس کو سماج میں
ہ درجہ نہ ملے۔
گمان کی بنیاد پر کسی کے خلاف رائے قائم کرنے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی کوئی رائے ہی قائم نہ
۔ آدمی رائے قائم نہ کرنے کے لئے آزاد ہے۔ مگر رائے قائم کرتے ہی وہ قابل مواخذہ ہو جاتا ہے۔
اچھا گمان کرنا جائز ہے۔ اور برا گمان کرنا بلاشبہ ناجائز

بھلی بات

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ بولے تو بھلی بات بولے، ورنہ چپ رہے (من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیراً او لیصمت)۔

دنیا کا اکثر بگاڑ کسی غلط بول کا نتیجہ ہوتا ہے اسی طرح دنیا کا اکثر بناؤ کسی اچھے بول کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک بول سے لوگوں میں محبت بڑھتی ہے اور دوسرا بول لوگوں میں نفرت پھیلانے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں سنجیدہ اور ذمہ دار آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان و قلم کو استعمال کرنے میں بے حد احتیاط کرے۔

زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کچھ لکھنا یا بولنا چاہتا ہے مگر لکھنا یا بولنا اسی انسان کے لئے جائز ہے جو مذکورہ پیغمبرانہ ہدایت پر عمل کرے۔ جو شخص اس ہدایت پر عمل نہ کر سکے اس کے لئے لکھنا اور بولنا سرے سے جائز ہی نہیں۔

اس معاملہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کے پاس کہنے کے لئے ایک ایسی بات ہے جو دوسروں کے بارے میں اچھا گمان پیدا کرنے والی ہے۔ جس کی اشاعت سے لوگوں کے درمیان محبت کی فضا پیدا ہونے کی امید ہے۔ جو واضح طور پر ایک ایسی بات ہے جس سے لوگوں کے اندر مثبت ذہن یا تعمیری شوق پیدا ہونے والا ہے۔ اس قسم کی بات بلاشبہ ایک بھلی بات ہے اور اس کو کہنے پر خدا کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ جو بات لکھنے یا کہنے جارہے ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک منفی بات ہے۔ اندیشہ ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے اندر بدگمانیاں پیدا ہوں۔ لوگوں کے اندر اشتعال بھڑکے۔ لوگ ایک دوسرے کے خلاف نفرت کرنے لگیں۔ انسانیت دوست اور دشمن میں تقسیم ہو جائے۔ ایسی صورت میں آپ کے اوپر لازم ہے کہ آپ چپ رہیں، نہ کہ بول کر انسانیت کے مسائل میں اضافہ کا سبب بن جائیں۔

عافیت کا راز

پیغمبر اسلام ﷺ کے ایک صحابی حضرت عمیر بن حبیب بن حماشہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ جو آدمی نادان کے چھوٹے شر پر راضی نہ ہوگا۔ اس کو نادان کے بڑے شر پر راضی ہونا پڑے گا (من لا یرضی بالقلیل مما یاتی بہ السفیہ یرضی بالکثیر) الطبرانی۔

موجودہ دنیا ہر قسم کے انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں اگر اچھے لوگ ہیں تو اسی کے ساتھ برے لوگ اور نادان لوگ بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ امتحان کی مصلحت کی بنا پر ان میں سے ہر ایک کو آزادی حاصل ہے۔ اس لئے موجودہ دنیا میں حالات کبھی معتدل نہیں رہتے۔ یہاں بار بار ایک کو دوسرے سے شکایت پہنچتی ہے۔ یہاں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے لئے کسی نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ سب ہنگامۂ حیات کا نتیجہ ہے۔ اس سے بچنا کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

اب ایک شخص وہ ہے کہ جب اس کو کسی سے تکلیف پہنچے تو وہ فوراً اس کا بدلہ لینے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ وہ تکلیف پہنچانے والے کو سبق دینا چاہے۔ مگر موجودہ دنیا میں اس قسم کی جوابی کاروائی کا نتیجہ مزید برائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہاں عقل مند وہ ہے جو چھوٹی تکلیف کو برداشت کر لے تاکہ وہ بڑی تکلیف سے بچ سکے۔ ابتدائی تکلیف ہمیشہ چھوٹی تکلیف ہوتی ہے اور دوبارہ پیش آنے والی تکلیف زیادہ بڑی تکلیف۔ اس لئے ابتدائی تکلیف کو برداشت کر لینا اپنے نتیجہ کے اعتبار سے بڑے شر کے مقابلہ میں چھوٹے شر کو گوارہ کرنا ہے۔

موجودہ دنیا میں انتخاب (چوائس) بے شر اور شر کے درمیان نہیں ہے بلکہ چھوٹے شر اور بڑے شر کے درمیان ہے۔ ایسی حالت میں چھوٹے شر کو گوارہ کر لینا عقل مندی ہے نہ کہ بے شر کی طرف دوڑنا، کیوں کہ بے شر حالت اس دنیا میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔

یہ فطرت کا اصول ہے۔ اور اس دنیا میں کوئی کامیابی فطرت کی پیروی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے نہ کہ اس سے انحراف کے ذریعہ۔

برداشت کا فائدہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے غصہ کو ضبط کرے جب کہ وہ اس کے نفاذ پر قادر ہو تو اللہ اس کے دل کو ایمان اور سلامتی سے بھر دیتا ہے (من کظم غیظا وھو یقدر علی انفاذہ ملأ اللہ قلبہ امنا و ایمانا)۔

یہ پیغمبرانہ تعلیم انسانیت کی تعمیر کے لئے شاہ کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن افراد کے اندر یہ صفت ہو وہ اعلیٰ روحانی ترقی حاصل کریں گے اور جس سماج کے بیشتر لوگ اس صفت کے حامل ہوں وہ سماج امن و سکون کا گہوارہ بن جائے گا۔

جب ایک آدمی کے اندر کسی کے خلاف غصہ آجائے اور وہ اس غصہ کے اظہار پر قادر ہو اس کے باوجود وہ غصہ کو اپنے اندر ہی اندر ضبط کرلے تو یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں ہوتا۔ ایسا آدمی اپنے اس عمل کے ذریعہ اپنے اندر ایک نئی اخلاقی طاقت کو جنم دیتا ہے۔ وہ ترقی کر کے نیا انسان بن جاتا ہے۔

وہ اپنے اندر نفرت کے بجائے محبت کی پرورش کرتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو انتقام کے بجائے معافی کے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ وہ اپنے اندر منفی نفسیات کو دباتا ہے اور اس کی جگہ مثبت نفسیات کو فروغ دیتا ہے۔ اس طرح غصہ کو ضبط کرنا اس کے لئے اپنی شخصیت کی تعمیر کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں مثبت شخصیت کی تعمیر کا سب سے بڑا کورس یہی ہے۔ اسی کورس سے گذر کر وہ آدمی بنتا ہے جو اعلیٰ انسانی صفات کا حامل ہو۔ جو لوگ غصہ کو ضبط کرنے کی اس تعلیم کو اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوں ان کی شخصیت کی اعلیٰ تعمیر بھی واقعہ بننے والی نہیں۔

غصہ کا اظہار شخصیت کو برہم کرتا ہے اور غصہ کو ضبط کرنا شخصیت کو سکون عطا کرتا ہے۔ غصہ اگر پیچھے کی طرف سفر ہے تو غصہ کو ضبط کرنا آگے کی طرف سفر۔ غصہ یہ ہے کہ آدمی حالات کے درمیان گھر کر رہ جائے اور غصہ کو ضبط کرنا یہ ہے کہ آدمی حالات سے اٹھ کر اپنے جینے کے لئے ایک بلند تر سطح حاصل کرلے۔ غصہ برداشت کرنے میں صرف فائدہ ہے، اور غصہ برداشت نہ کرنے میں صرف نقصان۔

تالیفِ قلب

قرآن میں زکوٰۃ کی ۸ مدیں بتائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک مد وہ ہے جس کے لیے تالیفِ قلب کا لفظ آیا ہے (التوبہ ۶۰) اس سے مراد ہے الفت یا دل جوئی کے لیے خرچ کرنا۔ یہ مد اصلاً غیر مسلموں کے لیے رکھی گئی ہے تاکہ ان کے دل نرم ہوں اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو سکیں۔

تالیفِ قلب سے مراد صرف مال خرچ کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ایک مستقل اصول ہے جو دعوتی عمل میں مختلف پہلوؤں سے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کو ایک لفظ میں دعوتی دل جوئی کہا جا سکتا ہے۔ اس دعوتی دل جوئی کی چند مثالیں یہ ہیں:

۱۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا تو ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ تم لوگ فرعون سے نرم انداز میں اپنی بات کہنا (فقولا لہ قولاً لیّناً) طٰہٰ ۴۴

حضرت موسیٰ کو یہ ہدایت فرعون کے مقابلہ میں دی گئی جو کہ معلوم طور پر ایک سرکش انسان تھا۔ اس لحاظ سے اس حکم کا مطلب یہ ہوا کہ مخاطب (یا مدعو) خواہ سرکشی کرے، خواہ وہ اشتعال انگیز انداز اختیار کرے، داعی کو ہر حال میں نرم انداز میں گفتگو کرنا ہے۔ اس کو یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو اس کا پابند بنانا ہے کہ وہ مدعو کی سخت کلامی کا اثر نہ لیتے ہوئے اپنی بات ٹھنڈے طریقہ سے کہے گا، وہ کسی حال میں بھی ردعمل کا طریقہ اختیار نہیں کرے گا۔

۲۔ قرآن میں اہل کتاب کو خطاب کرتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں: قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواءٍ بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ (آل عمران ۶۴) یعنی اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم عبادت نہ کریں سوا ایک اللہ کے۔ یہ انداز کلام بھی تالیف قلب کی ایک مثال ہے۔ اس آیت میں کلمۃ سواء کا لفظ تقریب کے لیے ہے۔ وہ اس لیے ہے کہ مخاطب دعوت کو اجنبی سمجھ کر اس سے متوحش نہ ہو بلکہ اسے خود اپنی ایک چیز سمجھ کر اس کو قبول کرے —— یہ دوری کو قربت میں تبدیل کرنے کی ایک حکیمانہ تدبیر ہے۔

۳۔ قرآن میں حکیمانہ دعوت کے لیے جو احکام دیے گئے ہیں ان میں سے ایک حکم یہ ہے: وقل لھم فی انفسھم قولاً بلیغاً (النساء ۶۳) اس آیت کا ترجمہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان الفاظ میں کیا ہے: وبگو بایشاں سخنے موثر در دلِ ایشاں۔ یعنی ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دل پر اثر کرنے والی ہو جو ان کے اندر تک اتر جائے۔

قرآن کی یہ آیت منافقین کے ذیل میں آئی ہے جو کہ اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ اس اعتبار سے اس حکم کا مطلب یہ ہوا کہ فریق ثانی خواہ تمہارے خلاف اشتعال انگیز کارروائیوں میں مشغول ہو، تب بھی تم اعتدال کا رویہ نہ چھوڑو۔ تم ان کے رویہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر حال میں ان کے خیر خواہ بنے رہو۔ تم جب بھی ان سے خطاب کرو تو ایسے بہترین اسلوب میں خطاب کرو جو ان کو اپیل کرنے والا ہو، جو ان کو تمہارے قریب لائے، نہ کہ اور زیادہ تم سے دور کر دے۔

۴۔ تالیفِ قلب کی ایک رہنما مثال وہ ہے جو ہجرت کے بعد یہود کے معاملہ میں اختیار کی گئی۔ دین اسلام میں کعبہ کو عبادت کا قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ گئے تو وہاں آپ نے بیت المقدس کو اپنا قبلۂ عبادت بنالیا جو کہ یہود کا قبلہ تھا۔ ۱۶ یا ۱۷ ماہ تک آپ اور تمام مسلمان اسی کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے یہاں تک کہ نیا حکم آیا اور آپ نے دوبارہ کعبہ کو اپنا مستقل قبلہ بنالیا (فتح الباری ۲۱/۸)

پیغمبر اسلام نے کیوں ایسا کیا کہ وہ تقریباً ڈیڑھ سال تک یہود کے قبلہ کو اپنا قبلہ بنائے رہے اس کا سبب تالیفِ قلب تھا۔ آپ نے ایسا اس لیے کیا کہ یہود آپ سے اجنبیت کے بجائے قربت محسوس کریں اور اس طرح اسلام کے دائرہ میں آنا ان کے لیے آسان ہو جائے (فاختار القدس طمعاً فی ایمان الیہود و استمالتہم) تفسیر القرطبی ۲/۱۵۰

ان چند مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تالیف قلب یا دل جوئی کا مطلب کیا ہے۔ یہ دعوتی اسلوب کا لازمی تقاضا ہے۔ داعی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ناصحانہ اور حکیمانہ انداز میں اپنے مدعو تک اس بات کو پہنچائے جس کو وہ کامل حق سمجھتا ہے۔ یہ پہنچانا سادہ طور پر صرف اعلان کے معنی میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ اخلاص اور خیر خواہی کے انداز میں ہوتا ہے۔ دعوت کا یہ پہلو داعی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ تالیف قلب کی تمام شرطوں کو پورا کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو ادا کرے۔

تالیف قلب کی کوئی ایک یا چند متعین صورت نہیں۔ داعی کا مزاج اور زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اس کی مختلف اور متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔ داعی کے اندر اپنے مدعو کے لیے خیر خواہی کا جذبہ اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ ہر طرح مدعو کی رعایت کرے گا، وہ ہر موقع پر خود ہی یہ جان لے گا کہ اسے اپنے مدعو کو راہ راست پر لانے کے لیے کیا اور کس طرح کرنا چاہیے۔

دعوت در اصل مدعو کے حق میں محبت اور خیر خواہی کا اظہار ہے۔ سچا داعی وہ ہے جو اپنے جذبات سے زیادہ مدعو کے جذبات کا لحاظ کرے۔ جو اپنی مصلحتوں پر مدعو کی مصلحت کو مقدم بنائے۔ جو اپنے وقار کو نظر انداز کرکے مدعو کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کرے۔ اس یک طرفہ کردار کے بغیر دعوتی کام کی انجام دہی ممکن نہیں۔

ایک شخص کیچڑ میں پھنسا ہوا ہو اور آپ اس کو اس سے نکالنا چاہیں تو یقینی طور پر آپ کے دامن پر بھی کیچڑ کے کچھ نہ کچھ چھینٹے آجائیں گے۔ یہی معاملہ داعی اور مدعو کا بھی ہے۔ داعی جب مخلصانہ طور پر مدعو کو اس کی برائیوں سے بچانا چاہے اور تالیف قلب کی حد تک اس کی اصلاح کا حریص ہو جائے تو اس کے ساتھ بھی لازماً اس طرح کے معاملات پیش آئیں گے۔ مدعو کو بچانے کی کوشش میں جب وہ اس کے قریب جائے گا تو بظاہر اس کا دامن بھی کہیں نہ کہیں ملوث ہوتا ہوا دکھائی دے گا مگر داعی کے لیے یہ سب کچھ عین ثواب ہے۔ اس قسم کی چیزیں داعی کے مقام کو خدا کی نظر میں بڑھانے والی ہیں نہ کہ کسی بھی درجہ میں اس کے مقام کو گھٹانے والی۔

حدیبیہ پرنسپل

۶ ستمبر ۱۹۹۲ کو مسٹر آصف جیلانی (مقیم لندن) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو آپ اکثر حدیبیہ کے اصول پر عمل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ حدیبیہ کا معاہدہ پیغمبر اسلام نے تو وحی کی بنیاد پر کیا تھا۔ آج کے مسلمان کس طرح اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حدیبیہ ہی نہیں بلکہ آپ کا ہر قول و فعل وحی کی بنیاد پر ہوتا تھا، جیسا کہ قرآن میں ہے: وما ینطق عن الہوی ان ھو الا وحی یوحی (النجم ۳-۴) پھر کیا آپ رسول اللہ کی ہر بات کو اسی عذر کی بنیاد پر چھوڑ دیں گے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو ہر بات بذریعہ وحی بتائی۔ پھر آپ نے اس پر عمل کیا۔ اس طرح آپ کا قول و عمل ہمارے لئے نمونہ بن گیا۔

حدیبیہ ایک سنت رسول ہے۔ یہ کس موقع کے لئے سنت ہے۔ اس کا اندازہ اس زمانہ کے حالات کے مطالعہ سے ہوتا ہے جب کہ حدیبیہ کا معاملہ کیا گیا۔ صورت حال یہ تھی کہ ہجرت کے بعد مخالفین اسلام نے جنگ چھیڑ دی۔ کئی جھڑپیں یا جنگیں ہوئیں۔ مگر وہ فیصلہ کن نہ بن سکیں۔ جنگی مقابلوں کے باوجود مکہ فتح نہیں ہو رہا تھا۔ حالاں کہ مکہ کو فتح کرنا مقصد رسالت میں شامل تھا تاکہ اس کو شرک اور بت پرستی سے پاک کیا جائے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں آپ نے حدیبیہ کا معاملہ فرمایا۔ اور اس کے نتیجے میں شاندار طور پر مکہ فتح ہوا۔

موجودہ زمانہ میں ہر جگہ مسلمانوں کی یہی حالت ہے۔ پچھلے ۲۰۰ سال سے وہ اپنے حریفوں سے مسلح ٹکراؤ کر رہے ہیں۔ مگر یہ ٹکراؤ مسلمانوں کے نقصان میں اضافہ کے سوا کوئی اور نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔ اب مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ٹکراؤ اور تصادم کے بے فائدہ تجربہ کو مزید نہ دہرائیں۔ وہ صلح حدیبیہ کے اصول کو مکمل طور پر اختیار کر لیں۔

اب تک انھوں نے جنگ کی قوت کو ناکام طور پر استعمال کیا۔ اب انھیں چاہیے کہ وہ امن کی قوت کو استعمال کریں۔ امن کی قوت کو استعمال کرنے ہی کا دوسرا نام [illegible] ہے۔ جس دن مسلمان سنت رسول کی روشنی میں ایسا فیصلہ کریں گے اسی دن [illegible]
اسی طرح جیسے دور اول کے مسلمانوں کی تاریخ اسی اصول کے استعمال سے بنی تھی۔

مال کی پاکی

قرآن میں متقی پرست انسان کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ — جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ پاکی حاصل کرے۔ اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ مگر صرف اپنے خدائے برتر کی خوشنودی کے لیے۔ اور عنقریب وہ خوش ہو جائے گا۔

اسلام میں اس بات کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ آدمی اپنی کمائی کو صرف اپنے لیے خاص نہ کرے بلکہ اس میں سے دوسروں کو بھی دے۔ اپنے کمائے ہوئے مال کو صرف اپنے اوپر خرچ کرنا اور اس میں سے خدا کا اور انسان کا حصہ نہ نکالنا اسلام میں سخت گناہ ہے۔

کوئی شخص اگر اپنا مال دوسرے کو اس لیے دے کہ اس نے اس کے اوپر احسان کیا تھا تو دیا اگرچہ کوئی برائی نہیں مگر صرف اس قسم کے عطیے سے اسلامی تعلیم کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ احسان اتارنے کے لیے یا کسی اور جوابی فائدہ کے لیے دینے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کے لیے اسلام میں اپنا مال دوسروں پر خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

کوئی آدمی جب اپنے مال کا ایک حصہ دوسرے کو دیتا ہے یہ اس کی طرف سے ایک قسم کی قربانی ہوتی ہے۔ یہ اپنی ایک محبوب چیز میں دوسرے کو حصہ دار بنانا ہے، صرف اس لئے کہ وہ ضرورت مند ہے اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ مال والے لوگ اپنے مال کو دوسرے ضرورت مندوں کی مدد پر خرچ کریں۔

قرآن کے مطابق، کوئی آدمی نیکی کا درجہ نہیں پا سکتا جب تک وہ اپنے محبوب اثاثہ میں سے دوسروں کو نہ دے (آل عمران۔ ۹۲) یہ گویا محبت کی قربانی ہے۔ اور محبت کی قربانی ہی وہ سب سے بڑی قربانی ہے جو آدمی کی داخلی تطہیر کرتی ہے اور اس کو روحانی ترقی کی طرف لے جاتی ہے۔

جسم کی پاکی پانی سے ہوتی ہے، اور روح کی پاکی قربانی سے۔ آپ کے جسم پر کیچڑ لگ جائے تو آپ اس کو پانی کے ذریعہ پاک کر سکتے ہیں۔ لیکن آدمی کی اندرونی ہستی میں جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو محبوب چیز وں کی قربانی ہی کے ذریعہ پاک کیا جا سکتا ہے۔

فرق کے ساتھ برابری

[illegible] تعلیم یافتہ اصحاب اکٹھا تھے گفتگو شروع تھا۔ ہندستانی مسلمان۔ [illegible] ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ یہاں کے حالات [illegible] کے ساتھ ایڈجسٹ کریں۔ جب تک وہ ایسا نہیں کریں گے وہ نقصان اٹھاتے رہیں گے۔ وہ [illegible] ملک میں ترقی نہیں کرسکتے اور نہ امن وعافیت کے ساتھ رہ سکتے۔ ایک مسلمان نے کہا کہ ہندستان کا کانسٹی ٹیوشن تو یہاں کے تمام باشندوں کو بلا لحاظ فرقہ اور مذہب برابر (equal) کا درجہ دیتا ہے پھر آپ ہم کو نابرابری کی تعلیم کیوں دے رہے ہیں۔ ہم کانسٹی ٹیوشن کو لیں یا آپ کی بات کو۔

میں نے کہا کہ میں نابرابری کی تعلیم نہیں دے رہا ہوں بلکہ حقیقت کی تعلیم دے رہا ہوں۔ آپ کے سوال کے جواب میں میں وہی کہوں گا جو ایک یہودی دانشور نے امریکہ کے یہودیوں سے اسی قسم کے سوال کے جواب میں کہا تھا۔ اس نے کہا یہ صحیح ہے کہ امریکی دستور کے اعتبار سے امریکہ کے یہودی اور امریکہ کے مسیحی دونوں برابر ہیں۔ مگر ایک اقلیت میں ہے اور دوسرا اکثریت میں۔ اس لیے زندگی کے بندوبست میں عملاً ان کے درمیان فرق رہے گا۔ اس کے بعد اس نے ایک یہودی کے اسی قسم کے سوال کے جواب میں کہا کہ ہاں، برابر مگر مختلف:

Yes, equal but different.

یہ کوئی تعصب اور امتیاز کی بات نہیں۔ یہ زندگی کا ایک یونیورسل اصول ہے۔ وہ ہر سماج میں رہتا ہے، حتی کہ خالص اسلامی سماج میں بھی۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اعلان فرمایا کہ تمام انسان برابر ہیں۔ مگر اس کے ڈھائی ماہ بعد جب آپ کی وفات ہوئی تو خلافت کے لیے یہ اعلان کیا گیا کہ قریش خلیفہ ہوں گے اور انصار وزیر اور مشیر [illegible]

برابری کے باوجود عملی بندوبست میں یہ فرق ہمیشہ [illegible]

اعتبار سے برابر ہیں مگر انتظامی تقسیم میں دونوں کے درمیان فرق ہے [illegible]

اعتبار سے یکساں ہیں مگر عملی اعتبار سے دونوں میں فرق [illegible]

اعتبار سے یکساں ہیں مگر عملی پہلو سے دونوں میں فرق [illegible]

یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ کوئی بھی شخص اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ اس دنیا میں جو لوگ پیدا کیے جاتے ہیں، ان میں پیدائشی استعداد اور حالات کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔ فرق ایک ابدی حقیقت ہے جو پیدائش سے اس دنیا میں ہے اور وہ آخر وقت تک یہاں باقی رہے گا۔ ایسے حالات میں ہمارا کام فرق کو مٹانا نہیں ہے، بلکہ فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے سماجی اور قانونی اعتبار سے سب کو یکساں درجہ دینا ہے۔ فرق کو مٹانا ممکن نہیں۔ البتہ اس کو سماجی امتیاز تک پہنچنے سے روک دینا ممکن ہے، اور ہمیں یہی دوسرا کام کرنا چاہیے۔

جس سماج میں اس فطری حقیقت کو مانا جائے وہ سماج کامیاب ہوگا۔ اور جس سماج کے لوگ اس فطری حقیقت کو تسلیم نہ کریں وہ سماج تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔ کیوں کہ فطرت کی قائم کی ہوئی حقیقتوں کو بدلنا کسی کے بس میں نہیں۔

اگر آپ کے راستہ میں ایک ابھری ہوئی چٹان ہو تو چٹان سے لڑ کر اس کو زمین کے برابر کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ بلکہ اس سے کتراتے ہوئے اس کے دائیں بائیں کی طرف سے اپنا راستہ نکال لیجیے۔

اس اصول کو انسانی زندگی میں اختیار کرنا انسان کے آگے جھکنا نہیں ہے بلکہ وہ خدا کے آگے جھکنا ہے۔ یہ کسی انسان سے موافقت نہیں بلکہ خود خدا سے موافقت ہے۔ ایسے موقع پر موافقت کی روش کو وقار کا مسئلہ بنانا گویا خدا کے آگے سرکشی کرنا ہے، اور کون ہے جو خدا کے آگے سرکشی کر کے اس دنیا میں کامیابی حاصل کر سکے۔

حب وطن اور اسلام

[illegible] انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سمینار تھا۔ اس کا اہتمام [illegible] کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کا موضوع مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور تعلیمات [illegible] میں نے بھی ایک تقریر کی۔ میں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک حب الوطنی کا مسئلہ تھا۔

میں نے کہا کہ ۲۰ ویں صدی میں ابھی حال تک مسلم مفکرین کسی نہ کسی طور پر اس نظریہ سے متاثر رہے ہیں جس کو عام طور پر پان اسلامزم کہا جاتا ہے۔ اس میں دور جدید کے بہت سے مفکرین کے نام شامل ہیں۔ مثلاً سید جمال الدین افغانی، اقبال، محمد علی، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ابوالکلام آزاد، وغیرہ۔ یہ لوگ مسلمانوں کو ایک بین اقوامی برادری سمجھتے تھے اور مسلمان کو ایک عالمی قومیت کا رکن بتاتے تھے۔ اپنے اس نظریہ کی بنیاد پر ان کا کہنا تھا کہ قومیت "نیشن هڈ" کی بنیاد مذہب پر ہے نہ کہ وطن پر۔

میں نے کہا کہ میری عمر ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے ۸۰ سال ہو رہی ہے۔ میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اسلام اور اسلام سے متعلق علوم کے مطالعہ میں گزارا ہے۔ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ قومیت کو مذہب پر مبنی قرار دینا کوئی اسلامی نظریہ نہیں۔ یہ سراسر ایک سیاسی نظریہ ہے جو مخصوص حالات میں پیدا ہوا۔ ۲۰ ویں صدی کے نصف اول میں مسلمانوں کے سیاسی قائدین یورپی استعمار کے خلاف تمام دنیا کے مسلمانوں کو ابھارنا چاہتے تھے۔ اپنے اس سیاسی مقصد کے نظریاتی جواز کے لیے انھوں نے عالمی قومیت کا مذکورہ نظریہ پیش کیا۔ یہ اسلام کا سیاسی استحصال تھا نہ کہ اسلام کی حقیقی ترجمانی۔

اس معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر وہی ہے جو پولیٹکل سائنس کا نقطۂ نظر ہے اور جس کو تمام دنیا میں نظری یا عملی طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ قومیت (نیشن هڈ) کی بنیاد وطن (مدر لینڈ) پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا میں پاسپورٹ پر کسی آدمی کی قومیت (نیشنلٹی) وہی لکھی جاتی ہے جو وطن کی نسبت سے اس کی ہے، خواہ وہ ایک مذہب سے تعلق رکھنے والا ہو یا دوسرے مذہب سے۔ مثلاً انڈیا میں ہر مسلمان یا غیر مسلمان پاسپورٹ میں اپنے آپ کو انڈین لکھتا ہے، برطانیہ میں برٹش، امریکہ میں امریکن، وغیرہ۔

مبنی بر وطن قومیت کا یہ نظریہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس معاملہ میں اسلام اور بقیہ دنیا میں کوئی اختلاف یا ٹکراؤ نہیں۔

[illegible] معنی ہے کہ افکار جدیدہ تمام تر قدیم خطوط سے مختلف ہیں۔ اس پر کچھ لوگوں نے یہ استدلال کیا کہ [illegible] ہے کہ موجودہ [illegible] کا تجربہ ہے اور اسلام نہیں۔ یعنی یہ ایک واقعہ ہے کہ دنیا میں [illegible] قومیت کی بنیاد وطن پر رکھا گیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام میں بھی قومیت کی بنیاد وطن پر قائم ہے۔ مگر یہ تشریح درست نہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں میں چند باتیں عرض کروں گا۔

فقہ کا ایک مسلّم اصول یہ ہے کہ چیزوں کا اصل ان کا مباح ہونا ہے (الاصل فی الاشیاء الاباحۃ)

Everything is lawful unless it is declared unlawful

یہ ایک واضح بات ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں قرآن وحدیث میں کوئی براہ راست ہدایت موجود نہیں۔ قرآن وحدیث میں نہ یہ کہا گیا ہے کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے اور نہ یہ کہ اس کی بنیاد وطن پر ہے اس لیے اس معاملہ کو ان امور سے متعلق سمجھا جائے گا جن کی بابت پیغمبر اسلام ؐ نے فرمایا کہ: (انتم اعلم بامور دنیاکم (تم اپنی دنیا کے معاملات کو زیادہ جانتے ہو) شرح مسلم ۱۵/۱۱۸

جہاں تک عقیدہ اور عبادت اور آخرت کے معاملات کا تعلق ہے، ان میں مسلمان پابند ہیں کہ وہ شریعت کی رہنمائی کو تاویل کے بغیر قبول کریں مگر جو امور انتظام دنیا سے تعلق رکھنے والے ہیں ان میں انسان کو اختیار ہے کہ وہ اپنے حالات کے لحاظ سے جس طریقہ کو درست سمجھے اس کو اختیار کرے۔

اس معاملہ میں ایک پیغمبرانہ واقعہ سے مزید رہنمائی ملتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یمن میں ایک شخص نے نبوت کا دعوی کیا اس کا نام مسیلمہ تھا۔ اس نے دو آدمیوں پر مشتمل اپنا ایک سفارتی وفد مدینہ بھیجا انھوں نے مدینہ آکر پیغمبر اسلام ؐ سے ملاقات کی اور مدعی نبوت کا یہ تحریری پیغام پہنچایا کہ میں نبوت میں آپ کے ساتھ شریک کیا گیا ہوں (فانی قد اشرکت فی الامر معک)

مسیلمہ کے دونوں سفیروں سے کلام کرنے کے بعد آپ نے ان سے پوچھا کہ اس بارے میں تمہاری رائے کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری بھی وہی رائے ہے جو ہمارے صاحب کی رائے ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر ایسا نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا (اما واللہ لولا ان الرسل لا تقتل لضربت اعناقکما) سیرۃ ابن کثیر ۴/۹۸

پیغمبر اسلام ؐ کے اس واقعہ سے اسلام کا ایک اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ بین اقوامی معاملات میں شریعت کا طریقہ بھی وہی ہوگا جو دوسری قوموں کا طریقہ ہے۔ دوسری قوموں میں اگر سفیر کی جان کو ہر

والے کی محبت ہو گی [illegible] اسلام [illegible]
کرتے ہوئے یہ کہا ہی بالکل درست ہے کہ [illegible]
پایا جائے گا [illegible] شریعت میں بھی اختیار کر لیا جائے گا۔ اس معاملہ کو [illegible]
مسئلہ نہیں بنایا جائے گا۔

ایک بار میں ایک جگہ [illegible] تھا وہاں ایک صاحب نے اپنی تقریر میں حب وطن کی اہمیت بیان کی اور کہا کہ اسلام میں بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ: حب الوطن من الایمان (وطن سے محبت کرنا ایمان کا ایک حصہ ہے) ایک عالم جو اس وقت وہاں موجود تھے، انھوں نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ حب الوطن من الایمان کوئی حدیث نہیں ہے، یہ تو صرف ایک عربی مقولہ ہے۔

میں نے کہا کہ یہ درست ہے کہ حب الوطن من الایمان حدیث نہیں۔ مگر وہ سادہ طور پر صرف عربی کا ایک مقولہ نہیں بلکہ وہ فطرت کا ایک مقولہ ہے جو انسانی نفسیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام دین فطرت ہے اس لیے فطرت انسانی کا ہر صحیح تقاضا بھی عین اسلام کا تقاضا ہے۔ مثال کے طور پر حدیث میں کہیں یہ نہیں آیا ہے کہ حب الام من الایمان (ماں کی محبت ایمان کا حصہ ہے) اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہر مسلمان اس کو اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس کے دل میں اپنی ماں سے محبت ہو۔ جس آدمی کے دل میں اپنی ماں کی محبت نہ ہو وہ اپنے ایمان میں بھی کامل نہ ہوگا کیونکہ فطرت اور ایمان میں کوئی تضاد نہیں۔

میں نے کہا کہ جو چیز فطرت انسانی کا جزء ہو، اس کو قرآن وحدیث میں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ قرآن وحدیث میں لکھے بغیر ہی شریعت کا ایک لازمی جزء ہے۔ قرآن وحدیث میں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ اے مسلمانو، تم اپنی ماں سے محبت کرو۔ کیونکہ یہ چیز حکم کے بغیر اپنے آپ ہی فطرت کے زور پر حاصل تھی۔ اسی طرح قرآن وحدیث میں یہ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں کہ اے مسلمانو، تم اپنے وطن سے محبت کرو کیونکہ وطن سے محبت انسانی شرافت کا تقاضا ہے، وہ انسان ایک پست انسان ہے جس کے دل میں اپنے وطن کے لیے محبت نہ ہو۔ ایسے گہرے فطری تقاضے کے لیے شریعت میں کسی لفظی حکم کی ضرورت نہیں، وہ اپنے آپ ہر مومن کے دل میں پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔

یہاں ایک معاملہ کی وضاحت ضروری ہے۔ بعض انتہا پسند ہندو لیڈروں نے کہا ہے کہ ہندوستان کے عیسائی اور مسلمان سچے محب وطن نہیں ہو سکتے اس لیے کہ محب وطن ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے وطن یا اس جغرافی خطہ کو آدمی مقدس سمجھے جہاں وہ پیدا ہوا ہے۔ ہندو چونکہ بھارت ماتا (زمین) کو مقدس سمجھتا ہے اور اس کو معبود کا درجہ دیتا ہے اس لیے وہی بھارت کا سچا محب وطن (دیش بھگت) ہے۔ عیسائی اور مسلمان چونکہ اپنے مخصوص عقیدہ کی بنا پر زمین یا کسی زمینی خطہ کو معبود کی طرح مقدس نہیں سمجھ سکتے اسی لیے وہ بھارت کے سچے دیش بھگت بھی نہیں ہو سکتے۔

یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے خود ساختہ عقیدہ کی بنا پر اپنی ماں کو معبود مان لے اور اس کی پرستش کرنے لگے تو اس بنا پر اس کو یہ کہنے کا لائسنس نہیں مل جائے گا کہ اس کے سوا بقیہ لوگ اپنی ماں سے محبت نہیں کرتے، کیونکہ وہ اپنی ماں کو معبود نہیں سمجھتے۔ کسی شخص یا گروہ کو بلاشبہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی ماں کو (یا اپنے وطن کو) معبود سمجھنے لگے مگر کسی بھی قانون یا اصول کی بنا پر ایسے لوگوں کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ دوسروں کے بارے میں یہ حکم لگائیں کہ وہ اپنی ماں کو (یا اپنے وطن کو) معبود نہیں، اور نہ وہ نہ اپنی ماں سے محبت کرنے والے قرار پائیں گے اور نہ اپنے وطن سے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات کا تعلق عالمی سطح پر مانے ہوئے رواج سے ہے نہ کہ کسی شخص یا گروہ کے اپنے مفروضہ سے۔ عالمی اور بین اقوامی سطح پر جب یہ مان لیا گیا ہے کہ قومیت کی بنیاد وطن پر ہے، اور وطن سے مراد معروف معنوں میں جغرافی وحدت ہے نہ کہ پُراسرار معنوں میں تقدیسی وحدت۔ اس لیے حب الوطنی کا معیار ہر ایک کے لیے یہی ہوگا۔ البتہ ہر ایک کو یہ آزادی حاصل رہے گی کہ وہ اس کے علاوہ کوئی اور عقیدہ پسند کرتا ہو تو اس کو اپنے لیے اختیار کر لے۔

نقصان میں فائدہ

[illegible] کہ یہاں نقصان میں بھی فائدہ ہے۔ یہاں [illegible] [illegible] ہیں۔ اس کی ایک مثال ذہنی خلل کے [illegible] آئی ہے۔ [illegible] بیماری کا سا اثر ہے۔ امریکہ میں ہر قسم کی باتوں پر ریسرچ ہوتی رہتی ہے۔ [illegible] معلوم ہوا کہ چوٹ اگر قابل برداشت دائرہ میں ہو تو وہ انسانی دماغ کو متحرک کرکے اس کے اندر نئی [illegible] پیدا کردیتی ہے۔

جب دماغ کو کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو وہ اس کی صلاحیتوں کو جگا دیتا ہے۔ دماغی خلل کی ایک نادر قسم جو دماغ کے بعض عمل کے لئے نقصان کا باعث ہوتی ہے وہ فنکارانہ صلاحیت میں اضافے کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔ یہ بات ایک حالیہ مطالعہ سے معلوم ہوئی ہے۔ دماغ کے ایک حصہ کو صدمہ پہنچنا بعض دوسرے دماغی عمل کو زندہ کر سکتا ہے۔ یہ بات امریکی ڈاکٹر بروس ملر (Bruce Miller) نے بتائی جو امریکہ کی کیلی فورنیا یونیورسٹی میں ماہر علم الاعصاب کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ وہ اس تحقیقی ٹیم کے ناظم تھے جس نے اس موضوع کا علمی سروے کیا۔

When brain damage sparks talent

Washington: A rare form of dementia which causes the loss of many brain functions can also heighten the artistic talent of those afflicted, according to a study, reports Reuter. Damage to one part of the brain may somehow release functions that were previously suppressed, neurologist Dr Bruce Miller from the University of California at Los Angeles, who conducted the study, said yesterday.

(*The Hindustan Times*, New Delhi, May 2, 1998).

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں نہ صرف فائدہ والی چیزوں میں فائدہ ہے بلکہ ان چیزوں میں بھی فائدہ کا پہلو چھپا ہوا ہے جو بظاہر نقصان والی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی دنیا میں آدمی کے لئے کسی بھی حال میں مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

[illegible] پاکستان [illegible] گیا ہے۔ [illegible]
[illegible] کی حیثیت [illegible] تھی۔ یہاں میری تقریر کے بعد سوال و
جواب ہوا تھا۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ عقیدہ صرف قول کا نام ہے یا قول اور عمل
دونوں کا۔ [illegible] صاحب جو غالباً سلفی تھے، انھوں نے اس پر [illegible] صحیح العقیدہ
ہونا چاہیے۔

میری سمجھ میں آیا کہ ساری خرابی غلط تقابل کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ سلفی حضرات فاسد العقیدہ کا تقابل صحیح العقیدہ سے کرتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم مطلوب عقیدہ پر قائم ہیں۔ "صحیح العقیدہ" کا لفظ غلط تو نہیں ہے مگر وہ ناقص ہے۔ کیوں کہ دونوں ہی صورتوں میں عقیدہ کیفیاتی حقیقت نہ رہ کر ایک کمیاتی حقیقت بن جاتا ہے۔ وہ ایک لفظی مجموعہ کی جگہ دوسرا لفظی مجموعہ ہے۔

حدیث کی زبان میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کامل العقیدہ کا لفظ بولا جائے۔ یعنی خدا کو کامل معرفت کے درجہ میں پالینا۔ عقیدہ کی حیثیت اگر ایک لفظی مجموعہ کی جگہ دوسرے لفظی مجموعہ کی ہو تو بظاہر درست ہونے کے باوجود عقیدہ محض ایک اوپری چیز رہتا ہے۔ مگر جب عقیدہ کو کامل معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا ——— خدا کی گہری معرفت (realisation) اور خدا جیسی ہستی کو آدمی جب ادراک اور معرفت کے درجہ میں پالے تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ایسا ہوگا کہ اس کے اندر تواضع اور خشوع کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

سید محمد کلیم ایم ایس سی (پیدائش ۱۹۶۴) اسلام آباد (پاکستان) کے رہنے والے ہیں۔ آج کل وہ تلاشِ معاش کے سلسلہ میں کناڈا آئے ہوئے ہیں۔ یکم ستمبر کو فلاڈلفیا میں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ پاکستان کے مقابلہ میں کناڈا اور امریکہ میں کیا فرق آپ نے دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ بہت۔ جب تک میں اسلام آباد میں تھا میرا غیر مسلموں سے کوئی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ یہاں آیا تو میں نے غیر مسلم سوسائٹی کو دیکھا۔ یہاں اسلام کی حقانیت مزید واضح ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پاکستان میں اگر روشنی ہے تو یہاں اندھیرا ہے۔ میں نے مثال پوچھی تو انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں مارل ویلوز ہیں۔ یہاں کی سوسائٹی میں کوئی

[illegible] علماء [illegible] سے [illegible] ملاقات [illegible] مسلم [illegible]

ہیں۔ [illegible] سے کہا کہ ایک سوال ہے کہ اگر آپ [illegible]

تو آپ لوگ [illegible] کو چھوڑ کر یہاں [illegible] کیوں چلے آئے۔ آپ لوگ [illegible]

[illegible] اس کا کوئی واضح جواب نہ دے سکے۔ آخر میں انھوں نے اعتراف کیا کہ ہمارے پاس

اس کا کوئی جواب نہیں۔

خواجہ کلیم الدین صاحب سے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ یہاں (99.99 percent) مسلمان حصول معاش کے لیے آتے ہیں نہ کہ اسلام کی دعوت کے لیے۔ لیکن اگر یہ آنے والے لوگ آنے کے بعد ایسا کریں کہ وہ دعوت کو پرائمری پوزیشن دیں اور حصول معاش کو سکنڈری پوزیشن دیں تو ان مسلمانوں کا یہاں آنا اور رہنا جائز (justified) ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہاں دعوتی عمل بھی شروع ہو جائے گا۔

امریکہ میں مقیم ہندستانیوں کا غالباً سب سے بڑا اور سب سے معیاری اخبار (India Abroad) ہے جو ہفتہ وار چھپتا ہے اور ۵۶ صفحہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ بیک وقت چھ جگہوں سے چھپتا ہے۔ میں نے اس کا شمارہ ۹ اگست ۱۹۹۶ دیکھا۔

اس میں ایک خبر یہ تھی کہ ۳۵ سالہ چک کوہلی (Chuck Kohli) نے انوسٹ کرنے والوں (investors) کے ساتھ ۳۰ ملین ڈالر کا فراڈ کیا۔ اس کے نتیجہ میں ان کو ۵۰ مہینہ کی سزا ہوئی اور اسی کے ساتھ جرمانہ بھی۔

دوسری خبر یہ تھی کہ قادیانی رہنما مرزا طاہر احمد نے ایک بیان میں کہا ہے کہ واشنگٹن نے ضیاء الحق کی مدد کی یہ جانتے ہوئے کہ وہ ایک مطلق ڈکٹیٹر ہیں جب کہ آپ ہمیشہ ڈکٹیٹرشپ کے خلاف بولتے ہیں :

Washington supported Zia-ul Haqq knowing him to be an absolute dictator, while at the top of your voices you tell the world that you are against dictatorships.

ایک نوجوان عالم پاکستان سے امریکہ آئے ہوئے ہیں۔ وہ یہاں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں امریکہ میں مدد کر یہاں

[illegible] چاہتا ہوں۔ میں نے کہا یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ گفتگو کے دوران [illegible] معلوم ہوا کہ یہ [illegible] اسی طرح کے مدرسے کے فارغ [illegible]۔ میں نے کہا کہ ان لوگوں کے [illegible] ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی۔ ان علماء کے اخلاص اور دینی [illegible] قائل ہوں۔ مگر انگریز تو ہمارے لیے مدعو کا درجہ رکھتے تھے اور مدعو کے لیے نصح (خیر خواہی) کا [illegible] ہے۔ [illegible] میں جیسا آتا کہ [illegible] انگریزوں سے نفرت کیوں کریں گے۔ مگر ہمارے پاکستانی عالم نے علماء کی اس منفی روش کو جائز ثابت کرنا شروع کر دیا۔

میں نے کہا کہ آپ فرماتے ہیں کہ میں مغربی دنیا میں جاکر دعوت کا کام کرنا چاہتا ہوں، اور مغربی لوگوں کے لیے آپ کے سینہ میں خیر خواہی اور محبت نہیں۔ پھر آپ دعوت کا کام کیسے کریں گے۔ میں نے کہا کہ آج کل لوگوں نے دعوت کا کام یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسلام کی بالاتری ظاہر کر کے دوسری قوموں کے اوپر فخر کریں۔ یہ دعوت نہیں ہے بلکہ یہ قوم پرستی ہے۔ دعوت یہ ہے کہ دوسروں کو آپ اپنے جیسا انسان سمجھیں۔ آپ کے دل میں ان کے لیے محبت ہو۔ ان کی اصلاح کی خاطر آپ ان کی زیادتیوں کو نظر انداز کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ آپ ان کی نجات کے حریص بن جائیں۔ اس کے بغیر جو دعوتی کام کیا جائے گا وہ ایک مذاق ہو گا نہ کہ حقیقی معنوں میں دعوت الی اللہ۔

جولائی۔ اگست ۱۹۹۶ میں اٹلانٹا میں اولمپک کھیل ہوئے تھے۔ اس موقع پر شروع اگست میں وہاں پائپ بم پھٹا تھا جس سے کافی سراسیمگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے چند دن بعد امریکی پریسیڈنٹ کلنٹن ٹی وی پر آئے۔ انھوں نے بم حادثہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ واقعہ بہت افسوس ناک ہے۔ مگر ہم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ ثبوت کے بغیر فوری طور پر کسی کو مجرم سمجھ بیٹھیں:

Let's not jump to any conclusions.

ایسے مواقع پر پہلے یہ ہوتا تھا کہ فوراً مسلمانوں پر شبہ کیا جانے لگتا تھا۔ مگر حال میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے جن میں تحقیق سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے بعد فوراً مسلمانوں پر شبہ کرنے کا مزاج ختم ہو گیا۔ یہ بھی ایک سبق آموز بات ہے۔ کیوں کہ ہمارے معاشرہ میں تو یہ حال ہے کہ خواہ کچھ بھی ثابت ہو جائے، ایک بار اگر رائے خراب ہو گئی تو وہ ہمیشہ خراب ہی رہے گی۔

[illegible] سلم [illegible] Horizon) [illegible]

[illegible] (ation) [illegible] تقسیم کیا۔ اس [illegible]

[illegible] (Kenneth L. Woodward) [illegible] سے معلوم ہوا [illegible]

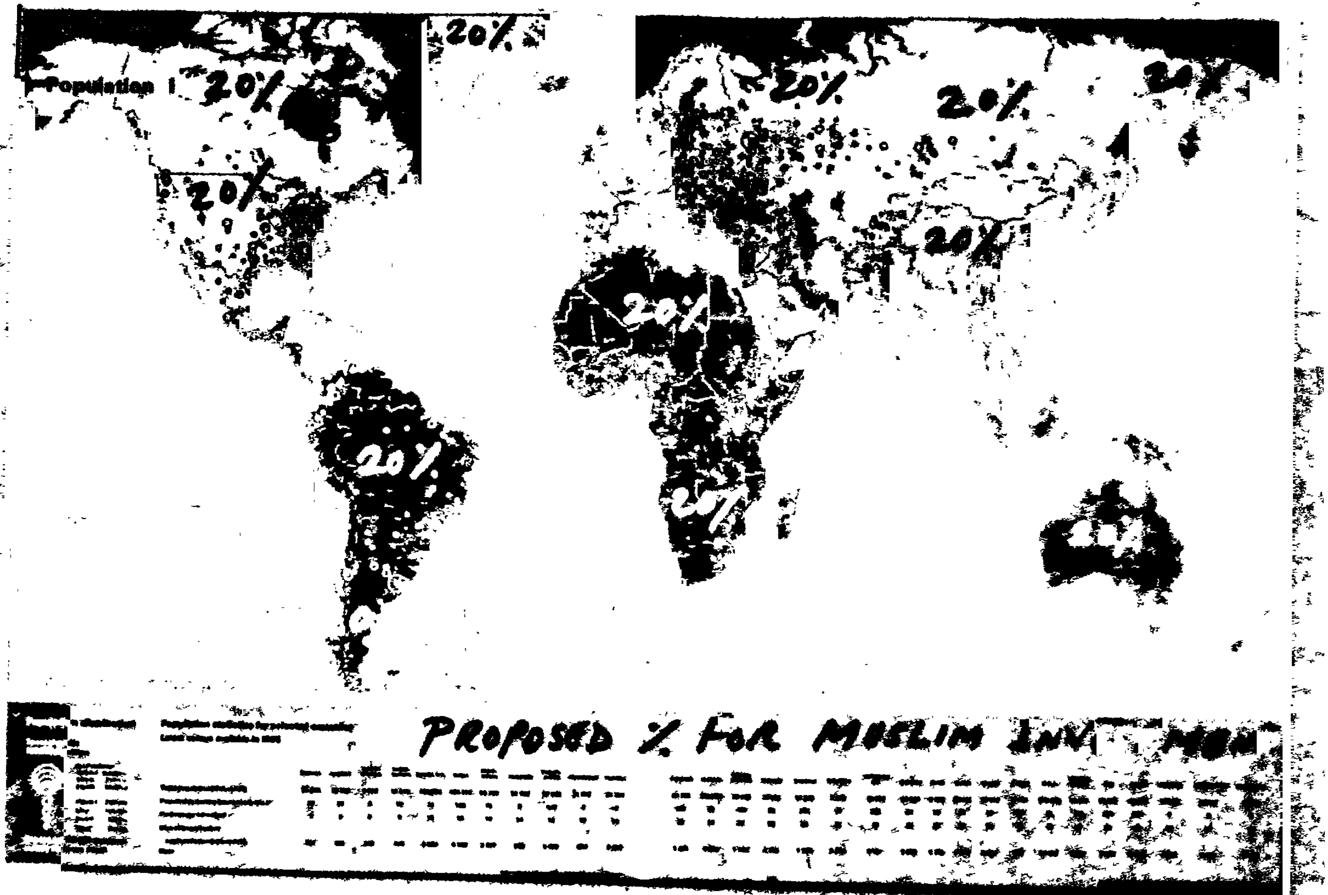
اس میں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ طاقت کے ذریعہ اسلام کو دنیا میں پھیلایا جائے۔

اس الزام کا جواب دیتے ہوئے انگلش ہارٹ میں ایک مقالہ کا اصل حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے صرف اس وقت دفاع کے لیے جنگ کی ہے جبکہ انھیں اکسایا گیا ہے یا ستم زدہ لوگوں کی درخواست ہے۔ انھوں نے کبھی اسلام کو پھیلانے کے لیے جنگ نہیں کی:

Historically, Muslims have fought only when provoked, in defense of themselves, or at the request of the oppressed—never for the purpose of spreading Islam.

یہ ایکشن الرٹ مجھ کو ایک پاکستانی مسلمان نے دیا تھا۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ انڈیا نے ہمارے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ اس نے اپنی فوجی طاقت استعمال کرکے بنگلہ دیش بنوایا ہے۔ میں نے کہا کہ اپنے اس بیان میں آپ ماضی میں مسلمانوں کی اس فوج کشی کو جائز قرار دے رہے ہیں جو انھوں نے علاقہ کے ستم رسیدہ لوگوں کی درخواست پر کیا۔ پھر یہی تو انڈیا کا معاملہ بھی ہے۔ اس نے شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کی فریاد پر بنگلہ دیش کے معاملہ میں مداخلت کی اور آخر میں اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ آپ کو ڈبل اسٹینڈرڈ نہیں بننا چاہیے۔ یا تو آپ دونوں کو غلط کہیں یا دونوں کو درست قرار دیں۔ دوہرا معیار اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں ایک پمفلٹ نظر سے گزرا۔ اس میں ایک مسلم ماہر معاشیات نے یہ تجویز کیا تھا کہ مسلمان اپنی اقتصادیات کے ذریعہ ساری دنیا کو اپنے زیر اثر لا سکتے ہیں۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ منصوبہ بندی کے تحت ساری دنیا میں سرمایہ کاری کریں (ملاحظہ ہو نقشہ ذیل)۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس قسم کی تجویزیں محض خوش فہمی ہیں جو حقیقۃً تجویزیں۔ اس لیے کہ مناسب مالی سرمایہ کاری صرف مطلوبہ رقم کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ سب سے پہلے قومی شعور اور مجموعی اخلاق کا معاملہ ہے۔ ہمارے یہاں نہ تو اس کے مطابق ضروری شعور موجود ہے اور نہ اس کو سپورٹ دینے والا مجموعی کردار۔ ایسی حالت میں کسی بھی درجہ میں اس کا امکان نہیں کہ وہ کامیابی کی منزل تک پہنچ سکے۔


Population
20%
20%
20%
20%
20%
20%
20%
20%
20%
PROPOSED % FOR MUSLIM IMMIGRATION

[illegible]

[illegible] ہے حال ہی میں [illegible] اسلام اور مسلمانوں کی [illegible]

کے سلسلے میں دو فلمیں امریکہ میں تیار کی گئی ہیں۔ ایک کا نام "سچے جھوٹ" (True Lies) [illegible]

ہندوستان کے تین بڑے شہروں دہلی [illegible] بمبئی میں [illegible]

جاری ہیں۔ احتجاج کے باوجود حکومت ہند اس اسلام دشمن فلم پر پابندی عائد کرنے سے قاصر ہے۔ وجہ حکومت کے ذمہ داران جانیں۔ دوسری فلم ہے "امریکہ میں جہاد" (Jihad in America) یہ فلم ۲۱ نومبر ۱۹۹۴ امریکی ٹیلی ویژن کے (P.B.S. Channel) پر پورے امریکہ میں دکھائی گئی ہے۔ فلم کا خالق (Steven Emerson) دنیا میں اسلام دشمنی کے لیے مشہور ہے۔

بنگلور کے انگریزی نیم ماہی جریدہ "دلت وائس" (Dalit Voice) مورخہ ۱۶ تا ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ کے شمارہ میں شمالی امریکہ کی اسلامی تنظیم "دائرۂ اسلام" کے صدر محترم جناب عبدالملک کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے یہ انکشاف کیا ہے کہ شمالی امریکہ کے "یوبا شہر" (Yuba City) میں ایک مسجد جو پچھلے چار سال سے زیر تعمیر تھی اور اب مکمل ہو چکی تھی، کو یکم ستمبر ۱۹۹۴ میں مسلمانوں سے نفرت کے اظہار کے طور پر امریکی حکومت نے جلا کر خاک کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس شہر میں تقریباً ایک سو سے زیادہ مسلمان خاندان آباد ہیں۔ جن میں اکثریت پاکستانی مسلمانوں کی ہے جنھوں نے "یوبا شہر" کو اپنا وطن ثانی بنایا تھا۔ تین سو مسلمانوں پر مشتمل مسلمانوں کی یہ قوم یہاں ۱۹۵۰ سے آباد ہے جن کا ذریعہ معاش کاشت کاری ہے۔ اور یہ تمام مسلمان اسی مسجد میں روزانہ پانچ وقت خدا کے حضور میں سربسجود ہوتے تھے۔ لیکن دہشت گرد یہودیت و عیسائیت کے تنگ نظری میں گھرا ہوا امریکہ مسلمانوں کی یہ دینی علامت بھی برداشت نہیں کر سکا۔" (رفیق منزل، اپریل ۱۹۹۵)

روم میں ۱۹۶۰ میں اولمپک کھیل ہوئے تھے۔ اس میں باکسنگ چیمپئن محمد علی کلے، سابق نام (Cassius Marcellus Clay) کو سونے کا تمغہ ملا۔ اس کو لے کر وہ اپنے وطن لوئی ول (Louisville) پہنچا۔ یہاں [illegible] خوشی میں ایک سفید فام (all-white restaurant) میں چلا گیا۔ یہ سفید فام لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ ایک سیاہ فام

[illegible] کالا امریکی لڑکا ہے اس کے ہاتھ کھانا بیچنے سے انکار کیا اور اس کو باہر نکال دیا۔
اس واقعہ کا محمد علی کے اوپر سخت اثر ہوا۔ رد عمل کے طور پر سونے کا تمغہ جو اس کو بہت مشکل کھیل سے ملا تھا اس کو اس نے غصہ میں دریائے اوہایو (Ohio) میں پھینک دیا۔ اب اٹلانٹا میں ہونے والے اولمپک کھیلوں میں مشعل روشن کرنے کے لیے جب اس کو بلایا گیا تھا تو انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے چیئرمین ہوان انٹونیو سامارانچ (Juan Antonio Samaranch) نے سابق تمغہ کے بدل کے طور پر دوسرا طلائی تمغہ خود اپنے ہاتھ سے ۴ اگست ۱۹۹۶ کو محمد علی کے گلے کی گردن میں پہنایا۔

امریکی نوجوانوں کا مذکورہ فعل وقت کے تقاضے کے خلاف تھا۔ چنانچہ آخر کار وقت کا تقاضا غالب آیا اور محمد علی کو زیادہ شاندار طور پر امتیازی تمغہ سے نوازا گیا۔

بزنس پروموشن کے لیے یہاں جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی چیز کی خریداری پر مزید ایک چیز تحفہ میں دی جائے۔ مثلاً گاہک نے دکان سے ایک قلم خریدا تو اس کو ایک بال پین تحفہ کے طور پر مفت دیا جائے۔ اس کو ایک جملہ میں اس طرح کہا جاتا ہے :

"Buy one, get one free"

تاجر اس انسان کا نام ہے جو قیمت لے کر چیز فراہم کرنے کے اصول کو جانتا ہو۔ مگر اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ یہاں پانے کے لیے بھی دینے والا بننا پڑتا ہے۔ یہاں جو لوگ دینے والے نہیں وہی لوگ پانے والے بنیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ یہاں صرف لینے والے بن کر رہنا جانتے ہوں وہ کبھی پانے والے نہیں بن سکتے۔

امریکہ میں اسلام قبول کرنے والے زیادہ تر مسلم صوفیوں سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک محمد رحیم باوا محی الدین تھے۔ وہ سری لنکا سے تعلق رکھتے تھے، اور بالکل ناخواندہ تھے۔ وہ امریکہ آئے۔ وہ اپنی گفتگوؤں اور تقریروں میں، عام صوفیوں کی زبان میں بولتے تھے۔ ایک صاحب کے الفاظ میں، انھوں نے اسلام کو رحمت اور محبت اور امن اور اتحاد کے مذہب کی حیثیت سے پیش کیا :

He proclaimed an Islam of mercy and compassion, an Islam of peace and unity.

دو ٹکڑی ہوتے ہوئے [illegible]

[illegible] کے خطبے کتابی صورت میں چھاپ لیا۔ ایک کتاب جس کا نام یہ ہے

Islam & World Peace: Explanations of a Sufi

یہ کتاب میں نے امریکہ کے زمانۂ قیام میں دیکھی۔ یہ ۱۷۷ صفحہ کی کتاب ہے جو غالباً ۱۹۸۷ میں چھپی۔ اس میں اسلام، وقت، مومن، دولت، جہاد، امریکہ کے مسلمان [illegible] اتحاد، کلمۂ شہادت، علم، ام القرآن، رب العالمین، پر تقریریں ہیں۔ اس میں جہاد کو جہاد بالنفس بتایا گیا ہے۔ قرآن کو داخلی قرآن (inner Quran) کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ انتہائی سادہ زبان میں ہے۔ دیباچہ نگار کے الفاظ میں وہ بچوں جیسے اسلوب (Childlike style) میں ہے۔

مغربی ملکوں کے لوگ جنگجو مسلمانوں سے متنفر ہیں۔ مگر عین اسی وقت وہ مسلم صوفیوں سے محبت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کے تحت روحانی سکون کی تلاش میں ہیں۔ اور روحانی سکون کسی آدمی کو صوفیوں کے یہاں محبت کے پیغام میں ملتا ہے۔ سفید فام امریکی مسلموں نے اس مسلم صوفی کے نام پر ایک سنٹر قائم کیا ہے جس کو میں نے اس سفر میں دیکھا۔

ایک تقریر میں باوا جی نے کہا کہ اسلام محبت اور صلاحیت کا دین ہے۔ اگر ہم خدا کی محبت کو دنیا کے سامنے پیش کریں تو محبت ساری دشمنیوں کا خاتمہ کر دے گی:

Love will eat away all enmity. (p. 138)

موسم کی پیشین گوئی کرنے والا محکمہ یہاں بہت متحرک رہتا ہے۔ لوگ ہر روز اہتمام کے ساتھ اس کو ٹی وی پر سنتے ہیں۔ حتی کہ بہت سے لوگ اپنے باتھ روم میں ٹرانسسٹر لگا کر رکھتے ہیں تاکہ جب وہ باتھ روم میں ہوں اس وقت بھی وہ موسم کے بارے میں اعلانات سنتے رہیں۔

یہاں کے اخباروں اور ٹی وی پر مسلسل اعلان آ رہا تھا کہ اٹلانٹک میں شدید طوفان (hurricane) اٹھا ہے۔ وہ بڑھ رہا ہے اور ۲ ستمبر تک وہ نیویارک کے ساحل تک پہنچ جائے گا۔ اس کی رفتار ۱۱۰ میل فی گھنٹہ ہوگی۔ لوگ بہت پریشان تھے۔ مگر عین وقت پر اس نے اپنا رخ بدل دیا اور وہ مشرق کی طرف چلا گیا۔

۲ ستمبر سے پہلے یہاں ایک صاحب سے اس پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ اسلام کے

بارہ میں لاتعداد پیشین گوئیاں کبھی بالکل غلط نہیں ہوئیں۔ مگر وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں موسم کی سائنس بہت ترقی کر چکی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ میری موجودگی ہی میں یہاں دلچسپ واقعہ پیش آگیا۔ صفحہ کے نیچے یہاں نیویارک ٹائمس (۳ ستمبر) کی ایک تصویر نقل کی جا رہی ہے۔

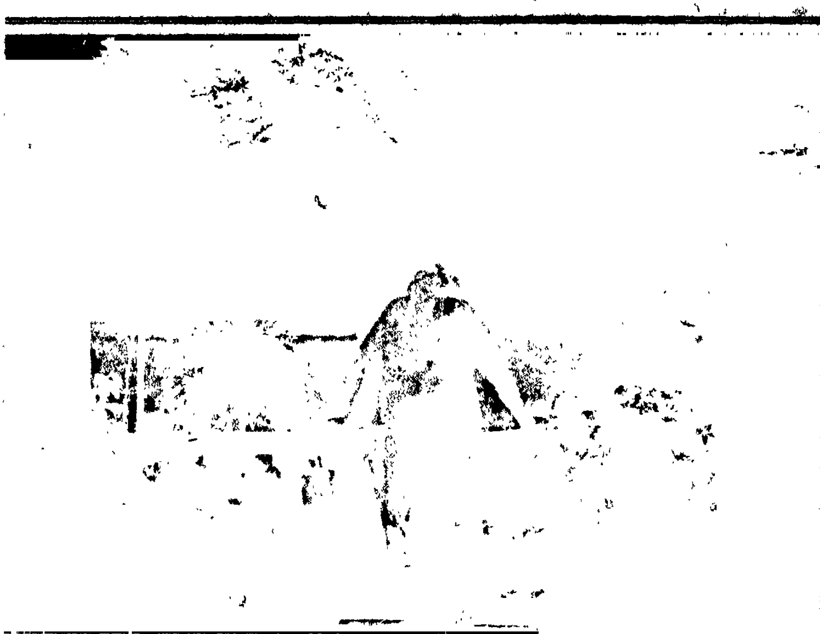
نیویارک سے شائع ہونے والے پاکستانی اخبار عوام کے شمارہ ۹-۱۰ اگست ۱۹۹۶ میں ایک پاکستانی شاعر کا یہ شعر پڑھا جو موجودہ زمانہ کے مسلم معاشرہ کی نہایت صحیح تصویر ہے:

ہر شخص بنا لیتا ہے اخلاق کا معیار　　اپنے لیے کچھ اور زمانے کے لیے اور

پاکستان کے لوگ امریکہ میں بہت ہیں۔ اس لیے پاکستان کے کئی کئی اخبار اپنا امریکی ایڈیشن بھی چھاپتے ہیں۔ یہاں اس قسم کے کئی اخبار دیکھے۔ ان کی دو سرخیاں ملاحظہ ہوں:

پاکستان فرقہ واریت کے شعلوں کی لپیٹ میں۔ پانچ روز میں ۳۶ قتل

پاکستان پوسٹ، نیویارک، ۲۳-۲۹ اگست ۱۹۹۶



Librado Romero/The New York Times

Calm Instead of the Storm

New Yorkers, including one enjoying the Hudson River from Wave Hill in Riverdale, basked in sunshine and a high just short of the 90-degree mark yesterday, a Labor Day that forecasters had said might be ruined by Hurricane Edouard. Instead, the storm moved to sea.

ہماریوں کو پاکستان جیسی [illegible] لایا جائے گا [illegible]

[illegible] نیویارک، [illegible]

میں نے ایک پاکستانی بزرگ سے کہا جب پاکستان میں بھی وہی ہوتا تھا جس کا الزام آپ لوگ انڈیا پر ڈالتے ہیں تو پھر علاحدہ پاکستان بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان کے بانیوں (اقبال، جناح) کے ذہن میں پاکستان کا نقشہ کچھ اور تھا۔ میں نے کہا کہ اقبال اور جناح ہمیشہ تو زندہ رہنے والے نہ تھے۔ انھیں جاننا چاہیے تھا کہ ان کے مرنے کے بعد جو لوگ پاکستان کے وارث ہوں گے وہ کیسے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ ایک کار چلانے کے لیے بھی پیشگی اندازہ (advance anticipation) کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ پھر قوم و ملک کو چلانے کے لیے تو پیشگی اندازہ کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ پھر آخر یہ کس قسم کے لیڈر تھے جنھوں نے آگے کا اندازہ کیے بغیر قوم کو گڑھے کی طرف دوڑا دیا۔

اگست ۱۹۹۶ کے آخری ہفتہ کی امریکی خبروں میں سے ایک خبر یہ تھی کہ پریسیڈنٹ کلنٹن کے ایک اہم مشیر ڈک موریس (Dick Morris) کے بارہ میں یہاں کے ایک اخبار اسٹار (Star) نے یہ خبر چھاپی کہ ایک کال گرل کے ساتھ ان کا افیئر چل رہا ہے۔ اس کے فوراً بعد اس مشیر (aide) نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ یہاں کے ایک اخبار نے اس کو اچانک زوال (sudden downfall) سے تعبیر کیا تھا۔

امریکی زندگی کا یہ ایک عجیب پہلو ہے کہ یہاں افراد کو آخری حد تک آزادی حاصل ہے۔ بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ امریکی کلچر کا ایک تسلیم شدہ حصہ بن چکا ہے۔ لیکن حکومتی ذمہ دار کو وہ اس سے اوپر دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اگر کبھی کسی ذمہ دار کے بارہ میں اس قسم کی کوئی خبر اخبار میں آ جائے تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ اپنا عہدہ چھوڑ کر الگ ہو جائے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حدیث میں ہے کہ عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے، اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تمثیل کی زبان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پسلی کی طرح [illegible] میں ایک "ٹیڑھ" ہے۔ یہاں ٹیڑھ کا مطلب یہ ہے کہ وہ فطری طور پر زیادہ جذباتی (emotional) واقع ہوئی ہے۔ عورت جب کسی معاملہ میں جذباتی کیفیت میں مبتلا ہو جائے تو مرد کو چاہیے کہ وہ اس

کی رعایت کرے۔ اس کے برعکس اگر وہ جوابی سخت مدت اختیار کرے گا تو یہ عورت کی شخصیت کو توڑنے کے ہم معنی بن جائے گا۔

خواجہ کلیم الدین صاحب کے صاحبزادے بلال صاحب اور لقمان صاحب نے میری کچھ تقریر ویڈیو پر ریکارڈ کرلی۔ ایک تقریر میں میں نے کہا کہ ایمان اور دعوت دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ایمان ایک عظیم معرفت ہے۔ اور کوئی چیز اگر آدمی کو معرفت کے درجہ میں ملے تو وہ عین اپنی فطرت کے مطابق چاہنے لگتا ہے کہ وہ اس کا اعلان کرے۔ کوئی عظیم معرفت سینہ میں چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی وہ لازماً باہر آکر رہے گی۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں دعوت زندہ نہیں ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ان کو معرفت والا ایمان حاصل نہیں۔

دوسری تقریر میں میں نے کہا کہ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا کہ اے رسول، اللہ کی طرف سے تمہارے اوپر جو اترا ہے، اس کو تم لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے اس کو نہیں پہنچایا تو تم نے پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا (المائدہ ۶۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ آپ کے بعد یہ کام آپ کی نیابت میں آپ کی امت کی ذمہ داری ہے۔ امت جب نائب رسالت یا قائم مقام رسالت ہوگئی تو اس کے بعد باعتبار نوعیت امت کی حیثیت وہی ہوگئی جو اس سے پہلے پیغمبر کی تھی۔

۲۶ اگست کو جناب عبد الرحیم چشتی حیدر آبادی (۷۰ سال) سے ملاقات ہوئی وہ انجینیر ہیں۔ حیدر آباد سے وہ پاکستان چلے گئے۔ اس کے بعد امریکہ آکر آباد ہوگئے۔ انھوں نے بتایا کہ حیدر آباد کے قاسم رضوی نہایت کامیاب مقرر تھے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہ حال تھا کہ لوگ پکچر کو چھوڑ کر ان کی تقریر سننے کے لیے آیا کرتے تھے۔ میں بھی انھیں میں سے ایک تھا۔ انھوں نے کہا کہ قاسم رضوی مخلص مگر بے وقوف تھے۔ بلکہ مولانا آزاد کو چھوڑ کر ہند وپاک کے تمام مسلم لیڈر بے وقوف ہی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۷ میں لاہور میں میری ملاقات قاسم رضوی سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ نے تو مسلمانوں کو مروا دیا۔ قاسم رضوی کچھ دیر چپ رہے۔ پھر بولے: میاں تم ٹھیک کہتے ہو، مجھ سے غلطی ہوئی۔

میں نے کہا کہ "آزاد حیدرآباد" کی تحریک تو سراسر حماقت تھی۔ حیدرآباد چاروں طرف سے انڈین یونین سے گھرا ہوا تھا، پھر وہ آزاد ملک کیسے بن سکتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان جذباتی لوگ ہیں، وہ حقیقت کو کہاں دیکھتے ہیں۔ اس زمانہ میں ایسا طوفان تھا کہ جو اس کے خلاف بولے اس کے لیے جینا مشکل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ابوالحسن صاحب اس کے خلاف بولے تو مسلمانوں نے ان کو غدار قرار دیا۔

انھوں نے کہا کہ مجھے ہندستانی مسلمانوں کی بہت فکر ہے۔ میں نے کہا کہ پھر ہندستانی مسلمانوں کے لیے آپ کا کیا مشورہ ہے۔ انھوں نے کہا: پڑھیں، بے تحاشا پڑھیں۔

میں نے کہا کہ آپ مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک لائق رہنما سمجھتے ہیں، پھر مسلمانوں نے ان کی قدر کیوں نہیں کی۔ انھوں نے کہا کہ تعلیمی کمی کی وجہ سے مسلمانوں میں تجزیہ (analysis) کی طاقت نہیں۔ اور کوئی تجزیہ کرکے انھیں بتائے تو اس کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ تجزیاتی مطالعہ میں تنقید ہوتی ہے۔ بے لاگ ہو کر بولنا پڑتا ہے۔ مسلمان اس قسم کے مطالعہ کی اہمیت کو نہیں جانتے، اس لیے وہ گہری حقیقتوں سے باخبر بھی نہیں ہوتے۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں کھل کر تجزیہ و تنقید ہوتی ہے، اس لیے ہر بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مگر مسلم قوموں میں اس قسم کے حقیقت پسندانہ مطالعہ کا وجود نہیں۔

۲۷ اگست کی شام کو دو نومسلم امریکی خاتون میری رہائش گاہ پر آئیں۔ ان کے کچھ ذاتی سوالات تھے جن کا میں نے جواب دیا۔ پھر ان کو کچھ حدیثیں سنائیں۔ ایک خاتون کا مسئلہ یہ تھا کہ اسلام کے بعد ان کے شوہر سے جدائی ہو گئی تھی۔ اور اب ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نئی زندگی کس طرح شروع کریں۔ دوسری خاتون کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے دو بچے تھے۔ وہ امریکی سوسائٹی کے اثرات قبول کر رہے تھے۔ اب وہ جاننا چاہتی تھیں کہ بچوں کو ماحول کے اثرات سے کس طرح بچائیں۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس زمانہ میں ولی وہ ہے جو پیسہ کے پیچھے نہ بھاگے۔ نماز اور حج اور تہجد پر عمل کرنا آسان ہے۔ کیوں کہ وہ آپ کی زندگی کے نقشہ کو درہم برہم نہیں کرتا۔ مگر جب آدمی یہ فیصلہ کرے کہ وہ پیسہ کے پیچھے نہیں بھاگے گا تو یہ اپنے آپ سے اور سارے ماحول سے لڑنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

اسنا (ISNA) کی طرف سے ایک میگزین پلین فیلڈ سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا نام اسلامک ہورائزن (Islamic Horizon) ہے۔ اس کے شمارہ جولائی۔ اگست ۱۹۹۶ میں ایک جرنلسٹ کشمیری لیڈر کی طرف سے انڈیا کے خلاف پُرشور بیان شائع ہوا تھا۔ اس میں ہندستانی "مظالم" کا ذکر کرنے کے بعد اس معاملہ میں بین اقوامی برادری کی خاموشی کی شکایت کی گئی تھی، اور کہا گیا تھا کہ یہ خاموشی صرف کشمیر کی خوں ریزی میں مزید اضافہ کرے گی:

The silence of the international community will only result in more bloodshed in the ravaged land. (p. 14)

یہ شکایت نہایت عجیب ہے۔ اس لیے کہ یہی نام نہاد مسلم لیڈرشپ ہے جو رات دن یہ اعلان کرتی رہتی ہے کہ "بین اقوامی برادری" اسلام دشمن ہوگئی ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش کرتی رہتی ہے۔ ایسی حالت میں اس مسلم دشمن برادری سے یہ امید رکھنا کہ وہ مسلمانوں کی تباہی کا خاتمہ کرے گی، بلا شبہ لغویت کی حد تک احمقانہ بات ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا لکھنے اور بولنے والا طبقہ کیوں اس قسم کی بے معنی باتیں کرتا ہے۔ عقل کے اس دیوالیہ پن کی مثال شاید دنیا کی کسی اور قوم میں موجود نہیں۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کی مسلم دنیا میں مخلص افراد تو بے شمار ہیں۔ مگر وہ آدمی سرے سے اس زمانہ کی مسلم دنیا میں موجود نہیں جس کے اندر ساؤنڈ تھنکنگ کی صفت پائی جاتی ہو۔

میں نے سنا تھا کہ امریکہ میں جو عرب آباد ہیں ان کے بچے عربی سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے بتایا جو عربوں سے قریب رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ عرب بچوں کے والدین ٹیوٹر رکھ کر انھیں عربی زبان پڑھانا چاہتے ہیں مگر بچے پڑھ نہیں پاتے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ عرب اپنے گھروں میں عامی زبان بولتے ہیں اور ٹیوٹر ان کو فصیح زبان پڑھانا چاہتا ہے۔ عرب بچے اگرچہ گھر کے اندر عامی زبان سنتے ہیں، مگر ٹیوٹر کے ذریعہ پڑھائی جانے والی فصیح زبان الگ زبان کی طرح نظر آتی ہے۔ انھیں مشکل معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زبان کے ساتھ ایک نئی زبان سیکھیں۔ انھوں نے کہا عربوں کی بولی اگر وہی ہوتی جو فصیح عربی ہے تو یہ تضاد نہ ہوتا

اور ان کے بچوں کے لیے عربی سیکھنا آسان ہو جاتا۔ اب عربی سیکھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک [illegible] زبان کی صرف کتابت کو سیکھ رہے ہیں۔ جس زبان کو وہ صرف بول رہے تھے اس کو [illegible] رہے ہیں۔

امریکہ میں فیونرل ہوم ہوتے ہیں۔ موت ہونے کے بعد ٹیلی فون کر کے فوراً اپنے مُردہ کو فیونرل ہوم کے حوالے کرنا ہوتا ہے۔ وہ لاش کو اٹھا لے جاتے ہیں اور اس کے تمام رسوم ادا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ میت کو قبر میں اتارنے کا کام آدمی کے ہاتھ نہیں کرتے بلکہ کرین اس خدمت کو انجام دیتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہاں عیسائیوں اور یہودیوں کے فیونرل ہوم ہیں، مگر مسلمانوں کے فیونرل ہوم موجود نہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ اسرائیل میں سیاہ فام یہودی اور سفید فام یہودی کے درمیان زبردست امتیاز ہے۔ مثلاً وہاں کے ایک اسپتال میں سیاہ فام یہودی کا خون لیا گیا۔ اس کو جس بوتل میں رکھا گیا، اس پر لکھ دیا گیا کہ اس کو استعمال نہ کریں۔ مطلب یہ کہ وہ پھینکنے کے لیے ہے نہ کہ استعمال کرنے کے لیے۔ یہ معاملہ امریکہ کے اخبار میں چھپ گیا اور اس پر یہاں بڑا شور کیا گیا۔

مغربی ملکوں میں ایک بات کا مجھے بار بار تجربہ ہوا۔ مجھے کسی اجتماع میں خطاب کے لیے بلایا گیا۔ اور بتایا گیا کہ یہاں سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہوں گے۔ اس کی رعایت سے وہاں میں نے جو تقریر کی اس میں اسلام کو خالص علمی انداز میں پیش کیا۔ آخر میں سوال و جواب کا وقفہ تھا۔ لیکن لوگوں کی طرف سے جو سوالات آئے وہ زیادہ تر عام قسم کے سوالات تھے۔ کوئی گہرا علمی سوال سامنے نہ آسکا۔

امریکہ کے سفر میں بھی اسی قسم کے تجربات ہوئے۔ یہاں ایک اجتماع میں مجھے شرکت کی دعوت دی گئی۔ اور صراحت کے ساتھ کہا گیا کہ وہاں سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہوں گے۔ اس لیے وہاں اسلام کے پیغام کو سائنسی انداز میں پیش کیا جائے۔ میں نے اللہ کی توفیق سے ایسا ہی کیا۔ مگر تقریر کے بعد جب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو لوگوں کی طرف سے کوئی علمی اور فکری سوال پیش نہیں کیا گیا۔ میں نے وہاں اسلام کی فکری عظمت پر تقریر کی تھی۔ مگر سوالات جو کیے گئے وہ یہ تھے کہ —— فلاں جگہ مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ فلاں قوم ہمارے خلاف سازش کر رہی ہے، اس پر آپ کیا کہتے ہیں۔

غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ علمی سوال ہمیشہ علمی زندگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اونچی تعلیمی ڈگریاں تو لے لیتے ہیں مگر اس کے بعد عملاً وہ صرف مادی ترقی کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔ زیادہ پیسہ کمانا اور شاندار زندگی کی تعمیر کرنا، بس انھیں چیزوں پر ان کا ذہن لگا رہتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عملاً وہ صرف معاشی حیوان بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ذہنوں میں اونچے علمی سوالات پرورش ہی نہیں پاتے، پھر وہ اونچے سوالات کس طرح کر سکتے ہیں۔

۲۸ اگست کو حسب معمول ہم لوگ نماز فجر کے بعد ٹہلنے کے لیے نکلے۔ تقریباً دو میل تک ہم لوگ سڑکوں پر ٹہلتے رہے۔ مگر کہیں اونچا نیچا نہیں ملا۔ ہر طرف ہموار سڑک تھی اور کسی خطرہ کے بغیر مسلسل ہم ٹہل سکتے تھے۔ جب کہ ہندستان کے کسی بڑے سے بڑے شہر میں بھی ایسا ممکن نہیں۔ وہاں بار بار فٹ پاتھ کہیں اونچا ہوگا۔ کہیں گڑھا ہوگا، کہیں فرش ٹوٹا ہوگا۔ کہیں کوڑا پڑا ہوگا۔ ٹھوکر سے بے فکر وہاں ٹہلنا ممکن نہیں۔

امریکہ میں آج کل خاندانی زندگی کا بہت چرچا ہے۔ اخبار، ٹی وی، میٹنگ ہر جگہ اس کا ذکر ہے۔ ہر جگہ خاندانی اقدار (family values) پر زور دیا جا رہا ہے۔ صدر امریکہ بل کلنٹن نے ایک ویلفیر بل پر دستخط کیے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں خاندانی زندگی اس حد تک ٹوٹ گئی ہے کہ وہ ایک قومی خطرہ نظر آنے لگی ہے۔

امریکہ میں پہلے آزادی کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ لوگوں کو یہ یقین کرایا گیا کہ مکمل انفرادی آزادی فرد کی شخصیت کے مکمل ارتقاء کے لیے ضروری ہے۔ مگر اب یہ آزادی انارکی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی شخصی ارتقاء کے لیے نہایت ضروری ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کی ایک حد بھی ہے۔ آزادی اگر حد سے باہر ہو جائے تو وہ الٹا نتیجہ پیدا کرے گی۔

نیویارک ٹائمس (۲۸ اگست) میں شیمان (Serge Schememann) کی ایک رپورٹ تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسرائیل میں بھی کم و بیش وہی جھگڑے ہیں جو پاکستان میں ہیں۔ اسرائیل میں ایک طرف سیکولر یہودی ہیں جو وہاں سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف آرتھوڈاکس یہودی

[illegible] کہنا ہے کہ اسرائیل یہودی مذہب کے نام پر بنا ہے [illegible] یہودی [illegible]
[illegible] ایک مذہبی یہودی نے کہا کہ ہماری اقدار کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے [illegible]

What's at stake is values.

۲۹ اگست کی رات کو ۱۰ بجے ٹی وی پر صدر امریکہ بل کلنٹن کی تقریر تھی۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے کلنٹن کو اگلے صدارتی الکشن کے لیے دوسری بار اپنا نمایندہ بنایا ہے۔ یہاں کے رواج کے مطابق آج شکاگو میں پارٹی کی طرف سے بڑے پیمانہ پر ایک نیشنل کنونشن تھا۔ اس میں کلنٹن نے اپنی قبولیت کا اعلان کیا۔ اس موقع پر انھوں نے جو مفصل تقریر کی وہ امریکہ کے مختلف ٹی وی چینلوں پر لائیو ٹیلی کاسٹ کی گئی۔

میں نے یہ تقریر سنی۔ محسوس ہوا کہ بل کلنٹن میں خطاب کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ کلنٹن کی لمبی تقریر میں ایک جملہ نے مجھ کو اسٹرائک کیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ اگلی صبح کو نیویارک ٹائمس (۳۰ اگست) آیا تو اس نے اپنے صفحہ اول کی رپورٹ میں اسی جملہ کو اس کی سرخی بنایا تھا۔ وہ جملہ یہ تھا کہ —— امریکہ میں امید دوبارہ واپس آگئی ہے :

Hope is back in America.

کلنٹن نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہمیں تعلیم کی ہر سطح پر امتیاز (excellence) کو اپنا نشانہ بنانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں مذہبی آزادی میں یقین رکھتا ہوں۔ میں تقریر کی آزادی میں یقین رکھتا ہوں۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ لوگ محنت کے ساتھ کام کریں اور قانون کی پوری پابندی کریں :

I believe in religious liberty, I believe in freedom of speech, and I believe in working hard and abiding by the rules.

۳۰ اگست کو نماز جمعہ کے بعد تقریر سے فارغ ہوا تو ایک نوجوان الگ سے آکر ملے۔ انھوں نے کہا کہ میری بہن کی عمر ۳۰ سال ہو چکی ہے۔ مگر ابھی تک ان کا رشتہ نہ ہو سکا۔ آپ ان کے لیے کوئی دعا لکھ دیں۔ میں نے دل میں دعا کی کہ خدایا اس خاتون کا کہیں مناسب رشتہ ہو جائے۔ پھر ان کو کاغذ پر ایک آیت لکھ کر دی اور کہا کہ اس کو [illegible] کے بعد دس بار، اور عشاء کے

پھر کسی بار پڑھ لیا کریں۔ وہ یہ ہے: رب انی لما انزلت الیّ من خیر فقیر (القصص-۲۴)

۲۹ اگست کی شام کو ہم لوگ نیویارک کے ساحل اٹلانٹک کو دیکھنے کے لیے گئے۔ یہ دنیا کا دوسرا سب سے بڑا سمندر ہے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ کیسی عجیب نشانی ہے کہ سمندروں کے پانی میں نمک ملا دیا گیا ہے۔ نمک ایک محفوظ رکھنے والا عنصر (preservative) ہے۔ اس کی وجہ سے سمندر کا پانی خراب ہونے نہیں پاتا۔ اب دوسرا سوال یہ تھا کہ انسان نمکین پانی کو استعمال نہیں کر سکتا، اس کو میٹھا پانی چاہیے۔ یہ ضرورت اس طرح پوری ہوتی ہے کہ پانی ہلکا عنصر ہے اور نمک اس کے مقابلہ میں بھاری ہے۔ چنانچہ گرمی کے موسم میں سمندر کا پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے تو نمک نیچے رہ جاتا ہے اور صرف پانی نکل کر اوپر چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد دھوپ اور ہوا اور زمینی کشش کے زیر اثر یہ غیر نمکین میٹھا پانی بارش کی صورت میں برستا ہے اور دوبارہ زمین پر آکر انسان کی ضرورت پوری کرتا ہے۔

دو متضاد تقاضوں میں یہ توازن اتفاقی طور پر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی قادر مطلق ذہن ہو جو عالمی سطح پر اس کی منصوبہ بندی کرے۔ اس طرح کے بے شمار واقعات کائنات میں بکھرے ہوئے ہیں جو تمام آوازوں سے زیادہ بلند آواز میں یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق اور ناظم ہے۔ اس کے بغیر نہ دنیا بن سکتی اور نہ وہ قائم رہ سکتی۔

ہمارے سامنے یہاں کا مشہور پل (suspension bridge) ہے جو اٹلانٹک کے دو جزیروں ــــ لانگ آئی لینڈ اور اسٹریٹن آئی لینڈ کو ملاتا ہے۔ یہ ایک لٹکا ہوا پل ہے جو لوہے کے رسّوں پر قائم کیا گیا ہے۔ وہ ایک کیلو میٹر لمبا ہے۔ انڈیا میں اس کی مثال ہگلی کا پل ہے جو ہاوڑہ میں ہے۔

اٹلانٹک کے ساحل پر دیر تک بیٹھ کر ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ ایک گفتگو کے ذیل میں میں نے کہا کہ ہمارے یہاں آج کل عبادت کے مختلف ماڈل رائج ہو گئے ہیں ــــ حنفی ماڈل، سلفی ماڈل، وغیرہ۔ مگر یہ سب کے سب فارم میں فرق کی بنیاد پر بنے ہیں۔ ایک سیٹ آف فارم ان کا ہے اور دوسرا سیٹ آف فارم اُن کا۔ مگر عبادات میں اصل چیز اس کی داخلی اسپرٹ ہے، اور اس پر زور کسی کے یہاں بھی نہیں۔

نیویارک گویا امریکہ کا بمبئی ہے۔ بمبئی کے مقابلہ میں یہاں کی [illegible]
میں قریب [illegible] سائز کی گاڑیاں ہیں۔ مگر نیویارک [illegible]
پولیوشن ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہاں کی گاڑیوں میں ایک کنورٹر (converter) لگا ہوا
ہے۔ پٹرول جلنے کے بعد اس سے دھواں (گیس) نکلتا ہے۔ کنورٹر اس کو [illegible] زہریلی گیس
کاربن مونو آکسائڈ (carbon monoxide) کو کم مضر گیس کاربن ڈائی آکسائڈ (carbon dioxide) میں
تبدیل کر دیتا ہے۔ گاڑی کے چلنے کے دوران اس کے اندر یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

۳۰ اگست کو جمعہ تھا۔ پروگرام کے مطابق مجھے مسلم سنٹر نیوبرنزوک میں جمعہ کا خطبہ دینا تھا اور نماز پڑھانا تھا۔ ہم لوگ ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہو کر ڈیڑھ گھنٹہ میں وہاں پہنچے۔ خطبہ میں مسنون عربی مضمون کے ساتھ میں نے انگریزی میں نماز کی بابت کچھ باتیں کہیں۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ نماز کا ایک ظاہری پہلو ہے اور دوسرا اس کا داخلی پہلو ہے۔ دونوں کی اہمیت ہے۔ اور نماز کا حقیقی فائدہ اس وقت مل سکتا ہے جب کہ نماز کی ظاہری ہیئت بھی اچھی طرح ادا ہو، اور اس کی داخلی اسپرٹ (خشوع) بھی پوری طرح پائی جائے۔

خطبہ کا وقت سوا بجے تھا۔ میں خطبہ ختم کر کے منبر سے اترا کہ نماز پڑھاؤں۔ اس وقت مرکز کے ذمہ دار آگئے۔ انھوں نے کہا کہ خطبہ چند منٹ پہلے ختم ہو گیا۔ کچھ لوگ جو دفاتر میں کام کرتے ہیں وہ خطبہ میں شریک نہیں ہو پاتے۔ وہ ٹھیک ڈیڑھ بجے آتے ہیں تاکہ تکبیر اولیٰ کے ساتھ جماعت میں شریک ہو جائیں۔ آخر یہ طے ہوا کہ نماز میں قرأت لمبی کی جائے تاکہ کم از کم جماعت میں ان کی شرکت ہو جائے۔

اس تجربہ کے بعد سنن ابی داؤد کی وہ روایت میری سمجھ میں آئی جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: من زار قوما فلا یؤمھم ولیؤمھم رجل منھم (جو شخص کسی قوم میں جائے وہ ان کی امامت نہ کرے۔ خود ان کا اپنا آدمی امامت کرے)۔

اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ مقامی آدمی جو پہلے سے نماز کی امامت کر رہا ہے وہ وہاں کے حالات کو بخوبی جانتا ہے اور ان کی رعایت کرتے ہوئے نماز پڑھا سکتا ہے۔ جب کہ باہر کا آدمی مقامی حالات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے کوئی ایسی بات [illegible] حال،

سے مطابقت نہ رکھتی ہو اور اس کی وجہ سے غیر ضروری طور پر کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے۔

نماز جمعہ کے بعد دوبارہ مسجد میں ایک خطاب ہوا۔ اس خطاب میں آخرت اور جنت اور جہنم سے متعلق کچھ حدیثیں پیش کیں اور ان کی تشریح کی۔

۲۱ اگست کو فجر کی نماز کے بعد نیویارک سے فلاڈلفیا کے لیے روانگی ہوئی۔ راستہ میں دریا کے نیچے لمبی ٹنل تھی۔ میرے ساتھی نے کہا: ہمارے یہاں پانی کے اوپر سے سفر ہوتا ہے یہاں پانی کے نیچے سے سفر ہو رہا ہے۔ یہ ۸۰ میل کا سفر تھا۔ پورا سفر جنتان عن یمین وشمال (سبا-۱۵) کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف سرسبز قدرتی مناظر اور ان کے درمیان جگہ جگہ خوب صورت مکان۔ سڑک نہایت عمدہ اور اس کے اوپر پھسلتی ہوئی زرق برق گاڑیاں۔ پورا سفر ایک مسحور کن ماحول میں ہوا۔

آخرکار ہم لوگ بنسلیم (Bensalem) پہنچے جو فلاڈلفیا کی ریاست میں واقع ہے۔ یہاں سب سے پہلے ہم لوگ جناب رئیس احمد انجینیر کی رہائش گاہ پر اترے۔ یہ ایک نہایت مرصع اور پرکشش مکان تھا۔ یہ تمام مناظر ذاتی طور پر تو میرے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے تھے۔ کیوں کہ میں طبعی طور پر سادگی کا دلدادہ ہوں۔ میرے لیے ساری کشش صرف سادگی میں ہے۔ مگر ہمارے ایک پاکستانی ساتھی نے کہا کہ "یہ چیزیں بھلا اپنے ملک میں کہاں ہیں۔ اسی لیے تو ہمارے نوجوان دیوانہ ہو کر امریکہ کی طرف بھاگ رہے ہیں"۔

مغرب کی نماز ہم لوگوں نے فلاڈلفیا کی مسجد فرنٹ اسٹریٹ میں پڑھی۔ یہاں مسجد میں میرا خطاب رکھا گیا تھا۔ میں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں بتایا کہ اسلام کا مقصد تعمیر شعور اور کیرکٹر بلڈنگ ہے۔ اسلام کا اصل نشانہ اسلامائزیشن آف مین ہے نہ کہ اسلامائزیشن آف اسٹیٹ یا اور کچھ۔

یہاں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک پاکستانی مسلمان سے میں نے پوچھا کہ امریکہ میں آپ لوگوں کے لیے پلس پوائنٹ کیا ہے اور مائنس پوائنٹ کیا۔ انھوں نے کہا کہ سب سے بڑا مائنس پوائنٹ یہ ہے کہ ہماری فرسٹ جنریشن تو اپنی آئیڈنٹٹی باقی رکھنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ مگر سکنڈ جنریشن اور اس کے بعد کی جنریشن کے لیے اپنی آئیڈنٹٹی کو باقی رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ میں نے کہا کہ انسان تقابل کے تحت ایک کو لیتا ہے اور دوسرے کو چھوڑتا ہے۔

آپ نے پاکستان اور امریکہ کا تقابل کیا تو امریکہ آپ کو اقتصادی اعتبار سے بہتر نظر آیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ پاکستان کو چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ اسی طرح آپ کی اگلی جنریشن اسلامی آئیڈیل کو اسی وقت باقی رکھ سکے گی جب کہ اس کو امریکی کلچر کے مقابلہ میں اسلامی کلچر زیادہ اعلیٰ دکھائی دے۔ یہ کام موجودہ نسل کو کرنا ہے۔ مگر موجودہ نسل ڈالر کمانے میں اتنا زیادہ مشغول ہے کہ اسے کسی اور کام کی فرصت نہیں۔

۲۱ اگست کی رات جناب فضل الرحمن صاحب کے مکان پر گزاری۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اپنا کوئی تجربہ بتائیے۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۷۳ میں جب میں یہاں آیا تو کافی تلاش کے بعد میں نے ایک سروس حاصل کی۔ مگر اتفاق سے اس کے چند ہی دن کے بعد عید آ گئی۔ میں نے چاہا کہ میں عید منانے کے لیے آفس سے ایک دن کی چھٹی لوں۔ میرے تمام دوستوں نے منع کیا کہ ابھی تو تم نے سروس جوائن کی اور ابھی تم چھٹی مانگو گے تو وہ چھٹی نہیں دیں گے بلکہ فائر کر دیں گے (سروس ختم کر دیں گے) مگر میری طبیعت نہیں مانی۔ میں نے اپنے دفتر میں چھٹی کی درخواست دے دی۔ میرا سپروائزر ایک یہودی تھا۔ اس نے وہی بات کہی جس سے میرے دوستوں نے مجھے ڈرایا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ کوئی پاکستان نہیں ہے کہ ابھی آئے اور ابھی چھٹی۔ سروس اور عید دونوں تم کو ایک ساتھ نہیں مل سکتی۔ تم سروس یا عید دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو۔

اس نے کہا کہ ہم تم کو چھٹی تو نہیں دے سکتے، البتہ ہم تم کو فائر کر سکتے ہیں۔ اس نے کہا کہ لنچ کے وقت تک میں تم کو مہلت دیتا ہوں۔ تم سوچ لو کہ تم کو سروس چاہیے یا عید۔ اس وقت تک تم مجھ کو بتا دو۔ لنچ کے بعد اس نے پوچھا کہ کیا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا کہ یہ میرا مذہب کا معاملہ ہے۔ اور اس معاملہ میں میں کمپرومائز نہیں کر سکتا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد اس نے کہا کہ جاؤ اپنی عید مناؤ کل کے لیے تمہاری چھٹی ہے۔ پھر اس نے کہا کہ تم اسی طرح ہمیشہ اپنے مذہب پر قائم رہنا:

Son, stand for your religious rights.

فضل الرحمن صاحب کے مکان کے بیسمنٹ میں نماز باجماعت ادا کی۔ صبح سویرے کافی لوگ آ گئے۔ نماز کے بعد درس کی صورت میں ایک تقریر کی۔ اس میں اس آیت کو موضوع بنایا گیا تھا کہ: لقد کان لکم ۔۔۔ (الاحزاب ۲۱)

خبرنامہ اسلامی مرکز۔۱۳۵

۱۔ پیولائف میگزین (نئی دہلی) کے نمائندہ نے ٹیلی فون پر ۸ ۲ر اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ مسجد میں جاکر نماز ادا کرنے کی اجازت عورتوں کو بھی پوری طرح حاصل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مسجد میں باجماعت نماز مردوں کے لئے لازمی ہے اور عورتوں کے لئے اختیاری۔ یہ عورتوں کے لئے بطور رعایت ہے۔

۲۔ بی بی سی لندن کے نمائندہ مسٹر ریحان فضل نے ۴ر مئی ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ۱۹۴۷ کے بعد ہندو مسلم تعلقات سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ میڈیا کا طریقہ یہ ہے کہ وہ زیادہ تر سنسنی خیز خبروں کو رپورٹ کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں صرف "بیڈ نیوز" میڈیا میں جگہ پاتی ہیں جب کہ وہ صرف ایک فیصد ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ۹۹ فیصد "گڈ نیوز" ہیں مگر میڈیا ان کو رپورٹ نہیں کرتا۔ اس لئے آپ لوگوں کا تاثر یہ بن گیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت اچھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہاں کے مسلمان بہت سے ملکوں سے بہتر ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔

۳۔ ڈیلی ٹیلی گراف کی نمائندہ راج لکشمی بھٹاچاریہ نے ۵ر مئی ۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو روزہ کے موضوع پر تھا۔ ان کو روزہ کا اسلامی تصور بتایا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ روزہ کا مقصد روحانی تزکیہ، اخلاقی ڈسپلن اور صبر کی تربیت ہے۔

۴۔ ریورنڈ والسن تھمپو (Reverend Valson Thampu) نے ٹائمس آف انڈیا کے لئے ۱۰ر مئی ۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اہانت رسول کے مسئلہ سے تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب "شتم رسول کا مسئلہ" کے نام سے چھپ چکی ہے۔ سوالات کے جواب میں زیادہ تر وہی باتیں کہی گئیں جو اس کتاب میں شائع ہو چکی ہیں۔

۵۔ امریکی اخبار لاس اینجلس ٹائمس کے نمائندہ ڈکسٹر فلکنس (Dexter Filkins) نے ۱۳ر مئی

۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان اور پاکستان کے نیوکلیر ٹسٹ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ تشدد کا طریقہ دونوں ملکوں میں سے کسی کے لئے بھی مفید نہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان امن قائم کرنے کا واحد راز یہ ہے کہ دونوں اسٹیٹس کو (Status quo) پر راضی ہو جائیں۔

۶۔ میڈیکل کالج (کٹیہار) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بہار کا ایک سفر کیا۔ ۲۳ مئی ۱۹۹۸ کو روانگی ہوئی اور ۲۶ مئی کو واپسی ہوئی۔ ۲۳ مئی کو پٹنہ میں پلینٹیریم (Planetarium) کے ہال میں ایک تقریر ہوئی۔ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان بڑی تعداد میں موجود تھے۔ تقریر کا موضوع تھا "مذہبی ہم آہنگی (Religious harmony) اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کے حوالوں سے بتایا گیا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان کو عزت اور احترام دیا جائے خواہ وہ اپنے مذہب کا ہو یا غیر مذہب کا۔

۷۔ بہار کے سفر میں ۲۴ مئی ۱۹۹۸ کو کٹیہار میڈیکل کالج میں خطاب کا پروگرام تھا۔ یہ ایک بڑا جلسہ تھا جس میں اطراف کے ہندو اور مسلمان دونوں کثرت سے شریک ہوئے۔ یہاں صدر اسلامی مرکز کی تقریر کا موضوع مذہبی ہم آہنگی تھا۔ تقریر میں جو باتیں کہی گئیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ تمام مذاہب کو ایک ثابت کرنے کا کوئی تعلق مذہبی ہم آہنگی سے نہیں ہے۔ مذہبی ہم آہنگی ٹالرنس اور باہم احترام کے جذبہ کے تحت آتی ہے نہ کہ یہ ثابت کرنے سے کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔

۸۔ ہندی اخبار نئی دنیا (اندور) کے نمائندہ مسٹر سدھانشو راجیو نے ۲۷ مئی ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ موضوع تھا "اسلام، ماڈرنٹی اینڈ اسٹیٹ" اس سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ اسلام کا نقطۂ نظر بتایا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں داخلی طور پر ایسی تعلیمات موجود ہیں کہ کوئی بھی نئی صورت حال اس کے لئے مسئلہ نہ بنے۔ جہاں تک اسٹیٹ کا تعلق ہے اسلام کا یہ نظریہ نہیں کہ مسلمان ہر جگہ لڑ کر اسلام کا سیاسی اور قانونی نظام قائم کریں۔ اس معاملہ میں صحیح اسلامی نقطۂ نظریہ ہے کہ ساری کوشش فرد اور سماج کی اصلاح پر صرف کی جائے۔ جب کوئی سماج اصلاح یافتہ ہو جائے گا تو اس کے اندر سے اپنے آپ اسلامی حکومت ابھر سکے۔

۹۔ دوردرشن دہلی میں ۴ جون ۱۹۹۸ کو ایک فلم ڈسکشن تھا۔ اس کا موضوع تھا "سائنٹفک ٹمپر" (سائنسی مزاج) صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انھوں نے اس موقع پر بتایا کہ سائنٹفک ٹمپر کا مطلب حقیقت پسندانہ سوچ ہے۔ اور یہ خود اسلام کی تعلیم بھی ہے۔ پیغمبر اسلام کی ایک دعا ہے: اللھم ارنا الاشیاء کماھی (اے خدا ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب **as it is thinking** ہے۔ یہی سائنٹفک ٹمپر کا اصل مطلب بھی ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ سوچ کسی بھی ترقی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

۱۰۔ ۶ جون ۱۹۹۸ کو نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر (آئی سی) میں ایک اجتماع ہوا اس کے صدر سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال تھے۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ انڈیا اور پاکستان کے تعلقات کو کس طرح بہتر بنایا جائے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ موضوع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اقوام متحدہ کے ایک نمائندہ ایک سال پہلے دہلی آئے تھے۔ انہوں نے ایک ملاقات میں مجھ سے پوچھا کہ انڈیا اور پاکستان کے مسئلہ کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا فارمولا صرف ایک ہے اور وہ ہے:

Accept the statusquo

اس سلسلہ مین انھوں نے بتایا کہ اسٹیٹس کوازم اسلام کا ایک مستقل اصول ہے۔ اس کا مطلب بے عملی نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قائم شدہ عملی صورت حال کو مان کر بقیہ دائروں میں جدوجہد کرنا۔ دوسرے لفظوں میں، مسائل کو نظرانداز کر کے مواقع کو استعمال کرنا۔ اس مسئلہ کا واحد قابل عمل حل یہی ہے۔

۱۱۔ ۱۰ جون ۱۹۹۸ کو جسولا وہار (دہلی) کی مسجد میں ایک پروگرام تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد یہاں صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ہوئی۔ اس کا موضوع تعلیم کی اہمیت تھا، بتایا گیا کہ اسلام میں علم اور تعلیم کی بے حد اہمیت ہے۔ اسی لئے ہر زمانہ میں یہ رواج رہا ہے اور آج بھی ہے کہ ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ اور ہر مدرسہ کے ساتھ ایک مسجد ہوتی ہے۔ علم اور عبادت دونوں بیک وقت اسلام کی بنیاد ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

اکتوبر ۱۹۹۸ شمارہ ۲۶۳

فہرست	صفحہ
دانش مند کون	۴
زوجین کا درجہ	۶
انتقام نہیں	۸
ایک گفتگو	۱۰
ایک واقعہ دو انجام	۱۴
دیوار قہقہہ	۱۷
سفرنامہ امریکہ ۳	۱۹
سوال و جواب	۴۲
خبر نامہ اسلامی مرکز	۴۸

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, Near ove Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2580436
e-mail: [illegible]@juno.com

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at [illegible] Printing Press, Delhi.

دانش مند کون

عن شداد بن اوس قال قال رسول الله ﷺ الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والعاجز من اتبع نفسه هواها وتمنی علی الله (المشکاۃ المصابیح الجزء الثالث صفحہ ١٤٥٤) حضرت شداد ابن اوس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ دانش مند وہ ہے جو نفس پر قابو رکھے اور موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل کرے۔ اور عاجز وہ ہے جو خواہشات کی پیروی کرے۔ اور اللہ پر جھوٹی امیدیں قائم کرے۔

جب آدمی کے اندر ایمان زندہ ہو تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ زیادہ عمل کرنے کے بعد بھی وہ اپنے کو کم سمجھتا ہے۔ اس کا یہ احساس اس کو سر تاپا عمل بنا دیتا ہے۔ نیکی کے ہر موقع پر وہ نیک کرداری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قول وعمل کو خدائی احکام کے تابع نہ کرے۔ اس کا زندہ ایمان اس کے لئے قول طیب اور عمل صالح کی ضمانت بن جاتا ہے۔

مگر جو لوگ ایمانی کمزوری کا شکار ہوں، ان کے اندر اس قسم کا طاقتور جذبہ باقی نہیں رہتا۔ اب خدا کے احکام ان کے رہنما نہیں ہوتے بلکہ ان کی خواہشات ہی ان کے لئے رہنما بن جاتی ہیں۔ اب انہیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ جب بھی وہ بولیں تو سچ بولیں۔ وہ اپنے عمل سے عمل صالح کا مصداق ثابت کریں۔

اس دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی سطح پر آجاتے ہیں۔ ان کو اپنی خواہشات کے سوا کسی اور چیز کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اپنے تمام وقت اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے لگا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے

لئے خدا کے یہاں وہ انعام نہیں جو ایک اعلیٰ انسان کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

تاہم مسلم قوموں کی ایک صفت یہ ہے کہ خواہ زوال کے نتیجہ میں ان کے یہاں قول طیب اور عمل صالح باقی نہ رہا ہو۔ تب بھی اسلامی عقائد ان کے یہاں باقی رہتے ہیں مگر یہ سب کچھ رسمی سطح پر ہوتا ہے نہ کہ زندہ یقین کی سطح پر۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی پوری زندگی دو عملی کی روش پر قائم ہو جاتی ہے۔ اپنی حقیقی عملی زندگی میں وہ مکمل طور پر خواہشات اور مادی مفادات کے پیرو بنے رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ اپنی خیالی دنیا میں جھوٹی امیدوں کا ایک خود ساختہ محل بنا لیتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے دینی عقائد کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔ دنیوی اعتبار سے وہ پوری طرح ایک فعال زندگی گذارتے ہیں، لیکن اخروی اعتبار سے وہ صرف خوش فہمیوں میں جینے والے بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی حقیقی عمل کئے بغیر ہی بڑے بڑے نتیجہ کی امید قائم کر لیتے ہیں۔ ان کا یہ ذہن بن جاتا ہے کہ ہمارے معاملات پیشگی طور پر درست ہو چکے ہیں، دنیا اور آخرت میں ہمارا کوئی معاملہ بگڑنے والا نہیں۔

آدمی بیک وقت دو چیزوں پر یکساں درجہ کی توجہ نہیں دے سکتا۔ جو آدمی آخرت کو اہمیت دے وہ آخرت سے تعلق رکھنے والی باتوں کو بے حد اہمیت دے گا۔ اس کے مقابلہ میں دنیوی چیزیں اس کی نظر میں غیر اہم ہو جائیں گی۔ اور جو آدمی دنیا کو اہمیت دے وہ دنیا کے معاملات کو بے حد سنگین سمجھے گا۔ اس کے مقابلہ میں آخرت سے تعلق رکھنے والی باتیں اس کو زیادہ اہم دکھائی نہ دیں گی۔ یہی فرق بتاتا ہے کہ کون آخرت پسند ہے اور کون دنیا پرست۔

زوجین کا درجہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مردوں کو جنت میں حوریں دی جائیں گی۔ مگر عورتوں کے لیے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا۔ کیا قرآن کی اسکیم میں صرف مردوں کا حصہ ہے۔ عورتوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں جب کہا گیا کہ اچھے مردوں کو اچھی حوریں دی جائیں گی اس میں اپنے آپ یہ مطلب شامل ہو گیا کہ اچھی عورتوں کو وہاں اچھے مرد ملیں گے۔ اس میں بیک وقت دونوں بات کہی گئی ہے۔ ایک کے لیے براہ راست انداز میں اور دوسرے کے لیے بالواسطہ انداز میں

قرآن میں حور کا لفظ چار بار آیا ہے۔ مگر اس سے زیادہ بار زوج کا لفظ آیا ہے۔ حور سے مراد خوب صورت عورتیں ہیں۔ اور زوج کے معنی جوڑے (spouse) کے ہیں۔ زوج میں عورت اور مرد دونوں شامل ہیں۔ اس لیے شوہر اور بیوی کے لیے زوجین کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ صالح مرد اور صالح عورتوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا اور وہاں ان کو ازواج مطہرۃ (البقرہ) ملیں گے۔ یعنی پاکیزہ جوڑے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مردوں کے لیے پاکیزہ عورتیں اور عورتوں کے لیے پاکیزہ مرد۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ مرد و عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے برابر کے ساتھی ہیں (آل عمران) حدیث میں ہے کہ النساء شقائق الرجال، یعنی عورتیں مردوں کا نصف ہیں۔ اس طرح اسلام میں عورت اور مرد دونوں کو یکساں مقام دیا گیا ہے۔

قرآن میں ہے کہ ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتوں کو اپنے نیک اعمال کی بنا پر جنت میں داخلے گا (الاحزاب ۳۵)۔ دونوں کے اوپر یکساں طور پر عمل کی ذمہ داری ہے اور دونوں کے لیے یکساں طور پر برابر کا انعام۔

اسلام میں مرد اور عورت کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ دونوں یکساں طور پر حالت امتحان میں ہیں۔ اور دونوں کے لیے یکساں طور پر ابدی انعام ہے۔ ان پہلوؤں سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح عورت و اسلام ایک

کے ہے، وہی عزت واحترام دوسرے کے لیے بھی ہے۔

البتہ میدانِ عمل (workplace) کے اعتبار سے دونوں میں کچھ فرق رکھا گیا ہے۔ مرد کا میدانِ عمل بنیادی طور پر باہر ہے اور عورت کا میدانِ عمل بنیادی طور پر اندر۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورتیں باہر نہیں نکلیں گی۔ مثال کے طور پر عورتوں کے اوپر بچوں کی تربیت کی ذمہ داری ہے۔ اب اگر عورتیں بچوں کی تعلیم کے لیے اسکول جاتی ہیں تو یہ ان کے لیے اپنے میدانِ کار کی توسیع قرار دیا جائے گا نہ کہ اس سے انحراف۔

اسلام میں عورت کا درجہ کیا ہے، اس کا اندازہ ایک حدیث سے ہوتا ہے۔ امام البخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے۔ حضرت بریرہ کے شوہر ایک غلام تھے جن کا نام مغیث تھا۔ گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ مغیث اپنی بیوی کے پیچھے چل رہے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عباس کیا تم کو اس پر تعجب نہیں کہ مغیث کو کتنی زیادہ محبت ہے بریرہ سے اور بریرہ کو کتنا زیادہ بغض ہے مغیث سے۔ رسول اللہ ﷺ نے بریرہ سے فرمایا کہ کیا اچھا ہو کہ تم مغیث کی طرف رجوع کر لو۔ بریرہ نے کہا کہ اے خدا کے رسول کیا آپ مجھے اس کا حکم دیتے ہیں آپ نے فرمایا کہ میں صرف سفارش کر رہا ہوں۔ بریرہ نے جواب دیا: تو مجھے اس کی ضرورت نہیں (لا حاجة فیه) فتح الباری ۹/

۳۱۹

بریرہ نے اپنے شوہر مغیث سے تفریق کرا لی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے بریرہ کو مشورہ دیا کہ تم رجوع کر لو اور مغیث کے ساتھ زندگی گزارو مگر بریرہ نے آپ کے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا۔ اور مغیث سے رجوع پر راضی نہیں ہوئیں۔

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں عورت کو کتنی زیادہ آزادی حاصل ہے۔ اس کے مطابق، عورت نہ صرف مرد کے برابر ہے بلکہ اس کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ خود پیغمبر اگر وحی کی بنیاد پر کوئی مطالبہ کرے تو وہ اس کو ماننے پر مجبور ہے۔ لیکن پیغمبر کے ذاتی مشورہ کو ماننا اس کے لئے ضروری نہیں۔

انتقام نہیں

۱۹ جون ۱۹۹۸ کو بی بی سی لندن نے اپنے "دریافت" کے پروگرام کے تحت ایک انٹرویو نشر کیا۔یہ انٹرویو حکیم محمد سعید صاحب (کراچی) سے لیا گیا تھا۔ حکیم سعید صاحب پاکستان کے ایک کامیاب انسان سمجھے جاتے ہیں اسی کے ساتھ وہ معیاری صحت کے مالک ہیں۔انٹرویور کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا کہ میری صحت کا راز متوازن زندگی ہے۔ میں تقلیل غذا کے اصول پر عمل کرتا ہوں اور ۲۴ گھنٹہ میں صرف ایک بار کھانا کھاتا ہوں۔ میں اپنا کپڑا خود اپنے ہاتھ سے دھوتا ہوں حتی کہ اپنی شیروانی بھی اپنے غسل خانہ کی صفائی میں خود اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں۔ایک مرتبہ اسکول کے بچوں نے ان سے پوچھا کہ جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں انھوں نے جواب دیا کہ میں بیماری کو اپنے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔

انھوں نے بتایا کہ ایک بار میری والدہ سخت بیمار ہوئیں اس وقت میں روم (اٹلی) میں تھا انھوں نے اطلاع بھیج کر مجھے بلوایا۔ میں فوراً واپس آیا۔جب میں ان کے پاس پہنچا انھوں نے کہا کہ اب میں مرنے والی ہوں۔تم کو میری آخری وصیت یہ ہے کہ تم زندگی کا کسی سے انتقام نہ لینا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ والدہ کی یہی نصیحت میری صحت اور کامیابی کا واحد راز ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انتقام کی نفسیات تمام انسانی خرابیوں کی جڑ ہے۔اور انتقام نہ لینے کا مزاج تمام انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ آدمی اگر اسی ایک اصول کو پکڑ لے تو وہ اس کی ہمہ جہتی کامیابی کے لئے کافی ہو جائے۔

زندگی میں ہر ایک کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس کے اندر غصہ اور انتقام کے جذبات کو بھڑکا دیتے ہیں۔ یہ ہر آدمی کا نازک ترین امتحان ہے۔ اگر وہ غصہ اور انتقام کے راستہ پر چل پڑے تو وہ ہر لحاظ سے ناکام ہو جائے گا اور اگر وہ غصہ اور انتقام کے جذبات کو روک لے اور مثبت ذہن کے تحت اپنی زندگی کا نقشہ بنائے۔ تو وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہو کر رہے گا۔

موجودہ دنیا میں انسان کو بہت سے لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا ہوتا ہے۔ ان دوسرے لوگوں سے بار بار ایسے تلخ تجربے پیش آتے ہیں جو اس کی انانیت کو جگائیں اور اس کے اندر غصہ کی آگ بھڑکا دیں۔ جب کسی آدمی کا یہ حال ہوتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر وہی منفی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو انتقام کہا جاتا ہے اس وقت آدمی معتدل حالت پر باقی نہیں رہتا۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ جس سے اسے تلخ تجربہ پیش آیا ہے اس کے اوپر اپنے غصہ کی آگ کو انڈیل دے، اس کو بھرپور طور پر اپنے انتقام کا نشانہ بنائے۔

اس قسم کا جذبہ پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر اس جذبہ کو استعمال کرنا انتہائی حد تک ہلاکت خیز ہے عقل مندی یہ ہے کہ جب اس قسم کی آگ آدمی کے سینہ میں بھڑکے تو وہ اس کو اندر ہی اندر بجھانے کی کوشش کرے نہ یہ کہ اس کو ظاہر کر کے سماج میں تباہی پھیلائے اور خود بھی تباہی کا نشانہ بنے۔

ہر انتقام دوبارہ نئے انتقام کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اس کا حل یہ ہے کہ انتقام کے جذبہ کو پہلے ہی مرحلہ میں دبا دیا جائے۔ انتقام کا حل انتقام لینا نہیں ہے بلکہ انتقام نہ لے کر اس کو بھلا دینا ہے۔

ایک گفتگو

۲۶ جون ۱۹۹۸ کو پٹنہ کے جناب نواب حیدر بنجارا سے (Tel: 251179) ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ بہار کے ایک سابق ہندو وزیر بھی تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر بستی میں اور ہر قوم میں خدا کے پیغمبر آئے۔ اس بیان کے مطابق بھارت میں بھی ضرور خدا کے پیغمبر آئے ہوں گے۔ ایسی حالت میں اگر ہم رام اور کرشن اور بدھا کو پیغمبر مانیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قرآن میں یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ پیغمبروں میں فرق نہ کرو، اور تمام پیغمبروں پر ایمان لاؤ۔ (البقرہ۔۱۳۶) اس لئے دوسرے پیغمبروں کو ماننا خود ہمارے عقیدہ کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

میں نے کہا کہ اصولی طور پر یہ بات درست ہے۔ کہ ہر بستی اور ہر قوم میں خدا کی طرف سے آگاہ کرنے والے آئے (فاطر۔۲۴) حدیث کے مطابق ان خدائی فرستادوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ اجمالی ایمان کے طور پر یقیناً ہم ان تمام پیغمبروں کو مانتے ہیں مگر جب کسی شخصیت کو نام لے کر پیغمبر بتایا جائے تو ضروری ہے کہ اس کے لئے ہمارے پاس کوئی ثبوت موجود ہو۔ محض ذاتی قیاس کی بنا پر ہم کسی متعین شخص کو پیغمبر نہیں کہہ سکتے۔ رسالت پر ایمان کی تکمیل کے لئے تمام پیغمبروں پر نام بنام ایمان لانا ضروری نہیں صرف مجمل ایمان سے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

اس معاملہ میں پہلا ذریعہ قرآن وحدیث ہے۔ مگر جب ہم قرآن کو اس نظر سے دیکھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں نام لے کر جن پیغمبروں کا ذکر آیا ہے ان کی

تعداد دو درجن سے زیادہ نہیں۔ اس لئے ان مذکورہ شخصیتوں کے بارے میں تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے۔ جہاں تک دوسرے پیغمبروں کی بات ہے، ان کے بارے میں جاننے کا مزید ماخذ صرف دو ہو سکتے ہیں، تاریخ اور دوسرے مذہبوں کی مقدس کتابیں۔

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے، وہ پیغمبر اسلام کے سوا کسی بھی دوسرے پیغمبر کا ذکر نہیں کرتی، حتی کہ پیغمبر اسلام سے پہلے قریبی زمانہ میں آنے والے پیغمبر حضرت مسیح کا بھی نہیں۔ خالص تاریخی اعتبار سے، پیغمبر آخر الزماں کو چھوڑ کر بقیہ تمام پیغمبر غیر معلوم اور غیر مذکور شخصیتیں ہیں۔ ایسی حالت میں تاریخ کے حوالہ سے کسی پیغمبر کو پیغمبر ماننے کا سوال ہی نہیں۔

اس کے بعد دوسرا ماخذ مذہب کی مقدس کتابیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک ماخذ بائبل کا ہے۔ بائبل میں کچھ ایسے نبیوں کے نام آئے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، مثلاً نحمیاہ اور یرمیاہ وغیرہ۔ چنانچہ علمائے اسلام نے بائبل کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے ان شخصیتوں کو بھی خدا کے پیغمبر کے طور پر تسلیم کیا ہے۔

اس کے بعد ہندوازم کو لیجئے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے مطابق رام اور کرشن کو مقدس شخصیت مانا جاتا ہے۔ اس بنا پر کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ رام اور کرشن کو ہمیں پیغمبر ماننا چاہئے مگر خالص علمی اعتبار سے اس قسم کا نظریہ درست نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود ہندو مذہب میں رام اور کرشن کو پیغمبر نہیں مانا جاتا بلکہ ان کو اوتار مانا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، پیغمبر اور اوتار کے درمیان بنیادی فرق موجود ہے۔

اسلامی تعلیم کے مطابق، پیغمبر عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ اس کی

مزید خصوصیت صرف یہ ہے کہ خدا اس کو اپنے پیغام کی پیغام رسانی کے لئے چنتا ہے،
فرشتہ کے ذریعہ اس پر اپنا کلام اتارتا ہے۔ اس کے برعکس ہندو مذہب میں جب ایک
کو اوتار کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا اس شخص کی صورت میں دنیا میں ظا
ہوا۔ یہ وہی چیز ہے جس کو فلسفہ کی زبان میں تجسیم (incarnation) کہا جاتا ہے۔ ا
طرح اوتار کا مطلب تجسیمی خدا (incarnate-god) ہے۔ نہ کہ اسلامی معنوں میں پیغ
خدا۔ ایسی کسی شخصیت کو اگر اوتار کہا جائے تو یہ اسلامی عقیدہ کے خلاف ہوگا اور اگر اس
پیغمبر کہا جائے تو ہندو عقیدہ کے خلاف۔

پھر جب خود ہندو مذہب رام اور کرشن کو پیغمبر نہ بتا رہا ہو تو ہم خود سے کس طر
ان کے اوپر پیغمبر کا لیبل لگا دیں گے۔ کسی مذہبی نظام کی کوئی شخصیت اس پہلو سے اس وقت
قابل غور ہو سکتی ہے جب کہ وہ مذہبی نظام اس کے پیغمبر خدا ہونے کا دعوی کرے۔ جس
شخصیت کو وہ پیغمبر خدا کی حیثیت سے پیش نہ کرے، اس پہلو سے اس کا نام سرے سے ز
بحث لایا نہیں جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رام اور کرشن کو پیغمبر کہنا اتنا ہی غیر علمی ہے جتنا ؟
اور ابراہیم کو اوتار کہنا۔

اب گوتم بدھ کے معاملہ کو لیجئے۔ کچھ لوگ ان کو خدا کا پیغمبر بتاتے ہیں مگر یہ درست
نہیں۔ اس لئے کہ گوتم بدھ کی موجود تعلیمات کے مطابق، وہ سرے سے خدا کے وجود ہی
نہیں مانتے۔ چنانچہ بدھ مذہب کو ایک غیر خدائی مذہب (godless religion) کہا جا
ہے۔ پھر جو شخصیت خدا کے وجود ہی کو نہ مانتی ہو اس کو خدا کا پیغمبر کس طرح کہا جا
گا۔ ایسے قول پر تو وہ مثل صادق آئے گی کہ: مدعی ست گواہ چست۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندوؤں نے بطور خود یہ اعلان کیا کہ گوتم بدھ ایک

اوتار تھے۔اس طرح انھوں نے گوتم بدھ کو ہندو اوتاروں میں شامل کرلیا۔ مگر بدھ مذہب کے لوگ اس بات کو نہیں مانتے۔ان کا کہنا یہ ہے کہ جب ہم خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے تو کیسے ممکن ہے کہ ہم گوتم بدھ کو خدا کا اوتار بتائیں۔

اوپر جو کچھ کہا گیا، اس کا تعلق صرف ان مذہبی شخصیتوں سے ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے ظہور سے پہلے پیدا ہوئیں۔ پیغمبر اسلام کے بعد پیدا ہونے والی مذہبی شخصیتوں پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔اسلامی عقیدہ کے مطابق، محمد ﷺ پر نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ایسی حالت میں آپ کے بعد پیدا ہونے والی کسی شخصیت کو اس حیثیت سے زیر غور لانا سرے سے ممکن ہی نہیں، خواہ اس نے اپنے کو پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

آخری بات یہ ہے کہ جو لوگ مذکورہ قسم کا نظریہ پیش کرتے ہیں وہ اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میل ملاپ پیدا ہوگا۔ مگر میل ملاپ کا تعلق اس قسم کے کسی نظریہ سے نہیں۔اگر ایسا ہوتا تو مذاہب کے درمیان کبھی داخلی لڑائی نہ ہوتی۔ جیسا کہ معلوم ہے مہاتما گاندھی کو جس شخص نے قتل کیا وہ ایک ہندو تھا نہ کہ مسلمان۔اسی طرح نواب زادہ لیاقت علی خاں کو جس نے قتل کیا وہ ایک مسلمان تھا نہ کہ ہندو۔یہی پوری تاریخ میں جاری رہا ہے۔ میل ملاپ کی بنیاد باہمی احترام ہے نہ کہ مذہبی اشتراک۔

ایک واقعہ دو انجام

دہلی کے اوکھلا وہار کے علاقہ میں ایک تقریری پروگرام کے تحت جانا ہوا۔ نظام الدین سے اوکھلا وہار تک کے اس سفر میں مندرجہ ذیل افراد میرے ساتھ تھے: برادرم محمد خالد ندوی، مسجد کے امام قاری محمد سمیع اللہ صاحب، اور واحد علی انجینئر صاحب Tel: 6922073

۱۰ جون ۱۹۹۸ کی شام کو میں اس مسجد میں پہنچا جس کو عام طور پر جسولا وہار کی مسجد کہا جاتا ہے۔ اس مسجد کو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ اس کے بارے میں مجھے کوئی واقفیت تھی۔ عشاء کے وقت جب میں وہاں پہنچا تو یہ میرے لئے ایک غیر متوقع منظر تھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ مسجد جس کا نام اقراء مسجد ہے کسی آبادی میں نہیں ہے بلکہ ایک کھلی ہوئی جگہ پر ہے۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ یہاں مسجد کے چاروں طرف مسلمانوں کی بہت بڑی کالونی تھی۔ اس کالونی کے اندر انھوں نے یہ مسجد بنائی تھی۔ مگر یہ کالونی غیر قانونی تھی اور دلی کے ماسٹر پلان کے خلاف بنائی گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۸۹ میں راجیو گاندھی کی حکومت کے زمانہ میں اس قسم کی دوسری بہت سی کالونیوں کی طرح اس کو بھی مکمل طور پر توڑ دیا گیا۔ ڈی ڈی اے کے عملہ نے بلڈوزر کے ذریعہ مسلمانوں کے ہزاروں مکانوں کو ڈھا دیا۔

آخر میں مسجد کی باری تھی مگر یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا D D A کا ایک ملازم جس کا نام پنڈت شرما تھا وہ بلڈوزر کا آپریٹر تھا۔ اس نے مسجد کو بلڈوز کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے افسر نے سختی کے ساتھ حکم دیا مگر وہ راضی نہیں ہوا۔ افسر نے دھمکی

ی کہ میں تم کو ملازمت سے برخواست کردوں گا تو پنڈت شرما نے کہا کہ آپ جو چاہیں
ریں، مگر میں مسجد پر اپنا بلڈوزر نہیں چلا سکتا۔ چنانچہ پوری کالونی مکمل طور پر ڈھادی گئی مگر
مسجد اکیلی عمارت کی حیثیت سے کھڑی رہی۔ ایک عرصے تک یہ مسجد غیر آباد پڑی ہوئی
ھی۔ اب قاری محمد سمیع اللہ صاحب نے اس کو آباد کیا ہے۔ انھوں نے اس کی نئی تعمیر
کے وہاں ایک مدرسہ بھی قائم کر دیا ہے جس کا نام مدرسۃ الحراء ہے۔

ایک طرف جسولا وہار کی یہ مسجد ہے جس کو توڑنے سے ہندو انکار کر دیتا ہے دوسری
رف ایودھیا کی مسجد ہے جس کو ہندو اقدام کر کے توڑ ڈالتا ہے۔ یہ فرق کیوں۔ اس فرق
ا وجہ یہ ہے کہ جسولا وہار کا ہندو ایک نارمل ہندو تھا۔ جب کے ایودھیا کا ہندو ایک غیر
رمل ہندو تھا جس کی انا کو نا اہل مسلم لیڈروں نے اپنی اشتعال انگیز تقریروں سے بھڑکا دیا
ھا۔ گویا کہ جسولا وہار کا ہندو اگر مسٹر ہندو تھا تو ایودھیا کا ہندو مسٹر ایگو۔ سیکڑوں سال کی
اریخ بتاتی ہے کہ مسٹر ہندو نے کبھی کسی مسجد کو نہیں توڑا مگر جب مسٹر ہندو کو بھڑکا کر مسٹر
یگو بنا دیا جائے تو اس کے بعد وہ ہو گا جو ۶ / دسمبر ۱۹۹۲ کو ایودھیا میں پیش آیا۔

یہ واقعہ گویا اس آیت کی تفسیر ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ: اگر تم صبر کرو اور اللہ
سے ڈرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہیں پہونچائے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں سب اللہ
کے بس میں ہے (وان تصبرو ا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شئیا ان اللہ بما یعملون
محیط) آل عمران۔ ۱۲۰۔

اس آیت کے مطابق، اس دنیا میں اصل مسئلہ کید (سازش) کی موجودگی نہیں ہے،
لکہ صبر کی غیر موجودگی ہے۔ اہل ایمان اگر صبر کی روش اختیار کریں تو خدا کی ضمانت ہے کہ
خالفین کی سازش یقینی طور پر بے اثر ہو کر رہ جائے گی۔ البتہ اگر اہل ایمان بے صبری کی

روش اختیار کریں تو سخت اندیشہ ہے کہ وہ اغیار کی سازش کی زد میں آ جائیں گے۔

مذکورہ دونوں مثالیں اس کا کھلا ہوا نمونہ ہیں۔ ایودھیا کی مسجد کے معاملہ میں جذبا لیڈروں کی رہنمائی میں مسلمانوں نے غیر صابرانہ روش اختیار کی۔ اس نتیجہ یہ ہوا کہ ایودھ کی مسجد کو کچھ مشتعل ہندوؤں نے توڑ دیا۔ اس کے برعکس دہلی کی مسجد کے معاملہ میں کو جذباتی لیڈر اشتعال دلانے کے لئے موجود نہ تھا۔ یہاں فطرت نے مسلمانوں کی رہنمائی ک چنانچہ انھوں نے صبر اور خاموشی کی روش اختیار کرلی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کی مسج جہاں تھی وہیں بدستور قائم رہی، بلکہ سرکاری حکم کے باوجود ہندو نے اس کو توڑنے سے انکار کر دیا۔

جسولا وہار کی مسجد اور ایودھیا کی مسجد کا تقابل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دونوں کلی طور پر ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ تمثیل یا تقابل کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا کہ دونوں کے درمیان کلی یکسانیت پائی جائے۔ تمثیل یا تقابل ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان جزوی مشابہت کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ کلی مشابہت کے اعتبار سے۔

قرآن مجید میں بتوں کی مثال مکڑی سے دی گئی ہے (العنکبوت۔۴۱) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بتوں میں مکڑی کی طرح پاؤں ہوتے ہیں یا وہ بھی مکڑی کی طرح جالہ بنتے ہیں۔ یہ مثال صرف ایک مشترک جزو کے اعتبار سے ہے جو دونوں کے درمیان یکساں طور پر پایا جا رہا ہے اور وہ ہے کمزوری۔

دیوارِ قہقہہ

ایک پرانا قصہ ہے کہ کہیں ایک بہت لمبی اور اونچی دیوار تھی۔ جو لوگ دیوار کے اِس پار رہتے تھے انھیں دیوار کے اُس پار کا حال کچھ معلوم نہ تھا۔ چنانچہ دیوار کے اِس پار بسنے والوں کے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ انھوں نے چاہا کہ دیوار کے دوسری طرف کا حال معلوم کریں۔

اس مقصد کے لیے ایک بہت لمبی سیڑھی بنائی گئی اور پھر ایک آدمی کو تیار کیا گیا کہ وہ اس سیڑھی پر چڑھ کر دیوار کے اوپر تک جائے اور وہاں جاکر یہ دیکھے کہ دیوار کے دوسری طرف کیا ہے۔ وہ آدمی سیڑھی کے ذریعہ دیوار کے اوپر چڑھا مگر جب اس نے اوپر پہنچ کر دیوار کے دوسری طرف کا منظر دیکھا تو وہ اتنا زیادہ بے خود ہوا کہ وہ قہقہہ لگا کر اس کی طرف کود پڑا۔ اس کے بعد ایک اور آدمی کو اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا مگر جب وہ اوپر پہنچا تو وہ بھی پہلے شخص کی طرح قہقہہ لگا کر دیوار کی دوسری طرف کود گیا۔ اسی طرح بہت سے لوگ دریافت حال کے لیے دیوار پر چڑھائے گئے، مگر ہر ایک قہقہہ لگا کر دوسری طرف کودتا رہا اور دیوار کے دوسری طرف کا حال بدستور لوگوں کے لیے غیر معلوم رہا۔ اس تجربہ کی بنا پر اس دیوار کا نام دیوار قہقہہ مشہور ہو گیا۔

یہ قصہ تمثیل کی زبان میں موجودہ زمانہ کی ایک صورت حال کو بتاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ مسلم دنیا (یا مشرقی دنیا) کے باہر مغربی دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا، نئے علوم پیدا ہوئے، فکر وعمل کی ایک نئی تعمیر ہوئی، یہ نئے اسباب اتنے طاقت ور تھے کہ اس کے ذریعہ اہل مغرب نے ساری دنیا پر براہ راست یا بالواسطہ غلبہ حاصل کر لیا۔

اس کے بعد مسلم دنیا یا مشرقی دنیا کے نوجوان تعلیم یا کسی اور مقصد کے تحت مغربی دنیا کی طرف جانے لگے یہ عمل پچھلے تقریباً سو سال سے جاری ہے۔ یہ مسلم نوجوان گویا وہ لوگ تھے جو مشرق اور مغرب کے درمیان قائم شدہ دیوار پر چڑھے تاکہ دوسری طرف کا حال معلوم کریں۔ وہ مغرب کو اور مغربی تہذیب کو جانیں اور پھر واپس آکر اہل مشرق کو اس سے باخبر کریں۔

مگر دوبارہ یہ ہوا کہ ان مشرقی نوجوانوں کا یہ سفر دیوار قہقہہ کی چڑھائی کے ہم معنی بن گیا۔ ان کو جب مغربی دنیا کو دیکھنے کا موقع ملا تو وہ اس سے اتنا زیادہ مسحور ہوئے کہ وہ بے تابانہ اس کی

طرف ٹوٹ پڑے وہ مسلم تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب کے دل دادہ ہو گئے وہ ایسا نہ کر سکے کہ مغربی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اسلام کی طرف لوٹیں اور اسلام کی نمایندگی کے تقاضے پورے کریں، وہ دنیا کی قوموں کے سامنے اسلام کے داعی بن جائیں۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ اسلام سے تو انھوں نے صرف رسمی قسم کا تعلق رکھا۔ عملی طور پر وہ پوری طرح مغرب اور مغربی تہذیب کے نمائندے بن کر رہ گئے۔

یہ صورت حال آج بہت بڑے پیمانہ پر قائم ہے۔ مسلم دنیا کے بیشتر باصلاحیت نوجوان مغربی علوم کو سیکھ کر مغرب کی سیاسی اور اقتصادی مشین کے پرزے بنے ہوئے ہیں۔ وہ بظاہر اسلام کا نام لیتے ہیں مگر عملاً وہ خدمت اسلام کے بجائے خدمت مغرب کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں۔

دیوارِ قہقہہ تو شاید ایک افسانوی دیوار ہو، مگر جدید دیوارِ قہقہہ پورے معنوں میں ایک حقیقی دیوار ہے اور اسی کے ساتھ نہایت سنگین مسئلہ بھی۔ اس جدید دیوار نے اہل اسلام کے بہترین افراد کو ان سے چھین لیا ہے۔ اس نے ہمارے انتہائی لائق نوجوانوں کو خدمتِ اسلام کے میدان سے ہٹا کر خدمتِ غیر اسلام کے میدان میں سرگرم کر دیا ہے۔

اس مسئلہ کا ایک جزئی حل یہ ہے کہ ایسے ادارے قائم کیے جائیں جہاں ان نوجوانوں کو چھٹیوں کے زمانہ میں بلایا جائے اور ہر سال کم از کم ایک مہینہ ان کو یہاں گزارنے کا موقع دیا جائے۔ یہاں کوشش کی جائے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعہ انھیں اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ جہاں ہیں وہ وہاں وَن مَین ٹو مشن کے اصول پر رہ سکیں۔ یعنی اپنا معاشی کام کرتے ہوئے وہ بقدرِ امکان دوسروں کو اسلام کا پیغام بھی پہنچائیں۔

نیویارک میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ وہ امان اللہ خان ولد نصیب اللہ خان ہیں۔ وہ ۱۹۲۰ میں کریم نگر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد سروس کے تحت حیدرآباد میں مقیم ہوگئے۔ سروس کے تحت وہ اس مکان میں رہے جس کا رقبہ ۱۰۰ + ۱۰۰ تھا۔ ان کے لڑکے اور لڑکیاں نیز کئی رشتہ دار امریکہ میں تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹۸۸ میں وہ امریکہ آئے۔

انھوں نے بتایا کہ جب میں امریکہ آنے لگا تو میں نے حیدرآباد کا مکان ایک مسلمان کو کرایہ پر دے دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب میں حیدرآباد گیا اور اس کے اوپر کے حصہ میں رہنا چاہا۔ تو مذکورہ مسلمان نے سیڑھیاں بند کردیں اور مجھے مجبور کیا کہ میں مکان چھوڑ دوں۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ وہ نہ مکان کو خالی کرتے ہیں اور نہ ٹھیک سے کرایہ ادا کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ امان اللہ خاں صاحب کو بدنام کررہے ہیں تاکہ اپنے جرم پر پردہ ڈال سکیں۔ امان اللہ خاں صاحب واپس آکر آج کل نیویارک میں اپنی لڑکیوں کے پاس مقیم ہیں : Tel (718) 6390343, 2583435

حیدرآباد کا یہ واقعہ کوئی ایک واقعہ نہیں۔ اس طرح کے واقعات ہر جگہ اور ہر مسلم بستی میں ہورہے ہیں۔ مسلمانوں میں آج کل بے شمار تحریکیں اسلام کے نام پر چل رہی ہیں۔ مگر کوئی بھی تحریک ایسی نہیں جو اس قسم کے معاملات میں دخل دے کر متعلقہ مسلمان کو ظلم اور سرکشی سے روکے۔ یہود پر اسی لیے لعنت کی گئی کہ وہ نہی عن المنکر کا یہ کام نہیں کرتے تھے۔ مسلمان اس قانون الٰہی سے مستثنیٰ نہیں۔ اگر ان کے علماء اور ذمہ دار اپنی موجودہ روش پر قائم رہیں تو کوئی بھی دوسرا عمل انھیں مذکورہ قانون کی زد میں آنے سے بچا نہیں سکتا۔

۳۱ اگست ۱۹۹۶ کو مفتی محمد سعید خاں (پیدائش ۱۹۶۱) سے ملاقات ہوئی۔ وہ پاکستان سے سیاحت کے طور پر امریکہ آئے ہوئے ہیں۔ وہ ڈٹرائٹ میں اپنے دوستوں کے ساتھ تھے۔ میری آمد کی خبر سن کر ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ ان کے ساتھ تین اور نوجوان بھی تھے۔ یہ چاروں آدمی ڈٹرائٹ سے سات سو میل کا سفر طے کرکے فلاڈلفیا پہنچے۔ ٹیلی فون سے انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ اس وقت میں فلاڈلفیا میں ہوں۔ یہاں ۳۱ اگست کو جناب رئیس احمد صاحب انجینیر کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ ملاقات کئی گھنٹہ تک جاری رہی۔

انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی بہت سی کتابیں پڑھیں تو کچھ سوالات پیدا ہوئے۔ میں نے

چاہا کہ ان کا جواب معلوم کروں۔ سوالات انھوں نے کاغذ پر نوٹ کر رکھے تھے۔ اس سے مجھے سہولت حاصل ہوتی رہی۔

میں نے پوچھا کہ ہمارے یہاں کی جو کتابیں آپ نے پڑھیں ان کا خلاصہ آپ نے کیا سمجھا۔ اسلام کی آئیڈیالوجی سب سے زیادہ طاقت ور آئیڈیالوجی ہے۔ جدید تحقیقات نے صرف ان کی صداقت میں اضافہ کیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اسلام کو آئیڈیالوجی کے اعتبار سے لے کر اٹھیں۔ اس کا مزید فائدہ یہ ہوگا کہ اسلام کو نیا خون حاصل ہوگا جس کی آج اسلام کو شدید ضرورت ہے

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ جہاں تک تصور دین کا تعلق ہے، دوسرے علماء سے مجھے کسی بھی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ میرا سارا اختلاف صرف تدبیر کار کے بارہ میں ہے۔ میرا کہنا ہے کہ دور جدید ایک بدلا ہوا زمانہ تھا۔ ہمارے رہنماؤں کو چاہیے تھا کہ وہ عصری تقاضوں کو سمجھ کر اس کے مطابق تدابیر اختیار کرتے۔ مگر انھوں نے قدیم ذہن کے تحت اقدامات کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اقدامات سے امت کو نقصان کے سوا کچھ اور نہیں ملا۔ تدبیر کار کے بارے میں یہ تنقیدی مطالعہ انتہائی ضروری ہے تاکہ ہم دوبارہ وہ غلطی نہ کریں اور آئندہ زیادہ بہتر اور صحیح منصوبہ کے تحت اپنے اقدامات کرسکیں۔

جناب رئیس احمد صاحب (فلاڈلفیا) کے مکان پر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا ایڈیشن ۱۹۹۲ تھا اس کو جگہ جگہ سے دیکھا۔ اس کتاب کا جو ایڈیشن میرے پاس ہے اس میں کئی جگہ کالی سیاہی سے کسی تصویر یا عبارت کو مٹا دیا گیا ہے۔ مثلاً جموں اینڈ کشمیر کے عنوان کے تحت جو مضمون ہیں اس میں میری انسائیکلوپیڈیا میں ابتدائی پیراگراف مٹا دیا گیا ہے۔ اس کو حکومت ہند کے حکم کے تحت مٹایا گیا ہے۔ مگر موجودہ ایڈیشن میں وہ پورا حصہ موجود ہے۔ اسی طرح اسلام کے بارہ میں جو مضامین ہیں ان میں بھی میری انسائیکلوپیڈیا میں کئی جگہ مٹایا ہوا ہے۔ مثلاً معراج (Miraj) میں رسول اللہ کی تصویر تھی اس کو عربوں کے اصرار پر مٹا دیا گیا ہے۔ مگر یہ تمام قابل اعتراض حصے موجودہ نسخے میں موجود ہیں۔ میں نے سوچا کہ لوگوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے سے تو اپنا غیر مطلوب منظر مٹا دیا مگر بقیہ ساری دنیا کی آنکھوں کے سامنے وہ بدستور اسی طرح اپنی پوری صورت میں موجود ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کسی ناپسندیدہ منظر کو دیکھنے کے لیے آدمی اپنی آنکھیں بند کرلے جب کہ عین اسی وقت ساری دنیا

کی آنکھیں اسس کو دیکھ رہی ہوں۔

ایک بار ایک پاکستانی خاندان اپنے عزیز کی شادی کی سالگرہ (wedding anniversary) میں جارہا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ بدعت شاید پاکستان سے یہاں آئی ہے۔ انھوں نے برأت ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو پہلے سے مغربی لوگوں میں مروج تھی، ہم لوگوں نے ان سے لے لیا ہے۔ میں نے کہا کہ پاکستان ویسٹ کو اسلامائز کرنے کے لیے بنایا گیا تھا، مگر اب وہ خود اسلام کو ویسٹرنائز کرنے کا کام کر رہا ہے۔ ایک پُرشور اسلامی تحریک کا یہ انجام بھی کیسا عجیب ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ یہ تو باہم ملنے کے لیے ہے —— تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔

ایک صاحب نے کہا کہ "انڈیا میں مسجدیں ڈھائی جارہی ہیں . . . ." میں نے کہا کہ کلام کا یہ انداز بے حد غیر اسلامی ہے۔ یہ جنرلائزیشن ہے، اور جنرلائزیشن بلاشبہ اسلام میں جائز نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انڈیا میں ایک مسجد ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ڈھائی گئی تھی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اس کے بعد بھی انڈیا میں تقریباً چار لاکھ مسجدیں محفوظ حالت میں موجود ہیں۔ انڈیا میں ایک مسجد ڈھائی گئی ہے نہ کہ مسلسل طور پر وہاں مسجدیں ڈھائی جارہی ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ خود امریکہ میں جہاں آپ ہیں وہاں بھی ایک مسجد کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا ہے۔

۱۳ اگست کی شام کو عشاء کی نماز رئیس احمد صاحب (فلاڈلفیا) کے مکان پر پڑھی گئی۔ یہاں کئی تعلیم یافتہ مرد اور عورتیں رہائش گاہ پر جمع ہو گئے۔ چنانچہ ساڑھے گیارہ بجے تک سوال و جواب کی صورت میں گفتگو ہوئی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ایک ہے کسی چیز کا شرعاً بدعت ہونا، اور دوسرا ہے اس بدعت کے خلاف دھوم مچانا۔ میں نے کہا کہ کسی چیز کے بدعت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ فوراً اس کے خلاف پُرشور مہم شروع کر دیں۔ "بدعت" کے خلاف تحریک چلانے کا تعلق حالات سے ہے نہ کہ نفس مسئلہ سے۔ یعنی اگر مخالفانہ تحریک سے مثبت نتیجہ نکلنے کی امید ہو تو تحریک چلائی جائے گی، ورنہ خاموشی اختیار کی جائے گی۔

مفتی محمد سعید خاں صاحب (راولپنڈی) الرسالہ اور کتابوں کو بہت شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ مگر ان کا خیال تھا کہ الرسالہ میں تنقید نہیں ہونا چاہیے۔ خاص طور پر بڑی شخصیتوں

پر تنقید سے لوگ بھڑکتے ہیں۔

میں نے کہا کہ بھڑکنے والے کون ہیں، وہ ایک محدود طبقہ ہے۔ اس وقت سب سے بڑا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو آزاد خیال ہیں۔ اس کے سامنے یہ سوال ہے کہ دورِ جدید میں ہمارے علماء اور رہنماؤں نے بار بار مجاہدانہ اقدامات کیے، مگر یہ اقدامات صرف مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کا سبب بنے۔ وہ اس ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں کہ کیا اسلام میں کوئی کمی ہے۔ کیا اسلام دورِ جدید میں صحیح رہنمائی دینے سے محروم ہے۔ یہ لوگ جب الرسالہ میں اس قسم کی تنقیدوں کو پڑھتے ہیں تو اسلام پر ان کا اعتماد از سرِ نو قائم ہوجاتا ہے۔ وہ ناکامی کے واقعات کو ان رہنماؤں کی تدبیر کار کی غلطی یا اجتہادی خطا قرار دے رہے ہیں نہ کہ اسلام کی کمزوری۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک عظیم الشان کام ہے۔ جس چیز کو لوگ اسلام کی کمزوری کے خانہ میں ڈالے ہوئے تھے اس کو بشری کمزوری کے خانہ میں ڈال دیا۔

۳۱ اگست کی شام کو فضل الرحمٰن صاحب، مفتی سعید صاحب وغیرہ سے پاکستان پر گفتگو ہوئی۔ فضل الرحمٰن صاحب نے کہا کہ انڈیا نے بنگلہ دیش بنوایا، ہم کیسے اس کو معاف کرسکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا نے بنگلہ دیش نہیں بنوایا۔ بلکہ اس نے بنگالیوں کی پاکستان کے خلاف ناراضگی کو استعمال کیا۔ محمد بن قاسم نے سندھ میں داہر کے خلاف ناراض ہندوؤں کو استعمال کیا۔ اسپین میں طارق نے شاہ کے خلاف ناراض گروپ کو استعمال کیا:

You have to know that your enemy will
fish in your troubled water.

مفتی محمد سعید خاں صاحب کا تقریباً دو دن کا ساتھ رہا۔ یکم ستمبر کی صبح کو ۹ بجے وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس گئے۔ آخر وقت میں میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنے آخری تاثرات بتائیں۔ انھوں نے میری ڈائری پر یہ الفاظ لکھے جو بغیر کسی مزید اضافہ کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

فکری ہلاکت کئی طرح پہ واقع ہوتی ہے۔ اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی رائے پر مر مٹے اور یہ سمجھنے لگے کہ بس صرف اسی کی رائے کسی معاملے میں درست ہے اور

بقیہ سب لوگ غلطی پر ہیں۔ ایسا شخص صرف اپنے ذہنی خول میں جیتا ہے اور خارجی حالات اُس کی ذہنی سطح سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے جب وہ کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اپنے خول کے پاٹ اور خارجی حالات کے پاٹ میں پس جاتا ہے۔

سعید ۲ ستمبر ۱۹۹۶

امریکہ کے لیے یہ میرا پانچواں سفر تھا۔ میں نے دیکھا کہ جو لوگ اپنے ملکوں سے یہاں آئے ہیں وہ اپنے ملکوں کے مقابلہ میں یہاں زیادہ بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ ذہن اپنے اپنے ملکوں سے نکل کر یہاں آتے ہیں۔ مگر اس بار تفصیلی مشاہدہ کے بعد میری رائے یہ نہیں ہے کہ استثنائی طور پر یہ افراد ایسے ہوتے ہیں جو واقعی غیر معمولی ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ بلکہ آنے والوں میں زیادہ تعداد اوسط ذہن کے لوگوں کی ہوتی ہے۔

میرا احساس یہ ہے کہ زیادہ بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں آکر لوگ زیادہ محنت کرتے ہیں۔ وہ آخری حد تک پُرامن رہتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ وہ سسٹم سے مکمل طور پر ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں۔

یکم دسمبر ۱۹۹۶ کی صبح کو ہم لوگ رئیس احمد (فلاڈلفیا) کے مکان پر تھے۔ یہاں ناشتہ کا انتظام تھا۔ مفتی سعید احمد خاں صاحب وغیرہ سب مل کر ہم لوگ چھ آدمی تھے۔ نماز کے بعد چائے کے لیے بیٹھے، میز پر ڈبل روٹی کے ساتھ مکھن اور جیلی تھی۔ لوگ ایک ایک پیس اٹھا کر اس پر مکھن اور جیلی لگا رہے تھے۔ میں نے کہا کہ گھر پر میرا معمول کا ناشتہ یہی ہے۔ میری لڑکی فجر بعد مجھے دو پیس مکھن اور جیلی لگا کر دیتی ہیں، ایک گلاس پانی کے ساتھ میں اس کو کھاتا ہوں اور آخر میں ایک پیالی چائے پی لیتا ہوں۔

پھر میں نے کہا کہ اس قسم کا کام مجھے بالکل نہیں آتا۔ چنانچہ ہوائی جہاز کے سفر میں ناشتہ کے لیے ڈبل روٹی اور مکھن اور جیلی آتی ہے تو میں تینوں کو الگ الگ کھا لیتا ہوں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ بعض باتیں نحو و صرف کے اعتبار سے درست ہوتی ہیں، مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے غلط ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص میرے بارہ میں کہے کہ ان کو ایک پیالی چائے

اور مرد کے درمیان فرق کو بحث تک لے گئے ہیں۔ مگر یہاں آپ لوگ حد کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ اس نے کہا کہ ہم تو حد کو قائم کیے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ آزادی اس وقت تک جب تک وہ دوسرے کی آزادی میں دخل اندازی نہ بنے :

Freedom until infringement upon others' freedom.

پھر گفتگو کے درمیان اسلام اور مغربی تہذیب کا تقابل کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ صرف ایک حد کو مانتے ہیں، اور وہ ہے ڈائرکٹ دخل اندازی۔ مگر اسلام میں ڈائرکٹ کے سوا ایک اور حد کو بھی تسلیم کیا گیا ہے، اور وہ ہے اِن ڈائرکٹ دخل اندازی۔ مثلاً ایک عورت اور ایک مرد اگر انفرادی سطح پر ایک دوسرے پر دست درازی نہ کر رہے ہوں تو آپ کے نزدیک اس کے بعد سب کچھ جائز ہے۔ مگر اسلام اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھتا ہے کہ انفرادی آزادی کے استعمال کے اثرات سماجی اور قومی دائرہ میں کیا ہوں گے۔ گویا اسلام نے حد کے تصور کو بالواسطہ اثرات تک وسیع کیا ہے۔ اس نے میری بات کے وزن کو تسلیم کرتے ہوئے کہا : (I think you are right)

۲ ستمبر کو ایک واقعہ ہوا جو امریکہ کے تمام اخباروں میں چھپا۔ یہاں کے ٹمپا ایرپورٹ (Tampa International Airport) پر ایک شخص یو ایس ایر کے جہاز پر سوار ہونے والا تھا۔ مگر اس کا سامان جب ایرپورٹ کے کنویر بلٹ (Conveyor belt) سے گزرا تو اس سے ساتھ لگی ہوئی ایکسرے مشین نے بتایا کہ اس کے اندر دھماکہ خیز اشیاء اور گن ہیں۔ مسافر کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ یہ ایک ۱۲ سالہ نوجوان رگمین (Roman Regman) تھا۔ وہ ایک مسیحی سیمنری کا طالب علم ہے۔ ریکارڈ کے مطابق وہ ایک گُڈ اسٹوڈنٹ تھا۔

یہاں اس طرح کے کئی واقعات ہوئے ہیں جس میں اسلحہ یا بم پکڑا گیا ہے۔ مگر اس میں مسلمان ملوث نہ تھے۔ اس طرح مسلمانوں کی تشدد پسند تصویر میں کسی قدر کمی واقع ہوئی ہے۔

۴ ستمبر کی شام کو ہم لوگ بروکلین پبلک لائبریری دیکھنے کے لیے گئے۔ گیٹ پر پہنچے تو اندر سے ایک سفید فام شخص نکل رہا تھا۔ یہاں عام طور پر لوگ اچانک سوال کرنا پسند نہیں کرتے۔ مگر میرے مختلف حلیہ اور میری پگڑی کو دیکھ کر وہ چپ نہ رہ سکا۔ میرے ساتھی

جناب کلیم الدین صاحب جو پستلون پہنے ہوئے تھے ان سے کہا کہ کیا یہ سکھ ہیں :

Is he a Sikh?

سکھ بہت چھوٹی اقلیت ہیں۔ مگر انھوں نے اپنی شناخت ساری دنیا میں اس طرح قائم کر رکھی ہے کہ وہ دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ لائبریری میں داخل ہوئے۔ یہ ایک مکمل نمائین منزلہ عمارت تھی۔ اس میں ہر قسم کی سہولتیں اور انتظامات اعلیٰ معیار کے ساتھ موجود تھے۔ تیسری منزل پر مذہب کا شعبہ تھا۔ وہ بھی کافی جامع تھا۔ میرے ذہن نے امریکہ کی اس پبلک لائبریری کا تقابل دہلی کی پبلک لائبریری سے کیا تو دہلی کی لائبریری اس کے مقابلہ میں ایسی نظر آئی جیسے راشٹرپتی بھون کی لائبریری کے مقابلہ میں کسی جھگی جھونپڑی کی لائبریری۔

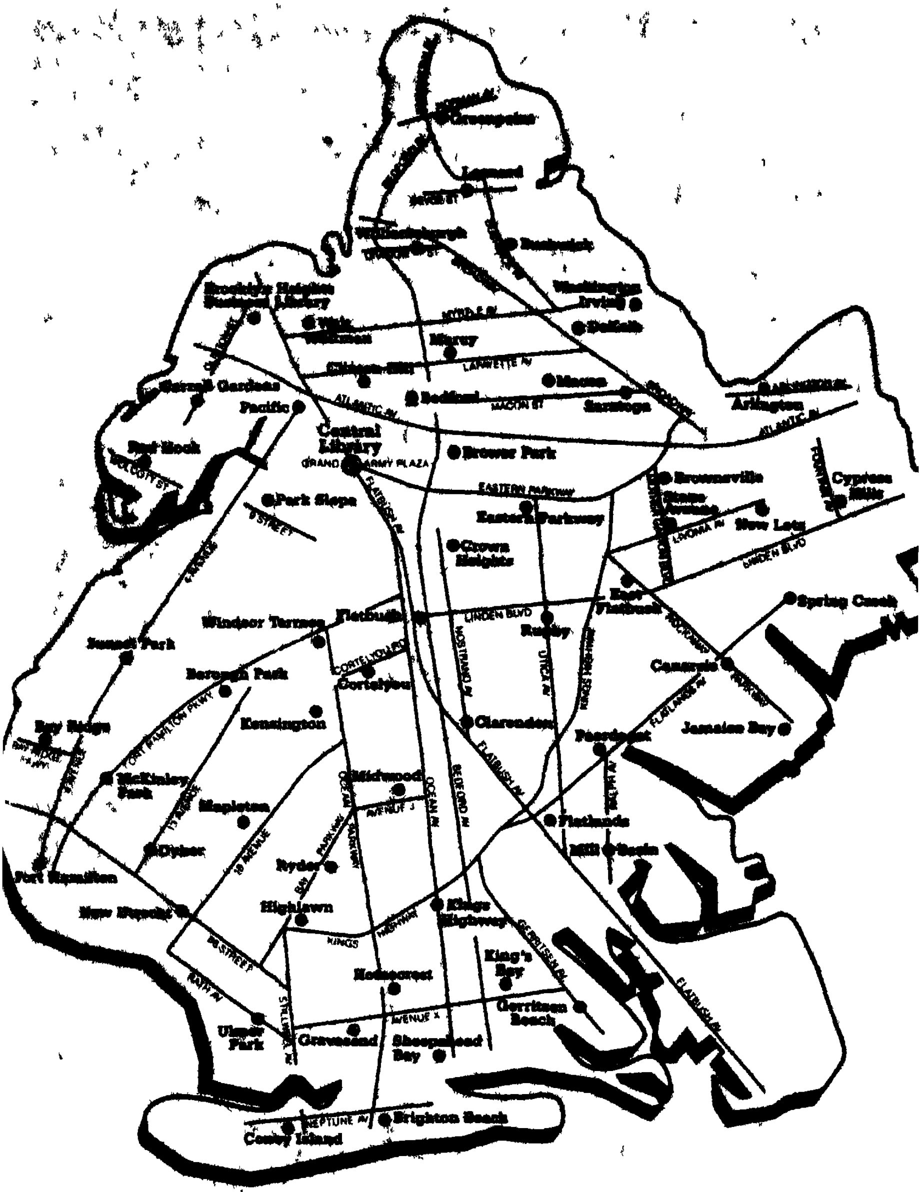
یہاں ہر قسم کی کتابیں مفت پڑھنے کے لیے دی جاتی ہیں۔ لائبریری کی وسیع دنیا میں ہر قسم کی علمی سہولتیں موجود ہیں۔ ہر ضرورت کے لیے کثرت سے کمپیوٹر لگے ہوئے ہیں، آپ خود انھیں استعمال کریں، لائبریری کے عملہ کی مدد سے ان سے فائدہ اٹھائیں۔

میں نے کمپیوٹر کے دو تجربے کیے۔ پچھلے سالوں میں (Living with Islam) کے عنوان سے مغربی جرائد میں کئی مقالے شائع ہوئے ہیں۔ ہم نے کمپیوٹر سے اس کے حوالے پوچھے۔ بٹن دباتے ہی اس کی اسکرین پر تمام حوالے آگئے۔ پھر ہم نے ایک اور بٹن دبائی تو ساتھ لگی ہوئی مشین پر ہلکی آواز شروع ہوئی اور ایک مقالہ کا پورا پرنٹ آؤٹ نکل کر باہر آگیا۔ پھر دوبارہ بٹن دبائی تو اس نے ایک اور مقالے کا مکمل پرنٹ آؤٹ نکال کر ہمیں دے دیا :

۱۔ دی اکونومسٹ ۴ اپریل ۱۹۹۲

۲۔ دی اکونومسٹ ۱۸ مارچ ۱۹۹۵

یہاں کچھ لوگوں نے زبانی طور پر ایک قصہ بتایا۔ یہ ایک سفید فام عورت سوسن اسمتھ (Susan Smith) کا قصہ تھا۔ میں اس قصہ کو حوالے اور تاریخ کے ساتھ زیادہ متعین صورت میں جاننا چاہتا تھا۔ مجھے عورت کا نام معلوم نہ تھا۔ یہاں کی ایک خاتون کارکن سے ذکر کیا تو اس نے فوراً اس کا نام بتادیا۔ اب کمپیوٹر پہ یہ نام بتایا گیا اور فوراً ہی اسکرین پر اس کے بارہ میں تفصیلی معلومات آنا شروع ہوگئیں۔ اس واقعہ کی رپورٹیں اور اس کے بارہ میں آرٹیکل کثرت



Brooklyn Public Library

سے کمپیوٹر کے اندر فیڈ کیے ہوئے تھے۔ کمپیوٹر نے ان سب کی معلومات ہم کو دینا شروع کر دیا۔ آخر میں ہم نے دو رپورٹوں کو حاصل کرنے کے لیے کمپیوٹر کا بٹن دبایا۔ اگلے ہی لمحہ پاس رکھی ہوئی مشین پر اس کا پرنٹ آؤٹ نکل کر باہر آگیا۔

یہ واقعہ امریکہ کی سفید فام نسل کے لیے ایک بے حد شرمناک واقعہ ہے۔ مگر وہ کسی کمی بیشی کے بغیر اپنی مکمل صورت میں کمپیوٹر کے خزانہ میں موجود تھا اور کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت اس کو بلا قیمت حاصل کر سکتا تھا۔ یہی آزادی اور موضوعیت مغربی ملکوں کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

یہاں میں نے ایک غیر یہودی سے پوچھا کہ امریکہ میں یہودی اتنا زیادہ چھائے ہوئے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے اور ان کی طاقت کا راز کیا ہے۔ اس نے کہا کہ جہاں تک میرا خیال ہے یہودیوں پر پچھلی تاریخ میں بہت مظالم ہوئے۔ خود امریکہ میں بھی شروع شروع میں عیسائی ان پر بہت زیادتیاں کرتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں یہودیوں میں ایک قسم کا جذبۂ بقا (survival instinct) پیدا ہو گیا۔ چنانچہ وہ ہر معاملہ میں ذمہ داری اپنے آپ پر لیتے ہوئے جینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہاں ملک کی قوت کے لیے بہت کام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دینے والا سماج (giver society) بن گئے ہیں۔ اس طرح دھیرے دھیرے ان کے خلاف نفرت ختم ہو گئی۔

ایک طالب علم سے بات کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ یہاں کے اچھے اسکولوں میں بالکل غیر متعصبانہ ماحول ہے۔ مثلاً کوئی یہودی نوجوان اگر ایک واقعہ کو لے کر عربوں کی برائی بتائے تو فوراً کوئی بول دے گا کہ —— تم جنرلائزیشن کر رہے ہو۔ تم کو آبجکٹیو رہنا چاہیے۔ اس طرح یہاں کے طالب علم کے اندر متعصبانہ ذہن پرورش نہیں پاتا۔

مذکورہ اسباب کی بنا پر میری رائے ہے کہ مغربی تہذیب دجال کا ظہور نہیں، اپنے امکانات کے اعتبار سے وہ اسلام کے حق میں تائید الٰہی کا ظہور ہے۔ اس نے وہ تمام اسباب پیدا کر دیے ہیں جو اد خال الکلم کی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی ضرورت ہے۔ اب ہمیں یک طرفہ طور پر مدافعت کر کے وہ حالات پیدا کرنا ہے جس میں نارمل انداز میں اسلام کی اشاعت ہونے لگے۔

نیویارک ٹائمس یہاں کا بہت مشہور اخبار ہے۔ وہ (۱۸۵۱) جاری ہوا تھا۔ اس کی پیشانی پر ہر روز یہ جملہ لکھا ہوا ہوتا ہے —— تمام خبریں جو چھاپنے کے قابل ہوں :

All the news thats fit to print.

موزوں خبروں کے انتخاب کا فیصلہ کرے گا۔ اس کا فیصلہ اخبار کے انٹرسٹ (انٹرسٹ) کرے گا کہ خود خبروں کی اپنی نوعیت۔ یہیں سے اخبار یا میڈیا کا رول عملی طور پر یک رخا ہو جاتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اخبار ہمیشہ شور یا دھماکہ والی خبروں کو زیادہ لیتا ہے۔ تعمیری خبروں کی اس کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں۔

ایک صاحب کو الرسالہ کی تنقیدوں سے اختلاف تھا۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ میں اور مجھ میں جو فرق ہے وہ صرف یہ کہ آپ لوگوں نے اپنے اکابر کو معیار بنایا ہے اور ہم نے اصحاب رسول کو معیار بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے دفاع میں کچھ باتیں کہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا اکابر غلطی پر تھے۔ میں نے کہا کہ آپ یا کوئی شخص جو بھی کہے، میں اللہ کے فرشتوں کے سامنے جو الفاظ ریکارڈ کرانا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ اس وقت جب کہ لوگ اپنے اکابر کو معیار بنائے ہوئے تھے، میں نے اعلان کیا کہ اے مسلمانو، اصحاب رسول کو معیار بناؤ۔

پھر میں نے کہا کہ آپ کا طریقہ عملی طور پر ممکن نہیں۔ کیوں کہ اکابر کی کوئی ایک قسم نہیں۔ ہمارے یہاں درجنوں الگ الگ حلقے ہیں اور ہر حلقہ کے اپنے اکابر ہیں۔ اور ہر ایک اپنے ہی اکابر کو معیار سمجھتا ہے۔ پھر آپ کیسے یہ طے کریں گے کہ فلاں گروہ کے اکابر کو مانو اور فلاں گروہ کے اکابر کو نہ مانو۔ مگر اصحاب رسول کا تو ایک ہی گروہ ہے۔ ان کو معیار ماننے کی صورت میں اس قسم کا کوئی مسئلہ سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔

آج کل پریسیڈنٹ کلنٹن کی ایک کتاب چھپی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۰ صفحہ پر مشتمل ہے اور اس کتاب کا نام یہ ہے:

Between Hope and History: Meeting America's Challenges for the 21st Century.

یہ کتاب الکشن کے مقصد کے تحت لکھی گئی ہے جو نومبر ۱۹۹۶ میں ہونے والا ہے۔ یہاں کتنا زیادہ فکری آزادی ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ۴ ستمبر کو میں نے ایک تعلیم یافتہ امریکی سے اس کا ذکر کیا تو اس نے اس کو مایوس کن (disappointing) قرار دیا۔ اس نے کہا کہ

لٹریری اپوائنٹمنٹ آف دیو ہے وہ ایک معمولی کتابچہ ہے۔ اس کتاب میں مشکل سے ایسی کوئی سطر ہے جو کہ نومبر الکشن کے بعد یاد رکھی جاسکے :

There is hardly a line in it that will be remembered beyond the November election.

۱۹۹۱ کی خلیجی جنگ میں سابق صدر امریکہ جارج بش نے عراق کے صدر صدام حسین کو یا ان کی فوج کو آخری حد تک تباہ کرنے سے پہلے چھوڑ دیا تھا۔ اب صدام حسین نے دوبارہ کردستان (جنوبی عراق) میں اپنی فوجیں داخل کردیں۔ اس کے فوراً بعد صدر کلنٹن کے حکم سے امریکی فوجوں نے عراق پر میزائل کے ذریعہ حملے کیے۔ یہ حملے ستمبر ۱۹۹۶ کے آغاز میں کیے گئے جب کہ میں امریکہ میں موجود تھا۔

تاہم اس بار یہ معاملہ بے حد نازک ہے۔ چنانچہ صدر کلنٹن کو ابھی وہ عالمی تائید نہیں ملی ہے جو جارج بش کو اپنے فوجی اقدام پر مل گئی تھی۔ اس کی کم از کم ایک وجہ وہ ہے جو ایک امریکی پروفیسر نے بتائی۔ اس نے کہا کہ صدام کو روکنا بہت ضروری ہے۔ مگر اس بار ہماری پوزیشن بہت زیادہ مضبوط نہیں، کیوں کہ اس بار صدام خود اپنے ملک میں ہے :

But we're not on very firm ground this time because he is in his own country.

نیویارک میں جناب محمد ابراہیم شیخ (Tel. 718-252-7266) سے ملاقات ہوئی۔ انھیں الرسالہ مشن سے مکمل اتفاق ہے۔ وہ الرسالہ اور کتابوں کو ۲۰ — ۲۰ بار پڑھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مستقبل میں الرسالہ اتنا پھیلے گا کہ وہی مسلمانوں کا عمومی فکر بن جائے گا۔

ان کی اہلیہ ایک امریکی نومسلمہ ہیں۔ ان کا نام زرینہ شیخ ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اسلام کی طرف آپ کو کیسے رغبت ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے انھیں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی چیز مفقود ہے۔ اس مفقود چیز کو انھوں نے اسلام میں پالیا :

Before embracing Islam, there was something missing that she found in Islam.

نمازِ ظہر کے بعد ہم لوگ اسلامک سنٹر سے روانہ ہو کر عبد الرحمٰن خاں صاحب کے مکان پہنچے۔ یہاں کچھ آدمی اکٹھا ہوگئے۔ عصر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک بات میں نے یہاں کے بیشتر مسلمان اپنی نئی نسل کے بارہ میں بہت متردد رہتے ہیں۔ ان کو ڈر ہے کہ ان کی اگلی نسل اسلامی شناخت کو کھو دے گی۔ مگر میں ان لوگوں کے بارہ میں بہت زیادہ پُر امید ہوں۔ مگر مروجہ اسلامی شناخت یا ملی شناخت دراصل تاریخی شناخت ہے۔ وہ اس اسلام کی شناخت نہیں جو رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔

میں نے کہا کہ قدیم نسل کنڈیشننگ کی وجہ سے اصلی اور فطری اسلام کو سمجھنے سے قاصر رہی ہے۔ نئی نسل اس قسم کے ذہنی بوجھ سے آزاد ہے۔ اس لیے خالص اور بے آمیز اسلام کو زیادہ سمجھ سکتی ہے۔

امریکہ میں انگریزی کتابوں کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے۔ سب سے زیادہ لٹریچر غالباً سلفی حضرات کی طرف سے فلڈ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد صوفی لٹریچر کا نمبر ہے۔ اور پھر مختلف تحریکوں اور تحریکی اداروں کے شائع کردہ لٹریچر ہیں۔ تاہم میرا احساس ہے کہ ان میں زیادہ تعداد ان کتابوں کی ہے جن میں اپنے اپنے گروہی یا ذاتی رجحانات کی تبلیغ کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام کو موضوعی انداز میں پیش کرنے والی کتابیں نسبتاً بہت کم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اسلام لوگوں کے اندر جوش تبلیغ پیدا نہیں کرتا بلکہ "اپنا اسلام" زیادہ تبلیغی جوش پیدا کرتا ہے۔

ایک کتاب پڑھی۔ اس میں اسلامی عبادت کو جسمانی ریاضت کے ساتھ وابستہ کرکے بتایا گیا تھا کہ ــــ اس کا ایک جملہ یہ تھا کہ یہ بات دھیان میں رکھنا چاہیے کہ اکثر اسلامی عبادتیں مثلاً نماز اور حج جسمانی صحت کے متقاضی ہیں :

It is important to point out that many of the devotions in Islam like Salat and Hajj require a body that is physically fit. *Islam the Natural Way*, by Abdul Wahid Hamid.

مصنف نے اسلامی عبادتوں کو محض ان کے فارم کے اعتبار سے لیتے ہوئے انھیں ایک طرح کا جسمانی فعل سمجھ لیا۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ عبادات کے ساتھ جسمانی فعل کا پہلو اس کا صرف ظاہری پہلو ہے۔ اس کا حقیقی پہلو اس کی داخلی کیفیت ہے۔ اسی لیے معذور شخص کی عبادت بھی اتنی ہی کامل قرار پاتی ہے جتنی کہ ایک تندرست آدمی کی عبادت۔ حتیٰ کہ اگر معذور آدمی کی

عبادت میں داخلی کیفیت بڑھ جائے تو وہ تندرست آدمی کی عبادت سے زیادہ افضل ہو جائے گی۔

یو جی انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کا مرکز پاکستان میں ہے۔ مگر اس نے مختلف ملکوں میں نیز امریکہ میں بھی شاخیں کھولی ہیں۔ نیویارک برانچ کی طرف سے اس کا آرگن ویلفیر جرنل کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ یہ بیک وقت اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس میں مسلسل الرسالہ کے اردو اور انگریزی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اسپین کا سفرنامہ پورا کا پورا اس جرنل نے قسط وار شائع کیا ہے۔ نیویارک کے قیام کے زمانہ میں میں نے ۱۹۹۶ کے کچھ شمارے دیکھے جن میں الرسالہ کے اردو اور انگریزی مضامین نقل کیے گئے تھے۔ یہ جرنل اخباری سائز پر ہے اور نیویارک سے چھپتا ہے (Tel. 718-6395120)

۴ ستمبر کی شام کو نیویارک کے میاں اصغر علی صاحب اور ان کے ساتھی ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ دوسری قوموں میں بہت جلد اتفاق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے میں سے کسی کی قیادت کو مان کر متحد ہو جاتے ہیں۔ مگر مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد قائم نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ آپس میں لڑتے ہی رہتے ہیں۔ اس بنا پر کچھ لوگ شبہ کرنے لگے ہیں کہ شاید مذہب اسلام میں کوئی خرابی تو نہیں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جب مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوا تو ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگوں نے مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ تم دنیا کے امام ہو، اٹھو اور عالم کی امامت وقیادت سنبھال لو۔ اس طرح تمام مسلمانوں میں برتری کا جذبہ ابھار دیا گیا یہ ایک بے معنی بات تھی۔ کیونکہ زندگی میں اصل ضرورت تواضع کی ہے نہ کہ برتری کی۔ امام تو ایک ہوتا ہے۔ باقی تمام لوگوں کو مقتدی بننا پڑتا ہے۔ ۱۰ ہزار میں ۹۹۹۹ آدمیوں کو پیچھے ہٹنا پڑتا ہے، تب ایک شخص آگے بڑھ کر امامت کرتا ہے۔ اس لیے صحیح بات یہ تھی کہ لوگوں میں اطاعت کا جذبہ ابھارا جاتا۔ تواضع اتحاد کی جڑ ہے اور برتری اختلاف کی جڑ۔

انھوں نے کہا کہ انسان تو خدا کا خلیفہ ہے۔ یعنی وہ خدا کا ڈپٹی اور نائب ہے۔ پھر اس طریق تعبیر میں کیا غلطی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ نظریہ بذات خود بے اصل ہے کہ انسان خدا کا نائب اور ڈپٹی ہے۔ انسان خدا کا عبد ہے۔ اسی لیے کلمۂ شہادت میں یہ نہیں ہوتا کہ اشهد ان محمدًا خليفته ورسوله

[illegible] اشهد ان محمدا عبده ورسوله۔

پھر میں نے کہا کہ اس قسم کی تعبیرات کے عملی نتائج کو دیکھ کر جدید طبقہ اسلام کے بارے میں تشکیک میں پڑ گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں پر تنقید کرکے ان کی غلطی کو واضح کیا جائے جنھوں نے اس قسم کی تعبیرات پیش کیں۔ اگر آپ تنقید نہ کریں تو لوگ خود اسلام کے بارہ میں مشتبہ ہو جائیں گے۔ تنقید کرنا گویا اس الزام کو اسلام سے ہٹا کر کچھ افراد پر ڈالنا ہے، اور تنقید نہ کرنا گویا افراد کو بچا کر اسلام پر الزام کو باقی رہنے دینا۔

نیویارک سے نکل کر ہم لوگ الغزالی اسکول پہنچے۔ یہ ایک ہائی اسکول ہے جس کو عربوں نے قائم کیا ہے۔ یہاں لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ عرب اساتذہ بیشتر میری کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ اسکول میں ہال کی صورت میں ایک مسجد بھی ہے۔ اس کے دروازہ پر ایک طالب علم کے ہاتھ کا لکھا ہوا حسب ذیل کتبہ ہے: اذا دخلتَ المسجدَ فلا تجلس حتی تصلی رکعتین

(ولیم عبد اللہ العبد القادر)

امریکہ میں (دوسرے مغربی ملکوں کی طرح) چائلڈ ابیوز (child abuse) کا سرکاری ادارہ ہے جو سوشل ویلفیر ڈپارٹمنٹ کے تحت کام کرتا ہے۔ وہ سرپرستوں کے مقابلہ میں بچوں کا دفاع کرتا ہے۔ کلیم الدین صاحب نے ایک دل چسپ بات بتائی۔ ان کی بچی ذِکریٰ یہاں پبلک اسکول میں پڑھتی ہے۔ ایک سال پہلے کا واقعہ ہے، وہ اسکول گئی تو اس کی خاتون ٹیچر نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں رنگ کی مانند کچھ لگا ہوا ہے۔ اس نے فوراً بچی کے والدین کو ٹیلی فون کیا۔ ان کو شبہ تھا کہ بچی کے والدین نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے جس کا نشان اس کے ہاتھ پر ہے۔ والدین نے تحریری طور پر بتایا کہ بچی کے ہاتھ پر جو نشان ہے وہ دراصل مہندی کا نشان ہے جو ہمارے کلچر میں "میک اپ" کے مقصد کے تحت استعمال کی جاتی ہے تب جاکر انھیں چھٹی ملی۔

الغزالی اسکول سے پھر ایک اور صاحب کے ساتھ روانگی ہوئی۔ یہ ایک سفید فام نومسلم مسٹر عبد الرحمن تھے۔ ان کا سابق نام مسٹر بنڈر (Timothy B. Bender) تھا۔ ان کی عمر ۴۳ سال ہے اور انھوں نے اسی سال ۱۹۹۲ میں اسلام قبول کیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کس چیز نے آپ کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے کہا کہ جنت کا شوق۔ میں نے پوچھا کہ اسلام قبول کرنے

کے بعد آپ خوش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت خوش (very happy)

عبدالرحمن صاحب کے ساتھ روانہ ہو کر ہیں ڈاکٹر سلیم اسے خان کے اسٹور میں پہنچا جو ٹرشن میں واقع ہے۔ یہاں دوسری طبی چیزوں کے علاوہ آکسیجن مشین (Oxygen concentrator) سپلائی کی جاتی ہے۔ یہ ان مریضوں کے لیے ہے جو اپنی سانس کے ذریعہ بقدر ضرورت آکسیجن نہیں لے سکتے۔ یہ مشین ہوا سے آکسیجن لے کر انھیں باہر سے آکسیجن پہنچانے کا کام کرتی ہے۔

راستہ میں ایک جگہ گایوں کا فارم نظر آیا۔ مگر وہ بھی پارک کی طرح تھا۔ تمام جانور خوب صورت دیواروں کے اندر رہتے۔ کوئی جانور سڑکوں یا راستوں پر گھومتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ گائے کے تقدس کے نام پر جھگڑے انڈیا میں ہوتے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں گائے کا حق امریکہ میں ادا کیا جاتا ہے جو گائے کی تقدس کا قائل نہیں۔

مولانا ذکی صاحب نے بتایا کہ یہاں والنٹیرزم بہت زیادہ ہے۔ بہت سے کام (مثلاً راستوں کی صفائی اور قانون کا احترام) لوگ بالکل رضاکارانہ طور پر انجام دیتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ امریکہ میں دو سو برس سے جمہوریت کا نظام قائم ہے۔ ہر چار سال پر بالکل پرامن طور پر حکومت بدل جاتی ہے۔ جیتنے والا حکومت چلاتا ہے، ہارنے والا اپنی ہار مان لیتا ہے۔ یہ سب اس طرح ہے کہ یہاں کا سماج تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں اس کے لیے تیار کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح کسی ملک میں اسلامی نظام بھی اس وقت قائم ہوگا جب کہ وہاں کے سماج کو اس کے موافق بنایا جا چکا ہو۔ سماجی تعمیر کے بغیر حکومت کی تشکیل کا خیال ایک دیوانہ پن ہے نہ کہ کوئی واقعی منصوبہ بندی۔

چلتے ہوئے ایک جگہ سڑک مڑی تو وہاں موٹے حرفوں میں ڈیڈ اینڈ (dead end) لکھا ہوا تھا۔ مولانا ذکی صاحب نے کہا کہ اسی طرح مغربی تہذیب بھی اپنے ڈیڈ اینڈ پر پہنچ چکی ہے۔ مثلاً سابق صدر جارج بش نے چھ بلین ڈالر ڈرگ کے استعمال کو روکنے پر خرچ کیے۔ مگر ایک فی صد بھی کمی نہ ہو سکی۔ ہتھیاروں کی انڈسٹری پر انھوں نے اپنی اقتصادیات کو قائم کیا۔ مگر اب اس کے مواقع دن بدن ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ فیملی لائف یہاں کی تباہ ہو گئی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے۔ مگر اسلام کو ان کے سامنے متبادل کے طور پر لانے کے

لیے سب سے پہلے ہمیں اپنی قومی لڑائی کو، اپنی نفرت کی پالیسی کو ختم کرنا ہوگا۔

راستہ میں ایک بڑی خوب صورت دکان دوبارہ ایک پارک نما میدان میں کھڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ گاؤں کی گروسری (کھانے پینے کے سامان کی دکان) تھی۔ ہمارے یہاں شہروں میں بھی اس قسم کی صاف ستھری دکان نہیں۔

انھوں نے ایک صاحب کا قول بتایا کہ "مولانا مودودی اتنے بڑے ہیں کہ کوئی ان سے چھوٹا بھی نہیں"۔ میں نے کہا کہ یہ تو لفظی تک بندی ہے۔ دوسرا شخص کہہ سکتا ہے کہ "مولانا مودودی اتنے چھوٹے تھے کہ ہر شخص ان سے بڑا ہے"۔ میں نے کہا کہ ہمارے یہاں تنقید اور تعریف دونوں میں اس طرح کے الفاظ بولنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے الفاظ سے نہ کسی کا بڑا ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ کسی کا چھوٹا ہونا۔

پروگرام کے مطابق تھوڑی دیر کے لیے مذکورہ اسٹور پر بیٹھا۔ وہاں لوگوں سے مختصر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد جناب محمد ذکی الدین الشرفی آگئے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر ان کے گھر پہنچا۔ یہاں غسل کیا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور ظہر کی نماز پڑھی۔ ذکی الدین صاحب سے نہایت مفید باتیں ہوئیں۔ پھر انھوں نے مجھ کو اسلامک سنٹر (ٹرنٹن) پہنچایا جس کے وہ ڈائرکٹر ہیں۔

ذکی الدین صاحب نہایت ذہین آدمی ہیں۔ عربی تعلیم کے بعد امریکہ آکر انھوں نے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ انھوں نے اپنے کئی قصے سنائے۔

دوپہر کا کھانا مولانا ذکی الدین الشرفی کے مکان پر کھایا۔ اس کے بعد ان کے صاحب زادہ محمد تقی الدین ذکی (پیدائش ۱۹۷۵) کے ہمراہ قیام گاہ (ماؤنٹ ہالی) کے لیے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ان سے گفتگو ہوتی رہی۔

انھوں نے کہا کہ کالج میں میرے تعلقات زیادہ تر ہندو لڑکوں سے ہیں۔ ان سے اکثر مذہب پر گفتگو ہوتی ہے۔ ہندو طلبہ کہتے ہیں کہ اسلام میں ٹالرنس نہیں ہے۔ ہندوازم کا کہنا ہے کہ سچائی صرف ہندو دھرم میں نہیں ہے۔ بلکہ سچائی ہر جگہ ہو سکتی ہے۔ مگر آپ لوگ کہتے ہیں کہ صرف اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ اسی وجہ سے ساری لڑائی ہے۔ اگر آپ لوگ ہمارے نقطۂ نظر کو مان لیں تو فرقہ وارانہ جھگڑے ختم ہو جائیں۔

میں نے کہا کہ ان لوگوں کا ایسا کہنا درست نہیں۔ سماجی امن کے لیے اصل چیز ٹالرنس کی سپرٹ ہے نہ کہ یہ عقیدہ کہ ہر مذہب یا ہر نظریہ سچا ہے۔ مثلاً یہاں امریکہ میں آپ دیکھئے، اکیڈمک حلقہ میں کوئی متشددانہ لڑائی نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہر اسکالر دوسرے اسکالر کے نقطۂ نظر کو درست مانتا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ اختلاف کے وقت وہ کہہ دیتے ہیں :

Let us agree to disagree

میں نے کہا کہ ٹالرنس کی اہمیت اسلام میں بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ ہندوازم میں۔ فرق یہ ہے کہ ہندوازم میں ٹالرنس کی بنیاد باہمی اعتراف (mutual recognition) پر ہے اور اسلام میں ٹالرنس کی بنیاد باہمی احترام (mutual respect) پر۔ اس معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر عین وہی ہے جو سائنٹفک کمیونٹی میں عملاً رائج ہے۔

اسلامک سنٹر میں عربی اخبار المسلمون (۵ مئی ۱۹۹۵) دیکھا۔ اس میں ایک رپورٹ فلسطین کے بارہ میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کا عنوان یہ تھا کہ قدس اسلامی امت کو پکار رہا ہے : القدس تستصرخ الامة الاسلامية۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس طرح کا عنوان ظاہر کرتا ہے کہ فلسطین کے معاملہ میں امت نے کچھ نہیں کیا، اور اب فلسطین مسلمانوں کو مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ مگر یہ سراسر خلاف واقعہ بات ہے۔ ۱۹۴۸ میں جب فلسطین کا مسئلہ پیدا ہوا تو شیخ حسن البنا نے قاہرہ میں پرجوش تقریر کرکے ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس میں ایک لاکھ سے زیادہ مصری شریک تھے۔ جلوس کا نعرہ یہ تھا کہ اے فلسطین، ہم حاضر ہیں :

لبيك يا فلسطين۔

اس کے بعد فلسطینیوں، عربوں اور ساری مسلم دنیا نے اس محاذ پر ہر قسم کی بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے فلسطین کے محاذ پر مزید کھو دیا۔ ان کی قربانیاں انھیں کچھ بھی دلانے میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ گویا آج مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمان فلسطین کی مدد کے لیے نہیں دوڑے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مدد کے لیے دوڑ پڑنے کے باوجود انھیں ناکامی

کے سوا اور کوئی چیز حاصل نہیں۔ گویا آج اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ امت کو فلسطین کی مدد کے لیے پکارا جائے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ غور کیا جائے کہ مسلمانوں کی کامل مدد کے باوجود ان کی مدد مفید کیوں نہیں ہوئی۔

۶ ستمبر کو ماؤنٹ ہالی کے اسلامک سنٹر میں ڈاکٹر نجم اختر (۳۲ سال) سے ملاقات ہوئی (Tel. 301-3360241)۔ انھوں نے الکٹرانک کمیونی کیشن میں ڈاکٹریٹ تک تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ امریکہ کی ایک بڑی کمپنی لاک ہیڈ مارٹن (Locheed Martin) میں ہیں۔ یہ کمپنی فوجی اہمیت کے سامان تیار کرتی ہے۔ انھیں یہودیوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ اب وہ یہاں سے چھوڑ کر سعودی عرب جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہودیوں کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ بہت پارٹی ورکر ہوتے ہیں اور بہت لگن والے (extremely dedicated) ہوتے ہیں۔ یہی ان کی ترقی کا اصل راز ہے۔

دوسری بات یہ کہ یہودیوں میں قومی سوچ بہت زیادہ ہے۔ کوئی یہودی خواہ وہ کہیں بھی ہو، وہ ہمیشہ اسرائیل کے بارہ میں سوچ رہا ہوتا ہے۔ حتی کہ وہ مذہب کو بھی اس معاملہ میں رکاوٹ نہیں بناتا۔ اس کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ مسلمان اگر میرے کام کا ہے تو میں مسلمان کو لوں گا، یہودی کو نہیں لوں گا۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے کام کے لیے بہترین آدمی کون ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میرا انٹرویو ہوا تو کل پانچ امیدوار تھے۔ ان میں ہندو، عیسائی، یہودی سب تھے۔ میں اکیلا مسلمان تھا۔ مگر انھوں نے میرا انتخاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کوئی آپ کو نماز پڑھنے سے نہیں روکتا۔ مگر لوگ خود نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ مجھے دوسروں کے جیسا ہونا چاہیے۔ وہ اس میں اپنا فائدہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں سے الگ نہ دکھائی دیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر کوئی مسلمان یہ کہتا ہے کہ اس کے ساتھ یہودی کمپنی میں تعصب کیا گیا تو وہ غلط کہتا ہے۔ وہ اپنی کمزوری کا الزام دوسرے کے اوپر ڈال رہا ہے۔

نیویارک میں میرا قیام خواجہ کلیم الدین ایم ایس سی کے مکان (بروکلین) میں تھا۔ ۵ ستمبر ۱۹۹۶ کی صبح کو یہاں سے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ہم لوگ چند پل سے گزرے۔ معلوم ہوا کہ نیویارک میں ۶۷ واٹر کراسنگ ہیں۔ نیویارک مختلف جزیروں پر واقع ہے۔ ایک جزیرہ سے دوسرے

جزیرہ میں آنے جانے کے لیے بہت سے راستے بنائے گئے ہیں۔ کچھ پانی کے اوپر سے پل کی صورت میں اور کچھ پانی کے نیچے سے سرنگ کی صورت میں۔ دونوں قسم کے راستوں کے لیے ایک مشترک لفظ واٹر کراسنگ ہے۔

خواجہ کلیم الدین صاحب نے بتایا کہ نیویارک میں انھوں نے ایک عرب سے ملاقات کی۔ ان کو الرسالہ مشن کی کچھ کتابیں دیں اور کہا کہ اس ملک میں ہمیں دعوت کا کام کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم نہ صرف اپنے پڑوسیوں کا حق ادا کریں گے بلکہ دعوت کے ذریعہ ہمیں دوسری قوموں کے افراد حاصل ہوں گے جو ہمارے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوں گے۔ مذکورہ عرب نے جواب دیا کہ یہ تو ایک رسکی کام ہے۔ کیا معلوم کہ اسی بہانے دشمن قوم کے افراد ہمارے اندر داخل ہو جائیں تاکہ وہ ہمارے راز دریافت کریں اور اندر سے ہمیں نقصان پہنچائیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عام تصور یہ ہے کہ تمام قومیں ہماری دشمن ہوگئی ہیں اور وہ ہمارے خلاف سازش کرتی رہتی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ خود یہ تصور شیطان کی سب سے بڑی سازش ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ ہم کو مدعو قوموں سے متنفر کر دے تاکہ ہم ان کے اوپر اسلام کی دعوت کا کام کرنے کا خیال ہی چھوڑ دیں۔ خواجہ کلیم الدین صاحب نے کہا کہ یہ (Them versus us) کا تصور ہے جو قومی ہے نہ کہ اسلامی۔

نیویارک میں خواجہ کلیم الدین صاحب کے یہاں ایک روز میں کھانے کی میز پر تھا۔ ان کے چھوٹے صاحب زادے لقمان میاں ایک پلیٹ لائے اور اس کو میرے سامنے رکھ دیا۔ مرغ کے گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس میں سے لیجئے۔ میں نے پلیٹ کو اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا: mere sight is horrible ۔ وہ میرے ہندستانی لہجہ کو پوری طرح سمجھ نہ سکے۔ مزید وضاحت کے بعد انھوں نے اس بات کو اپنی زبان میں اس طرح کہا:

Even looking at it makes me feel sick.

سوال کے جواب میں میں نے بتایا کہ بوقت ضرورت میں گوشت بھی کھا سکتا ہوں۔ مگر میں پیدائشی اعتبار سے ویجیٹیرین ہوں۔ میری والدہ اگرچہ گوشت کھاتی ہیں، مگر میرے والد مکمل طور پر ویجیٹیرین تھے جن کا انتقال ۱۹۲۹ میں ہو گیا۔ میری چچازاد بہن مریم مرحومہ کا یہ حال تھا

کہ جس چمچہ سے گوشت نکالا گیا ہو اس چمچہ سے اگر دال یا سبزی نکالی جائے تب بھی وہ اس کو نہیں کھا سکتی تھیں۔ اس طرح میرے خاندان میں کئی عورت اور مرد ویجیٹیرین رہے ہیں تاہم میں بائی برتھ ویجیٹیرین ہوں نہ کہ بائی چوائس۔

۵ ستمبر ۱۹۹۶ —— اس وقت میں ماؤنٹ ہالی (Mount Holly) کے اسلامک سنٹر میں ہوں۔ یہ ایک خوب صورت دنیا ہے جو فطرت کی خوب صورت تر دنیا میں واقع ہے۔ چاروں طرف فطرت کا سرسبز حسن پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک پرسکون ماحول ہے جس میں کسی چڑیا کی آواز سنائی دیتی ہے اور کبھی قریب کی سڑک سے گزرنے والی کسی کار کی آواز۔

پچھلے ۲۵ سال میں مسلمانوں نے امریکہ میں اس طرح کے تقریباً ایک ہزار اسلامک سنٹر بنائے ہیں۔ یہ سنٹر آبادیوں کے عین درمیان بھی ہیں اور موجودہ سنٹر کی طرح آبادی کے پرسکون مقام پر بھی۔ میں نے ایک تقریر میں کہا کہ دور اول میں صحابہ کرام اطراف کے ملکوں میں پھیل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ اور مدینہ میں صحابہ کی قبریں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ مثلاً حضرت خالد کی قبر شام میں ہے اور حضرت معاذ بن جبل کی قبر اردن میں۔ اسی طرح صحابہ کرام کی زیادہ تعداد ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں جاکر آباد ہوگئی

یہ دراصل جذبۂ دعوت تھا جس نے انھیں عرب کے باہر مختلف ملکوں میں پہنچا دیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس بھی یہی ہے۔ یہ مسلمان ابتدائی طور پر جب یہاں آئے تو وہ معاش کے جذبہ کے تحت آئے۔ مگر حالات نے انھیں مجبور کیا کہ وہ یہاں اپنی اسلامیت کو زندہ کریں۔ کیوں کہ انھیں محسوس ہوا کہ اگر ہم نے اپنی اسلامی شناخت کھو دی تو ہم یہاں بالکل بے جگہ ہو کر رہ جائیں گے۔ اب انھوں نے مسجدیں اور ادارے اور سنٹر بنانے شروع کر دیے۔ اس طرح اب یہی ہوتا جا رہا ہے کہ عملاً وہ یہاں اسلام کے نمائندہ اور داعی بن کر رہیں۔

مولانا محمد ذکی الدین شرفی نوجوانی کی عمر سے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی تحریریں پڑھتے رہے ہیں۔ وہ ان کے گہرے معتقد ہیں۔ ایک روز انھوں نے ایک بات کہی۔ پھر میری فرمائش پر حسب ذیل الفاظ کاغذ پر لکھ کر مجھے دیے: مولانا مودودی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جدید ریاست (modern state) کے تناظر میں قرآن کا تصور توحید

انتہائی تسلسل، وضاحت اور یقین محکم کے ساتھ بیان کیا (۹ ستمبر ۱۹۹۶)

اس عبارت میں جس چیز کو "جدید ریاست" کہا گیا ہے، وہ دراصل ریاست کا کمیونسٹ تصور تھا جو عرصہ ہوا ختم ہو گیا۔ مارکس نے ریاست کو ایک ہمہ گیر اور کلی ادارہ کے طور پر پیش کیا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اس فکر کا غلغلہ بلند ہوا۔ مولانا مودودی، بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح، اس سے متاثر ہوئے اور اسلام کے تصور توحید میں سیاسی حاکمیت کا تصور شامل کر کے اسلام کو ایک کلی ریاست کے روپ میں پیش کیا۔ مگر یہ قرآن کا تصور توحید نہیں تھا بلکہ وہ قرآن کی کچھ آیتوں کی غلط اور غیر علمی تفسیر تھی (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، تعبیر کی غلطی)

ریاست کا جدید تصور، مارکسی تصور سے بالکل مختلف ہے۔ جدید سیکولر جمہوری نظام میں ریاست سمٹ کر "انتظامیہ" کے ہم معنی بن گئی ہے۔ ایڈمنسٹریشن کے باہر تقریباً تمام شعبے آزاد انسانی شعبے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مولانا مودودی اپنے حال میں گرفتار تھے اور ان کے معتقدین ماضی میں گرفتار ہیں۔ اول الذکر کا کیس اگر مرعوبیت کا کیس ہے تو ثانی الذکر کا کیس شخصیت پرستی کا کیس۔

۹ ستمبر کی شام کو میں ماونٹ ہالی کے سنٹر میں اوپر کی منزل میں واقع اپنے کمرہ میں لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ دو ہندو صاحبان آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا یہاں میری موجودگی کا علم ان کو کس طرح ہوا۔ ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ مسٹر کملیش شاہ (Tel. 908-3294006) اور مسٹر بھرت جانی (Tel. 908-2831863) ہیں۔ میں ان کو بالکل جانتا نہیں تھا۔ ان کو بمبئی سے مہیش بھائی نے خبر دی تھی کہ اس وقت میں امریکہ میں ہوں۔ انھوں نے مختلف جگہوں پر ٹیلی فون کر کے میرا پتہ معلوم کیا اور پھر یہاں پہنچ گئے۔

یہ لوگ ایک بہت بڑی تحریک سے وابستہ ہیں۔ اس کا سنٹر بمبئی میں ہے۔ امریکہ کی تقریباً ہر ریاست میں ہزاروں ہندو ان کی تحریک سے وابستہ تھے۔ وہ ایک بڑا اجتماع یہاں کرنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں اس میں اپنے خیالات پیش کروں۔ مگر طے شدہ پروگرام کی بنا پر کسی بڑے اجتماع کے لیے میں وقت نہیں دے سکتا تھا۔

سوال وجواب

سوال

کہاجاتا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے ۸۰ علوم درکار ہے۔ان ۸۰علوم میں مہارت کے بغیر قرآن کو سمجھنا ممکن نہیں۔ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ عام مسلمان کس طرح اسلام کو سمجھیں۔ کیا قرآن صرف ماہرین علوم کے لئے اترا ہے،عام اانسانوں کے لئے نہیں۔ عام لوگوں کاکام صرف یہ ہے کہ سمجھے بغیر قرآن کے الفاظ کی تلاوت کرتے رہیں، اور قرآن کو سمجھنے کاکام ماہرین علوم کے لئے چھوڑدیں ۔(عبدالسلام اکبانی،ناگپور)

جواب

"۸۰ علوم" میں مہارت کا نظریہ نہ قرآن وحدیث میں کہیں ملتا ہے اور نہ وہ کسی صحابی سے منقول ہے۔اس کے برعکس قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ،اللہ تعالی نے قرآن کو آسان بنادیا تاکہ لوگ اسے سمجھیں (القمر ۴۰)ایسی حالت میں قرآن فہمی کا مذکورہ نظریہ خود قرآن کے خلاف ہے۔مزید یہ کہ یہ قابل عمل بھی نہیں۔اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں کوئی اسلامی شخصیت یاکوئی عالم ایسا نہیں جوان مفروضہ ۸۰ علوم میں کامل مہارت رکھتا ہو۔اب اگر مذکورہ اصول کومان لیاجائے تو یہ بھی کہنا پڑے گا کہ اسلام کی پوری تاریخ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں گذراجو قرآن کو حقیقی طور پر سمجھے اوراس کی توضیح وتفسیر کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے اصلا صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ایک، عربی زبان کی بخوبی واقفیت،اور دوسرے وہ چیز جس کو قرآن میں تقوی کہاگیا ہے،(البقرہ ۲۸۲)یعنی حسن نیت،سنجیدگی اور سچی طلب۔ عربی زبان سے بخوبی واقفیت آدمی کواس قابل بناتی ہے کہ وہ قرآن کے بیانات کابنیادی فہم حاصل کرسکے۔اور تقوی اس بات کا ضامن ہے کہ وہ دوسرے ضروری ماخذوں سے بھرپور

استفادہ کرے مثلاً حدیث سے۔ اور اسی کے ساتھ وہ اس حد تک سنجیدہ ہو کہ اس غلطی سے بچ جائے جس کو تفسیر بالرائے کہا جاتا ہے۔

سوال

دعوت کے دو طریقے ہیں۔ ایک، "قولی دعوت" اور دوسرے "فعلی دعوت" فعلی دعوت کے بغیر دعوت کا عمل بے فائدہ ہے۔ مسلمان جب تک اپنے اخلاق وافعال سے اسلام کا مظاہرہ نہ کریں، محض تقریر و تحریر کے ذریعہ کوئی شخص اسلام سے قریب آنے والا نہیں۔ اس لئے دعوتی مقصد کے تحت پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اخلاق واعمال اور سیرت و کردار کو درست کیا جائے۔ مسلمانوں کی عملی اصلاح کے بغیر صرف قولی دعوت کا کوئی فائدہ نہیں (محمد یعقوب، حیدر آباد)

جواب

قولی دعوت اور فعلی دعوت کی تقسیم سراسر بے بنیاد ہے، قرآن وحدیث میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں۔ فعل بلاشبہ مطلوب ہے، مگر اس کا محرک ذاتی اصلاح ہے نہ کہ دعوت و تبلیغ۔ مثلاً روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غیر مسلموں کے مجمع میں جاتے اور ان کو خطاب کرتے ہوئے کہتے کہ، اے لوگو لا الہ الا اللہ کہو تم فلاح پاؤ گے (ایها الناس قولوا لااله الا الله تفلحوا) مگر قرآن وحدیث میں کہیں بھی یہ حکم نہیں آیا ہے کہ اے مسلمانو، تم عمل صالح کرو تا کہ اس کو دیکھ کر لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ یہ ایک خلاف واقعہ بات مشہور ہے کہ دور اول میں لوگ مسلمانوں کے اخلاق کو دیکھ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی پیغمبر کو کبھی مخالفت کا سامنا کرنا نہ پڑتا۔ اصل یہ ہے کہ دور اول کے مسلمانوں کے دل دوسروں کی نفرت سے خالی تھے۔ انہوں نے کسی سے مادی جھگڑا

بھی نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معتدل فضا میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اس دوران فطری طور پر اسلام زیر بحث آنے لگ۔ معتدل فضا میں یہی تفاعل (interaction) دعوت کے کام میں سب سے زیادہ مددگار ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کی عمومی اشاعت رک جانے کا سبب مسلمان کی بے عملی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تمام تر سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی اور مادی تحریکوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرتیں پیدا کر دیں۔ اس کے نتیجہ میں دونوں کے درمیان معتدل فکری تعلق باقی نہ رہا۔ اب دعوت کے مواقع کھولنے کے لئے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کو ختم کیا جائے۔ جیسے ہی نفرت کی فضا ختم ہو گی اسلام کا فطری پیغام لوگوں کے دلوں میں داخل ہونا شروع ہو جائے گا۔

سوال

قرآن کی سورہ المائدہ میں ارشاد ہوا ہے۔ ومن لم یحکم بما انزل الله فاو لئك هم الكفرون (المائده ٤٤) اس آیت کو جب میں پڑھتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں کہ آج ہم قرآن کریم کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ ہماری عدالتوں میں، ہمارے دیگر معاملات میں فیصلے قرآن کریم کے خلاف ہوتے ہیں آپ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائیں کہ کیا واقعۃً ہی ہم کافر ہو گئے ہیں۔ کیا ہم اس حالت میں جو آج ہندستان میں ہے جنت کے مستحق ہو سکتے ہیں (صدر الدین، پونچھ کشمیر)

جواب

اس آیت کا تعلق اجتماعی نظام سے نہیں ہے بلکہ فرد کے ذاتی عمل سے ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندستان میں یا اس قسم کے دوسرے ملکوں میں قائم شدہ سیاسی

نظام سے لڑ کر اس کو بدلا جائے اور عدالتوں میں اسلامی قانون کے متعلق فیصلے کروائے جائیں۔ اس قسم کے کسی نام نہاد انقلابی نظریہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس آیت کا خطاب تمام تر فرد سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے ساتھ جب کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ اس کے بارے میں شریعت کا مسئلہ معلوم کرے، خواہ علماء کے ذریعہ یا دارالافتاء کے ذریعہ۔ اور جب شریعت کا مسئلہ معلوم ہو جائے تو پوری آمادگی کے ساتھ اس کو اختیار کر لے۔ مسلمان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ جو چیز شرعی قانون کے تحت اس کا حق نہیں ہے اس کو پانے کے لئے وہ ناحق طور پر ملکی عدالت میں پہنچ جائے اور جو چیز اس کو خدائی قانون کے تحت نہیں مل رہی تھی اس کو وہ انسانی قانون کی مدد سے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ تمام افراد اس آیت کا مصداق ہیں جو اپنے نزاعات کو اسلامی اصول کے تحت طے نہیں کرتے بلکہ اس کو لے کر ملکی عدالتوں میں پہنچ جاتے ہیں تاکہ وہاں سے من مانا فیصلہ حاصل کر سکیں۔ اور شرعی قانون کے تحت جو چیز ان کا حق نہیں ہے اس کو وضعی قانون کی مدد سے اپنے لئے حاصل کر لیں۔

سوال

آپ اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہمیشہ ایڈجسٹمنٹ کی بات کرتے ہیں، آپ دوسروں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ نزاع کے موقع پر ایڈجسٹ کر کے رہیں۔ مگر آپ کا اپنا عمل اس کے خلاف ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسری اسلامی شخصیتوں سے جب آپ کا کوئی اختلاف ہوتا ہے تو آپ فوراً ان کے خلاف تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ایڈجسٹمنٹ کے فلسفہ کے مطابق، آپ کو ان کی تنقید یا مخالفت نہیں کرنا چاہئے۔ (ظہیر احمد صدیقی ندوی، لکھنؤ)

جواب

ایڈجسٹمنٹ کا تعلق عمل سے ہے نہ کہ قول سے، یعنی دو آدمیوں کے درمیان کسی معاملہ میں نزاع پیدا ہو تو اس کی وجہ سے انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگیں۔ انہیں قول کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرنا چاہئے۔ اختلاف کو عملی ٹکراؤ تک نہیں لے جانا چاہئے، عملی ٹکراؤ سے ہمیشہ طرح طرح کے نقصانات پیدا ہوتے ہیں، مگر سنجیدہ قولی اختلاف غیر معمولی فائدوں کا باعث ہے۔ اگر کسی سماج میں قولی اختلاف یا تنقید کو ختم کر دیا جائے تو ایسے لوگوں کا ذہنی ارتقا رک جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ظالم حکمراں کے خلاف قولی اعلان کو افضل جہاد بتایا گیا ہے۔ مگر اسی ظالم حکمراں کے خلاف عملی خروج یا پر تشدد مخالفانہ کارروائی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

سوال

آپ کی کتاب فکر اسلامی پڑھی یہ پوری کتاب مجھے قابل اعتراض نظر آئی اس لئے کہ آپ اس کتاب کے مطابق یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کو زمانہ حاضر کے مطابق ڈھالیں۔ حالانکہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ زمانہ کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائے۔ (مفتی ندرت یہ مظاہری و مفتی شعیب قاسمی، چترا بہار)

جواب

یہ محض ایک غلط فہمی ہے۔ اس کتاب کا موضوع اجتہاد ہے۔ اجتہاد کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اسلام کو زمانہ حاضر کے مطابق بنایا جائے۔ بلکہ اجتہاد کا مقصد ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں از سر نو اسلام کو منطبق کرنے کی کوشش کی جائے۔ رسول اللہ

ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت کو مدینہ سے بنو قریظہ کی بستیوں کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ تم لوگ بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز ہر گز نہ پڑھنا۔ لیکن راستہ میں ان صحابہ کو محسوس ہوا کہ غروب آفتاب قریب آچکا ہے اور اگر انہوں نے راستہ میں عصر کی نماز نہ پڑھی تو بنو قریظہ پہنچنے تک اس کا وقت ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے بظاہر حکم رسول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے راستہ میں عصر کی نماز پڑھ لی۔ صحابہ کا یہ عمل اسلام کو حالات کے مطابق ڈھالنا نہیں تھا بلکہ بدلے ہوئے حالات میں اسلام کو از سر نو منطبق کرنا تھا۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔ یہ اجتہاد زندگی کی ایک فطری ضرورت ہے۔ وہ ہر حال میں اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ مذکورہ کتاب میں اسلامی شریعت کے اسی پہلو کو زمانہ حاضر کی نسبت سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سوال

افغانستان میں طالبان اس اعلان کے ساتھ لڑ رہے ہیں کہ وہ اقتدار حاصل کر کے اسلامی قانون نافذ کریں گے۔ اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے (محمد خالد ندوی)

جواب

حضرت عائشہ کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے دلوں کو بدلا اور اس کے بعد شرعی قانون کا نفاذ فرمایا۔ افغانستان کے طالبان اس کے برعکس بم اور گن کے ذریعہ اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی فرق یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ طالبان اسلامی قانون کے نفاذ میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ وہ اپنی انتہا پسندانہ اور تشدد کارروائیوں کے ذریعہ افغانستان میں جو چیز لائیں گے وہ صرف تباہی ہو گی۔ وہ نہ کوئی مادی تعمیر کے سکیں گے اور نہ اسلامی تعمیر۔

۱۔ ۲۳؍جون ۱۹۹۸ کو زی ٹی وی (نئی دہلی) نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق اجودھیا کی بابری مسجد سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ نزاعات ہر سماج میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر مہذب سماج میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو یا تو پر امن گفت وشنید کے ذریعہ طے کیا جائے یا کورٹ کے ذریعہ۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ کہنا درست نہیں کہ یہ عقیدہ کا مسئلہ ہے اس لئے اس کا تعلق عدالتی فیصلہ سے نہیں۔ اگر آپ رام کو بھگوان کہیں تو یہ بلا شبہ عقیدہ کا مسئلہ ہے اور کوئی عدالت اس معاملہ میں فیصلہ نہیں دے سکتی مگر جب آپ یہ کہتے ہیں کہ رام فلاں خاص جگہ پیدا ہوئے تو یہ ایک تاریخی بیان ہوتا ہے نہ کہ کوئی اعتقادی بیان۔ اسی طرح جب آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں جگہ ایک مندر تھا اور فلاں حاکم نے اس کو توڑ کر مسجد بنایا تو یہ بھی ایک تاریخی بیان ہوتا ہے اور جس بیان کی حیثیت تاریخی ہو اس کو تاریخی شہادتوں کی بنیاد پر ہی طے کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ ۲۶؍جون ۱۹۹۸ کو دوردرشن (نئی دہلی) پر ایک پینل ڈسکشن تھا۔ اس کا موضوع تھا مشترک کلچر کے سماج میں اتحاد کیسے حاصل ہو۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انہوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سماجی اتحاد کا راز یہ نہیں ہے کہ اختلافات کو مٹا کر یکسانیت لائی جائے۔ فرق اور اختلاف فطرت کا حصہ ہیں۔ اس لئے سماجی اتحاد کا راز صرف ایک ہے اور وہ ٹالریشن اور باہمی احترام ہے۔

۳۔ آریہ سماج مندر (دہلی) میں ۵؍جولائی ۱۹۹۸ کو شراب بندی پر ایک جلسہ تھا، جس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ایک تقریر کی۔ وہاں ایک امریکی

جرنلسٹ بھی موجود تھے انہوں نے شراب کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر پر انٹرویو لیا۔اس سلسلہ میں شراب کا اسلامی حکم بتایا گیا۔

۴۔ انگریزی اخبار ٹڈ ڈے (نئی دہلی) کے ایڈیٹر مسٹر جان پال نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹڈ ڈے کے شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۹۸ میں چھپ چکا ہے۔ اس انٹریو کا عنوان یہ تھا

The nuclerar bomb has no religion

۵۔ ہندی ہفتہ وار انڈین جنگ کے ایڈیٹر آلوک موہن نے یکم اگست ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر آزادی کے بعد کے پچاس سال سے تھا۔ اس مدت میں ملک نے کیا کھویا کیا پایا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اس مدت میں ملک نے پایا بہت کم اور کھویا بہت زیادہ۔

۶۔ ذی ٹی وی کی ٹیم ۴ اگست کو اسلامی مرکز میں آئی، اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ملک اور ملت دونوں قسم کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ملکی ترقی اور سماجی تعمیر کے لئے سب سے اہم چیز ایجوکیشن ہے۔ ملک کے بیشتر لوگ اگر تعلیم یافتہ ہو جائیں تو ملک کے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

نومبر ۱۸۹۸، شمارہ ۲۶۴

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi

فہرست

فہرست	صفحہ
دور قرآن	۴
کتاب فطرت	۶
زندگی کیا ہے	۷
برائی کے بعد	۹
منصفانہ رویہ	۱۰
اشاعت فاحشہ	۱۱
ظالم انسان	۱۲
ذرو اس سے جو وقت ہے آنے والا	۱۳
سائنسی مزاج	۱۶
سفر امریکہ ۴	۱۸
سوال و جواب	[illegible]

دور قرآن

لندن کے انگریزی اخبار سنڈے ٹائمس میں ایک تفصیلی رپورٹ چھپی ہے۔ اس رپورٹ کو مرتب کرنے والے جان ہارلو (John Harlow) ہیں۔ اس رپورٹ کا تعلق اصلاً بائبل سے ہے۔ اس کے ساتھ اس میں قرآن کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کو دہلی کے انگریزی اخبار میں نقل کیا گیا۔

بائبل کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ دس سال پہلے تک مذہبی کتابوں میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب تھی۔ مگر اب اس کی مانگ میں قابل لحاظ حد تک کمی ہو گئی ہے۔ چنانچہ چرچ کی طرف سے بائبل کی مانگ کو برقرار رکھنے کی مختلف تدبیریں کی جارہی ہیں۔ مثال کے طور پر بائبل کے مختلف اجزاء کو نئے نئے عنوان دے کر چھاپنا۔

مگر قرآن کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق، عالمی مارکیٹ میں قرآن کے ترجمہ کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۱۸۱۵ اور ۱۹۷۵ کے درمیان بائبل کے ۲ بلین سے زیادہ نسخے تقسیم کئے گئے۔ مگر جہاں تک فروخت کا تعلق ہے وہ نمایاں طور پر کم ہو گئی ہے جب کہ قرآن کے ترجمہ کی فروخت مسلسل طور پر بڑھ رہی ہے۔ ایک پبلشر کلیر پیٹرسن (Claire Paterson) نے کہا کہ اب ہمیں قرآن کا ترجمہ چھاپنا چاہیئے۔

More than 2.5 billion Bibles were distributed between 1815 and 1975, but sales have markedly slowed down while those of the Koran have continued to increase. Claire Paterson, a Canongate editor, said: Maybe we should do the Koran next. (The Sunday Times)

(The Times of India, New Delhi, August 16, 1998)

موجودہ زمانہ میں اس قسم کے مختلف واقعات پیش آ رہے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ شاید اب وہ دور آ گیا ہے جس کو مسند احمد کی ایک روایت میں ادخال کلمہ کہا گیا ہے۔ یعنی ایک ایسا دور آئے گا جب کہ اسلام کا کلمہ ساری دنیا میں پھیلے گا اور وہ ہر گھر میں داخل ہو جائے گا۔

یہ اتنا بڑا کام ہے جو صرف اہل اسلام کے ذریعہ انجام نہیں پا سکتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس منصوبہ کو واقعہ بنانے کے لئے دوسری قوموں کو اس عمل (process) میں شریک کر دیا۔ اس حقیقت کی طرف بخاری کی ایک روایت میں اشارہ موجود ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ اس دین کی تائید فاجر آدمی سے بھی کرے گا (ان اللہ لیؤید ہذا الدین بالرجل الفاجر)

اشاعت اسلام کے اس بین اقوامی منصوبہ کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے پچھلی صدیوں کے درمیان بہت سی بڑی بڑی تبدیلیاں فرمائیں۔ اس کے لئے مذہبی آزادی کا دور لایا گیا۔ پرنٹنگ پریس کی ایجاد ہوئی۔ کمیونی کیشن کو اس حد تک بڑھایا گیا کہ ساری دنیا ایک گلوبل ولیج میں تبدیل ہو گئی۔ مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا ذوق عام ہو گیا۔ مختلف تحقیقات ایسی سامنے آئیں کہ ان کے بعد اسلام کو نئی علمی اور تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی۔ پڑول کے ظہور کے بعد اسلام دوبارہ دنیا والوں کے لئے قابل توجہ چیز بن گیا۔

اس طرح کے مختلف حالات نے ادخال کلمہ کے پراسس کو موجودہ زمانہ میں تیز تر کر دیا ہے۔ یہ اشاعتی پراسس یقینی طور پر مسلسل جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری نشانہ تک پہنچ جائے۔

کتاب فطرت

انسان کو دنیا میں کس لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اپنے خالق کی معرفت کے لئے۔ معرفت رب ہی اس دنیا میں کسی انسان کا سب سے بڑا حاصل ہے۔ جو آدمی مخلوقات میں خالق کی دریافت کر لے وہی صاحب معرفت ہے اور جو صاحب معرفت ہے وہی خدا کا وہ مطلوب انسان ہے جس کے لئے آخرت کی ابدی دنیا میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

اس مقصد کے لئے خدا نے پوری کائنات کو ایک کھلی ہوئی کتاب بنا دیا۔ یہاں ایک سورج ہے۔ یہ گویا عظیم خدائی ٹارچ ہے جو اندھیرے میں چھپی ہوئی خبروں کو اجالے میں لاکر ان کو قابل مشاہدہ بنا دیتا ہے۔ یہاں دریاؤں اور سمندروں کے مناظر ہیں جو خدا کی صفات رحمت کی کہانیاں بیان کر رہے ہیں۔ یہاں پہاڑ اور درخت ہیں جن کو دیکھ کر آدمی روحانی غذا حاصل کرتا ہے۔ یہاں ہوا کے جھونکے ہیں جو ہر شخص کو لمس ربانی کا تجربہ کراتے ہیں۔ یہاں چڑیوں کے چہچہے ہیں جو صبح و شام آدمی کو خدائی نغمے سنا رہے ہیں۔

یہ کتاب فطرت ہے۔ اس کتاب میں وہ سب کچھ کامل طور پر درج ہے جو آدمی کو جاننا چاہیے۔ اس کتاب میں علم و آگہی کا وہ پورا ذخیرہ رکھ دیا گیا ہے جس کو دریافت کر کے آدمی اپنی اعلیٰ روحانی تعمیر کر سکے۔ خدا کے نزدیک محروم وہ نہیں ہے جو مال و دولت سے محروم ہو۔ بلکہ محروم وہ ہے جو اس خزانہ فطرت سے اپنا حصہ نہ لے سکے۔ اندھا وہ نہیں ہے جو آنکھ کا اندھا ہو، اندھا وہ ہے جو بصیرت کی صلاحیت سے خالی ہو۔ جاہل وہ نہیں ہے جو مشرقی اور مغربی درسگاہوں کی ڈگریاں نہ رکھتا ہو۔ بلکہ جاہل وہ ہے جس کو رب المشرقین والمغربین کی درسگاہ سے علم حاصل کرنے کا موقع ملا مگر وہ محرومی کی حالت میں اس دنیا سے چلا گیا۔

زندگی کیا ہے

زندگی کے معاملہ کو سمجھنے کے لئے مرکزی تصور کیا ہے۔ وہ کون سا بنیادی نکتہ ہے جس کی روشنی میں زندگی کے تمام معاملات کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔

خدائی تعلیم کے مطابق، یہ مرکزی نکتہ یا بنیادی تصور، صرف ایک ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ ابتلاء (الملک ۲) ہے۔ یعنی آزمائش (test)۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی خدائی ٹسٹ پر ہے۔ خدا کے فرشتے ہر لمحہ اس ٹسٹ کی رپورٹ تیار کر رہے ہیں۔ اسی رپورٹ پر اگلے مرحلۂ حیات میں آدمی کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور پھر کسی کو جنت میں داخلہ ملے گا اور کسی کو جہنم میں۔

یہ ٹسٹ کیا ہے۔ وہ ٹسٹ یہ ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں جن احوال سے دوچار ہوتا ہے ان میں وہ کیا رسپانس دیتا ہے۔ ایک قسم کا رسپانس آدمی کو جنت کا مستحق بناتا ہے اور دوسری قسم کا رسپانس اس کو جہنم والوں کی فہرست میں شامل کر دیتا ہے۔

اصولی اعتبار سے اس رسپانس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو ربانی رسپانس کہا جاسکتا ہے اور دوسرے کو شیطانی رسپانس۔ ربانی رسپانس یہ ہے کہ آدمی جب کسی صورت حال سے دوچار ہو تو وہ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس معاملہ میں خدا کی مرضی کیا ہے۔ مثلاً کسی نے آپ کو غصہ دلا دیا تو آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ غصہ کا جواب غصہ سے دینا اللہ کو پسند ہے یا غصہ کا جواب معافی سے دینا۔ اسی طرح اتفاقی اسباب سے کسی کا مال آپ کے قبضہ میں آگیا تو آپ کو سنجیدگی کے ساتھ یہ جاننے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ ایسا مال مجھے اپنے پاس رکھنا چاہیئے یا اس کو اصل مالک کی طرف لوٹا دینا چاہیئے۔

اسی طرح ایک صورت حال سامنے آتی ہے جب کہ جھوٹ بول کر مقبولیت ملتی ہے اور سچ بولنے سے آدمی کو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی محبوبیت کھودے گا۔ ایسے موقع پر چاہیئے کہ آدمی کھلے ذہن کے ساتھ معلوم کرے کہ دونوں میں سے کون سا رسپانس خدا کو اس سے مطلوب ہے اور پھر اس کو اختیار کر لے۔

آدمی ہر لمحہ مختلف احوال سے دوچار ہوتا ہے۔ صبح وشام اس کے ساتھ مختلف قسم کے معاملات پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ احوال و معاملات سب کے سب امتحان کے پرچے ہیں۔ آدمی کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ ان پرچوں کو کس طرح حل کرتا ہے۔

ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اپنی ذاتی خواہش پر چلے۔ وہ صرف اپنے ذاتی فائدے کو دیکھے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی ذاتی رائے کو اختیار کرے۔ ایسا آدمی اپنے امتحانی پرچے کو حل کرنے میں ناکام ہو گیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جب بھی کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کرے۔ وہ قرآن و حدیث میں اس کا مسئلہ تلاش کرے۔ اور پھر خدا کی کتاب اور رسول کی سنت سے جو حکم ملے اس کو دل کی پوری آمادگی کے ساتھ قبول کر لے، خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔

موجودہ دنیا میں کسی چیز کا ملنا یا کسی چیز کا چھننا نہ انعام کے لئے ہے اور نہ سزا کے لئے۔ بلکہ دونوں ہی آزمائش کے لئے ہیں۔ آدمی کو چاہیئے کہ وہ ہر معاملہ کو اسی نظر سے دیکھے۔ جب اس کو کوئی چیز ملے تو وہ خدائی قانون کے مطابق اس کا حق ادا کرے۔ اور جب کوئی چیز اس سے چھن جائے تب بھی وہ وہی کرے جو خدائی قانون میں ایسے موقع پر کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔

برائی کے بعد

واقم الصلاۃ طرفی النہار وزلفا من اللیل ان الحسنات یذھبن السیات ذلک ذکری للذاکرین (ھود ۱۱۴) اور نماز قائم کرو دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لئے۔

آدمی اپنی فطری کمزوریوں کی بنا پر طرح طرح کی کوتاہیاں کرتا ہے۔ بعض اوقات اس سے کوئی بڑا گناہ بھی سرزد ہو جاتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو آدمی کا ضمیر فوراً اس کو ملامت کرتا ہے۔ اس طرح ضمیر گویا اس بات کا پیشگی اعلان ہے کہ تم یہ غلطی کر کے اللہ کی نظر میں مجرم بن گئے ہو۔ موجودہ حالت میں تم اللہ کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔

اب انسان کیا کرے مذکورہ آیت اسی سوال کا جواب ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ برائی کے بعد نیکی کرنے کی کوشش کرے۔ یہ نیکی گویا اس کی طرف سے برائیوں کی تلافی ہے۔ یہ خدا کی نظر میں اپنے آپ کو دوبارہ مقبول بنانے کی کوشش ہے۔

جب آدمی کوئی برائی کرتا ہے تو ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ نیکی کے بارے میں اس کا جذبہ کمزور پڑ گیا تھا۔ وہ برائی کرنے اور نیکی کے بارے میں اپنی حساسیت کھو بیٹھا تھا۔ اس کے اندر سے وہ مزاج رخصت ہو گیا تھا جو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اذا سرتک حسنتک وسائتک سیئتک فانت مؤمن (مشکاۃ المصابیح ۱/۲۰) یعنی جب نیکی کر کے تم کو خوشی ہو اور برائی کر کے تم کو دکھ ہو تو سمجھ لو کہ تم مؤمن ہو۔

برائی کے بعد نیکی کرنا نیکی کے بارے میں اپنی حساسیت کو دوبارہ زندہ کرنا ہے۔ یہ برائی کے میل کو نیکی کے پانی سے دھو کر اس کو صاف کر دینا ہے۔

منصفانہ رویہ

قرآن (المائدہ ۸) کے مطابق، اللہ پر ایمان لانے والے ہر شخص کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے قول اور اپنے فعل کو منصفانہ بنانے کا پورا اہتمام کرے، گھر کے اندر اور گھر کے باہر ہر جگہ وہ عدل کی روش پر قائم رہے۔ حتی کہ اس وقت بھی جب کہ دوسروں سے اس کو شکایت پہنچی ہو، جب کہ دوسرں نے اس کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کیا ہو۔

اس آیت کا دوسرا پہلو وہ ہے جو داعی اور دعوت سے تعلق رکھتا ہے۔ حق کا داعی جب کسی ماحول میں دعوت کا کام شروع کرتا ہے تو وہ ایک بگڑا ہوا ماحول ہوتا ہے۔ اگر لوگ بگڑے ہوئے نہ ہوں تو دعوتی کام کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مدعو گروہ زیادتی کر کے داعی گروہ کے حقوق چھین لیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مدعو گروہ سیاسی غلبہ حاصل کر کے داعی گروہ کو مغلوبیت کی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مدعو گروہ حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنے حق سے زیادہ لے لیتا ہے اور داعی گروہ کو اپنے حق سے کم پر راضی ہونے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں داعی گروہ سخت نازک حالات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اب اگر داعی گروہ رد عمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے تو ایسا ہو گا کہ داعی گروہ کے دل میں مدعو گروہ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اس کا لٹریچر مدعو گروہ کی ظالمانہ داستانوں سے بھر جائے گا۔ اس کی مجلسوں سے لے کر اس کی صحافت اور ادب تک ہر جگہ مدعو گروہ کی زیادتیوں کا چرچا ہونے لگے گا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہو گا کہ داعی گروہ اور مدعو گروہ کے درمیان وہ معتدل فضا ہی ختم ہو جائے گی جو دعوتی عمل کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

اشاعت فاحشہ

قرآن (النور ۱۹) میں اشاعت فاحشہ کو سخت جرم بتایا گیا ہے۔ اشاعت فاحشہ کا مطلب ہے برائیوں کا چرچا۔ یعنی آدمی کا مزاج یہ ہو جائے کہ وہ دوسروں میں کوئی بھلائی دیکھے تو لوگوں کے درمیان اس کا چرچا نہ کرے۔ لیکن اگر کسی کے بارے میں صحیح یا غلط طور پر کوئی بری بات اس کے علم میں آجائے تو فوراً اس کو ہر ایک سے بیان کرنے لگے، وہ اس کو پورے معاشرے میں پھیلادے۔ یہاں تک کہ وہ شخص اتنا زیادہ بدنام ہو جائے کہ اس کے بارے میں لوگ کوئی اچھی بات سنیں تو یقین نہ کرسکیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی منافقانہ معاشرہ کی پہچان کیا ہے۔ کسی معاشرہ میں اگر ایسا ہو کہ اس کے افراد ایک دوسرے کے بارے میں انتخابی رپورٹنگ (selective reporting) کرنے لگیں۔ یعنی کسی آدمی میں اگر ۹۹ بات اچھی ہو تو وہ اس کا چرچا نہ کریں۔ البتہ اگر اس کے بارے میں کوئی ایک بری بات معلوم ہو جائے تو وہ فوراً اس کی اشاعت شروع کردیں۔ انہیں کسی کے بارے میں تعریفی بات کہنا اچھا نہ لگے، البتہ بری بات کہنا ان کے لئے محبوب ہو جائے۔ جس معاشرے کے افراد کا یہ حال ہو وہ معاشرہ بلا شبہ منافقوں کا معاشرہ ہے، وہ مخلص انسانوں کا معاشرہ نہیں۔

کسی معاشرہ میں جب یہ مزاج عام ہو جاتا ہے تو وہ انفرادی نفاق پر نہیں رکتا۔ اب نفاق ہی اس کے تمام اداروں کا عام کردار بن جاتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں مجلسوں میں ہونے والی گفتگوئیں، جلسوں میں ہونے والی تقریریں، حتی کہ اخباروں میں چھپنے والی خبریں، ہر ایک کا انداز یہی ہو جاتا ہے۔ ایسے معاشرہ کی ہر سرگرمی نفاق کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ ایسے معاشرہ کے مذہب کو، ایک لفظ میں نفاق کلچر کہا جاسکتا ہے۔

ظالم انسان

پانی اس مقام سے اندر داخل ہو جاتا ہے جہاں سوراخ ہو۔ ٹھیک اسی طرح ظالم انسان عین اس مقام سے آپ پر حملہ کرتا ہے جو آپ کا نازک مقام (vulnerable point) ہو۔ پانی کو اندر داخل ہونے سے روکنے کے لئے سوراخ کو بند کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح آپ کو چاہئے کہ اپنے نازک مقام کی نگرانی کرتے رہیں تاکہ ظالم لوگوں کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ آپ کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا سکیں۔

یہ صورت حال امتحانی آزادی کی بنا پر ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے آپ اس کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ اپنے معاملات کو ایسی محتاط صورت میں انجام دیں کہ کسی ظالم کو آپ پر ظلم کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

ظالم سے اس قسم کا تحفظ کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ ہر ایک کے بس میں ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن کو سرگرم رکھے اور جو معاملہ کرے اس کے تمام پہلوؤں کو پیشگی طور پر سمجھ لے۔ اس سلسلہ میں مشورہ نہایت مفید چیز ہے۔ اگر آپ کے اندر مشورہ کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو تو مشورہ ہی اس معاملہ میں اس کے تحفظ کے لئے کافی ہو جائے گا۔

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ آپ کے ساتھ جو کچھ آج پیش آیا ہے وہ اس سے پہلے ہزاروں لوگوں کے ساتھ پیش آچکا ہے۔ ماضی اور حال کے لوگوں میں وہ تجربات دہرائے جا چکے ہیں جس سے آپ آج دوچار ہو رہے ہیں۔ اس لئے اگر آپ آنکھ کھلا رکھیں تو آپ جان لیں گے کہ کسی معاملہ میں ایک غلطی کرنے کے بعد

تجربہ سے دوچار ہونے والے ہیں عین اسی قسم کی غلطی کی ایک مثال سی اور حص لی زندلی میں پہلے سے موجود ہے۔

دوسروں کے تجربات آپ کے لئے بہترین رہنما ہیں۔ اگر آپ دوسروں کے تجربات سے سبق لینا سیکھ لیں تو یہ بات آپ کے لئے اس کی ضمانت بن جائے گی کہ آپ کو ان نقصانات سے دوچار ہونا نہ پڑے جس سے دوسرے لوگ اپنی کسی غلطی کی بنا پر دوچار ہوئے۔

قرآن میں ایک طرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ خدا پر اعتماد و توکل کرو۔ دوسری طرف قرآن میں یہ بھی حکم ہے کہ تم لوگ اپنے بچاؤ کا انتظام رکھو۔ (النساء ا ۷) اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اگرچہ تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ ہر چیز مکمل طور پر اسی کے قبضہ میں ہے۔ مگر اسی کے ساتھ دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا خدا نے امتحان کے لئے بنائی ہے۔ اس امتحانی مصلحت کی بنا پر خود خدا نے ہر عورت اور مرد کو یہ آزادی دی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ یہ آزادی بالکل ضروری تھی۔ کیوں کہ آزادی کے بغیر امتحان کا مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اسی امتحانی آزادی کی بنا پر یہ صورت حال ہے کہ ہر آدمی کو یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ اب اگر لوگوں سے ان کی آزادی چھینی جائے تو امتحان کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لئے اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ خدا پر توکل کرتے ہوئے شریر لوگوں سے اپنے بچاؤ کا انتظام بھی ضرور رکھیں۔

اس دنیا میں کامیابی صرف اس شخص کے لئے ہے جو توکل اور بچاؤ کے اس دوطرفہ تقاضے کی رعایت کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

قرآن میں حضرت آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان ہوا ہے۔ ان کا نام ہابیل اور قابیل تھا۔ قابیل ایک بات پر ہابیل سے غصہ ہو گیا۔ اس کے دل میں اپنے بھائی کے خلاف حسد و بغض پیدا ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ قابیل ایک روز ہابیل کو جان سے مارنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ ہابیل ایک مخلص اور پاک باز انسان تھا۔ قرآن کے بیان کے مطابق اس نے اپنے بھائی قابیل سے کہا کہ: اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لئے تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو سارے جہان کا رب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی لے لے پھر تو آگ والوں میں شامل ہو جائے۔ اور یہی سزا ہے ظلم کرنے والوں کی۔ (المائدہ۔ ۲۸۔ ۲۹)

یہی بات حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ .... کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہو اور نہ دینار۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں نماز اور روزہ اور زکاۃ کے ساتھ آئے۔ اسی کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی ہو کسی پر الزام لگایا ہو اور کسی کا مال کھایا ہو، اور کسی کا خون بہایا ہو اور کسی کو مارا ہو۔ تو اس کی نیکیاں ان لوگوں کو دے دی جائیں گی جن کے ساتھ اس نے زیادتی کی تھی۔ پھر اگر معاملہ برابر ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو مظلوموں کے گناہ لے کر اس کے اوپر ڈال دیئے جائیں گے۔ پھر اس کو آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ (مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۱۸)

یہ ایک نہایت سنگین صورت حال ہے جس سے آدمی کو ڈرنا چاہئے۔ موجودہ دنیا آزمائش کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس لئے یہاں ہر انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جو چاہے

کرے۔ اس آزادی کی بنا پر آدمی اکثر بے خوف ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہاں زیادتی کرنے والے کا ہاتھ فوراً پکڑا نہیں جاتا، اس لئے وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں جو چاہوں کروں، میرے لئے خطرہ کی کوئی بات نہیں۔

مگر یہ ایک انتہائی بھیانک بھول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے کسی عمل کا جو سخت انجام انسان کے سامنے آنے والا ہے، اگر وہ اس کو پیشگی طور پر جان لے تو وہ بولنے کے بجائے خاموشی کو پسند کرے۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں اس طرح رک جائیں جیسے کہ ان میں جان ہی نہیں۔

قرآن و حدیث کے مذکورہ بیان کے مطابق، آج کی دنیا میں اگر کوئی شخص کسی آدمی کے خلاف زیادتی کرے، مثلاً وہ اس پر جھوٹا الزام لگائے، وہ اس کے مال و جائداد پر ناحق قبضہ کرلے، وہ اس کی آبرو ریزی کرے، یا اور کسی قسم کی زیادتی کرے تو یہ معاملہ اسی دنیا میں ختم ہو جانے والا نہیں۔

موت کے بعد جب تمام لوگ قیامت میں اکٹھا کئے جائیں گے تو وہاں ظالم اور مظلوم کا مقدمہ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ وہاں ہر آدمی مجبور ہوگا کہ بے بسی کے ساتھ اپنے خلاف فیصلہ کو مان لے۔ خدا کے حکم کے مطابق اس وقت ایسا کیا جائے گا کہ ظالم کے اچھے اعمال اس سے لے کر مظلوم کے خانہ میں ڈال دیئے جائیں گے اور اگر ظالم کے پاس نیکیاں کم ہوں تو مظلوم کی برائیوں کو ظالم کے اوپر ڈال دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد ظالم کو جہنم کے بھڑکتے ہوئے گڑھے میں پھینک دیا جائے گا تاکہ وہ ابد تک اپنے کئے کی سزا بھگتا رہے۔

آدمی اگر اپنے قول و عمل کے اس بھیانک انجام کو سوچے جو کل سامنے آنے والا ہے تو اچانک اس کی پوری زندگی بدل جائے گی۔

سائنسی مزاج

۲؍جون ۱۹۹۸ کو دوردرشن (نئی دہلی) میں ایک پینل ڈسکشن تھا۔ اس میں چھ آدمی تھے۔ میرے سوا ایک مرکزی وزیر، ایک سوشل ایکٹوسٹ، ایک پروفیسر، ایک انگریزی جرنلسٹ اور ایک تعلیم یافتہ خاتون۔ اس کا موضوع سائنٹفک ٹمپر (سائنسی مزاج) تھا۔

میں نے کہا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۴۷ میں کہا تھا کہ ہمارے دیش کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ سائنٹفک ٹمپر (سائنسی مزاج) ہے۔ مگر آزادی کے پچاس سال بعد بھی لوگوں میں سائنٹفک ٹمپر پیدا نہ ہو سکا۔ اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس رخ پر ایجوکیٹ نہیں کیا گیا۔

میں نے کہا کہ سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ سائنٹفک ٹمپر سے کیا مراد ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، اس سے مراد حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر (realistic approach) ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک دعا ہے۔ اس دعا میں آپ نے جن چیزوں کو خدا سے مانگا ان میں سے ایک یہ تھی: اللھم ارنا الاشیاء کما ہی (اے خدا، ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں) اس کے مطابق، سائنسی مزاج یا سائنسی سوچ کا مطلب ہے: جیسا ہے ویسا سوچنا (as it is thinking)

اس قسم کی سائنسی سوچ زندگی کے لئے بے حد اہم ہے، ایک فرد کے لئے بھی اور پوری قوم کے لئے بھی۔ ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جو ہم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے، اس کے اپنے قوانین ہیں۔ وہ خود اپنے اٹل اصولوں پر چل رہی ہے۔ ایسی حالت میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ اپنے آس پاس کی دنیا کو کھلے ذہن کے تحت دیکھا جائے۔ فطرت کے

ون کو اس کی اصلی صورت میں سمجھا جائے۔اسی سے وہ چیز پیدا ہو سکتی ہے جس کو
یقت پسندانہ سوچ کہا جائے۔اس سے آدمی اس قابل ہو سکتا ہے کہ چیزوں کے بارے
ں وہی رائے قائم کرے جو کہ بطور واقعہ ہونا چاہیے۔اسی کا نام سائنسی مزاج ہے،اور وہی
ل اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں جن کے اندر اس قسم کا مزاج پایا جاتا ہو۔

سائنسی سوچ دراصل اس سوچ کا نام ہے جو حقیقت واقعہ کے مطابق ہو۔اس کا
علق مادی دنیا سے بھی ہے اور انسانی دنیا سے بھی۔مثال کے طور پر آپ کو ایک دریا کے
پر پل بنانا ہے۔اب سائنسی طریقہ یہ ہو گا کہ آپ موم کے ذریعہ اپنا یہ پل نہ بنائیں،بلکہ
ہے کے ذریعہ بنائیں۔اسی طرح آپ کو غلہ کی فصل اگانی ہے تو آپ غلہ کا بیج زمین میں
الیں نہ کہ پتھر یا پلاسٹک کے ٹکڑے اپنے کھیت میں بکھیر دیں۔

یہی معاملہ انسانی دنیا کا بھی ہے۔انسانی دنیا میں بھی کوئی نتیجہ اس وقت حاصل کیا
جا سکتا ہے جب کہ اس میں متعلقہ حقائق کی پوری رعایت کی گئی ہو۔بصورت دیگر ظاہری
کوشش کے باوجود مطلوب نتیجہ نکلنے والا نہیں۔

آپ کسی کو اپنا حامی بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو اس کے ضمیر کو متحرک کرنا ہو گا۔اگر
آپ اس کی انا کو چوٹ پہنچائیں تو وہ برعکس طور پر آپ کا دشمن بن جائے گا۔اگر آپ
دوسروں سے کچھ پانا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ کرنا ہو گا کہ دوسروں کی نظر میں آپ دینے
والے بن جائیں،کیونکہ لوگ اسی کو دیتے ہیں جس سے انہیں خود بھی مل رہا ہو۔اگر آپ
لوگوں کے درمیان عزت کا درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو تواضع کی روش اختیار
کرنی پڑے گی۔کیونکہ عزت کا مقام تواضع کرنے والے کو ملتا ہے نہ کہ گھمنڈ کرنے والے
کو۔

۶ ستمبر کو دوبارہ مذکورہ ہندو صاحبان دو اور صاحبان کو لے کر آئے۔ یہ ڈاکٹر امت یادو (Tel. 757-5382108) اور مسٹر جینت باروٹے (Tel. 757-4830370) تھے۔ ان لوگوں سے دیر تک بات ہوتی رہی۔ یہ سب سوادھیائے تحریک سے جڑے ہوئے لوگ ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پورے امریکہ میں سوادھیائے کے ۳۰۰ سنٹر (کیندر) ہیں۔

ڈاکٹر نجم اختر صاحب امریکہ میں اپنا موجودہ کام چھوڑ کر سعودی عرب کی ایک یونی ورسٹی میں جارہے ہیں۔ وہاں وہ ٹیچنگ جاب کریں گے۔ انھوں نے بتایا کہ سعودی عرب کے مقابلہ میں امریکہ کی تنخواہ ڈھائی گنا زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ انھوں نے جب یہاں کا کام چھوڑنے کے لیے کہا تو کمپنی کے یہودی چیرمین نے انھیں پیش کش کی کہ ہم تمہاری سالانہ تنخواہ میں پانچ ہزار ڈالر بڑھا دیں گے، تم یہاں سے مت جاؤ۔

پھر ڈاکٹر نجم اختر صاحب کیوں یہاں سے جارہے ہیں۔ اس کا دو سبب ہے۔ ایک بچوں کا مسئلہ۔ ان کا خیال ہے کہ یہاں کے آزاد ماحول میں ان کے بچے خراب ہو جائیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ کا جذبہ بہت قابل قدر ہے، مگر اس کا تعلق نقل مکانی سے نہیں۔ آپ اپنی اگلی نسل کو اس سے روک نہیں سکتے۔ بڑے ہونے کے بعد آپ کے بیٹے اور پوتے دوبارہ یہیں آئیں گے، جیسا کہ دوسروں کے بیٹے اور پوتے کر رہے ہیں۔

دوسری بات ان کے ذہن میں یہ ہے کہ امریکہ میں اپنی صلاحیتوں کو میں دشمن کے حق میں مفید بنا رہا ہوں۔ یہاں اور بھی بہت سے نیک دل مسلمان ہیں جو اس طرح سوچتے ہیں اور اس بنا پر یہاں سے چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔ مگر مجھے اس طرز فکر سے اتفاق نہیں۔ اس طرز فکر کا سبب یہ ہے کہ یہ مسلمان ان "اغیار" کو دشمن اسلام کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ حالانکہ خود یہ طرز فکر اسلام کے حق میں سب سے بڑی دشمن ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ہم ان کو مدعو سمجھیں اور ان سے مدعو والا معاملہ کریں۔

اگر مذکورہ فکر کو اختیار کیا جائے تو کبھی بھی دعوت کا عمل شروع نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ داعی کے مقابلہ میں مدعو ہمیشہ برتر پوزیشن میں ہوتا ہے۔ وہ داعی کا استحصال کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے دعوت کا عمل صرف اس وقت شروع ہوگا جب کہ معاملہ کو اس ذہن سے نہ دیکھا جائے۔

تاتاریوں نے ہزاروں مسلمانوں کو پکڑ کر اپنا خادم بنالیا۔ یہی غلام اور خادم تھے جنھوں نے خاموش تبلیغ کے ذریعہ تاتاریوں کو مسلمان بنادیا۔ یہ مسلمان اگر سوچتے کہ میں اپنے آپ کو ان دشمنوں کی خدمت میں کیوں لگاؤں تو تاتاریوں کے درمیان دعوت کا عمل شروع ہی نہ ہوتا اور اسلام کی تاریخ کا وہ شاندار باب کبھی نہ لکھا جاتا جس کو اقبال نے اس طرح نظم کیا ہے :

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانہ سے پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

صحیح بات یہ ہے کہ مسلمان یہاں دعوتی مقصد کے تحت رہیں ، اور بقیہ چیزوں کو اپنے ذہن سے بالکل نکال دیں۔

ماونٹ ہالی کے سنٹر کی پشت پر بہت دور تک کھلا ہوا سرسبز میدان ہے۔ سنٹر کا ایک دروازہ اس کی طرف کھلتا ہے۔ ۸ ستمبر کی صبح کو میں نے یہ دروازہ کھولنا چاہا تو وہ غیر مقفل تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں اسی طرح دوسرے دروازے بھی غیر مقفل پڑے رہتے ہیں۔ یہاں چوری وغیرہ کا کوئی اندیشہ نہیں۔ جب کہ اس سے پہلے جب میں نیویارک میں تھا تو وہاں دروازہ کو پوری طرح بند رکھنا پڑتا تھا ، کیونکہ وہاں چوری کا بھی اندیشہ رہتا ہے اور تشدد کا بھی۔

اب اگر کوئی شخص صرف نیویارک کی ایک خبر لے کر اس کو جنرلائز کرے تو وہ کہے گا کہ امریکہ جرائم کا ملک ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ماونٹ ہالی کی مثال لے کر اس کو جنرلائز کرے تو وہ امریکہ کی بالکل دوسری تصویر پیش کرے گا جس میں امریکہ اسلام کی اخلاقی قدروں کا حامل دکھائی دینے لگے گا۔

تاریخ کی اکثر غلطیاں اسی قسم کے غلط جنرلائزیشن کے نتیجہ میں پیش آئی ہیں۔ لوگ صورت حال کا زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ نہیں کرتے۔ ان کے سامنے پوری تصویر کا کوئی ایک پہلو آتا ہے۔ اسی ایک پہلو کو وہ کل پہلو سمجھ لیتے ہیں۔ اور پھر اس کے بارہ میں ایک کلی بیان دے دیتے ہیں۔ اس قسم کا بیان ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ جنرلائزیشن کی یہ غلطی اسلامی تاریخ یا مسلم سماج کے بارہ میں بھی کی جاتی ہے اور دوسروں کے بارہ میں بھی۔

۸ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ مجھ سے خطبہ کے لیے اور نماز پڑھانے کے لیے کہا گیا۔ میں نے اس سے معذرت کی۔ البتہ خطبہ سے پہلے ۲۰ منٹ کی ایک تقریر کی۔ پہلے ۱۰ منٹ تک

انگریزی میں اور اس کے بعد امنٹ اردو میں۔

اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر آپ مکہ اور مدینہ جائیں تو وہاں آپ صحابہ کی بہت کم قبریں پائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ اسلام کا پیغام لے کر ساری دنیا میں پھیل گئے۔ چنانچہ ان کی قبریں بھی زیادہ تر باہر ہیں۔ حضرت عبادہ بن صامت کی اہلیہ کی قبر قبرص میں ہے۔ حضرت خالد کی قبر حمص میں۔ حضرت معاذ بن جبل کی قبر اردن میں، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ تاریخ دوبارہ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ دوبارہ مسلمان اپنے ملکوں سے نکل کر امریکہ میں اور دوسرے مغربی ملکوں میں بڑی تعداد میں آ گئے ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ ابتداءً معاش کے جذبہ کے تحت آئے تھے۔ مگر حالات نے انھیں بتایا کہ تمہیں اسلام کی نمایندگی کرنا ہے، ورنہ تم اپنا وجود کھو دوگے۔ چنانچہ آج یہ مسلمان تمام مغربی دنیا میں کثرت سے مسجد اور اسلامی مرکز اور دینی ادارے بنا رہے ہیں۔ بے شمار تعداد میں اسلامی لٹریچر لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کا وجود بذات خود یہاں اسلام کو موضوع بحث بنا دیتا ہے۔

یہاں ایک مسلمان ڈاکٹر کا حال معلوم ہوا۔ وہ اپنے فن میں نہایت ماہر ہیں۔ انھوں نے یہاں تقریباً ایک بلین ڈالر کمایا۔ شاندار مکان بنایا۔ بچوں کو نہایت اعلیٰ تعلیم دلائی۔ مگر اب ان کا جھگڑا خود اپنے بیوی بچوں سے ہو گیا ہے۔ بیوی بچے ایک طرف ہیں اور وہ دوسری طرف۔ زندگی سخت پریشانیوں کا شکار ہو گئی ہے۔ ذیابیطس اور دوسری بیماریاں بھی انھیں لاحق ہو گئی ہیں۔ شاندار مکان، شاندار کاریں اور شاندار بزنس، کسی چیز میں اب ان کے لیے سکون باقی نہیں رہا۔ جھگڑے کا آغاز یہاں سے ہوا کہ ان کے مطب میں لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ بیوی کو اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب پر شبہ ہو گیا۔ بات بڑھتے بڑھتے آخری حد پر پہنچ گئی۔

اس طرح کے واقعات یہاں بہت زیادہ ہیں۔ امریکہ ایک طرف دولت کی کثرت کی جگہ ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اس بات کی بھی ایک عبرت ناک مثال ہے کہ مادی فراوانی کبھی کسی کو سکون نہیں دیتی۔

۸ ستمبر ۱۹۹۶ کو اسلامی مرکز (ماؤنٹ ہالی) میں نماز فجر کے بعد مجھ سے درس کے لیے کہا گیا۔

سامعین میں زیادہ تر انگریزی جاننے والے تھے۔ اس رعایت سے میں نے انگریزی میں حدیث کا درس دیا۔ یہ درس اس حدیث پر مبنی تھا: من صلی الصبح فھو فی ذمۃ اللہ (جس نے صبح کی نماز ادا کی وہ اللہ کی گارنٹی میں آگیا)

میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز مصلیوں کے اندر ایسے انسانی اوصاف پیدا کرتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ دوسروں کی طرف سے مامون و محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان صفات کو چار الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے —— تواضع، شکر، اطاعت، سلامتی، ڈسپلن:

modesty, thanksgiving, submission, peace, discipline.

ابتدائی چار صفات انفرادی اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں۔ پانچویں صفت اجتماعی صفت ہے اور وہ نماز باجماعت کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔

مولانا ذکی الدین شرفی یہاں مسلسل طور پر مختلف قسم کے اسلامی پروگرام چلا رہے ہیں۔ ۸ ستمبر کو جناب فضل الرحمٰن صاحب کے مکان پر ہفتہ وار پروگرام تھا۔ صبح سویرے روانہ ہو کر ہم لوگ فضل الرحمٰن صاحب کے مکان پر پہنچے۔ یہاں اور بھی کئی لوگ اکٹھا تھے۔ ان کے مکان کے بیسمنٹ میں فجر کی نماز ادا کی گئی۔ مولانا ذکی الدین صاحب کی موثر قرأت نے اس کو بہت پُرتاثیر بنا دیا۔ نماز کے بعد مولانا ذکی الدین شرفی نے قرآن کا درس دیا۔

آخر میں میں نے یہ حدیث پڑھی: ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا وبمحمد رسولا وبالاسلام دینا۔ میں نے کہا کہ ایمان اور اسلام کا ایک فارم ہے اور دوسری چیز اس کی روح اور اسپرٹ ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے ایک پھل میں چھلکا اور مغز ہوتا ہے۔ ذائقہ والی دین داری آدمی کو اس وقت ملتی ہے جب کہ وہ فارم سے گزر کر روح اور اسپرٹ تک پہنچ جائے۔ اللہ کا نام لینا ایک ظاہری اعتبار سے ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب آپ اللہ کا نام لیں تو اللہ کی صفات کمال کو یاد کر کے آپ کا سینہ لرز اٹھے۔ اس کا نام ہے ذائقہ ایمان ہے۔ نماز کی ایک ظاہری ادائگی ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ نماز ادا کرتے ہوئے آپ کی پوری شخصیت خشوع اور تواضع کے احساسات میں ڈھل جائے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائگی کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ حساب کر کے مقرر رقم کسی کو دے دیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب آپ رقم دے رہے ہوں تو آپ الذین

یوتون ما آتو وقلوبہم وجلۃ کی تصویر بنا ہوا ہو۔ یہی معاملہ تمام اسلامی [illegible]

پروگرام کے بعد ناشتہ کی مجلس میں ہالینڈ سے آئے ہوئے ایک صاحب نے بتایا المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی ہالینڈ کے شہر لائیڈن میں پہلی بار [illegible] میں چھاپی گئی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ ڈچ لوگوں نے جب یہ منصوبہ بنایا کہ مسلم قوموں کو غلام بنائیں تو انھوں نے اپنے غلاموں کے مزاج اور مذہب کو سمجھنے کے لیے اس قسم کے کام کیے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کا کام مغربی ملکوں نے موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر کیا ہے مگر ان کو سازش وغیرہ سمجھنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان کو اس حدیث کا مصداق قرار دیا جائے۔ ان اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر (اللہ اس دین کی تائید برے آدمی کے ذریعہ بھی کرے گا)

، ستمبر کی شام کو ہم لوگ اسلامک سوسائٹی، سنٹرل جرسی پہنچے۔ یہاں عصر اور مغرب کے درمیان میرا خطاب رکھا گیا تھا۔ یہ کافی وسیع اور شاندار مرکز ہے۔ اس میں مسجد کے علاوہ کئی شعبے ہیں۔ حاضرین میں بیشتر غیر اردو داں تھے۔ اس لیے یہاں مجھ کو انگریزی میں خطاب کرنا پڑا۔

میں نے اپنی مفصل تقریر میں بتایا کہ مسلمانوں کے موجودہ مسائل کا واحد حل دعوہ ورک ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام کی حیثیت آئیڈیالوجیکل سپر پاور کی ہے۔ اسلام کو بطور دعوت پیش کرنا ہی اس وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ مگر ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اور دعوت کی بھی ایک قیمت ہے۔ یہ قیمت مدعو سے یک طرفہ محبت ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلام کی دعوتی قوت کو استعمال کریں تو آپ کو اس کی قیمت دینی پڑے گی۔

پھر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کا مدعو کوئی استثنائی طور پر ظالم نہیں ہے۔ مدعو سے ہمیشہ ہی داعی کو ظلم و زیادتی کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تم ضروری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دعوت کا کام کرو تو تمہارا دشمن بھی تمہارا دوست بن جائے گا۔ گویا کہ ہر دشمن امکانی طور پر ہمارا دوست ہے۔ مگر یہ دشمن اسی وقت دوست بنتا ہے جب کہ اس کی زیادتی کے باوجود اس کے ساتھ خیر خواہی کا سلوک کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سے اس عمل کی مثالیں بیان کیں۔

سنٹرل جرسی کی اسلامک سوسائٹی میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں کئی عرب بھی تھے۔ یہ ادارہ ۱۹۸۴ میں قائم ہوا۔ اس کے سابق صدر سے میں نے پوچھا کہ کیا اس کی تعمیر میں کوئی رکاوٹ پیش آئی، انھوں نے کہا کہ کوئی رکاوٹ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکی پڑوسیوں سے ہمارا رشتہ اچھا ہو۔ پولیس سے بہتر تعلق ہو اور دوسرے اداروں کو ہم نے شکایت کا موقع نہ دیا تو یہاں کبھی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی، یہ بات جناب محمد عبد الحمید صدیقی نے بتائی۔ وہ ۱۹۷۱ سے امریکہ میں ہیں۔ اور اسلامک سوسائٹی، سنٹرل جرسی کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔

نیو جرسی ایک اسٹیٹ ہے، جس کا ایک حصہ جرسی ہے۔ یہ علاقہ بہت زیادہ سرسبز ہے۔ ہر طرف باغات اور زرعی فارم پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس کو گارڈن اسٹیٹ بھی کہا جاتا ہے۔

۸ ستمبر کی شام کو عصر اور مغرب کے درمیان ماونٹ ہال کی مسجد میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں زیادہ تر عورتیں شریک تھیں۔ اس میں خطاب کا موضوع تھا کہ امریکی معاشرہ میں بچوں کا اسلامی تحفظ۔ اس پر بولتے ہوئے میں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا:

میں نے کہا کہ اگلی نسل کا اسلامی تحفظ اس طرح نہیں ہو سکتا کہ آپ ایک مولوی صاحب کو مقرر کر دیں جو روزانہ شام کو آکر "دینیات" پڑھا دیں۔ یا کوئی دینی رسالہ آپ اپنے بچوں کے نام جاری کر دیں۔ یا انھیں کلچرل نوعیت کی کچھ چیزوں کا عادی بنانے کی کوشش کریں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اگر آپ کو اپنے بچوں کو اسلامائز کرنا ہے تو سب سے پہلے اپنے گھر کو اسلامائز کیجئے۔ آپ کے گھر میں دنیا کا چرچا نہ ہو بلکہ دین کا چرچا ہو۔ گھر کا ماحول مادی رنگ میں رنگا ہوا نہ ہو بلکہ آخرت کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔

دوسری بات یہ کہ آپ اپنے بچوں کے اندر داعیانہ اسپرٹ پیدا کریں۔ یہ ایک اصول ہے کہ جو داعی نہیں بنتا اس کو مدعو بننا پڑتا ہے۔ اس لیے اگر آپ نے اپنے بچوں کے اندر داعیانہ اسپرٹ نہیں پیدا کی تو وہ دوسروں سے متاثر ہو کر رہیں گے۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کا قانون کبھی نہیں بدلتا۔

تیسری چیز یہ کہ یہاں ہر بچہ انگریزی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ مگر اس کے ساتھ ضروری ہے کہ بچہ کو اردو یا عربی زبان بھی ضرور پڑھائی جائے، تاکہ وہ اسلامی لٹریچر

سے استفادہ کے قابل ہو سکے۔ انگریزی میں بقدر ضرورت لٹریچر موجود نہیں ہے۔ اس بنا پر انگریزی زبان کافی نہیں ہو سکتی۔

بعد کو ایک صاحب ملے اور انھوں نے ایک سوال کیا۔ میں نے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ایک شخص اپنے بچہ کو ڈاکٹری نہ پڑھائے۔ اور جب وہ بڑا ہو جائے تو بلیک مارکٹ سے ڈاکٹری کا جعلی سرٹیفکٹ خرید کر اس کو ڈاکٹر بنانا چاہے تو یہ کیسا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو پاگل پن ہے۔ میں نے کہا کہ ہمارے اکثر سرپرستوں کا حال یہی ہے۔ وہ اپنے بچہ کو پہلے غیر جنتی راستہ پر چلائیں گے اس کے بعد چاہیں گے کہ اس سے جنت کا ٹکٹ حاصل کر کے اسے دے دیں۔ تو ایسا ٹکٹ صرف کسی خوش خیال آدمی کے ذہن میں ہو سکتا ہے۔ وہ حقیقی دنیا میں کبھی نہیں پایا جاتا۔

امریکی نومسلم عبد الرحمن صاحب ۸ ستمبر کو عشاء کی نماز کے بعد ملاقات کے لیے آئے۔ میں نے ان کو چند حدیثیں سنائیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے کہا کہ اسلام میں ہر چیز کا انحصار نیت پر ہے۔ نیت اچھی ہو تو ہر چھوٹا یا بڑا کام ثواب بن جاتا ہے۔ مثلاً ایک چیز آپ کو بروقت نہیں مل سکی ہے۔ آپ نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیا تو وہ ثواب بن گیا۔ اسی طرح آپ کو کسی نے برا کہا۔ آپ کو غصہ آگیا۔ آپ نے اللہ کی خاطر صبر کر لیا تو پھر صبر کرنا عظیم ثواب بن گیا۔ اسی طرح ہر چیز میں نیت کا پہلو شامل ہے۔ اور ہر کام اچھی نیت کے ساتھ ثواب بن جاتا ہے۔

۸ ستمبر کی صبح کو ماونٹ ہالی میں الرسالہ مشن سے اتفاق رکھنے والوں کا اجتماع ہوا۔ دیر تک گفتگو ہوئی۔ آخر کار الرسالہ فورم انٹرنیشنل کے نام سے ایک باقاعدہ تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اس اجتماع میں جو باتیں طے کی گئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ الرسالہ لٹریچر کی ویب سائٹ (انٹرنیٹ) شروع کیا جائے۔ اس طرح الرسالہ مشن ان شاء اللہ ورلڈ وائڈ ویب (WWW) سے مربوط ہو جائے گا۔

اس کے تحت ان شاء اللہ الکٹرانک میل (ای میل) کے پتوں کی ایک عالمی فہرست بنائی جائے گی۔ تاکہ دنیا بھر میں ہر جگہ ای میل کے ذریعہ الرسالہ کا پیغام پہنچایا جا سکے۔ اس سلسلہ میں رابطہ کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے:

خواجہ کلیم الدین، نیویارک (Tel. 718-2583435)

اس پروگرام میں ایک فلسطینی نوجوان امام یحیٰ الهندی (Tel: 202-5439449) بھی تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور نہایت سنجیدہ بھی۔ انھوں نے کہا کہ اسنا کی کانفرنس میں ایک اسٹال پر میں نے آپ کی انگریزی کتابیں دیکھیں۔ ان کا ٹائٹل (نام) مجھے بہت پسند آیا۔ اور میں نے تمام کتابیں خرید لیں۔

انھوں نے بتایا کہ اس سے پہلے میں ایک مسجد میں امام تھا۔ وہاں انتہا پسند عربوں کا غلبہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ نماز کے بعد یہ دعا کرو کہ اے خدا، امریکہ کو تباہ کر دے (O Allah, destroy America) مگر میں اس قسم کی دعا نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ وہاں اتنا اختلاف بڑھا کہ مجھے وہاں سے چھوڑ دینا پڑا۔

ڈاکٹر عرفان انیس عمر (ٹمپل یونی ورسٹی) بھی اس پروگرام میں شریک تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں امریکی مسلمانوں کے اندر ایک بڑی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ چند سال پہلے جب میں یہاں آیا اس وقت یہ حال تھا کہ امریکہ کا لفظ لوگوں کی زبانوں میں زہر گھول دیتا تھا۔ مگر آج وہ شدت ختم ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اب لوگ حقیقت پسندی کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ اسلامی مرکز کے ذریعہ ۱۹۷۰ میں "حدیبیہ پرنسپل" کو اختیار کرنے کے نام پر جو فکری مہم شروع کی گئی تھی وہ آج نہ صرف انڈیا میں بلکہ امریکہ تک کے فکر کو متاثر کر رہی ہے اور اسی کے ساتھ ہر جگہ دعوت کے راستے کھل رہے ہیں۔ حدیبیہ پرنسپل کو ابتداءً لوگوں نے بزدلی اور پسپائی سے تعبیر کیا تھا۔ مگر آج ساری مسلم دنیا میں بلا اعلان یا اعلان کے ساتھ یہی فکر چھاتا چلا جا رہا ہے۔ حدیبیہ پرنسپل دراصل نام ہے یک طرفہ طور پر مصالحانہ انداز اختیار کر کے داعی اور مدعو کے درمیان نارمل تعلق قائم کرنے کا، تاکہ دعوت کا عمل جاری ہو جائے۔ یہ عمل آج شروع ہو چکا ہے۔ اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ ایک صحیح عمل جب شروع ہو جائے تو وہ اپنے اختتام پر پہنچ کر رہتا ہے۔

امام یحییٰ نے بتایا کہ یہاں ایسے مسلمان ہیں جو یہ دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ، تو امریکہ کو تباہ کر دے:

O Allah, destroy America.

میں نے امریکہ کے زمانۂ قیام میں یہاں کی ایک مسجد میں نماز پڑھی۔ دوسری رکعت کے آخر میں امام صاحب نے ہاتھ اٹھا کر قنوت نازلہ پڑھی۔ اس میں انھوں نے کہا: اللهم عذب الكفرة والمشركين الذين يصدون عن سبيلك ويقاتلون اولياءك (اے اللہ، کافروں اور مشرکوں کو عذاب دے جو تیرے راستے سے روکتے ہیں اور تیرے اولیا سے جنگ کرتے ہیں)

ایک مسلم رہنما کے جلسہ میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے امریکہ کے خلاف پرجوش تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ملک کے اندر آپ نہایت اچھا نظام دیکھیں گے۔ یہاں انھوں نے مکمل ڈیموکریسی قائم کر رکھی ہے۔ مگر یہی لوگ ہیں جو عراق میں بم گراتے ہیں۔ جو اپنے مفاد کی خاطر مسلم ملکوں کو لڑاتے ہیں۔ اپنے ملک کے اندر وہ جمہوری ہیں اور باہر کے ملکوں میں منافق:

Democracy at home, hippocracy abroad

مسلمانوں کی اکثریت اپنی زبان سے اسی قسم کی باتیں کرتی ہے۔ اس کے باوجود مولانا ذکی الدین شرفی کے بیان کے مطابق، تقریباً ۹ بلین مسلمان اپنے ملکوں سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ ساری دنیا میں مسلم نوجوانوں کی پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح امریکہ پہنچ جائے۔ حالانکہ امریکہ کا شہری بننے کے لیے جو حلف لینا پڑتا ہے وہ روایتی اسلامی عقیدہ کے سراسر خلاف ہے۔ ایک دین دار مسلمان جنھوں نے یہ حلف لے کر امریکی شہریت حاصل کی ہے، ان سے کہا گیا کہ ایسے غلط حلف پر کیوں آپ نے دستخط کیا۔ وہ بولے، میاں، میں نے جج کے سامنے ہاتھ تو ضرور اٹھا دیا تھا مگر میں اس وقت بھی اپنے دل میں اس پر لاحول پڑھ رہا تھا۔ مزید یہ کہ ایک صاحب کے بیان کے مطابق، یہاں آنے والے مسلمانوں میں بمشکل دو فی صد مسلمان ہیں جو یہاں کی مسجدوں یا اسلامی اداروں سے وابستہ ہیں۔ بقیہ ۹۸ فی صد مسلمان صرف اپنی دنیوی سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں۔

یہ چند واقعات بتاتے ہیں کہ جو مسلمان امریکہ میں آکر آباد ہوئے ہیں، ان کی دینی اور اخلاقی حالت کیا ہے۔

۹ ستمبر کو مولانا ذکی الدین شرفی سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو ماونٹ ہالی کے اسلامک سنٹر میں ہوئی۔ موضوع موجودہ مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ میں نے کہا کہ جہاں تک ہندستانی مسلمانوں کا تعلق ہے

ان کا اصل مسئلہ ہندو تعصب نہیں ہے بلکہ نااہل لیڈروں کی غلط رہنمائی ہے۔ ہندستان میں جو مسائل تھے وہ صرف ہندستان کے لیے مخصوص نہیں تھے، وہ کسی ایک یا دوسری صورت میں ہر جگہ موجود تھے۔ یہ دراصل فطری چیلنج کا مسئلہ تھا نہ کہ کسی قوم کے تعصب یا ظلم کا مسئلہ۔ مگر نااہل مسلم لیڈروں نے ان مسائل کو ہندو تعصب کا مسئلہ بتایا، اور اس بنیاد پر علاحدگی کی دھواں دھار تحریک چلائی۔ انھیں اس بات کا شعور نہیں تھا کہ ہندو تعصب سے رہائی کے نام پر چلائی جانے والی تحریک کا آخری ہلاک انجام یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی زیادہ بڑی تعداد دوبارہ انھیں ہندوؤں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جائے۔

لیڈروں نے تو ہندستانی مسلمانوں کے معاملہ کو آخری حد تک بگاڑ دیا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کیے کہ دوبارہ مسلمانوں کا شعور صحیح رخ پر جاگنا شروع ہوا۔ اور اب خدا کے فضل سے ہندستان کے مسلمانوں نے تعمیر کے راستہ پر اپنے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب کہ ہندستانی مسلمان دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان بن جائیں گے۔

پاکستان کے ذیل میں میں نے کہا کہ مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں نے اپنی پوری تحریک اس مفروضہ پر کھڑی کی کہ وہ مسلم لیگ کے پیدا کردہ مومنٹم کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں۔ حالانکہ اس دنیا میں ایسا ممکن نہیں کہ مومنٹم کسی اور کے نام پر پیدا ہو اور کوئی دوسرا اسے استعمال کرے۔ مولانا ذکی الدین شرفی نے کہا کہ مگر جماعت اسلامی پاکستان کا تو دعویٰ ہے کہ یہ مومنٹم خود مولانا مودودی کا پیدا کیا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو مسئلہ اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تقسیم کی پوری تحریک ہندو اکثریت کے خوف پر اٹھائی گئی تھی، جب کہ پاکستان کو حقیقی اسلامی نظام میں ڈھالنے کے لیے خدا کے خوف کا سرمایہ درکار تھا۔ اور یہ مزید اضافہ کے ساتھ ناممکن ہے کہ خوف ہندو پر برپا ہونے والی حرکت کو اچانک خوف خدا پر مبنی حرکت میں تبدیل کر دیا جائے۔

" انقلابی اسلام " کے ایک علم بردار سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں پاکستان میں انقلاب لایا گیا۔ افغانستان میں اسلامی انقلاب لایا گیا۔ ایران میں اسلامی انقلاب لایا گیا۔ مگر انقلاب کے باوجود کہیں اسلام نہ آسکا۔ انھوں نے کہا کہ انقلاب تو ایک جاری عمل ہے۔

اسلامی انقلاب کا راز یہ ہے کہ وہ ہر دن اور ہر لمحہ زندہ رہتا ہے۔ انقلاب کے بعد بھی انقلاب جاری رہتا ہے:

The secret of the Islamic revolution is that it is lived everyday at every instant. After the revolution, the revolution continues.

میں نے کہا کہ کیا آپ اس کو مانتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کا مستند نمونہ وہ انقلاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عرب میں آیا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ پھر وہ انقلاب تو بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی انقلاب صحیح معنوں میں صرف فرسٹ جنریشن میں زندہ رہتا ہے۔ دوسری جنریشن اور تیسری جنریشن میں وہ کمزور پڑ جاتا ہے اور اس پر زوال آنے لگتا ہے۔ پھر آپ کون سا نیا انقلاب لائیں گے جو تمام قوانین فطرت کے خلاف جاری عمل بن جائے۔ جو پہلی نسل کے بعد اگلی نسلوں میں مزید اضافہ کے ساتھ ترقی کرتا رہے۔ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

ایک اجتماع میں مجھ سے کہا گیا کہ میں ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں کچھ بیان کروں۔ میں نے یہاں کے حالات پر کچھ باتیں کہیں۔ آخر میں سوال و جواب کا پروگرام تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کو اقتصادی اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سب ان نام نہاد لیڈروں کی باتیں ہیں جو آپ کے پاس آکر مسلمانوں کی فرضی کہانیاں بتاتے ہیں تاکہ آپ انھیں تعاون کے نام پر بڑی بڑی رقمیں دیں۔

پھر میں نے کہا کہ آج کا ہندستانی مسلمان مکمل طور پر ایک بدلا ہوا مسلمان ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے نا اہل لیڈروں نے انھیں بتا رکھا تھا کہ انڈیا ان کے لیے ایک پرابلم کنٹری ہے۔ مسلمانوں نے اسی فرضی وہم میں آزادی کے بعد چالیس سال کھو دیے۔ مگر اب خود حالات نے (نہ کہ رہنماؤں نے) انھیں بتایا کہ انڈیا میں ان کے لیے بھی اسی طرح مواقع ہیں جس طرح دوسروں کے لیے ہیں۔ چنانچہ آج کل انڈیا کے مسلمانوں میں زبردست اقتصادی سرگرمیاں جاری ہوگئی ہیں۔ آج آپ کسی بھی شہر یا بستی میں جا کر اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

ایک عالم رمضان کے زمانہ میں امریکہ آئے۔ افطار میں کھانا پینا ہوگیا تو اس کے بعد انھوں نے کہا: افطرَ عندکم الصائمون اکل طعامکم الابرار وصلّت علیکم الملائکۃ الّا جبریل (آپ کے یہاں روزہ داروں نے افطار کیا۔ نیک لوگوں نے آپ کا کھانا کھایا۔ فرشتوں نے آپ کے

اوپر درود وسلام بھیجا سوا جبریل کے) لوگوں نے پوچھا کہ جبریل کیوں نہیں۔ عالم نے جواب دیا کہ چائے آنے تک وہ رکے ہوئے ہیں۔

اس قسم کے لطیفے لوگوں کو بہت پسند آتے ہیں۔ مگر وہ میرے ذوق کے سراسر خلاف ہیں۔ جس طرح ہر چیز کی ایک حد ہے اسی طرح لطیفہ کی بھی حد ہے۔ وہ یہ کہ لطیفہ کو عام انسانوں تک محدود رہنا ہے نہ کہ وہ فرشتوں جیسی مقدس ہستی تک جا پہنچے۔

ایک صاحب پاکستان سے آکر امریکہ میں آباد ہو گئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک امریکی نومسلم سے شادی کی۔ گھر میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی بات پر میری اور ان کی تکرار ہو جاتی اور ہم دونوں میں جھگڑا ہو جاتا۔ اس طرح گھر کے اندر سکون نہیں رہتا تھا۔ آخر کار مجھے آپ کا الرسالہ ملا۔ اس کو پڑھنے کے بعد میرے گھر کی حالت بالکل درست ہو گئی۔

انھوں نے بتایا کہ میں نے الرسالہ میں ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا "تین منٹ" اس میں ایک واقعہ لکھ کر بتایا گیا تھا کہ امن اور بے امنی کے درمیان صرف تین منٹ کا فاصلہ ہے۔ جب کوئی شخص تلخ بات کہے اور آپ کے اندر اشتعال پیدا ہو جائے تو تین منٹ کے لیے وہاں سے ہٹ جائیے۔ اس کے بعد اپنے آپ دونوں کا دماغ ٹھنڈا ہو جائے گا اور سکون کی حالت واپس آجائے گی۔ انھوں نے بتایا کہ ایسے مواقع پر میں ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہوں اور اب میری گھریلو زندگی نہایت سکون کی زندگی ہے۔ اگر مجھے الرسالہ نہ ملتا تو شاید میرے یہاں طلاق کی نوبت آجاتی۔

امریکہ میں آپ جس مسلمان سے بھی ملیں، اس کی سب سے بڑی فکر اس کا بچہ ہوگا۔ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے اپنی ایرکنڈیشنڈ کار میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ پھر وہاں اپنے ایرکنڈیشنڈ کمرہ میں بات کرتے ہوئے کہا کہ مجھے سب سے زیادہ فکر ان بچوں کی ہے۔ آپ بتائیے کہ ان کی آخرت کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ آخرت کی کامیابی آخرت کے لیے مطلوب عمل کرنے سے ملتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آدمی کی ساری توجہ دنیا پر لگی ہوئی ہو۔ اور اسی کے ساتھ اسے آخرت بھی تحفہ کے طور پر مل جائے۔ میں نے کہا کہ آپ نے حدیث میں پڑھا ہوگا کہ ان شدۃ الحسن من فیح جہنم

(گرمی کی شدت جہنم کی سانس سے ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جہنم کے ابتدائی تجربات رکھے ہیں تاکہ آدمی ان سے گزر کر جہنم سے بچنے کی فکر کرے۔ مگر آپ لوگوں کی ساری کوشش یہ ہے کہ اپنے بچہ کو اس طرح رکھیں کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف کا تجربہ نہ ہونے پائے۔

یہ طریقہ خدائی اسکیم کے خلاف ہے۔ خدائی اسکیم میں جنت کا راستہ جہنم کے تجربات سے ہوکر گزرتا ہے۔ اور آپ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے بچوں کو جنت کی ٹھنڈی ہواؤں سے گزارتے ہوئے جنت کے دروازہ میں داخل کردیں۔

مولانا ذکی الدین شرفی ۱۹۸۹ میں آٹھویں سالانہ کانفرنس کے تحت تہران گئے۔ انھوں نے بتایا کہ شہر کی ایک مسجد میں وہ داخل ہوئے تو وہاں دیوار پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: یا خدا، تا ظہور مہدی منتظر نہضت خمینی را حفاظت بفرما (اے خدا، مہدی کی آمد تک خمینی انقلاب کی حفاظت فرما) مگر یہ دعا قانون فطرت کے خلاف ہے۔ اس دنیا کا قانون ہے کہ کوئی بھی انقلاب یہاں اپنی ابتدائی صورت میں صرف پہلی جنریشن تک رہتا ہے۔ اس کے بعد لازماً اس کا تنزل شروع ہوجاتا ہے۔ ایران کے انقلاب پسند صرف اپنے لیڈر کو جانتے تھے۔ اگر وہ قانون فطرت کو جانتے تو وہ مسجد میں اس قسم کے الفاظ نہ لکھتے۔ اس قسم کی دعا ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص بہار کا موسم پائے تو یہ دعا کرنے لگے کہ اے خدا، اب کبھی مجھے خزاں کو دیکھنا نہ پڑے۔

۹ ستمبر کو دوپہر کے کھانے پر کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کا ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) ہے۔ وہ چیزوں کو سفید و سیاہ میں دیکھ پاتے ہیں۔ حالانکہ یہ نظام فطرت کے خلاف ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کسی پہاڑی علاقہ میں جائیں تو وہاں بے شمار چشمے بہتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ آپ وہاں کھڑے ہوکر دیکھیں تو آپ پائیں گے کہ بار بار پانی کے راستہ میں پتھر کے ٹکڑے آتے ہیں۔

اب پانی کے لیے بظاہر دو چوائس ہے۔ یا تو وہیں ٹھہر جائے۔ یا پتھر کو توڑ کر آگے جانے کی کوشش کرے۔ عام آدمی کے مطابق ایسی حالت میں ٹھہرنا تو پسپائی قبول کرنا ہے۔ اس لیے پانی کو چاہیے کہ وہ درمیانی پتھر کو توڑ کر اپنے لیے سیدھا راستہ بنائے۔ مگر پانی ایسا نہیں کرتا

وہ خدا کی دی ہوئی فطرت کے مطابق، دائیں اور بائیں سے راستہ نکال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔
انسان کو بھی یہی فطری کورس اختیار کرنا ہے۔ اس کو ایسا نہیں کرنا ہے کہ جب دورانِ سفر کوئی رکاوٹ آجائے تو وہ سمجھے کہ میرے لیے یا تو ٹکراؤ کی صورت ہے یا پسپائی کی صورت۔ اس کو جاننا چاہیے کہ اگر وہ غور کرے تو عین وہیں اس کے لیے تیسری صورت موجود ہوگی جس کو اختیار کرکے وہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

کسی ملک کا کوئی آدمی اگر خصوصی لیاقت والا (exceptionally qualified) ہو اور وہ امریکہ آنا چاہے تو اس کو اس کے ملک کا امریکی سفارت خانہ فوراً ویزا دے دے گا۔ ایسے شخص کے لیے یہاں آکر کام کرنے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ یہ امریکی نظام کی ایک طاقت ہے۔ اس کی وجہ سے امریکہ کو دنیا بھر کے بہترین دماغ حاصل ہو گئے ہیں۔ اس معاملہ میں یہ لوگ اتنے فراخ دل ہیں کہ بظاہر ایک دشمن ملک کا آدمی بھی اگر خصوصی لیاقت رکھتا ہے تو وہ بلا امتیاز یہاں اپنے لیے جگہ پاسکتا ہے۔ چنانچہ روس کے بہترین سائنس داں آج امریکہ میں آکر کام کر رہے ہیں۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ یہودی پہلے زمانہ میں مسلسل حکومتوں کی تعذیب کا شکار ہوئے۔ وہ کسی بھی ملک میں ترقی نہ کرسکے۔ مگر موجودہ زمانہ میں وہ ہر ملک میں، خاص طور پر امریکہ میں غیر معمولی ترقی کر رہے ہیں۔ اس کا سبب کوئی نئی سازش نہیں ہے، بلکہ زمانہ کا فرق ہے۔ پچھلے زمانہ میں بادشاہی نظام ہوتا تھا۔ عام لوگوں کو آزادی حاصل نہ تھی۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی حکمراں کے دائرہ کو محدود کردیا گیا ہے۔ آج ہر فرد اور ہر قوم کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ یہودیوں نے اس جدید امکان کو بھرپور طور پر استعمال کیا۔ اس طرح پچھلے زمانوں میں کامیاب نہ ہونے والے جدید دور میں کامیاب ہو گئے۔

میں نے کہا کہ یہودیوں کی جو صفات آج ہیں، وہی صفات ان میں پہلے بھی تھیں۔ مگر قدیم زمانہ کا سیاسی نظام انھیں موقع نہیں دیتا تھا۔ جب کہ جدید زمانہ کے سیاسی نظام نے انھیں موقع دے دیا۔

امریکہ میں انفرادی آزادی کو غیر مطلق کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی زبردستی نہیں کرسکتے۔ اگر وہ ایسا کریں تو وہ قانون کی نظر میں مجرم ہو

جائیں گے۔ بیشتر لڑکا اگر اپنے ساتھ ایک گرل فرینڈ لے کر گھر میں آ گئے۔ یا لڑکی ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ گھر میں داخل ہو تو ماں باپ اس کو روک ٹوک کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتے۔ یہ مسئلہ اب اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ والدین مجبور ہو کر اپنی بیٹی سے یہ کہنے لگے ہیں کہ تم کو بوائے فرینڈ بنانا ہے تو کسی مسلمان لڑکے کو بناؤ۔

اصل یہ ہے کہ یہاں جو مسلمان آئے وہ ہمہ تن دولت کمانے پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے پاس نہ بچوں کی تربیت کے لیے کوئی موقع رہا اور نہ دین سے وابستگی قائم رکھنے کا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ یہاں کے مسلمانوں میں بمشکل دو فی صد ایسے مسلمان ہوں گے جو مسجدوں اور اسلامی سنٹروں سے جڑے ہوں۔ گویا ۹۸ فی صد تعداد رات دن صرف دنیا میں مشغول رہتی ہے۔ یہ لوگ ابتدائی دینی ذمہ داری بھی پوری نہیں کرتے، داعیانہ زندگی اختیار کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ ایسے غرق دنیا لوگوں کا انجام وہی ہونا ہے جو امریکہ کی مسلم نسلوں کا ہو رہا ہے۔

کچھ لوگ اپنے بچوں کو لے کر یہاں سے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں جا رہے ہیں۔ مگر جو دنیا پرستانہ ذوق انھوں نے اپنے گھر میں پیدا کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ دوبارہ بھاگ کر امریکہ چلا آتا ہے۔

جناب محمد ذکی الدین شرفی کو یہاں عام طور پر "امام ذکی" کہا جاتا ہے۔ وہ نہایت مخلص اور نہایت ذہین آدمی ہیں۔ انھوں نے امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ مگر ان کی سوچ میں منفی انداز اتنا رچ بس گیا ہے کہ وہ انتہائی مثبت واقعہ میں بھی حیرت انگیز طور پر منفی پہلو دریافت کر لیتے ہیں۔ ۱۲ ستمبر کو ایک گفتگو کے بعد میں نے ان کی بابت اپنی ڈائری میں حسب ذیل الفاظ لکھے:

Maulana Zaki has a unique expertise to convert a positive into a negative. In contrast, I always try to find some positive points even from obviously most negative situation.

۱۰ ستمبر کو مولانا ذکی الدین شرفی سے پاکستان اور مسلم ممالک کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ اس تعلق سے لوگوں کو آپ سے کافی شکایت ہے۔ میں نے کہا کہ وہ ساری شکایت غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے ان کے اوپر تنقید

کی ہے۔ یہ تنقید تو خود مولانا مودودی کے تیار کردہ دستور جماعت کا ایک اہم حصہ ہے۔ اسی طرح خلافت و ملوکیت میں انھوں نے لکھا ہے کہ اسلامی سیاست کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تنقید اور اظہار اختلاف کا کھلا ماحول موجود ہوتا ہے۔ پھر اس پر شکایت کیوں۔

پھر میں نے کہا کہ تنقید کوئی برائی نہیں۔ وہ ذہنی ارتقاء اور تخلیقی فکر (Creative thinking) کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ واحد شرط جو اس سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ تنقید کا تعلق صرف دماغ سے ہونا چاہیے۔ دل کو اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، اور خدا کے فضل سے یہ بات میرے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔

میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو دوسروں پر تنقید کریں اور اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھیں۔ میں مستقل طور پر اپنے آپ کو تنقید کے لیے پیش کرتا رہتا ہوں۔ مثلاً میرا معمول ہے کہ جب میں کوئی نیا مضمون لکھتا ہوں تو اپنی لڑکی ڈاکٹر فریدہ خانم کو دیتا ہوں کہ اس پر تنقید کرو۔ اسی طرح پچھلے تقریباً آٹھ سال تک مولانا انیس لقمان ندوی مستقل طور پر میرے ساتھ تھے۔ وہ دہلی آئے تو میں نے کہا کہ حضرت عمر فاروق کہا کرتے تھے کہ رحم اللہ امرأ اھدی الی عیوبی۔ مولانا انیس لقمان ندوی سے میں نے کہا کہ آپ میرے لیے اس قول کا مصداق بنئے۔ چنانچہ وہ برابر میرے اوپر تنقید کرتے تھے اور میں نہایت شوق سے اس کو سنتا تھا۔

آج کل وہ ایک عرب ملک چلے گئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک عرب شیخ سے انھوں نے اپنے بارے میں کہا کہ: انا ناقد اکبر ناقد فی الھند (میں ہندستان کے سب سے بڑے ناقد کا ناقد ہوں)

جو لوگ تنقید سے منع کرتے ہیں وہ اپنی سادگی کی بنا پر سمجھتے ہیں کہ ان کے [illegible] تنقید اور بے تنقیدی ہے۔ حالانکہ یہ بات [illegible] ہے وہ تنقید اور ذہنی جمود ہے۔ یعنی آپ [illegible] صورت حال نہیں ہوگی بلکہ ذہنی جمود ہوگا۔

پھر میں نے کہا کہ میرے پاس اس بات کے واضح اور متعدد ثبوت موجود ہیں کہ مولانا [illegible] پر سخت تنقید کے باوجود ان کے بارے میں میرے دل کے اندر بگاڑ نہیں آیا۔

۱- ان کے اوپر میں نے صرف علمی تنقید کی۔ میں نے کبھی ان کی ذات پر حملہ نہیں کیا یا ان کی تنقیص نہیں کی۔ کبھی عیب جوئی اور الزام تراشی کی زبان استعمال نہیں کی۔ کبھی ان کو بدنام کرنے والی باتیں نہیں کہیں۔ ہمیشہ تجزیاتی تنقید کا اسلوب اختیار کیا۔

۲- میری تحریروں سے جماعت اسلامی سے وابستگی رکھنے والے افراد بہت متاثر ہوئے۔ کئی لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میری طرح وہ بھی جماعت اسلامی سے استعفا دے دیں۔ مگر میں نے ہر ایسے شخص کو ہمیشہ استعفا دینے سے منع کیا۔ حتی کہ خود میری بیوی ابھی تک جماعت اسلامی کی رکن ہیں اور فہرست ارکان میں ان کا نام چھپا ہوا موجود ہے۔ میری علاحدگی کے بعد انھوں نے چاہا کہ وہ بھی جماعت کی رکنیت سے الگ ہو جائیں۔ مگر میں نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا: جماعت اسلامی کے ارکان کی فہرست میں اپنا نام باقی رہنے دو۔ کیا معلوم کس بہانے اللہ تعالیٰ کے یہاں بخشش ہو جائے۔

۳- تنقید کے باوجود مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی قدر دانی میرے دل میں باقی رہی۔ اس کے ثبوت میں وہ دیباچہ دیکھا جا سکتا ہے جو میں نے اپنی کتاب "علم جدید کا چیلنج" کے دیباچہ کے طور پر لکھا تھا۔

۴- ۱۹۷۱ میں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملنے ہی کے لیے لاہور گیا۔ وہاں جب ذیل دار پارک میں ان سے ملاقات ہوئی تو مصافحہ کرتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو واضح طور پر قلبی تعلق کی نشانی تھے۔

۵- ہندستان سے میں یہ سوچ کر لاہور گیا تھا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مطالعہ کا جو کمرہ ہے اس میں کچھ دیر کے لیے بیٹھوں گا۔ چنانچہ اسی کمرہ میں میں نے ان سے ملاقات کی۔ اور بالکل عقیدت مندانہ انداز میں دیر تک اس کمرہ میں بیٹھا رہا۔

۱۰ ستمبر کو محمد عادل خان انجنیر (۵۹ سال) کے یہاں شام کا کھانا تھا۔ وہ ایسٹ ایمپٹن (East Ampton) میں رہتے ہیں۔ ان کے مکان پر عورتوں اور مردوں کا ایک مختصر اجتماع ہوا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ایک نشست ہوئی جس میں سادہ انداز میں کچھ تذکیری باتیں کہی گئیں۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آج کل عالم اسلام میں ایک کلمہ

بہت مقبول ہے۔ وہ یہ ہے: الاسلام دینٌ و دولۃ (اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی) یہ دوئی (dichotomy) غیر فطری اور غیر اسلامی ہے۔ اس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ دو چیزیں ایک دوسرے سے الگ الگ چیزیں ہیں —— دین اور ریاست۔ اسلام صرف دین نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ وہ ریاست بھی ہے۔ حالانکہ یہاں بیج اور درخت والا رشتہ ہے۔ جس طرح بیج بڑا ہو کر درخت بنتا ہے۔ اسی طرح ایمان پہلے قلب انسانی میں متمکن ہوتا ہے۔ اس کے بعد بتدریج ظاہر ہو کر مکمل دین بن جاتا ہے۔

ایک پاکستانی بزرگ نے کہا کہ بے نظیر بھٹو پاکستان کی سب سے زیادہ بری حکمراں ہے۔ پچھلے الیکشن میں یہودیوں نے قاضی حسین (جماعت اسلامی) اور نواز شریف (مسلم لیگ) میں الائنس ہونے نہیں دیا۔ ورنہ آج پاکستان میں اسلام پسندوں کی حکومت ہوتی۔

میں نے کہا کہ موجودہ مسلم ذہن پر ہر جگہ یہودی سازش کا نظریہ چھایا ہوا ہے۔ ساری اسلامی تاریخ یہودی سازش کا شکار نظر آتی ہے —— یہودیوں نے سازش کرکے علی اور معاویہ کو لڑوایا اور خلافت راشدہ کا خاتمہ کیا۔ یہودیوں نے تاتاریوں کو استعمال کرکے عباسی خلافت تباہ کی۔ یہ یہودیوں کی سازش ہے۔

۱۰ ستمبر کی شام کو ماونٹ ہالی کی مسجد میں محمد نبیل المصری (۱۵ سال) سے ملاقات ہوئی۔ (Tel. 908-5060640) ان کا سبجکٹ کیمسٹری ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے علاقہ کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں اور نماز پڑھاتے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کی مسجد کے امریکی پڑوسیوں کی طرف سے کیا کچھ مسائل ہیں۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں۔ مسائل تو خود مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں (المشاکل بین المسلمین و المسلمین) میں نے پوچھا کہ امریکا کے بارے میں آپ کے تجربات کیا ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ ہم تو دعا کرتے ہیں کہ خدایا، امریکہ کے ذریعہ اسلام کو طاقت دے (اللّٰھم اعز الاسلام بامریکا)

مختلف ملکوں میں اسلامی حکومت کے قیام کے نام پر جو ٹکراؤ کی تحریکیں چل رہی ہیں، ان کے بارے میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے کہا کہ صحیح بات یہ ہے کہ اپنے دلوں میں اسلامی حکومت قائم کیجئے، اس کے بعد باہر بھی آپ کی اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی

[illegible] ملة الاسلام في قلوبكم [illegible] ملة الاسلام)

۱۱ ستمبر کو ٹمپل یونی ورسٹی (فلاڈلفیا) دیکھنے دوپہر بعد ڈاکٹر عرفان احسن صاحب کے ساتھ جانا ہوا۔ ٹمپل یونی ورسٹی میں ریلیجن کے شعبہ میں طلبہ اور اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ شعبہ کے موجودہ پروفیسر اکمل ایوب ہیں۔ وہ پیدائشی نابینا ہیں۔ اسی حالت میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق لبنان سے ہے۔

ان کے آفس میں پڑھنے والی مشین دیکھی۔ میں نے کہا کہ اس کو چلا کر دکھائیے۔ انھوں نے انگریزی کی ایک کتاب کھول کر ایک مشین میں رکھی اور بٹن دبایا تو مشین بآواز بلند کتاب کا مضمون پڑھ کر مسلسل سنانے لگی۔ اس مشین کا نام پرسنل ریڈر ہے —— آخرت میں مادی اشیاء بولیں گی، یہ اس کا کیسا عجیب مظاہرہ ہے۔

ڈاکٹر خالد بلینکن شپ ایک امریکی نومسلم ہیں۔ وہ ٹمپل یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ وہ کافی سنجیدہ تھے۔ ڈاکٹر خالد بلینکن شپ سے دیر تک گفتگو ہوئی۔ پروفیسر اکمل ایوب کا خیال ہے کہ سب مذاہب برابر ہیں۔ ان میں سے ہر مذہب میں سچائی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب آپ کہتے ہیں کہ صرف اسلام ہی دی ریلیجن (The Religion) ہے تو اس وقت آپ کے پاس اعتقادی کرائٹیریَن کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کے لیے ہمارے پاس وہی تاریخی کرائٹیریَن ہے جو ساری علمی دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ اسلام کے سوا کسی اور مذہب کو تاریخی استناد (Historical credibility) حاصل نہیں۔ انھوں نے بدھا کا نام لیا۔ میں نے کہا کہ بدھا کے بارہ میں بھی معلوم نہیں کہ اس کی زبان کیا تھی۔ انھوں نے کہا کہ بدھا کی زبان پالی تھی۔ میں نے کہا کہ خود اسکالرس کے نزدیک ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوا ہے کہ بدھا نے پالی زبان میں کلام کیا۔ یہی معاملہ دوسرے لوگوں کا ہے۔ کسی کے بارہ میں تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں کہ انھوں نے اپنی زبان سے جو الفاظ کہے تھے وہ آج اپنی اصل حالت میں محفوظ ہیں۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ہر بات تاریخی ہے اور علمی طور پر ثابت شدہ ہے۔

۱۱ ستمبر کی شام کو مجھے ایک گھر میں لے جایا گیا۔ بظاہر نہایت شاندار گھر تھا۔ آس پاس کا ماحول نہایت سرسبز و شاداب اور کافی کھلا ہوا۔ گھر کی خاتون آئیں۔ انھوں نے روتے ہوئے کہا:

مولانا صاحب، ہمارے لیے ہر نماز میں دعا کیجئے، اللہ ہمارے گھر میں سکون پیدا کر دے۔ اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں کی بظاہر شاندار زندگی کے پیچھے کس قدر غیر شاندار زندگی ہے۔

ٹیمپل یونی ورسٹی سے واپس ہو کر ہم لوگ جناب عثمان رومی کے مکان پر پہنچے جو یہاں کے ایک پُر فضا مقام پر واقع ہے (Tel. 609-4242064) یہاں تعلیم یافتہ مردوں اور خواتین کا ایک اجتماع تھا۔ مغرب کی نماز یہاں مکان کے بیسمنٹ میں پڑھی گئی۔ اس کے بعد مولانا ذکی الدین صاحب نے ایک تمہیدی تقریر کی۔ پھر میں نے خطاب کیا۔

میرے خطاب کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ لوگ جو امریکہ آئے وہ تقریباً سب کے سب مادی غرض سے آئے اور مادی غرض سے آنا اسلام میں کوئی پسندیدہ بات نہیں۔ تاہم یہ آپ کے لیے کوئی برائی کی بات نہیں۔ قرآن میں ہے کہ مومن کی سیئات کو بھی حسنات میں تبدیل کر دیا جاتا ہے (الفرقان ۷۰) پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کا بظاہر غیر محمود سفر محمود سفر نہ بن جائے۔

میں نے کہا کہ امریکہ میں آکر بسنے کے معاملہ میں اب آپ یہ کریں کہ وہ نیت کر لیں جو صحابہ کرام کی نیت تھی۔ وہ بھی عرب سے نکل کر باہر کے ملکوں میں چلے گئے۔ وہاں انھوں نے تجارتیں بھی کیں۔ مگر ان کی نیت یہ تھی کہ تمام انسانوں تک اسلام کی دعوت پہنچائیں۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کے سفروں کو اتنی برکت دی کہ اسلام قدیم آباد دنیا کے بیشتر علاقوں میں پھیل گیا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ لوگ واقعۃً اس قسم کا ارادہ کر لیں تو صحابہ کی تاریخ دوبارہ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ جس طرح پہلے زمانہ میں اسلام ساری دنیا میں پھیلا تھا اسی طرح اسلام جدید نسلوں میں بھی پھیل جائے گا۔

پھر میں نے کہا کہ تاریخ کے اعادہ کا یہ پراسس بالفعل شروع ہو چکا ہے۔ آج ساری دنیا میں مسلمانوں کے انٹرایکشن کی بنا پر لوگ اسلام سے قریب آرہے ہیں۔ صرف امریکہ میں چار ملین سے زیادہ لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

۱۲ ستمبر کی صبح کو حسب معمول سوال و جواب کی صورت میں ایک گفتگو ریکارڈ کی گئی۔ مولانا ذکی الدین شرفی کانفرنس میں آنے والوں کے خیالات، اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ریکارڈ کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں میری بھی کئی تفصیلی گفتگو انھوں نے ریکارڈ کی ہے۔

اس کے بعد ساڑھے دس بجے ان کے مشورہ پر امریکہ کے دیہات دیکھنے کے لیے ہم

دونوں روانہ ہوئے۔ پہلے ہم لوگ بڑے بڑے زرعی فارموں سے گزرے جو سڑک کے دونوں طرف دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ تمام فارم نہایت منظم تھے اور ان کا کوئی ٹکڑا بیکار نہ تھا۔ کہیں کوئی تنکا بھی سڑک پر یا فٹ پاتھ پر نظر نہ آیا۔ دیہات کے علاقے قابل دید تھے۔ دور دور بنے ہوئے خوب صورت مکانات، ہر مکان کے چاروں طرف صاف ستھرا سرسبز ماحول، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دیہات نہیں ہیں بلکہ مسلسل پھیلے ہوئے سرسبز پارک ہیں جن کے درمیان کہیں کہیں سلیقہ سے مکانات کھڑے ہوئے ہیں۔ ان دیہاتوں میں کمیونی کیشن اور ٹرانسپورٹ اور سڑکوں وغیرہ کی سہولت بھی اعلیٰ درجہ میں موجود تھی۔

ایک جگہ کھلے میدان میں ایک ہی رنگ کی بہت سی بسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ اسکول کی بسیں ہیں۔ یہاں گورنمنٹ کی طرف سے ۱۲ ویں درجہ تک کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے بچوں کو لانے اور لے جانے کا مفت انتظام ہے۔ طالب علم کا گھر کہیں بھی ہو اور صرف ایک طالب علم کو لینے کے لیے بس وہاں تک جائے گی۔ اس کا اصول یہ ہے کہ گھر اور اسکول کے درمیان اگر ایک میل کا فاصلہ ہے تو طالب علم کو خود چل کر اسکول پہنچنا ہے، اور اگر ایک میل سے زیادہ ہے تو گورنمنٹ بس اس کو لانے اور لے جانے کی ذمہ دار ہے۔

مولانا ذکی صاحب نے ایک جگہ گاڑی کھڑی کی۔ یہاں ایک سفید خوب صورت عمارت تھی۔ اس کے چاروں طرف نہایت صاف ستھرا ماحول تھا۔ ہندستانی معیار کے اعتبار سے بظاہر وہ گورنمنٹ ریسٹ ہاؤس معلوم ہوتا تھا۔ مگر مولانا ذکی صاحب نے بتایا کہ یہ اس گاؤں کا پوسٹ آفس ہے۔ وہاں جاکر انھوں نے کچھ ڈاک کا کام کیا اور اس کے بعد واپس آ گئے۔

راستہ میں ایک بہت وسیع عمارت تھی۔ اس کے باہر ایک پتھر پر لکھا ہوا تھا:

Deborah Heart and Lung Centre

معلوم ہوا کہ یہ دنیا میں دل اور پھیپھڑے کے علاج کا سب سے بڑا ہسپتال ہے۔ کوئی مریض یہاں آجائے تو اس کو فوراً داخل کر کے اس کا معیاری علاج کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ فیس دینے کے قابل ہے تو فیس دیتا ہے ورنہ اس کا پورا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ مولانا ذکی صاحب نے بتایا کہ ایک پاکستانی مسلمان یہاں آکر بیمار پڑ گئے۔ ان کا پورا علاج یہاں مفت کیا گیا۔ حالانکہ

اسپتال کی فیس لاکھوں ڈالر بن رہی تھی۔ یہ اسپتال زیادہ تر عوامی عطیات سے چلایا جاتا ہے۔

۱۲ ستمبر کی شام کو حسب پروگرام مسٹر بھرت جانی آئے (Tel. 908-2831863) ان کے ساتھ چل کر ڈیٹن (Dayton) پہنچا۔ یہاں مسٹر کملیش شاہ (Tel. 908-3294006) کے مکان پر ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں تقریباً پچاس کی تعداد میں تعلیم یافتہ ہندو اکٹھا ہوئے۔

ان کے سامنے خطاب کرتے ہوئے میں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ——

اختلاف انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ انسانی سماج سے اختلاف کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ پھر مل جل کر رہنے کا ماحول کیسے بنایا جائے۔ اس کا ایک ہی راز ہے، وہ ہے اختلاف کو برداشت کرنا۔ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرنا۔ اختلاف کو قلبی نفرت نہ بننے دینا۔

تقریر کے بعد مختلف سوالات ہوئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ اسلام کی کچھ دعائیں بتائیے۔ میں نے چند دعائیں عربی میں سنائیں اور پھر ان کا ترجمہ کیا۔ ایک دعا یہ تھی: اللّٰھم اجعل فی قلبی نوراً و فی بصری نوراً۔

کملیش صاحب کے مکان کے ایک بڑے کمرہ میں یہ میٹنگ ہوئی۔ لوگوں نے کئی باتیں بتائیں۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ آج ہی میں نے ریڈیو پر ایک قصہ سنا جو کل پیش آیا ہے۔ ایک ایشیائی باپ اپنی بیمار لڑکی کو لے کر بالٹی مور جا رہا تھا۔ وہاں کے ایک اسپتال میں اس کا اپوائنٹمنٹ تھا۔ راستہ میں اس کی کار کے انجن میں کچھ پرابلم پیدا ہو گیا۔ اس نے ایک میکینک کو دکھایا۔ کار میں ایک نیا پرزہ ڈالنے کی ضرورت تھی جو فوری طور پر دستیاب نہ تھا۔ میکینک نے مشورہ دیا کہ آپ رنٹ پر کار لے کر چلے جائیں اور گاڑی یہیں چھوڑ دیں۔ مگر فوری طور پر کرایہ کی کار نہ مل سکی۔

اب سوال تھا کہ کیا کیا جائے۔ کیونکہ لڑکی بیمار تھی اور فوراً روانہ نہ ہونے کی صورت میں وہ وقت پر اسپتال پہنچ نہیں سکتا تھا جو وہاں سے چار سو میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ میکینک نے کہا کہ کوئی حرج نہیں۔ میں آپ کو اور آپ کی لڑکی کو لے کر چلتا ہوں۔ چنانچہ میکینک اپنی گاڑی پر بٹھا کر ان کو لے گیا۔ اس آمد و رفت میں میکینک کے ۱۴ گھنٹے خرچ ہوئے۔ یہ سب کچھ اس نے رضاکارانہ طور پر کیا۔ اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔

۲۴ جون [illegible] ہال کی [illegible] میں پہنچ گیا۔ [illegible] کے بعد [illegible] سے ملاقات
ہوئی۔ محمد کامل مدنی (۶۰ سال) بمبئی میں پیدا ہوئے۔ ہندستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے
بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں سے پھر امریکہ آئے اور اب یہاں ایک اچھا جاب ہے۔ [illegible] گفتگو
کے دوران انھوں نے کہا کہ انڈیا سے میں اس لیے چلا آیا کہ وہاں میں نے دیکھا کہ تعصب ہے اور
مسلمان کے لیے ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ صرف آدھی بات کہہ رہے ہیں۔ پوری بات یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں نے فرقہ پرست لیڈروں کی رہنمائی میں ہندو مسلم تفریق کا ہنگامہ برپا کیا۔ انھوں نے دونوں فرقوں کے درمیان نفرت کو بھڑکایا۔ اس کے بعد وہی ہونا تھا جو وہاں ہوا۔ اگر امریکہ میں مسلمانوں کا کوئی قائد اعظم پیدا ہو جائے۔ وہ یہاں مسلمانوں اور امریکنوں کے درمیان تفریقی تحریک چلائے اور یہاں کے مسلمان اسی طرح ان قائد اعظم صاحب کا ساتھ دیں جس طرح انھوں نے غیر منقسم ہندستان میں ساتھ دیا۔ تو آپ لوگوں کا انجام امریکہ میں اس سے بھی زیادہ برا ہوگا جو ۱۹۴۷ کے بعد ہندستان میں ہوا۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ آپ درست کہہ رہے ہیں۔

چپس کا پیکٹ کھولا گیا تو اس میں سے ایک خوب صورت چھپا ہوا کاغذ نکلا۔ اس پر لکھا ہوا تھا کہ اس کاغذ کو دکھا کر ہمارے اسٹور سے آپ فلاں فلاں چیز ایک ڈالر کم میں خرید سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہی وہ چیز ہے جس کو آپ لوگ کنزیومرزم کہتے ہیں۔ ایک انجینئر صاحب جو دسترخوان پر تھے، انھوں نے کہا کہ "کنزیومرزم" کا لفظ آپ نے کس طرح جانا۔ ایک صاحب نے جواب دیا—آپ امریکہ میں رہتے ہیں، وہ امریکہ کے بارہ میں پڑھتے ہیں۔

نیویارک میں جیوے پاکستان (Tel. 718-793-1915) کے نام سے ایک ٹی وی ادارہ ہے۔ اس نے ۲۶ اگست ۱۹۹۶ کی شام کو ایک تفصیلی انٹرویو اپنے اسٹوڈیو میں ریکارڈ کیا۔

پہلے ۱۰ امنٹ تک میں نے اسلامی مرکز کی تاریخ اور اس کی سرگرمیوں کے بارہ میں بتایا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہندستانی مسلمانوں میں ایک عمومی بے حوصلگی آگئی تھی۔ عام ذہن یہ بن گیا تھا کہ اس ملک میں ہمارے لیے مواقع نہیں۔ یہاں صرف تعصب اور تشدد ہمارا مقدر بن چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ہندستان کے مسلم رہنما صرف شکایت اور احتجاج کے انداز

لکھنے اور پڑھنے میں مشغول تھے۔ ہم نے قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بتانا شروع کیا کہ ان کے لیے ہر قسم کے مواقع موجود ہیں۔ آج خدا کے فضل سے ہندستانی مسلمانوں میں نیا حوصلہ جاگ اٹھا ہے۔ اب وہ وہاں عزم و ہمت کے ساتھ زندگی کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

اس کے بعد ۲۰ منٹ تک ایمان، عبادت، اسلامی اخلاق، صبر و اعراض اور دعوت کے موضوع پر کلام کیا۔ انٹرویو کے آخر میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے لئے آپ کا پیغام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا پیغام یہ ہے کہ وہ یہاں قرآن کے الفاظ میں نفع بخش بن کر رہیں۔ وہ یہاں بوجھ (liability) نہ بنیں بلکہ وہ یہاں کے لیے سرمایہ (asset) بن جائیں۔ وہ صرف لینے والے بن کر نہ رہیں بلکہ دینے والے بن کر رہنے کی کوشش کریں۔

ایک پاکستانی مسلمان نے افسوس کے انداز میں کہا کہ "قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ ہم سب پاکستانی ہیں، اور ہمیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر کرنا چاہیے۔ مگر پاکستان کی نئی نسل اس سبق کو بھولتی جا رہی ہے۔ اس کو نہ پاکستانی ہونے پر فخر ہے اور نہ اسلام پر فخر"

میں نے کہا کہ آپ صرف نئی نسل کو کیوں کہہ رہے ہیں۔ آپ جیسے لاکھوں لوگ پاکستان کو چھوڑ کر امریکہ میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ کیا وہ خود بھی اس کا مصداق نہیں ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو سچ مچ پاکستان اور اسلام پر فخر ہوتا تو آپ ہرگز پاکستان اور اسلامی جمہوریہ کو چھوڑ کر یہاں نہ آتے۔ پھر میں نے کہا کہ فخر کی بات بذات خود ہی غلط ہے۔ اسلام ہمارا فخر نہیں ہے۔ اسلام ہماری ذمہ داری ہے۔

امریکہ میں مقیم پاکستانی ہر سال یہاں پاکستانی میلہ مناتے ہیں۔ ۸ اگست ۱۹۹۴ کو نیویارک میں جو میلہ منایا گیا اس موقع پر ایک سوینیر چھاپا گیا تھا، اس کو میں نے دیکھا۔ اس میں ایک مضمون تھا قیام پاکستان: اسلامیان ہند کے طویل سفر کی منزل۔ اس مضمون کا خاتمہ ان سطروں پر ہوا تھا:

"قائد اعظم محمد علی جناح (پاکستان کی مانگ پر) کوہ ہمالیہ کی مانند ڈٹے رہے، اور اپنا مطالبہ پورا کرایا۔ اس موقع پر مسز وجے لکشمی پنڈت نے کہا کہ اگر مسلم لیگ میں ایک سو گاندھی، ایک سو ابوالکلام آزاد اور ایک سو پنڈت جواہر لال نہرو ہوتے اور کانگریس میں صرف محمد علی جناح ہوتے

تو ملک بھی تقسیم ہو جاتا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کا اعلان ہوا۔ اور یوں دنیا کے نقشہ پر ایک اسلامی مملکت ابھری۔ اور وہ سلطنت جس کا چراغ ۱۸۵۷ء میں گل ہو جاتا پھر اس کا دیا روشن ہوا اور مسلمان ایک اسلامی سلطنت کے وارث بنے۔ آج پاکستان مسلمانوں کے لیے ایک قلعہ ہے۔ وہ دنیائے اسلام کا اہم ترین ملک ہے۔"

میں نے ایک پاکستانی مسلمان سے کہا کہ جب سو سال پہلے بھی زیادہ لمبی مدت کے بعد اسلام کا قلعہ اور اہم ترین اسلامی ملک وجود میں آگیا تو وہاں کے تمام بہترین افراد ملینوں کی تعداد میں پاکستان سے نکل کر یورپ اور امریکہ کیوں چلے آئے۔ پھر تو آپ لوگوں کو خوشی اور اطمینان کے ساتھ وہاں رہنا چاہیے تھا۔ مگر اس سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں نے کہا کہ پھر تو خود اپنے عمل سے آپ اس کی تردید کر رہے ہیں۔ آپ خود بتا رہے ہیں کہ یہ الفاظ محض ایک شاعری ہے، حقیقت واقعہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

امریکی اخباروں میں ہندستان کی خبریں بہت کم ہوتی ہیں۔ میرے طویل مدت قیام میں صرف ایک بار تفصیلی خبر تھی۔ یہ امرناتھ یاترا کے بارہ میں تھی جس میں شدید طوفان کے نتیجہ میں تقریباً ڈھائی سو آدمی مر گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ دی نیویارک ٹائمس (۲۷ اگست ۱۹۹۶) میں صفحہ اول پر سری نگر کی ڈیٹ لائن کے ساتھ جان ایف برنس (John F. Burns) کی رپورٹ چھپی تھی۔ مذکورہ رپورٹر ۳۴ سالہ پھل فروش جگدیش کیلا سے اسپتال میں ملا جو خود بھی اس حادثہ کا شکار ہوا تھا۔ رپورٹ کے مطابق، کیلا نے حادثہ کی ہولناک تفصیلات بتائیں۔ اس نے اس کو نرک کی یاترا قرار دیا:

...what he called his pilgrimage to hell.

جگدیش کیلا نے بتایا کہ جب طوفان آیا تو وہاں مکمل بے بسی کا عالم تھا۔ ہر شخص دہشت کی حالت میں تھا۔ لوگ برف میں پھنسے ہوئے مدد کے لیے چلّا رہے تھے۔ ہر ایک کہہ رہا تھا کہ بھگوان کے لیے مجھے بچاؤ:

For God's sake, save us.

امرناتھ میں شیو دیوتا کا مندر ہے۔ وہاں لوگ شیو کی پوجا کے لیے جاتے ہیں۔ مگر

عجیب بات ہے کہ یہ پجاری جب برف وباد کے طوفان میں پھنس گئے تو اس وقت ان میں سے کوئی شیو کو پکارنے والا نہ تھا۔ ہر ایک صرف بھگوان (خدا) کو پکار رہا تھا —— فطرت صرف ایک خدا کو جانتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنگین حالات میں جب ذہن کی مصنوعی تہیں ہٹتی ہیں اور صرف فطرت باقی رہ جاتی ہے، اس وقت ہر آدمی ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ کیونکہ اصل فطرت کی سطح پر وہ ایک خدا کے سوا کسی اور کو جانتا ہی نہیں۔

ایک امریکی نوجوان نے ہائے (Hi) کہا۔ اس کے بعد ایک لفظ کہا جو مجھ کو وَسّپ سنائی دیا۔ یہ دوسرا لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ دراصل (What is up) کا مخفف ہے۔ یعنی کیا حال ہے۔ کیسا چل رہا ہے۔ اس قسم کے مخففات اردو میں بہت کم ہوتے ہیں۔ مگر دوسری زبانوں میں وہ بہت زیادہ ہیں۔ اردو کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ اس میں بول چال کی زبان بھی تقریباً وہی ہے جو کتاب کی زبان ہے۔ مگر دوسری زبانوں میں ایسا بہت کم ہے۔

عربی زبان میں یہ حال ہے کہ علماء اور شیوخ تک روزمرہ کی گفتگو میں عامی زبان بولتے ہیں جو کم از کم آواز کے اعتبار سے کتابی زبان سے بہت زیادہ مختلف ہوتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اکثر مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک صاحب جو نیویارک میں عربوں کے ایک اسکول میں پڑھاتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ عربوں کے بچے عربی زبان سے نابلد ہوتے جا رہے ہیں اب ان کی زبان عملاً انگریزی بن گئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ عرب والدین اپنے بچوں کو عربی سکھانے کے لیے ٹیوٹر رکھتے ہیں، مگر بچے اس سے بھاگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیوٹر ان کو کتابی زبان پڑھاتا ہے۔ یہ بچے اپنے ماں باپ کو عامی زبان بولتے ہوئے سنتے ہیں۔ اس لیے یہ کتابی زبان ان کو ایک نئی زبان معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس کی طرف راغب نہیں ہوتے۔

مگر اردو میں یہ مسئلہ نہیں۔ کیوں کہ اردو زبان بولنے والا عین وہی زبان بولتا ہے جو کتابوں میں لکھی جاتی ہے۔ اس لیے ایک آدمی جو اردو زبان سمجھتا ہو اس کے لیے اردو سیکھنا عملاً صرف اس کی کتابت سیکھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ کیوں کہ اصل زبان کو تو وہ پہلے ہی سے جان رہا ہوتا ہے۔ جب کہ عربی میں ایسا نہیں ہے۔

امریکہ کا مشہور انگریزی روزنامہ نیویارک ٹائمس [illegible] اس کے

[illegible] اصل پر یہ الفاظ لکھا ہوا رہتا ہے ـــــ تمام خبریں جو چھاپنے کے قابل ہیں:

All the news that's fit to print.

اس کو پڑھ کر میں نے کہا کہ زیادہ درست بات یہ ہے کہ اس کے بجائے یہ لکھا جائے ـــ تمام خبریں جو ہماری پیپر انڈسٹری کے لیے موزوں ہیں :

All the news that's fit to our industry.

جناب ابراہیم صاحب کا دل کا آپریشن ہوا ہے۔ انھوں نے قمیص اٹھا کر دکھایا تو سینہ کے بیچ میں سیدھا لمبا نشان تھا۔ اصل یہ ہے کہ دل کے آپریشن میں سامنے کی ہڈیاں درمیان سے کاٹ دیتے ہیں تاکہ ڈاکٹر کا ہاتھ آدمی کے دل تک پہنچ سکے۔ آپریشن مکمل کرنے کے بعد ہڈیوں کے دونوں سرے ملا کر ٹانکا لگا دیتے ہیں۔ اس کے بعد فطری طور پر آسٹیو بلاسٹ (Osteoblast) کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی ہڈیوں کے کٹے ہوئے سروں پر بون سل (bone cells) تیزی کے ساتھ بننے لگتے ہیں اور وہ بہت کم مدت میں ہڈیوں کو دوبارہ جوڑ دیتے ہیں۔ یہ سارا عمل اپنے آپ فطری نظام کے تحت انجام پاتا ہے۔

ایک مجلس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ہمارے مفکرین نے مسلمانوں کے اندر یہ شعور جگایا کہ تم خدا کی طرف سے قیادت کے لیے مقرر کیے گئے ہو۔ تم ساری دنیا کے اوپر قائد ہو۔ یہ بات اسلام اور عقل دونوں کے اعتبار سے بے اصل تھی۔ اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں من تواضع رفعہ اللہ کا اصول ہے۔ یعنی بندہ تواضع کا ثبوت دیتا ہے۔ اس کے بعد خدا کی طرف سے اس کے لیے قیادت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

اسلام کا پورا نظام اسی اصول پر قائم ہے۔ سب سے پہلے اہل ایمان کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم خدا کے بندے ہو اور تم کو بندہ والی صفت کے ساتھ دنیا میں رہنا ہے (الذین یمشون علی الارض ھونا) پھر عورتوں کو گھر کے اندر یہ سبق دیا جاتا ہے کہ تم کو مرد کی قوامیت کے تحت اپنی زندگی گزارنا ہے۔ اسی طرح مردوں کو ہر رات اور دن کے درمیان پانچ بار اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ ان کا صرف ایک امام ہو اور تمام لوگ مستقل طور پر اس کے مقتدی بن جائیں۔

اس طرح اسلام تمام مردوں اور عورتوں کے اندر اس احساس کی پرورش کرتا ہے

خواہ کسی کے ماتحت ہو۔ اسلامی معاشرہ وہ ہے جس کے اندر تمام افراد احساس ماتحتی میں زندگی گزار رہے ہوں۔

کسی ملک میں ایک بلین آدمی ہوں تب بھی ان کا سردار ایک ہی ہوگا۔ ایک کم ایک بلین آدمی جب ماتحتی پر راضی ہوتے ہیں تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ ان کے اندر کوئی متحدہ نظام قائم کیا جائے۔ اس لیے کسی قوم میں امامت و قیادت کا شعور جگانا گویا قوم کے افراد کو الٹی خوراک دینا ہے۔ عملاً تو صرف ایک کو چھوڑ کر پوری کی پوری قوم کو ماتحتی اختیار کرنا ہوتا ہے اور آپ تمام کے تمام لوگوں کے اندر سرداری کا احساس ابھار دیتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف آپس میں لڑیں گے، وہ کبھی کوئی متحدہ نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

امریکہ میں مجھے ایک مسلمان انجینیر کے یہاں لے جایا گیا۔ ہم پہنچے تو بنگلہ نما ایک شاندار مکان کے سامنے دو بڑی آٹومیٹک گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ سب بینک سے سودی قرض لے کر حاصل کیا گیا ہے۔ یہ کسی ایک شخص کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا فتنہ ہے جس میں ۹۹ فی صد سے زیادہ لوگ مبتلا ہیں۔ اس فتنہ کے پیچھے جو کشش ہے وہ اتنی طاقت ور ہے کہ اس سے غیر متاثر رہنا صرف ولی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

پہلے ایسا ہوتا تھا کہ آدمی زندگی بھر محنت کر کے کماتا تھا اور پیسہ جمع کرتا رہتا تھا۔ پھر آخر عمر میں اس کے لیے ممکن ہوتا تھا کہ وہ جمع شدہ رقم کو استعمال کر کے اپنے لیے ایک پسندیدہ گھر بنا سکے۔ مگر یہ پسندیدہ مکان عملاً اس وقت ملتا تھا جب کہ اس کی زندگی کا آخر وقت آجاتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جدید نظام یہ موقع دیتا ہے کہ زندگی میں داخل ہوتے ہی اول دن تم اپنے لیے ایک پُررونق مکان حاصل کر لو اور اس کے اندر پوری عمر شاندار زندگی گزارو۔ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ تم بینک سے سودی قرض لے لو اور پھر بعد کو اپنی کمائی سے قسط وار صورت میں اس کو ادا کرتے رہو۔

فانی بدایونی کے زمانہ میں دنیا کی کشش کے اسباب آج کے مقابلہ میں بہت کم تھے۔ اس کے باوجود انھیں کہنا پڑا:

فریب جلوہ اور کتنا مکمل اے معاذ اللہ　　بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھا پایا

سوال

آپ کی کتاب فکر اسلامی پڑھی بظاہر اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک حریت پسند آدمی ہیں۔ کیا یہ لفظ آپ کے لئے بولنا درست ہوگا (ابرار احمد، سورت)

جواب

حریت پسند کا لفظ میرے لئے درست نہیں۔ اگر آپ میری تمام کتابیں پڑھیں تو آپ کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا پورا فکر قرآن و حدیث اور علماء حق کے مطالعہ سے ماخوذ ہے۔ میں مکمل طور پر "تقلیدی اسلام" کا حامی ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں قدیم بات کو جدید اسلوب میں بیان کرتا ہوں۔ یہ وہی چیز ہے جس کو مرحوم قاری محمد طیب صاحب ان الفاظ میں بیان کیا کرتے تھے...... مسائل قدیم ہوں، دلائل جدید ہوں۔

سوال

قربانی (ذبیحہ) جذبۂ رحم کے منافی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جانوروں کے تڑپنے کے بعد جو گوشت ہمیں کھانے کو ملتا ہے اس کی تڑپ اگر ذہن میں رکھئے تو کھانے کا جی نہیں چاہتا۔ جب کہ یہ گوشت کھانا اسلام میں جائز ہے۔ (شکیل احمد، وردہ، چندرپور)

جواب

یہ مسئلہ صرف قربانی کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود قانون فطرت کا ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق، آپ خواہ کچھ بھی کریں۔ ہوا میں سانس لیں، پانی پئیں، سبزی کھائیں، دودھ پئیں ۔ہر حال میں آپ جانوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ قربانی میں ایک جانور کو ہلاک کیا جاتا ہے اور عام حالات میں بیکٹیریا کو۔ اور زندہ جسم ہونے کے اعتبار سے جانور اور بیکٹیریا میں کوئی فرق نہیں۔

زندہ رہنے کے لئے ہمیں خوراک کی ضرورت ہے۔ اور فطرت نے زندہ اشیاء ہی کو ہماری خوراک بنایا ہے۔ غیر زندہ اشیاء (مردہ حیوان یا پتھر وغیرہ) کو ہم اپنی خوراک نہیں بنا سکتے ۔ ایسی حالت میں اصل سوال قربانی کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ آدمی زندہ رہے یا خودکشی کر کے اپنے آپ کو ختم کر لے۔ کسی کو یہ حق تو ہے کہ وہ کھانا پانی چھوڑ کر اپنے آپ کو ہلاک کر لے۔ مگر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ قربانی نہ کرو۔ کیوں کہ قربانی تو ہر آدمی عملاً کر رہا ہے۔ ہر آدمی ہر لمحہ ہزاروں جانوں کو مار کر انہیں اپنی خوراک بناتا ہے اس کے بعد ہی وہ اس دنیا میں زندہ حالت میں باقی رہتا ہے۔ قربانی اس دنیا میں زندگی کا ایک عام قانون ہے، وہ مخصوص طور پر جانور کے ذبیحہ سے متعلق مسئلہ نہیں۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ چیزوں سے نہیں ہوتا، خدا سے ہوتا ہے۔ خدا سے ہونے کا یقین اور اسباب سے کچھ نہ ہونے کا یقین یہ کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے، اس کے بارے میں بتائیں۔ (شکیل احمد، چندرپور)

جواب

اس مسئلہ کا جواب حدیث (الترمذی، کتاب القیامہ) میں موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ایک مسلمان نے کہا کہ اے خدا کے رسول میں اپنے اونٹ کو باندھوں اور پھر توکل کروں یا اس کو چھوڑ دوں اور پھر توکل کروں ۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنے اونٹ کو باندھو پھر توکل کرو (یا رسول اللہ اعقلھا واتوکل او اطلقھا واتوکل قال اعقلھا وتوکل)

اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز برائے امتحان ہے یہی معاملہ توکل کا ہے۔ اس دنیا کا نظام بظاہر اسباب و علل پر قائم ہے۔ یہاں کے حالات کا تقاضا ہے کہ آدمی پوری طرح اسباب

کی رعایت کرتے ہوئے اپنا عمل کرے۔ اس کے باوجود اس کو خدا ہی پر بھروسہ کرنا ہے۔ پھر بھی اس کی کیفیت یہ ہونی چاہیئے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ مومن وہ ہے جو ظاہری اعتبار سے ہر قسم کے اسباب فراہم کرے، مگر داخلی طور پر اس کا یقین یہ ہو کہ جو کچھ ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا۔ خدا کے حکم کے بغیر یہاں نہ کسی کو کچھ ملنے والا ہے اور نہ کسی سے کچھ چھینا جانے والا۔

سوال

کہا جاتا ہے کہ زکاۃ اور صدقات میں برکت ہے اور سود میں برکت نہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ براہ کرم تشریح فرمائیں۔ (مشتاق احمد، دہلی)

جواب

یہاں برکت کا لفظ کسی پر اسرار معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ معلوم اقتصادی معنی میں ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ زکاۃ یا صدقہ دوسروں کو دینے کا عمل ہے۔ اس کے برعکس سود دوسروں سے لینے کا عمل۔ کسی سماج میں جب ایسا ہو کہ لوگ اپنی کمائی کا ایک حصہ دوسروں کو دینے لگیں تو وہاں عمومی خوش حالی پیدا ہوگی۔ کمایا ہوا مال صرف کمانے والے کے پاس نہیں رہے گا بلکہ توسیع پاکر وہ دوسرں تک بھی پہنچتا رہے گا۔ اس کے مقابلہ میں سودی نظام میں یہ ہوگا کہ کچھ لوگ قرضوں کے ذریعہ دوسروں کے مال کا ایک حصہ اپنے لئے حاصل کرتے رہیں گے۔ سماج کی دولت پورے سماج میں گردش نہیں کرے گی بلکہ وہ کچھ افراد کے پاس سمٹ کر رہ جائے گی۔ یہی مطلب ہے بے برکتی کا۔ زکاۃ اور صدقہ کا طریقہ خوش حالی کو عمومی بناتا ہے۔ اور سود کا طریقہ خوش حالی کو کچھ لوگوں تک محدود کردیتا ہے۔

سوال

آپ غیر مسلموں کے اجتماعات میں جاتے ہیں۔ دعوتی اعتبار سے یہ ایک اچھی بات ہے۔ مگر جہاں تک معلوم ہوا ہے، آپ وہاں اسلامی عقائد کو پیش نہیں کرتے۔ بلکہ اسلام کے اخلاقی تعلیمات اور معاملات کو پیش کرتے ہیں۔ دعوت کا یہ طریقہ درست نہیں۔ آپ کو چاہئے کہ سنت نبوی کے مطابق اسلامی عقائد کو ان کے سامنے پیش کریں (زکی نور عظیم ندوی، لکھنؤ)

جواب

آپ کی یہ اطلاع درست نہیں، دعوت کوئی ایک ریکارڈ بجانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مخاطب کی نفسیات اور موقع و محل کی رعایت سے کوئی بات پیش کرنے کا نام ہے۔ اور میں خدا کے فضل سے یہی کرتا ہوں۔ مثلاً غیر مسلموں کے ایسے کئی اجتماعات ہیں جن میں میں نے ویدانت کی فلاسفی (ادویت واد) کے مقابلہ میں اسلام کے تصور توحید کو پیش کیا۔ بعض اجتماعات میں جہاں ایسے لوگ اکٹھا تھے جو اسلام کو تشدد پسند مذہب سمجھتے تھے، ان کے سامنے اسلام کو رحمت کلچر کے طور پر پیش کیا۔ اسی طرح بعض اور اجتماعات میں جہاں ایسے مخاطبین تھے جو اسلام کی تاریخ کے بارے میں شک و شبہ میں تھے، وہاں اسلامی تاریخ کی صحیح تصویر پیش کی۔ بعض اور مواقع پر جہاں محسوس ہوا کہ لوگ اسلام کے نام سے متوحش ہوتے ہیں وہاں یہ توحش دور کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اسلام کا مطالعہ کرنے لگیں۔ بعض مواقع پر جہاں لوگ مسلمانوں کے بعض اعمال کو دیکھ کر اسلام کے بارے میں بدگمان ہو رہے تھے۔ وہاں بتایا کہ اسلام کو سمجھنے کا ماخذ قرآن و سنت ہے نہ کہ مسلمانوں کی روش۔ یہی طریقہ سنت نبوی سے ماخوذ ہے۔ اسی کو ایک صحابی نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: کلم الناس علی قدر عقولہم۔

تذکیر القرآن

نئی طباعت
ایک جلد میں مکمل

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

نصف رعایت

ہدیہ : 400 روپے

1600 صفحات، باریک کاغذ پر ایک جلد میں مکمل۔

مساجد اور لائبریری وغیرہ میں تقسیم کرنے کے لئے 5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر

نصف رعایت کے ساتھ صرف 200 روپے میں دستیاب ہے

5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر ڈاک خرچ بھی ادارہ کے ذمہ ہوگا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

دسمبر ۱۸۹۸، شمارہ ۲۶۵

فہرست	صفحہ

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near pvs Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of
The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Alina Printing Press, Delhi.

توحید، عدل

اسلام کی تعلیمات دو بنیادی اصولوں پر قائم ہے ــــ توحید اور عدل۔ توحید کا مطلب ہے خدا کو ایک مان کر اپنے آپ کو ہمہ تن اس کے حوالے کر دینا اور عدل کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان معاملات کرتے ہوئے ترازو کی طرح ٹھیک ٹھیک حق کے موافق رویہ اختیار کیا جائے۔ توحید حقیقۃً یہ ہے کہ ایک انسان خدا کو اس طرح دریافت کرے کہ وہ اس کے قلب و روح میں سما جائے۔ خدا اس کی آنکھ کا نور ہو جس سے وہ دیکھے۔ وہ اس کا دماغ ہو جس سے وہ سوچے۔ وہ اس کا مقصود اعلیٰ ہو جو اس کی زندگی کا مرکز و محور بن جائے۔

عدل کے عنوان کے تحت انسان کی جو ذمہ داری ہے اس کی دو صورتیں قرآن سے معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر فرد اپنے ذاتی معاملات میں عادل بن جائے۔ اس کا سلوک دوسروں کے ساتھ بالکل ترازو کی مانند ہو جو ہمیشہ ٹھیک ٹھیک تولتا ہے، نہ کم اور نہ زیادہ (اقیموا الوزن بالقسط ولاتخسروا المیزان)

عدل کی دوسری صورت وہ ہے جو صاحب اختیار افراد کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد سے فرمایا کہ اے داؤد، ہم نے تم کو زمین پر با اقتدار بنایا ہے۔ پس تم لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کرو (ص ۲۶)

قرآن کے مطابق، ہر آدمی اپنے حاصل شدہ دائرہ کے اعتبار سے مکلف ہے۔ ایک آدمی کا اختیاری دائرہ محدود ہو تو اس کو اپنے اس محدود دائرہ کے اعتبار سے عادلانہ اصول پر قائم رہنا چاہیے۔ اس کے مقابلہ میں جس آدمی کا اختیاری دائرہ حکومت واقتدار تک پہنچ جائے اس پر لازم ہوگا کہ وہ اپنے اس توسیعی دائرہ میں اپنے آپ کو عادل اور منصف ثابت کرے۔

پانچ ارکان

حدیث میں آیا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ عقیدہ توحید، اقامت صلاۃ، روزہ، زکوۃ، حج۔ یہ پانچ ارکان صرف مذہبی ارکان نہیں ہیں۔ وہ دین اور دنیا دونوں قسم کی ترقی کی ضمانت ہیں۔ توحید کا عقیدہ ایک اعتبار سے خدا کے ساتھ انسان کے سچے تعلق کا اظہار ہے اور دوسرے اعتبار سے زندگی کی جدوجہد میں اعتماد ویقین کی مستحکم بنیاد عطا کرتا ہے۔ اور یقین واعتماد بلاشبہ موجودہ دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

نماز ایک اعتبار سے خدا کی عبادت ہے۔ اس کے ذریعہ بندہ رات دن کے لمحات میں خدا سے ربط قائم کرتا ہے۔ دوسرے اعتبار سے وہ منظم زندگی (disciplined life) کی تربیت ہے اور ڈسپلن بلاشبہ موجودہ دنیا میں کامیابی کی لازمی شرط ہے۔ روزہ ایک اعتبار سے مومن کی سالانہ عبادت ہے۔ دوسرے اعتبار سے وہ صبر وبرداشت کی تربیت ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ صبر وبرداشت کے بغیر موجودہ دنیا میں کوئی بڑا کام کرنا ممکن نہیں۔

زکوۃ ایک اعتبار سے بندۂ مومن کی مالی عبادت ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی چیز پر خدا کا شکرانہ ہے۔ دوسرے اعتبار سے وہ اجتماعی زندگی کو نفع بخشی کے اصول پر قائم کرنے کی ایک تدبیر ہے۔ زکوۃ اس بات کا سبق ہے کہ لوگ صرف لینے والے نہ بنیں بلکہ دینے والے بھی بنیں۔ اور یہی وہ مزاج ہے جو کسی سماج کو بہتر سماج بنانے والا ہے۔

حج ایک اعتبار سے گویا جامع عبادت ہے۔ اس میں عبادت کی نوعیت کے تمام تجربات اکٹھا کر دیے گئے ہیں۔ دوسرے اعتبار سے حج عالمی سیاحت کا تجربہ ہے۔ وہ آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ پھیلی ہوئی دنیا کو چل پھر کر دیکھے اور اس سے نصیحت حاصل کرے۔ وہ مقامی شخصیت سے اٹھ کر عالمی شخصیت بن جائے۔

مقبول دعا

دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ سچی دعا ہو۔ کوئی بندہ اگر حقیقی معنوں میں سچی دعا کرے تو دعا اور قبولیت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوگا۔ خدا کو غیرت آتی ہے کہ بندہ خدا سے مانگے اور وہ اس کی مانگ کو پورا نہ کرے۔ مگر ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ مانگنے والے نے صحیح معنی میں مانگنے کا حق ادا کیا ہو۔

دعا الفاظ کی تکرار کا نام نہیں۔ دعا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کچھ الفاظ اپنے اندر طلسماتی اثر رکھتے ہیں۔ اور اگر آدمی ان الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ اپنی زبان سے دہرا دے تو اس کے بعد اپنے آپ اس کی دعا "مناجات مقبول" کے ہم معنی بن جائے گی۔

دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے احساس کا اظہار ہے نہ کہ الفاظ کا اظہار۔ بندہ کے دل میں امنڈتی ہوئی کیفیات جب بیتاب ہو کر زبان سے نکل پڑتی ہیں تو اسی کا نام دعا ہوتا ہے۔ حقیقی دعا وہ ہے جس میں آدمی کی پوری شخصیت شامل ہو جائے۔ جو آدمی کے پورے وجود کی نمائندہ بن گئی ہو۔

دعا کی قبولیت کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کو دعا کے مطابق ڈھال لے۔ مثلاً ایک شخص شراب پیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی صحت خراب ہو گئی ہے۔ اب اگر وہ شخص خدا سے صحت کی دعا کرے تو اس کے ساتھ اس کو شراب نوشی کو ترک کرنے کا عہد بھی کرنا ہوگا۔ اسے اپنی دعا میں یہ کہنا ہوگا کہ خدایا، تو مجھے تندرست کر دے اور اس کے شکرانے میں میں آج ہی سے شراب نوشی کو چھوڑنے کا عہد کرتا ہوں۔ دعا کے ساتھ اس قسم کا عہد گویا اس کی قبولیت کی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت ادا کر دے اس کے لئے دعا کی قبولیت بالکل یقینی ہو جاتی ہے۔

منافقانہ خوبی

قرآن میں منافقین کاذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: اور جب تم انھیں دیکھو تو ان کے جسم تم کو اچھے لگتے ہیں۔ اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو تم ان کی بات کو سنتے ہو (واذا رایتھم تعجبك احسامھم وان یقولوا تسمع لقولھم) المنٰفقون ٤

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ امانت (honesty) لوگوں کے دلوں سے اٹھ جائے گی۔ اس زمانہ میں بظاہر لوگوں کے اندر حسین اخلاق موجود ہو گا مگر وہ منافقانہ ہو گا نہ کہ مخلصانہ۔ یہاں تک کہ ایک شخص کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ کتنا زیادہ عاقل ہے اور وہ کتنا زیادہ ظرف والا ہے اور وہ کتنا زیادہ صبر واستقلال والا ہے۔ حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہ ہو گا۔ (ویقال للرحل ما اعقله وما اظرفه وما احلده ومافی قلبه مثقال حبة خردل من ایمان) فتح الباری ١١/٣٤١

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کردار کی دو قسمیں ہیں ---- مخلصانہ اور منافقانہ۔ جو اخلاقی خوبیاں ایک مخلص انسان کے اندر ہوتی ہیں بظاہر وہی غیر مخلص انسان کے اندر بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر اللہ تعالی کو صرف مخلصانہ کردار مطلوب ہے، غیر مخلصانہ کردار کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔ مخلصانہ کردار خوف خدا کے تحت پیدا ہوتا ہے اور منافقانہ کردار خوف انسان کے تحت۔ مخلصانہ کردار کا محرک آخرت کا معاملہ ہے اور منافقانہ کردار کا محرک دنیا کا معاملہ۔ مخلصانہ کردار خدا پرستانہ جذبہ کے تحت ابھرتا ہے اور منافقانہ کردار صرف تاجرانہ جذبہ کے تحت۔

دو برائی

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک شرک ایک نا قابل معافی جرم ہے [illegible] اسی طرح حدیث میں ہے کہ وہ آدمی جنت میں نہیں جائے گا جس کے اندر ذرہ برابر بھی کبر ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دو برائیاں سب سے زیادہ بڑی برائیاں ہیں۔ شرک اور کبر (گھمنڈ) شرک خدا کی نسبت سے اور کبر بندوں کی نسبت سے۔ خدا کی نسبت سے انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا اور کسی کو اپنا بڑا سمجھے اور اس کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے۔ انسان کے اندر جو عقیدت و محبت کے اعلی جذبات ہیں ان کا واحد مرکز صرف ایک خدا ہے۔ ان جذبات کا مرکز خدا کو بنانا توحید ہے اور اس اعتبار سے کسی اور کو اپنے دل میں جگہ دینا شرک ہے۔

کبر (گھمنڈ) کا تعلق انسان سے ہے۔ انسان کے مقابلہ میں جو اخلاق مطلوب ہے وہ تواضع ہے۔ تواضع کی روش مطلوب انسانی روش ہے اور کبر کی روش غیر مطلوب انسانی روش۔ اللہ تعالی نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق رکھا ہے۔ کسی کو کوئی چیز کم ملی ہے اور کوئی چیز زیادہ۔ یہی فرق لوگوں کے اندر برتری کی نفسیات پیدا کر دیتا ہے۔ زیادہ والا کم والے کے مقابلہ میں گھمنڈ کرنے لگتا ہے۔ یہ اللہ کے نزدیک ایک بدترین جرم ہے۔

دنیا میں فرق کا یہ نظام دراصل امتحان کی بنا پر ہے۔ اب یہ چاہیے کہ جسکو کم ملے وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو۔ وہ یہ ثابت کرے کہ دنیا کی کمی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ آخرت میں وہ کمی کا شکار نہ ہو جائے۔ اس طرح جس کو زیادہ حصہ ملا ہے" بھی اس لئے کہ وہ اس عطیہ پر شکر کا ثبوت دے۔ وہ بظاہر برتر ہونے کے باوجود متواضع بن کر رہے۔ وہ اپنی فوقیت سے انسان کو فائدہ پہنچائے نہ کہ اس کی بنیاد پر اپنے کو دوسروں سے اونچا سمجھنے لگے۔

ڈبل معیار

قرآن کی سورہ نمبر ۸۳ میں بتایا گیا ہے کہ ـــــ خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں۔ اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں، ایک بڑے دن کے لئے جس دن تمام لوگ خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے (التطفیف ا۔۶)

ان آیتوں میں اس اخلاقی برائی کا ذکر ہے جس کو ڈبل معیار کہا جا سکتا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو ایک معیار سے جانچنا اور دوسرے کو اس سے مختلف معیار سے جانچنا۔ جس آدمی کے اندر یہ دوہرا معیار پایا جائے اس کے لئے اس آیت میں نہایت برے انجام کی خبر دی گئی ہے۔

ایسے مزاج کے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کے اندر ایک برائی کو دیکھتے ہیں تو اس کو شرعی یا اخلاقی معیار سے ناپ کر کہتے ہیں کہ دیکھو، یہ شخص کیسا برا ہے کہ ایسا اور ایسا فعل کر رہا ہے۔ مگر جب نشاندہی کی جائے کہ تم خود عین اسی فعل میں مبتلا ہو تو وہ جانچ کے معیار کو بدل دے۔ اب وہ کہے کہ یہ تو دنیا کا رواج ہے، ایسا تو سبھی لوگ کرتے ہیں۔

دوسرے شخص یا دوسری قوم کی برائی کی نشاندہی کر کے اس کو برا بتانا، اور خود اپنے اندر یا اپنی قوم کے اندر اسی قسم کی برائی پائی جائے تو کوئی نہ کوئی وجہ بتا کر اس کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرنا، یہ دہرا معیار ہے۔ اور جو لوگ دہرا معیار کی برائی میں مبتلا ہوں وہ خدا کی نظر میں بدترین مجرم ہیں۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں سخت سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔

ایک سائنس داں

تھامس الوا ایڈیسن (۱۹۳۱ـ۱۸۴۷) مشہور امریکی سائنس داں ہے۔ بچپن میں اس کے استاد نے اس کو ایک نااہل طالب علم قرار دیا تھا۔ مگر اپنی محنت کی بدولت ترقی کرتے کرتے وہ ایک عظیم سائنس داں بن گیا۔ تھامس الوا ایڈیسن جب آٹھ سال کا بچہ تھا اور اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ اس وقت کا واقعہ ہے۔ ایک روز اس کی خاتون ٹیچر نے اڑنے کے موضوع پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ آدمی "پر" نہ ہونے کی وجہ سے نہیں اڑ سکتا جب کہ چڑیا "پر" ہونے کی وجہ سے اڑتی ہے۔ سارے بچے مطمئن ہو گئے مگر الوا کے ذہن میں ایک مختلف مثال آگئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا کہ میڈم مگر پتنگ تو اڑتا ہے حالانکہ اس کے "پر" نہیں ہوتے۔ ٹیچر بچہ کے اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ مگر اس نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے کے بجائے اس کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا۔ اور بات کو یہاں تک بڑھایا کہ الوا کو اسکول سے نکلوادیا۔ اس نے کہا کہ یہ ایک بے وقوف لڑکا ہے اور بہت زیادہ بولتا ہے۔

تھامس الوا ایڈیسن نے بہت سی سائنسی چیزیں دریافت کیں۔ مثلاً وائرلیس، ٹیلی فون، بجلی، فوٹوگرافی، بجلی کی روشنی وغیرہ۔ تقریباً ایک سو چھوٹی بڑی ایجادات اس کی طرف منسوب ہیں۔ تھامس الوا ایڈیسن جب بچہ تھا تو وہ بہت زیادہ سوالات کرتا تھا۔ اسکول کی خاتون ٹیچر اس کے سوالات کا جواب نہ دے سکی تو اس نے اس معاملہ کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا اس بنا پر وہ الوا کی صلاحیت کو دریافت کرنے میں ناکام رہی۔ مگر الوا کی ماں اس نفسیاتی پیچیدگی سے خالی تھی۔ اس لئے اس نے بہت جلد اس حقیقت کو جان لیا کہ الوا کا زیادہ سوال کرنا دراصل اس کی تخلیقی ذہانت کا ثبوت ہے۔ اس نے مادرانہ شفقت کے ساتھ الوا کو علم و تحقیق کے راستہ پر ڈال دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک عظیم سائنس داں بن گیا۔

حب عاجلہ

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ فوری فائدہ(immediate gain) کی طرف دوڑتا ہے۔ اور دور کے فائدہ اور نقصان کو بھول جاتا ہے۔ اس بات کو قرآن (الدھر ۲۸) میں اس طرح بیان کیا گیا ہے —— یہ لوگ جلدی ملنے والی چیز کو چاہتے ہیں اور انھوں نے چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو (ان ھولاء یحبون العاجلة ویذرون وراءھم یوما ثقیلا)

موجودہ دنیا میں عمل کے دو میدان ہیں۔ ایک وہ میدان جس میں اپنا وقت اور مال اور قوت استعمال کی جائے تو فوراً اس کا فائدہ ملتا ہے۔ شہرت اور عزت حاصل ہوتی ہے۔ آدمی سماج کے اندر نیک نام بن جاتا ہے۔ ہر طرف اس کی تعریف ہونے لگتی ہے۔ دوسرا میدان وہ ہے جس میں بظاہر کوئی فوری فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ حتی کہ یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ ساری کوشش کرنے کے باوجود آدمی کو کوئی ریٹرن نہ ملے بلکہ برعکس طور پر وہ لوگوں کے درمیان غیر مقبول ہو کر رہ جائے۔ پہلے میدان کو دنیوی میدان اور دوسرے میدان کو اخروی میدان کہا جاسکتا ہے۔ جو آدمی اپنے وقت اور مال اور قوت کو دنیوی میدان میں خرچ کرے اس نے گویا اسی دنیا کی زندگی میں اپنے عمل کا بدلہ لے لیا، ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں (الاحقاف ۲۰) اس کے برعکس جو لوگ اخروی اہمیت والے مقاصد میں اپنے وقت اور اپنے اثاثہ کو استعمال کریں، وہی وہ لوگ ہیں جو موت کے بعد اپنے عمل کا ابدی انعام پائیں گے۔ عقل مند وہ ہے جو اپنے آپ کو وقتی کشش والی چیزوں سے اوپر اٹھائے اور آخرت کو اپنا مقصود بنا کر اس کے لئے عمل کرے۔

مسیح کا کردار

مسیح ابن مریم علیہ السلام کا زمانہ دو ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ وہ فلسطین میں پیدا ہوئے اور یہیں دعوت حق کا آغاز کیا۔ اس وقت فلسطین کے علاقہ میں زیادہ تر یہودی آباد تھے۔ ان یہودیوں نے حضرت مسیح کی بدترین مخالفت کی۔ اس کا مختصر تذکرہ قرآن میں ہے اور اس کی تفصیل انجیل (عہد نامہ جدید) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہودیوں نے حضرت مسیح کا انکار کیا۔ انھوں نے ان کی تحقیر کی۔ ان کو طرح طرح سے بدنام کیا۔ انھوں نے لوگوں کو حضرت مسیح سے متنفر کرنے کی کوشش کی تاکہ کوئی ان کا ساتھ نہ دے۔ اس وقت فلسطین کے علاقہ میں رومیوں کی حکومت تھی۔ یہودی جب اپنے ذرائع سے حضرت مسیح کا کچھ بگاڑ نہ سکے تو وہ حضرت مسیح کے خلاف جھوٹا کیس بنا کر ان کو رومی عدالت میں لے گئے اور وہاں سے ان کے خلاف فیصلہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص خدا کی اجازت کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے مطابق فلسطین میں حضرت مسیح کے خلاف جو کچھ ہوا وہ خدا کے اذن کے تحت ہوا۔ پھر خدا نے کیوں اس کا اذن دیا۔ اور ایک پاک اور معصوم انسان کے ساتھ اس قسم کے ظلم کو خدا نے کیوں گوارا کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانے میں یہودی خدا کے دین کے حامل تھے۔ وہ گویا کہ بگڑے ہوئے مسلمان تھے۔ وہ قساوت کا شکار تھے اور دینی اسپرٹ کو آخری حد تک کھو چکے تھے۔ انھوں نے ظاہری اور نمائشی دینداری کا شاندار لبادہ اپنے اوپر اوڑھ رکھا تھا۔ خدا کو

مطلوب تھا کہ ان کو بے نقاب (expose) کیا جائے۔ ان کی ظاہری دینداری کے پیچھے چھپی ہوئی بے دینی کو کھول کر نمایاں کر دیا جائے۔

اس وقت کے یہودی آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہر قسم کی بے انصافیاں کر رہے تھے۔ مگر یہ واقعات ان کی حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے کار آمد نہ تھے، کیوں کہ وہ دو طرفہ تھے۔ ان واقعات میں دونوں فریق بے انصافی کا شکار ہوتے تھے۔ اور جس واقعہ میں دونوں ہی فریق نے بے انصافی کر رکھی ہو وہ کسی کی اصل حقیقت کے اظہار کے لئے کافی نہیں ہو سکتا تھا۔

اس واقعہ کے لئے ایک ایسا انسان درکار تھا جو خود مکمل طور پر بے قصور ہو، اس کے باوجود لوگ اپنے سرکشی اور بے انصافی کے مزاج کے بنا پر اس کے خلاف کارروائیاں کرنے کے لئے ڈھیٹ ہو جائیں۔ اس وقت کے فلسطین میں اس قسم کا انسان صرف ایک تھا۔ اور وہ وہی شخصیت تھی جس کو مسیح ابن مریم کہا جاتا ہے۔

حضرت مسیح آخری حد تک ایک پاک اور بے قصور انسان تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی۔ البتہ انھوں نے یہ کیا تھا کہ انھوں نے یہودیوں کے خود ساختہ دین پر تنقیدیں کیں۔ انھوں نے ان کے خود ساختہ اکابر کو اصاغر بتایا۔ انھوں نے یہودیوں کے مزعومات کا غیر دینی ہونا ثابت کیا۔ تاہم یہ امر حق کا لفظی اعلان تھا نہ کہ کوئی قابل دست اندازی جرم۔ یہودی ان کی باتوں کا جواب دلیل کی زبان سے دے سکتے تھے۔ مگر ان کے بڑوں نے حضرت مسیح کی ان باتوں کو لے کر یہودی عوام کو [illegible] کہ قوم کی اکثریت کو ان سے بدظن کر دیا۔

حضرت مسیح کو بدنام کرنا بھی ان کے وجود کو اور ان کے مشن [illegible]

کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اور منصوبہ بنایا۔ اس وقت فلسطین میں رومیوں کی حکومت تھی۔ یہودیوں نے یہ کیا کہ حضرت مسیح پر بے بنیاد الزام لگا کر ان کو رومی عدالت کے سامنے کھڑا کر دیا۔ انھوں نے چاہا کہ رومیوں کے ہاتھوں حضرت مسیح کو قتل کروا دیں۔ مگر خدا نے ان کو اس انجام سے بچا لیا۔

حضرت مسیح کی یہ کہانی کوئی انفرادی کہانی نہیں۔ یہ خدا کی ایک سنت کی مثال ہے۔ جب بھی کسی قوم میں مذکورہ قسم کا بگاڑ آ جائے تو خدا اس کے بگاڑ کو بے نقاب کرنے کے لئے کسی پاکباز انسان کو کھڑا کرتا ہے جو مسیح کا کردار ادا کر کے لوگوں کی حقیقت کو بے نقاب کرے۔

بگڑے ہوئے معاشرے میں ایک بے قصور انسان ہی اس بات کا تاریخی ثبوت بن سکتا ہے کہ اس نے کسی کا کوئی نقصان نہیں کیا۔ اس کے باوجود لوگ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو گئے۔ اس پر جھوٹے الزام لگائے گئے۔ اس کو بدنام کر کے عوام سے اس کو کاٹنے کی کوشش کی گئی۔ حتی کہ اس کو جھوٹے مقدمات میں الجھایا گیا۔ یہ سب کچھ مسلسل طور پر اور علانیہ طور پر ہوتا رہا مگر وقت کے دینی ٹھیکیدار خاموش رہے۔ شیوخ کی خانقاہوں میں اس کی وجہ سے کوئی زلزلہ نہیں آیا۔ مفتیوں نے اس کے خلاف فتوے صادر نہیں کئے۔ جو علماء دین کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھے انھوں نے ان غیر انسانی اور غیر دینی معاملات کو جانتے ہوئے مگر وہ مسلسل حدیث کی زبان میں گونگے بنے رہے۔

کسی بگڑی ہوئی قوم کو اس طرح بے نقاب کرنا صرف ایک معصوم اور بے قصور انسان کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کے ذریعہ یہاں یہی منصوبہ پورا کیا۔

تاریخ برائے نصیحت

قرآن میں حضرت موسیٰ کا ذکر کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ خدا نے ان کو پیغمبر بنایا اور یہ حکم دیا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ اور ایام اللہ کے ذریعہ ان کی تذکیر کرو (ابراہیم ۵)

عربی زبان میں ایام کا لفظ تاریخ کے بڑے بڑے واقعات کے لئے بولا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص ایام عرب کا عالم ہے یعنی عرب کے تاریخی واقعات سے (یقال فلان عالم بایام العرب ای بوقائعها) اس آیت میں ایام سے مراد ایام تاریخ ہیں۔ ابن عباس اور مقاتل نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے کہ اس سے مراد وہ خدائی واقعات ہیں جو پچھلی قوموں کے ساتھ گذرے (عن ابن عباس ایضا ومقابل :بوقائع الله فی الامم السالفة) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۹/۳۴۲

مذکورہ حکم جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا اس کا تعلق خود ان کی اپنی قوم سے تھا یعنی بنی اسرائیل سے۔ حضرت موسیٰ سے کہا گیا کہ بنی اسرائیل کو گذری ہوئی تاریخ یاد دلاؤ اور اس کے ذریعہ ان کی نصیحت کرو۔ نصیحت سے مراد یہاں یہ ہے کہ ان کی تاریخ میں نصرت اور نعمت کے جو واقعات ہیں ان کو یاد دلا دلا کر ان کے اندر شکر کا جذبہ ابھارو۔ اسی طرح ان کی تاریخ میں ابتلا و آزمائش کے جو واقعات ہیں ان کو یاد دلا کر ان کے اندر عبرت کے احساسات جگاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ تاریخ کا مطالعہ برائے فخر [illegible] تاریخ کے مطالعہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس کو قومی فخر کا عنوان بنایا [illegible]

سے لوگوں کے اندر فخر اور برتری کے جذبات جاگنے چاہئیں۔ تاریخ کے مطالعہ کا یہ طریقہ غیر اسلامی ہے اور جو طریقہ اسلام کے مطابق نہ ہو اس سے کبھی خیر برآمد نہیں ہو سکتا۔

تاریخ کے مطالعہ کا صحیح طریقہ صرف ایک ہے، اور وہ عبرت پذیری ہے۔ تاریخ میں ہمیشہ مختلف قسم کے واقعات ہوتے ہیں، عروج کے بھی اور زوال کے بھی۔ عروج کے واقعات کا مطالعہ اس انداز میں ہونا چاہئے کہ اس سے لوگوں کے اندر شکر خداوندی کے احساسات جاگیں۔ لوگوں کے اندر یہ سوچ ابھرے کہ ہمیں اور زیادہ خدا کی اطاعت کرنا چاہیے تاکہ ہم اور زیادہ خدا کی نصرت وحمایت کے مستحق قرار پائیں۔ اسی طرح زوال کے واقعات کا مطالعہ اس انداز سے کیا جانا چاہیے کہ لوگوں کے اندر احتساب خویش کی سوچ ابھرے۔ اپنی غلطیوں کی اصلاح ان کی ساری توجہات کا مرکز بن جائے۔

تاریخ سے مراد عام انسانی تاریخ ہے، مسلمانوں کی بھی اور غیر مسلموں کی بھی۔ دونوں ہی قسم کی تاریخوں میں ہمیشہ عبرت ونصیحت کے بے شمار پہلو ہوتے ہیں۔ اور دونوں میں سے یکساں طور پر وہ فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے جو تاریخ کے مطالعہ سے مطلوب ہے۔

تاریخ کا مطالعہ صرف اس انسان کے لئے مفید ہوتا ہے جو اس کو نصیحت کے ذہن کے تحت پڑھے، کسی اور ذہن کو لے کر تاریخ کا مطالعہ مفید نہیں ہو سکتا۔ تاریخ تجربات انسانی کا مجموعہ ہے، کامیابی کے تجربات بھی اور ناکامی کے تجربات بھی۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کامیابی کے تجربات سے مثبت سبق لے، اور ناکامی کے تجربات سے یہ سیکھے کہ اس کو کیا نہیں کرنا چاہیے تاکہ اس کی کامیابی مشتبہ نہ ہو۔

اعتدال کی روش

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ روایت کے مطابق، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ غصہ اور رضامندی دونوں حالتوں میں میں انصاف کی بات کہوں (کلمة العدل فی الغضب والرضی) مشکاة المصابیح ۱۴۷۲/۳

یہ خدا سے ڈرنے والے ایک آدمی کی نہایت صحیح پہچان ہے۔ خدا کا ڈر اور آخرت کی پکڑ کا اندیشہ آدمی کو وہ آدمی بنا دیتا ہے جس کو انسان اصلی (man cut to size) کہا جاسکتا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جس کے اندر سے کبر اور نمائش اور جھوٹے وقار جیسے جذبات ختم ہو گئے ہوں۔ عجز وانکساری اس کی صفت بن گئی ہو، جو کہ کسی انسان کے اندر اس وقت لازماً پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ خدا کی عظمتوں کو پالے۔

جب کسی آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس وقت وہ اپنے میں نہیں رہتا۔ اس کے اندر انتقام کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ جس آدمی نے اس کو غصہ دلایا ہے اس کے خلاف جو کچھ کر سکتا ہے کرے مگر سچے مومن کے لئے اس قسم کا رویہ جائز نہیں۔

معتدل حالت میں ہر آدمی درست بات کرتا ہے۔ مگر جب اس کے سینہ میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھے تو وہ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے۔ یہی انسان کا امتحان ہے۔ جو آدمی دونوں حالتوں میں منصفانہ روش پر قائم رہے وہ خدا کا مطلوب انسان ہے اور جو آدمی اعتدال کی حالت میں ٹھیک رہے اور غصہ کی حالت میں کچھ اور بن جائے وہ خدا کا مطلوب بندہ نہیں۔

یہ آئیڈیل ہے، اور آئیڈیل پر چلنا ہر آدمی کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ رخصت دی ہے کہ جو آدمی جذبات سے مغلوب ہو کر غلط حرکت کر بیٹھے اس کو چاہیے کہ وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہو اور اس کی شرعی تلافی کرے۔

اعتصام بحبل اللہ

قرآن (آل عمران ۱۰۳) میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ —— اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور متفرق نہ ہو۔ اور اللہ کا یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ پس تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے (واعتصموا بحبل الله جميعا ولاتفرقوا واذكروا نعمة الله عليكم اذ كنتم اعداءً فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا)

اس آیت میں اللہ کی رسی سے مراد اللہ کی کتاب قرآن ہے۔ اور تفرق کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ اپنے اپنے ذاتی مفاد کو لے کر متفرق نہ ہو جاؤ اور اللہ کے دین میں سب بھائی بھائی بن کر رہو (ويجوز ان يكون معناه ولاتفرقوا متابعين للهوى والاغراض المختلفة، وكونوا في دين الله اخوانا) تفسير القرطبي ۴/۱۵۹

زندگی کے دو طریقے ہیں —— متابعت قرآن، متابعت ھویٰ۔ جو لوگ سچے مومن ہوں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ قرآن کا اتباع کرنا چاہتے ہوں ان کی ساری توجہ خدائی احکام کی طرف لگ جائے گی۔ ان کا تقویٰ ان کے اندر یہ شدید جذبہ پیدا کرے گا کہ وہ بے لاگ طور پر خدا کی مرضی کو جانیں اور پوری طرح اس پر قائم ہو جائیں۔ اس کے برعکس جن لوگوں کی دلچسپی کا مرکز ان کی خواہشیں اور ان کے اغراض ہوں وہ کبھی یکساں ذہن کے تحت نہیں سوچ سکتے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی خواہش اور اپنے مفاد کی طرف دوڑے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان میں سے ہر ایک کی راہ دوسرے سے الگ ہو جائے گی۔

جو لوگ سچائی کے ساتھ خدا کی کتاب کو اپنا رہنما بنائیں ان کے اندر لازمی طور پر

[illegible] اور جن لوگوں کی خواہشیں ان کی رہنما بن جائیں وہ لازمی طور پر متفرق اور مختلف ہو جائیں گے۔ وہ کبھی متحد گروہ نہیں بن سکتے۔

کتاب اللہ کو رہنما بنانے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ برتر سچائی لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔ یہ برتر سچائی چونکہ ایک ہے اس لئے تمام لوگوں کی توجہ صرف ایک نقطہ پر لگ جاتی ہے۔ اس فکری اتحاد کا نتیجہ عملی اتحاد کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کے برعکس جب لوگوں کی توجہ کا مرکز ان کی اپنی خواہش بن جائے تو ہر ایک کی خواہش چونکہ الگ الگ ہوتی ہے اس لئے لوگوں کے نشانے بھی الگ الگ ہو جائیں گے ۔ اسی کے نتیجہ کا دوسرا نام اختلاف و افتراق ہے۔

آیت میں "جمیعا" کا لفظ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ قرآن کی مخلصانہ پیروی کا ذہن اتحاد کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں پوری جماعت متحد العمل بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس اہواء اور اغراض عین اپنی نوعیت کے اعتبار سے تفرق کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ افکار و اعمال کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ عام حالات میں یہ شکایت پیدا ہو کر بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اپنی اپنی شکایتوں کی بنا پر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تفرق کی صورت میں نکلتا ہے۔

مگر جن لوگوں کو ایمانی شعور حاصل ہو جائے وہ انسانی شکایتوں سے اوپر اٹھ کر خدا میں جینے لگتے ہیں۔ شکایتیں ان کے اتحاد میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ وہ شکایتوں کے باوجود اس طرح ہو جاتے ہیں جیسے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہوں۔

[illegible]
[illegible] وہ بزم عالم سے اپنے دل کو اوپر اٹھا سکے۔

امریکہ میں ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت پریشان نظر آئے۔ [illegible] یہاں ایک بینک میں میں افسر تھا، اچھی تنخواہ تھی۔ پھر میں نے امریکی لڑکی سے شادی کی۔ اس کے بعد میرے اخراجات بہت بڑھ گئے۔ بینک میں میں نے ایک فراڈ کیا۔ میرا فراڈ پکڑا گیا۔ میری ملازمت ختم ہوگئی۔ برسوں تک میں ہاؤس اریسٹ رہا۔ میری صحت اور اقتصادی زندگی دونوں تباہ ہوگئی۔ اب بتائیے کہ میں کیا کروں۔

میں نے دو مشورے دیے۔ میں نے کہا کہ پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنی حد (Limit) کو جانئے۔ آپ نے جو فراڈ کیا وہ آپ کی طاقت سے باہر تھا۔ آپ اپنی حد پر قائم نہیں رہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ ماضی کو مکمل طور پر بھلا دیجئے۔ اس بات کو اچھی طرح جان لیجئے کہ آپ جہاں گرے ہیں وہیں سے دوبارہ آپ اپنا سفر شروع کر سکتے ہیں، پیچھے سے سفر کرنا آپ کے لیے ممکن نہیں۔

اس دنیا میں ہر آدمی غلطی کرتا ہے۔ تاہم آدمی کو دو بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ ایک یہ کہ یہاں غلطی کرنا آسان ہے۔ مگر غلطی کو نبھانا انتہائی مشکل کام ہے۔ دوسرے یہ کہ نقصان خواہ کتنا ہی بڑا ہو وہ آدمی کے سارے امکانات کو ختم نہیں کرتا۔ ہر نقصان کے بعد یہ امکان باقی رہتا ہے کہ آدمی از سر نو اپنی قوتوں کو اکٹھا کرے، وہ حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرکے دوبارہ نئی کامیابی حاصل کر لے۔

۲۸ اگست کی شام کو پروگرام کے مطابق ہم لوگ سنٹرل جرسی (South Brons Wick) کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں ڈاکٹر محمدی نقی کے مکان پر ایک اجتماع رکھا گیا تھا:

Tel. (908) 297-8037, 297-4100

یہ پچاس میل کا سفر تھا جو ایک گھنٹہ میں طے ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر راستہ میں ایک جگہ کار ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ٹریفک جام ہوگئی اور ہم لوگ ڈیڑھ گھنٹہ میں وہاں پہنچ سکے۔ میرے سر میں چکر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ لوگ [illegible] ہوں۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں تو آدمی کار انجوائے کرتا ہے [illegible] کے وقت ہم لوگ

[illegible] صدی تک کی سائنس کا [illegible] پیچھے [illegible] مشکل اور پڑھنا جگہ تھی۔ مغرب کی تہذیب کے بھٹکا نا ممکن ہو گیا۔ اس کے بعد ہال نما ویسٹ منسٹر میں اجتماع ہوا۔ تعلیم یافتہ مسلمان عورتیں اور مرد بڑی تعداد میں اکٹھا تھے۔ میں نے اپنی مفصل تقریر میں بتایا کہ قرآن وحدیث میں کہا گیا ہے کہ اسلام ہمیشہ غالب رہے گا، وہ کبھی مغلوب ہونے والا نہیں۔ اس سے غلط طور پر کچھ لوگوں نے سیاسی غلبہ مراد لے لیا ہے۔ اور بزعم خود اسلام کا سیاسی غلبہ قائم کرنے کے لیے جگہ جگہ بے فائدہ لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد اسلام کا نظریاتی غلبہ ہے اور فکری اور نظریاتی غلبہ بلاشبہہ ہر دوسرے غلبہ سے زیادہ عظیم ہے۔ پھر تفصیل سے بتایا کہ اسلام کا یہ غلبہ ہمیشہ قائم رہا ہے اور آج سائنسی دور میں بھی وہ آئیڈیالوجیکل سپر پاور کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

پھر میں نے بتایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ تشدد اور جنگ کی تباہ کن سرگرمیوں کو چھوڑ کر اسلام کی فکری برتری کے پہلو کو نمایاں کریں۔ اس سے ان کی اپنی روحانی ترقی بھی ہوگی اور دنیا کے لوگ تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہوں گے۔ رات کو ڈیڑھ بجے میں اپنی رہائش گاہ پر واپس آیا۔

۱۹۸۸ میں پان امریکن ورلڈ ایرویز (پان ایم) کا ایک جہاز اسکاٹ لینڈ کے شہر (Lockerbie) کے اوپر اڑ رہا تھا کہ اس کے اندر بم پھٹا اور وہ تباہ ہو گیا۔ ۲۰۰ آدمی مر گئے جو زیادہ تر امریکی تھے۔ یہ ایک بڑی امریکی کمپنی تھی مگر اس کے بعد وہ بند ہو گئی۔ جب کہ ٹھیک اسی طرح ایر انڈیا کا ایک جہاز دوران پرواز بم کا شکار ہوا اور وہ سمندر میں گر پڑا۔ مگر ایر انڈیا اس کے بعد بھی بند نہیں ہوئی۔ اس فرق کا سبب مجھے موجودہ سفر کے دوران معلوم ہوا۔

اصل یہ ہے کہ امریکہ میں فرد کے حقوق بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ پان ایم کے حادثہ کے بعد مرنے والے مسافروں کے ورثا نے یہاں کی عدالتوں میں مقدمات کیے اور تلافی کے لیے بہت بڑی بڑی رقموں کا مطالبہ کیا۔ عدالت نے ہر ایک کے حق میں فیصلے دیے۔ اس کے بعد کمپنی کو تمام لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں دینی پڑیں۔ حتی کہ اس کے اثاثے فروخت ہو گئے۔ اس طرح پان ایم دیوالیہ ہو کر بند ہو گئی۔

پان ایم کے حادثہ کا سبب دو لیبیا کے باشندے تھے جن کو امریکہ نے [illegible] اس کام کے

[illegible] رکھا تھا۔ چنانچہ امریکہ نے مطالبہ کیا کہ دونوں ملزموں کو اس کے حوالے کیا جائے [illegible]
نے ان کو حوالے نہیں کیا، کیوں کہ ان کو اندیشہ تھا کہ ان دونوں آدمیوں پر جب [illegible]
تو وہ سارے راز کھول دیں گے۔ اب صرف قذافی کو چاہیے تھا کہ وہ ملزموں کو [illegible]
سے اپنے معاملات درست کرتے۔ اس کے بجائے انھوں نے "سبق سکھانے" کے اصول کے تحت امریکہ کے خلاف مزید تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں۔

اسی سلسلہ کا ایک قصہ وہ ہے جو میں نے نیو یارک ٹائمس کے شمارہ ۲۱ اگست ۱۹۹۶ میں پڑھا۔ اے پی کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ کے بلیک لیڈر فرخان (Louis Farra Khan) کو "ہیومن رائٹس ایوارڈ" کے تحت ڈھائی لاکھ ڈالر ($ 250,000) دیے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ قذافی نے ان کو مزید ایک بلین ڈالر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حد درجہ غیر دانش مندانہ فعل ہے۔ یہ صرف امریکیوں کی نظر میں مسلمانوں کی تصویر بگاڑنے کے ہم معنی ہے۔ اس طرح مسائل اور زیادہ بڑھیں گے، وہ کسی بھی درجہ میں کم ہونے والے نہیں۔

پچھلے سالوں میں مسلمانوں کے درمیان جو تشدد پسند گروپ ابھرے ہیں اور جگہ جگہ اسلام کے نام پر بم اور گن کی تحریکیں چلا رہے ہیں، اس نے اسلام کو کوئی فائدہ تو نہیں پہنچایا۔ البتہ اس سے اسلام کو بے پناہ نقصان ہوا ہے۔ اس نے صلیبی جنگ کی بھولی ہوئی یادوں کو از سر نو مغربی انسان کے ذہن میں جگا دیا ہے۔ لوگ سوچنے لگے ہیں کہ کیا تشدد اور خوں ریزی کا نیا دور شروع ہو گیا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ امریکی نے کہا کہ یہ اسلامی لوگ آخر کیا کرنا چاہتے ہیں:

What do the Islams have in mind now?

اس امریکی نے اسلام کے لفظ کو جمع کی صورت میں استعمال کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو مسلمانوں کے ہم معنی سمجھ رہا ہے۔ یہ کتنا بڑا نقصان ہے جو موجودہ مسلمانوں کے ذریعہ اسلام کو پہنچا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان جگہ جگہ جو انتہا پسندانہ تحریکیں چلا رہے ہیں وہ حقیقۃً ان کی قومی تحریکیں ہیں۔ مگر ان مسلمانوں نے ان کو اسلام اور اسلامی جہاد کے نام پر چلا رکھا ہے۔
یہ بلاشبہ ایک سرکشی کا فعل ہے اور وہ سراسر اسلامی مفاد کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ یا تو وہ ان متشددانہ سرگرمیوں کو مکمل طور پر بند کر دیں یا کم از کم

وہ سیاسی کام اسلام کے بجائے قوم اور ملک کے نام پر ان کو انجام دیں۔ اگر وہ ایسا کریں اور اس کے بعد اسلام کو بدستور اسلام کے نام پر جاری رکھیں تو بجے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ مکمل طور پر خدا کی پکڑ میں آجائیں گے۔

جارج واشنگٹن (1732-99) امریکہ کا پہلا صدر تھا۔ وہ پیروں سے معذور تھا اور وھیل چیر پر رہتا تھا۔ مگر اس نے امریکہ کی تاریخ میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں یہاں زبردست اقتصادی بحران آیا۔ اس وقت جارج واشنگٹن نے نہایت مثبت اقدامات کیے اور لوگوں کے حوصلے کو بلند کیا۔ وہ کہتا تھا کہ :

You have nothing to fear except the fear itself.

آزادی کے بعد برصغیر ہند میں بدقسمتی سے کوئی "واشنگٹن" نہیں اٹھا۔ اور یہی ہماری تباہی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

ایک کتاب میں مزاحیہ جواب پر ایک باب (Artless art of repartee) تھا۔ اس میں یہ قصہ لکھا تھا کہ ایک وکیل بہت تیز تھا۔ چنانچہ ایک جج اس سے جلنے لگا۔ اور چاہنے لگا کہ کسی نہ کسی طرح اس کی انسلٹ کرے۔ ایک بار جج کے یہاں ایک کیس تھا۔ مذکورہ وکیل اس پر اپنے آرگومنٹ پیش کر رہا تھا۔ اس وقت جج کے پاس اس کا کتا بیٹھا ہوا تھا۔ جج نے چاہا کہ وکیل کو نظر انداز کرے۔ چنانچہ وہ اپنے کتے کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بولنے لگا۔ اس کے بعد وکیل خاموش ہو گیا۔ جج نے کہا کہ آپ اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھئے۔ وکیل نے جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ جناب عالی اس وقت مشورہ میں مصروف ہیں :

I think your lordship is under consultation.

جواب کا یہ انداز بے حد موثر انداز ہے۔ اس انداز کا جواب دینے کے لیے سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ آدمی جھنجلاہٹ میں مبتلا نہ ہو اور ہر حال میں اپنے ذہنی توازن کو برقرار رکھے۔ مذکورہ وکیل اتنا موثر جواب دینے پر صرف اس لیے قادر ہوا کہ وہ جج کے توہین آمیز رویہ پر غصہ نہیں ہوا۔ اگر وہ غصہ ہو جاتا تو کبھی بھی وہ جج کو اتنا موثر جواب نہیں دے سکتا تھا۔

نیویارک میں ہم لوگ صبح کو جس راستہ پر ٹہلنے کے لیے جاتے تھے، وہاں سلسلہ وار یہودیوں

[illegible]

۲۱ اگست کی صبح کو ہم یہاں سے گزرے تو تمام دکانیں کھلی ہوئی تھیں [illegible]

[illegible] ہے اس لیے دکانیں بند ہیں۔ یہ لوگ ۲۴ گھنٹے تک یعنی سنیچر [illegible]

اور جمعہ کی شام سے لے کر سنیچر کی شام تک کوئی کاروبار نہیں کرتے۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اسلام میں بھی جمعہ کو یہی حیثیت دی گئی ہے۔ قرآن [illegible] پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جمعہ کی نماز کی اذان ہو تو اس وقت اپنا کاروبار چھوڑ کر مسجد آجاؤ۔ اور جب جمعہ کی نماز پوری ہو جائے تو دوبارہ اپنے کاروبار کی طرف واپس چلے جاؤ۔ دونوں کا تقابل کیجئے، تو معلوم ہوگا کہ اسلامی شریعت کا قانون مکمل طور پر فطری ہے اور یہودی شریعت کا قانون سراسر غیر فطری۔

امریکہ کے صدر کلنٹن (Bill Clinton) نے ۲۰ اگست کو اپنی تقریر میں امریکی قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم دنیا کے پولیس مین نہیں بن سکتے:

We cannot become the World's policeman.

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات امریکی قوم کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ آپ کسی امریکی سے ملیں اور اس سے بات کریں تو آپ فوراً محسوس کریں گے کہ اس کو عالمی سیاست سے بہت کم واقفیت ہے۔ اس کی دلچسپیوں کا مرکز اس کا اپنا ملک امریکہ ہے نہ کہ ساری دنیا۔ یہاں کے ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرام بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

۳۰ اگست کو جمعہ کی نماز کے بعد نیویارک کی مسجد میں ایک مسلمان بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت عرصے سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ ہر جگہ مسلم ملکوں کے اندر دخل اندازی کر رہا ہے۔ ہمیں امریکہ کو ڈاؤن کرنا ہوگا ورنہ وہ ہمیں چین نہیں دے گا۔ میں نے کہا کہ یہ سارا مفروضہ ہی غلط ہے۔ امریکہ تو انتہائی حد تک ایک خود پسند ملک ہے [illegible] مسلم ملک میں اس کی "دخل اندازی" بالادستی حاصل کرنے کے لیے نہیں [illegible] کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اور اپنے [illegible]

[illegible] رہا ہے [illegible] حکومت میں ہو۔

اس معاملہ میں ہمیں عمل سے کام لینا چاہیے ــــــ ہمیں جاننا چاہیے کہ ہم کسی دوسری قوم کی مذمت ایک ایسے کام کے لیے نہیں کر سکتے جس کو ہم خود بھی قانون فطرت کے تحت اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک امریکی نے کہا:

We must act where we see that our interests are at stake.

امریکہ میں پیدا ہونے والے ایک مسلم نوجوان نے سوال کیا کہ نماز کے طریقوں میں اتنا فرق کیوں ہے۔ کوئی ایک ڈھنگ سے پڑھتا ہے اور کوئی دوسرے ڈھنگ سے۔ میں نے کہا کہ جو کچھ فرق ہے وہ جزئی آداب میں ہے نہ کہ بنیادی ارکان میں۔ اور جزئی آداب میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نماز پڑھا رہے تھے۔ رکوع سے اٹھنے کے بعد عام لوگوں نے خاموشی کے ساتھ ربنا لک الحمد کہا۔ ایک صاحب بلند آواز سے کہہ اٹھے: ربنا لک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ نماز ختم ہوئی تو رسول اللہ ؐ نے پوچھا کہ کس نے اس طرح بلند آواز سے کہا تھا۔ وہ صاحب ڈرے کہ شاید مجھ سے غلطی ہوگئی۔ پھر رسول اللہ ؐ نے کہا کہ وہ اتنا اچھا کلمہ تھا کہ اس کو لینے کے لیے بہت سے فرشتے دوڑ پڑے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا جو مقرر طریقہ (prescribed method) ہے اس کا مقصد صرف ایک بنیادی ڈھانچہ (basic structure) دینا ہے۔ اس بنیادی ڈھانچہ میں جزئی اور ضمنی فرق بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کوئی مکینکل قسم کا عمل نہیں۔ وہ ایک کیفیاتی عمل ہے۔ اور کیفیاتی عمل کبھی بھی بالکل بندھے ٹکے انداز کا نہیں ہو سکتا۔

نماز کے بیک وقت دو پہلو ہیں۔ ایک اس کا ظاہری ڈھانچہ، اور دوسرے اس کی داخلی اسپرٹ جس کو قرآن میں خشوع کہا گیا ہے۔ اس خشوع کا تعلق [illegible] کبھی بھی مکمل طور پر [illegible] نہیں کی جا سکتی [illegible] کے بارے میں جو روایات حدیثوں [illegible] اسی بات [illegible] ان کیفیات کے [illegible] [illegible]

ایک انڈیا مانیٹر (India Monitor) ہے جو نیویارک سے چھپتا ہے۔ اس کو ایک مسلم صحافی نکال رہے ہیں۔ اس کا شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۹۶ دیکھا۔ تقریباً پورا اخبار ہندستانی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی ایک رپورٹ ہندستان کی پرائیویٹ ایرلائنوں کے بارے میں تھی جس کے ساتھ گجرات ایرویز کی تصویر شامل تھی :

امریکہ میں مختلف ملکوں کے اور مختلف مذہبوں کے لوگ بستے ہیں۔ ہر قوم اور طبقہ کے لوگ اپنا اپنا اخبار نکالتے ہیں۔ مثلاً ہندو، مسلمان، سکھ، فلسطینی، مصری، وغیرہ۔ مگر ان میں سے ہر ایک کی حیثیت کمیونٹی پیپر کی ہے۔ یعنی جو گروہ اخبار نکالتا ہے اسی کے افراد اس کو پڑھتے ہیں۔ یہ صرف یہودیوں کی خصوصیات ہے کہ وہ جو اخبار یا میگزین نکالتے ہیں اس کو یہودیوں کے علاوہ سبھی لوگ پڑھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ اپنے اخبار میں صرف اپنی باتیں چھاپتے ہیں۔ اور یہودیوں کے اخبار میں سب کی باتیں موجود ہوتی ہیں۔

انڈیا مانیٹر کے رپورٹروں میں کئی مسلم نام بھی دکھائی دیے۔ مثلاً شہید لطیف، جاوید نقوی، راجہ اصغر، شیخ مشتاق، رمضان حسین۔ انڈیا کی آزادی کے پچاس سال پورا ہونے (commemeration) کے طور پر ایک پورا صفحہ تھا۔ اس میں گاندھی، نہرو، پٹیل، ٹیگور، سروجنی نائیڈو، امبیڈکر، رادھاکرشنن، مولانا آزاد کی تصویریں تھیں۔ ہر تصویر کے ساتھ اس کا ایک قول نقل کیا گیا تھا اور پھر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا :

کئی آوازیں، ایک قوم (Many voices, one nation)

سروجنی نائیڈو کی تصویر کے ساتھ ان کا یہ قول نقل کیا گیا تھا : کوئی بھی آپ کو وہ چیز نہیں دے سکتا جس کو لینے کی خود آپ کے اندر استعداد نہ ہو :

No one can give to you what you do not have the capacity to take.

پہلی ستمبر کو لیبر ڈے کی چھٹی تھی۔ اس دن زیادہ تر لوگ تفریح کے لیے مختلف مقامات پر چلے جاتے ہیں۔

۲ ستمبر ۱۹۹۶ کی شام کو ہم لوگ فلاڈلفیا سے دوبارہ نیویارک واپس آ گئے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہالینڈ سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہالینڈ میں سو فی صد تعلیم ہے، جب کہ امریکہ میں ایم اے ۸۰ فی صد تعلیم پائی جاتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں بڑے بڑے لوگ بھی سادہ انداز میں رہتے ہیں۔ ہالینڈ کے پرائم منسٹر کو ایک بار ماحولیات کے موضوع پر ٹی وی پر بولنا تھا۔ ان کو یہ کہنا تھا کہ لوگ گیس کے خرچ کو گھٹائیں تاکہ فضائی آلودگی میں کمی ہو سکے۔ اس کی ایک تدبیر انھوں نے یہ بتائی کہ لوگ کار کا استعمال کم کریں اور بائیسکل کا استعمال شروع کریں۔ اس مشورہ پر پہلا عمل خود پرائم منسٹر نے کیا۔ چنانچہ وہ بائیسکل پر سوار ہو کر ٹی وی اسٹیشن گئے۔

مولانا ذکی الدین شرفی نہایت مخلص اور نہایت باکردار آدمی ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی دوسری ممتاز صفت یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اغیار کی سازشوں کے بارہ میں ان کی معلومات کا خزانہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ عجیب و غریب سازشیں دریافت کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ سوویت یونین کی شکست یہودیوں کی سازش سے ہوئی۔ یہ یہودی ہی تھے جنھوں نے میکائیل گورباچیوف کو پلانٹ کیا تھا۔

ان کا خیال تھا کہ میں اس قسم کی سازشوں سے بالکل بے خبر ہوں۔ میں نے کہا کہ میرے ایک عزیز شاید آپ سے بھی زیادہ اس فن کے اکسپرٹ ہیں۔ ان کے دماغ کو سازشوں کی انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے میرے اور آپ کے درمیان جو فرق ہے وہ واقفیت کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ سازش کے مقابلہ میں کیا کیا جائے۔ آپ لوگ سازش کے انکشافات کو کام سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس میں قرآن کی اس آیت کو پکڑے ہوئے ہوں: وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً۔ میرے نزدیک اس کی اہمیت نہیں ہے کہ لوگ سازش کر رہے ہیں۔ اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ مسلمانوں میں صبر و تقویٰ ہے یا نہیں جو اس کا اصل توڑ ہے۔

ایک پاکستانی بزرگ سے پاکستان کی سیاست [illegible] سیاسی پارٹیوں کے احتساب [illegible] کی تائید کر رہے تھے۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ ضیاء کے عذاب [illegible] عذاب تھا، اور اس کی بیٹی اس سے بھی زیادہ بڑا عذاب ہے۔

میں نے کہا کہ آپ نے بڑی بات کہہ دی۔ [illegible] صالح انسان [illegible]

[illegible] کرنے کی [illegible] سے [illegible] صالح قرار دیتا ہوں۔ اور اس کا اقرار خود آپ نے [illegible]

کر لیا۔ [illegible] ہے کہ کسی عوامی لیڈر کو قتل کرنا ہمیشہ الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ [illegible]

بن کر وہ لوگوں کے درمیان ہیرو بن جاتا ہے۔ آپ لوگوں کی یہی پالیسی تھی جس نے [illegible] کے

الفاظ میں چھوٹے عذاب کو ختم کر کے زیادہ بڑا عذاب اپنے اوپر مسلط کر لیا۔

یہی وہ حکمت ہے جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ابی بن کعب کو قتل نہیں کرایا۔ کیوں کہ آپ جانتے تھے کہ زندہ ابی بن کعب چھوٹا مسئلہ ہے اور مقتول ابی بن کعب زیادہ بڑا مسئلہ۔

عرصہ ہوا امریکہ سے اسرائیل اور یہود کے بارے میں کتابیں چھپی ہیں۔ ان کا ٹائٹل ہے، ہم یہود اور اسرائیل کی کیا قیمت ادا کر رہے ہیں :

1. What price Israel

2. What price Jews

ان کتابوں میں دکھایا گیا ہے کہ یہودی کس طرح امریکہ کو لوٹ رہے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ کتابیں بہت پسند ہیں۔ بعض افراد نے جوش کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر میرے نزدیک ان کتابوں کا صحیح تاثر یہ نہیں کہ یہودیوں کو "لوٹنے والا" ثابت ہوتے ہوئے دیکھ کر آپ خوش ہوں۔ اصل یہ ہے کہ ان کتابوں سے یہ سبق لیا جائے کہ موجودہ زمانہ میں آنے والی تبدیلیوں کے نتیجہ میں کس طرح یہ امکان پیدا ہو گیا ہے کہ ایک گروپ انتہائی چھوٹی اقلیت رہتے ہوئے کس طرح پورے ملک کو اپنے حوصلوں کی تسکین کا میدان بنا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ۱۹۴۸ میں فلسطینیوں نے ٹکراؤ کے بجائے اگر اسی پالیسی کو اختیار کیا ہوتا تو آج فلسطین میں ان کی وہی حیثیت ہوتی جو آج یہودیوں کی امریکہ میں ہے۔

ایک صاحب نے امریکہ کے تعلیمی نظام کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کے اسکولوں میں بچوں کو جب کسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کو بتایا جاتا ہے تو بورڈ پر لکھ کر کہا جاتا ہے کہ ——— یہ حقیقت ہے، اور یہ رائے ہے :

These are facts, these are opinions.

...وں یہ کہا کہ اس طرح ہمارے بچوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ وہ گھر میں آتے ہیں تو جو معلومات ان کی سمجھ میں نہیں آتے ان کی بابت وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ایک رائے (opinion) ہے۔

میں نے کہا کہ یہ ذہن حقیقی اسلام کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ کیونکہ وہاں تو ہر چیز حقیقت ہے۔ مگر آپ اس کو خطرہ اس لیے محسوس کرتے ہیں کہ آپ نے حقیقی اسلام کے ساتھ خود اپنی طرف سے اس میں بہت سے اضافے کر رکھے ہیں۔ یہ اضافے غیر فطری اور غیر ثابت شدہ ہیں۔ اگر آپ ان اضافوں کو ہٹا دیں تو اس کے بعد جو اسلام بچے گا وہ ان بچوں کو حقیقت ہی دکھائی دے گا۔

ایک مجلس میں میں نے امریکہ میں مذہبی آزادی اور مواقع دعوت کے بارے میں کچھ کہا۔ پاکستان سے آئے ہوئے ایک بزرگ نے فرمایا کہ آپ انڈیا میں رہتے ہیں، آپ امریکہ کے بارہ میں نہیں جانتے۔ ہم یہاں رہتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ امریکہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ ہی لوگ جب ماڈرن کمیونی کیشن کی بات کرتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ یہ گلوبل ویلج کا زمانہ ہے۔ پھر آپ ہی یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ انڈیا میں رہنے والا آدمی امریکہ کے بارہ میں نہیں جان سکتا۔

میں نے کہا کہ مجھ میں اور آپ لوگوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ آپ بھی یہاں عملاً اپنی ہی سوسائٹی میں رہتے ہیں۔ خالص امریکیوں سے آپ کا انٹرایکشن بہت کم ہوتا ہے۔ امریکی معاشرہ کے بارہ میں آپ کی معلومات زیادہ تر میڈیا کی اطلاعات پر مبنی ہیں، یہی میرا بھی حال ہے۔ میں پانچ بار امریکہ آیا ہوں۔ اس کے علاوہ انڈیا میں ہر روز امریکہ کے بارے میں پڑھتا رہتا ہوں۔ اس لیے عملاً میرے اور آپ کے درمیان بہت زیادہ فرق نہیں۔

محمد البحناس ایک مصری ہیں۔ وہ امریکہ کی ایک مسجد میں خطبہ اور امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے لائق آدمی کی قدردانی کرنا نہیں جانتے۔ جہاں کوئی آدمی ابھرا وہ فوراً اس کو نیچا دکھانے کے لیے سرگرم ہو جاتے ہیں۔ ہزار برس میں مسلمانوں نے صرف یہ سیکھا ہے کہ خود اپنی قیادت کو کس طرح تباہ کریں:

How to destroy their own leadership

میں نے کہا کہ ہر امت کا ایک آزمائشی پہلو ہوتا ہے۔ اور بدقسمتی سے ہر امت [illegible]
میں فیل ہوتی رہی ہے۔ نسل ابراہیم (بنی اسرائیل) کو اللہ نے منتخب کیا [illegible]
کہ ان کے ذریعہ عمومی شہادت کا کام لیا جائے۔ مگر [illegible] منتخب قوم
(Chosen people) کا نظریہ پیدا ہوا اور داعی اور شاہد بننے کے بجائے وہ [illegible]
رہ گئے۔

یہودی زعم کو توڑنے کے لیے حضرت مسیح کو غیر معمولی معجزات دیے گئے۔ مگر ان کے پیروؤں نے یہ کیا کہ خود حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ اور اس طرح توحید میں شرک کا عقیدہ شامل کر دیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں آپ کے اصحاب کے ذریعہ یہ کام لیا گیا کہ قائم شدہ نظام جبر کو توڑا گیا تاکہ مذہبی آزادی کا ماحول پیدا ہو اور توحید کی دعوت کھلے ماحول میں جاری ہو سکے۔ اہل اسلام کے فوجی آپریشن کے ذریعہ یہ مقصد تو حاصل ہوا۔ مگر دوسرا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں میں حاکمانہ نفسیات پیدا ہو گئی۔ اسی حاکمانہ نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان کسی کی اطاعت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اِلّا یہ کہ انھیں اس کے لیے مجبور کر دیا جائے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ مغربی قوموں میں ہم دیکھتے ہیں کہ اتحاد ہے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی اتحاد ہے۔ مگر مسلمانوں میں کہیں بھی اتحاد نہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ سچائی ایک ہے۔ اب ہر مسلمان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ "ایک" مجھے حاصل ہے۔ اس لیے وہ دوسرے سے لڑتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ سچائی تو ایک ہی ہو سکتی تھی اور وہ مجھ کو حاصل ہو گئی۔ دوسرا جس چیز پر ہے وہ لازماً غلط ہے۔ کیونکہ سچائی ایک سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی۔

اس کے برعکس مغربی قوموں نے سیکولر نظریہ اختیار کر کے سرے سے اس بحث ہی کو ختم کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہبی سچائی کا تصور ایک وہم ہے، اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اس طرح وہ اس نفسیاتی پیچیدگی ہی سے خالی ہو گئے ہیں جو دو فریقوں میں ٹکراؤ پیدا کرتی ہے۔

ہندوؤں کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ مان لیا کہ سچائی خواہ ایک ہو، مگر اس کے مظاہر

سکتے ہیں۔ اس نفسیات نے ان کے اندر یہ ذہن بنایا کہ اگر میں سچا ہوں تو دوسرا بھی سچائی کا حامل ہو سکتا ہے۔ یہ عقیدہ اپنے آپ اس شدت کو ختم کر دیتا ہے جو ٹکراؤ تک لے جاتی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان میں بھی گہرا اتحاد قائم ہو سکتا ہے جیسا کہ دور اول میں قائم ہوا تھا۔ مگر اس اتحاد کی بنیاد ایک اور چیز میں ہے اور وہ تقویٰ ہے۔ مسلمانوں کو متحد رکھنے کی واحد طاقت تقویٰ ہے۔ اگر ان کے اندر فی الواقع خدا کا خوف موجود ہو تو یہ ان کے اتحاد کی ضمانت بن جائے گی۔ باعتبار عقیدہ اگرچہ وہ مانیں گے کہ سچائی ایک ہے۔ مگر جب اپنی ذات کا سوال ہوگا تو ان کو یہ اندیشہ لاحق ہو جائے گا کہ پتہ نہیں مجھ کو وہ واحد سچائی ملی یا نہیں۔ ان کو یہ ڈر لگا ہوا ہوگا کہ آخرت میں کہیں خدا یہ نہ کہہ دے کہ تم نے جس چیز کو سچائی سمجھ لیا وہ تمہارا وہم تھا نہ کہ حقیقی سچائی۔ یہ اندیشہ ناک نفسیات مسلمان کو تفرق سے بچاتی ہے۔ مگر جب یہ متقیانہ مزاج مسلمانوں میں باقی نہ رہے تو اس کے بعد وہی کچھ پیش آتا ہے جو موجودہ مسلمانوں میں دکھائی دے رہا ہے۔

نماز کے بارہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ حضرت عمر فاروق کا قول ہے کہ الصَّلاۃُ عِمادُ الدِّین مَن اقامها اقامَ الدِّین ومَن هدمها هدمَ الدِّین (نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے نماز کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا، اور جس نے نماز کو ڈھایا اس نے دین کو ڈھا دیا)

میں نے کہا کہ اس قول میں قائم کرنے اور ڈھانے کا تعلق کسی خارجی نظام سے نہیں ہے۔ اس کا تمام تر تعلق خود نمازی کی اپنی زندگی سے ہے۔ یعنی جو مسلمان فرد نماز کو اس کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ ادا کرے گا اس کی زندگی میں نماز کی روح اتر جائے گی۔ اس کی پوری زندگی دینی رنگ میں رنگ جائے گی۔ اس کے برعکس جو شخص نماز کو اس کی صحیح اسپرٹ کے ساتھ ادا کرنے میں ناکام رہے گا، اس کی زندگی بھی اسلامی زندگی نہیں بن سکے گی۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نے الرسالہ میں ڈائیلاکٹک تھنکنگ کو غلط بتایا ہے۔ یہ آپ کی اپنی بات ہے یا اس کا تعلق شریعت سے ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا تعلق مکمل طور پر

فرصت سے بہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں [illegible]
پھر مسلسل کہا حضرت عمر فاروق کا قول ہے کہ لیس العاقل الذی یعرف الخیر [illegible]
من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین۔ اس سے معلوم ہوا کہ [illegible]
دو پہلو (خیر یا شر) نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایک تیسرا پہلو خیر الشرین کا ہوتا ہے۔ جو آدمی
صرف یہ جانتا ہو کہ معاملات میں ہمیشہ یا تو خیر کا پہلو ہوتا ہے یا شر کا پہلو، وہ ہمیشہ خیر کو حاصل
کرنے کے نام پر شر سے ٹکراتا رہے گا، اور ساری قربانیوں کے باوجود عملاً کچھ بھی حاصل نہ کر سکے گا۔
کیوں کہ جس خیر کو حاصل کرنے کے نام پر قربانیاں دے رہا تھا وہ سرے سے قابل
حصول ہی نہ تھا۔

اس قول میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں بیشتر حالات میں چوائس خیر اور شر کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ آدمی کے لیے ایک ایسی تیسری چیز کا چوائس ہوتا ہے جو بڑے شر کے مقابلہ میں چھوٹے شر کی حیثیت رکھتی ہو۔

امریکہ کے زمانۂ قیام میں ایک سے زیادہ بتانے والوں نے مجھے بتایا کہ یہاں اب یہ حال ہو چکا ہے کہ بیٹا ایک گرل فرینڈ لے کر گھر میں آتا ہے یا بیٹی ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوتی ہے تو ماں باپ اس کو روک نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ اب ایسی مثالیں سامنے آرہی ہیں کہ باپ اپنی بیٹی سے کہتا ہے کہ تم کو ڈیٹنگ (dating) کرنا ہے تو کسی مسلمان لڑکے سے کرو، ہندو یا عیسائی لڑکے کے ساتھ مت کرو۔

ایک صاحب کے یہاں کھانا تھا۔ غالباً روٹی یا اور کوئی چیز نقصان کر گئی۔ میرا پیٹ کچھ خراب ہو گیا۔ میں نے دوسرے وقت کا کھانا چھوڑ دیا۔ میرے میزبان نے کھانے کے لیے کہا تو میں نے کہا کہ ۔ اس کے علاج کا میرے پاس ایک سادہ نسخہ ہے، اور وہ ہے ـــ فاقہ سے افاقہ

امریکہ کے سفر میں کئی دن تک ایک صاحب کا ساتھ رہا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، اور اسلام اور مسلمانوں کے معاملہ میں مخلص بھی تھے۔ مگر ان کے اندر منفی فکر اتنا زیادہ سمایا تھا کہ وہ عجیب و غریب طور پر ہر واقعہ کو اپنے منفی سانچہ میں ڈھال لیتے تھے۔ جب میں نے کہا کہ امریکہ میں مذہبی آزادی ہے تو فوراً وہ کچھ انکشافات بتا کر کہتے کہ یہ ظاہری آزادی حقیقت میں غلامی

کے پیچھے ہے۔ امریکہ میں اگر امریکہ میں دعوت کے مواقع ہیں تو وہ خود اپنا کے کریں تو ایک گہری سازش ہے جو یہودی دماغ کی پیداوار ہے۔ چند دن کے تجربہ کے بعد میں نے انھیں ایک کاغذ لکھ کر دیا جس میں حسب ذیل الفاظ درج تھے :

You have a unique expertise of turning the positive into negative. In contrast, I always try to seek out the positive aspect among the most obviously negative circumstances.

۱۴ ستمبر کی شام کو محمد حسین صاحب کے ساتھ ماونٹ ہال سے ٹرنٹن کے لیے روانگی ہوئی۔ ٹرنٹن کی مسجد میں ہم لوگ پہنچے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ یہاں مغرب کی نماز کے بعد خطاب کا پروگرام تھا۔ یہ خطاب انگریزی میں ہوا۔ کیونکہ حاضرین زیادہ تر انگریزی داں تھے۔

میں نے اتحاد کے موضوع پر تقریر کی۔ میں نے کہا کہ اس مسجد میں اس وقت مختلف ملکوں کے لوگ موجود ہیں۔ انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، عرب، مصر، وغیرہ۔ مگر تمام لوگوں نے مل کر ایک امام کے پیچھے نماز ادا کی۔ اس طرح نماز ہم کو اتحاد کا سبق دیتی ہے۔ نماز کا سبق یہ ہے کہ تم لوگ اپنے میں سے ایک کو امام بنا کر سب لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ۔ چنانچہ ایک کو چھوڑ کر تمام کے تمام لوگ بیک سیٹ پر چلے جاتے ہیں تب جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ یہی سبق ہمیں مسجد کے باہر بھی دہرانا ہے۔ باہر کی زندگی میں بھی ہمیں یہی کرنا ہے کہ ایک کو لیڈر مان کر تمام لوگ اس کی ماتحتی قبول کر لیں۔ یہی اتحاد کا اصل راز ہے۔

ڈاکٹر سید اسد علی (نفسیاتی ڈاکٹر) سے مسجد میں ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ یہاں تمام شادیاں لو میرج کی بنیاد پر ہوتی ہیں، اس کے باوجود کیوں ایسا ہوتا ہے کہ پچاس فی صد سے زیادہ کیسوں میں طلاق ہو جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ زیادہ بڑی وجہ بوریت ہے۔ یہاں کے لوگوں کا نظریہ لذت ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ کے بعد دونوں ایک دوسرے سے بور ہو جاتے ہیں اور پھر جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں، یہ جھگڑے تفریق تک پہنچ جاتے ہیں۔

دو آدمی بات کر رہے تھے۔ ایک صاحب کی آواز میرے کان میں آئی کہ انڈیا میں آپ خالص دودھ حاصل نہیں کر سکتے :

In India you cannot get pure milk.

میں نے سوچا کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اخبار کی تصویر ہمارے ملکوں میں بے حد مقبولیت والا دودھ ملتا ہے۔ خالص دودھ وہاں پانا سخت مشکل ہے۔

۱۴ ستمبر ۱۹۹۶ کی شام کو کانفرنس سے فارغ ہو کر میں اپنی قیام گاہ (... سوسائٹی) میں واپس آیا اور عشاء کی نماز کے بعد اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اٹھ کر کھولا تو ایک نوجوان کھڑے ہوئے نظر آئے۔ یہ ایک ترک نوجوان تھے۔ انھوں نے مجھے ایک عربی کتاب دی۔ یہ ۱۹۲ صفحہ کی کتاب تھی۔ اس کا نام تھا الخلافۃ والخلیفۃ۔ یہ کتاب اصلاً ترکی میں لکھی گئی تھی۔ موجودہ کتاب اس کا عربی ترجمہ ہے۔

اس کے صفحہ اول پر لکھا ہوا تھا: منشورات دولۃ الخلافۃ۔ اس کتاب میں "امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین" کا تعارف تھا۔ ان کا نام جمال الدین بن رشید خوجا اوغلو قابلان ہے۔ وہ ترکی کے ایک گاؤں دانگیس (Dangis) میں ۱۹۲۶ میں پیدا ہوئے۔ ۱۵ مئی ۱۹۹۵ کو جرمنی میں ان کا انتقال ہوا۔ اب ان کے صاحبزادے محمد متین بن جمال الدین خوجا اوغلو قابلان ان کی جگہ پر امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین ہیں۔ ترکی یا اور کسی مسلم ملک میں وہ اپنی تحریک نہیں چلا سکتے تھے اس لیے وہ جرمنی میں مقیم ہیں:

Nousser Street 418, 50733 Koln, Germany
Tel. (0221) 976553-0

اس طرح دولۃ الخلافہ اور امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین کی تحریک چلانا جنون کی حد تک بے معنی ہے۔ پھر یہ مجنونانہ تصور کیسے پیدا ہوا۔ اس کا سبب ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) ہے جس میں آج امت کے بے شمار لوگ گرفتار ہیں۔ چنانچہ کتاب کے صفحہ ۹ پر النظامان کے عنوان کے تحت لکھا ہوا ہے کہ دنیا میں صرف دو نظام ہیں۔ ایک حق ہے اور دوسرا باطل۔ یعنی شرعی نظام حق ہے اور اس کے سوا دوسرے تمام نظام باطل ہیں (واحد منہما حق والآخر باطل۔ یعنی ان نظام الشریعۃ حق وما عداہ من سائر الانظمۃ کلہا باطلۃ)

اسی دو قسمی طرز فکر کی بنا پر یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ شرعی نظام ابھی قائم نہیں ہے۔
پہلے ساری دنیا سے لڑ کر دوبارہ شرعی نظام قائم ہو۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ عمل کی ایک
ی صورت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ملے ہوئے مواقع کو استعمال کر کے مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنائیں۔
کے اخلاق کو درست کریں۔ غیر مسلم قوموں میں توحید اور آخرت کا پیغام پہنچائیں۔

جناب کلیم الدین صاحب الرسالہ کی مطبوعات اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی
ں کا ایک سیٹ فلاڈلفیا کے اس ادارہ باوا محی الدین فیلوشپ (Tel. 215-8796300) کو دیا۔
لوگوں نے بھی اپنی مطبوعات کا ایک سیٹ ہم کو دیا۔ ان کے نام یہ ہیں:

1. Who is God? pp. 10
2. A book of God's Love, pp. 116.
3. Islam and World Peace: Explanations of a Sufi, pp. 164.
4. Treasures of Wisdom, pp. 18.
5. The Golden Words of a Sufi Sheik, pp. 488.

صوفی اسلام اہل مغرب کو بہت اپیل کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فلسفیانہ تصورات
ے بہت قریب ہے۔ بیشتر فلاسفہ حقائق کو ایک وحدت کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ اور تصوف
ی نہ کسی طور پر وحدت الوجود کا قائل ہے۔ اس طرح دونوں میں ایک یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔
انچہ "گولڈن ورڈز" میں باوا محی الدین کے نقطۂ نظر کو انگریزی میں اس طرح بیان کیا گیا تھا:

God is within man and man is within God.

۱۴ ستمبر کی صبح کو فجر کی نماز میں امام صاحب نے سورہ الم نشرح پڑھائی۔ اس تقریب سے
ں نے ان مع العسر یسرا کی تشریح کی —— پرابلم کے ساتھ مواقع۔
حاضرین میں ڈاکٹر سلیمان افریقی بھی تھے جو ہوورڈ یونی ورسٹی (واشنگٹن) میں پروفیسر
یں۔ انھوں نے مکمل اتفاق کیا۔

چائے پر کچھ دیر تک مزید نشست ہوئی۔ تقریباً ۱۰ آدمی تھے۔ دوبارہ اسلامی
مضمون پر گفتگو ہوتی رہی۔ ۹ بجے صبح ہم لوگ یہاں سے روانہ ہوئے۔ ساتھ میں کلیم الدین صاحب،
عرفان انیس صاحب، بلال صاحب تھے۔ ماونٹ ہالی سے روانہ ہو کر ہم فلاڈلفیا پہنچے۔
۱۵ ستمبر کو ۱۰ بجے صبح کا وقت تھا جب ہم لوگ باوا محی الدین سنٹر (فلاڈلفیا) پہنچے۔ جب

ہم لوگ داخل ہو رہے تھے تو دو سفید فام مسلمان (محمد لطیف، محمد صالح) باہر کھڑے تھے۔ ان میں سے بہت سے سفید فام امریکی ہیں جو باوا کی تبلیغ سے مسلمان ہو گئے۔ آج شام اجتماع میں بہت سے عورت مرد یہاں موجود تھے۔ یہ سب نومسلم تھے۔ یہ ایک خوب صورت عمارت ہے۔ اس کے اندر ایک خوب صورت آڈیٹوریم تھا۔ باوا محی الدین یہاں ہرے رنگ کی ایک کرسی پر بیٹھ کر صوفیانہ گیت گاتے تھے۔ اس کا ریکارڈ تیار کر لیا گیا تھا۔ وہ یہاں بجایا جا رہا تھا۔ یہ گیت تامل زبان میں تھا۔ ساتھ ساتھ ایک خاتون اس کا انگریزی ترجمہ کرتی جا رہی تھی۔

یہاں ایک صاحب نے بتایا کہ باوا محی الدین لنکا کے کسی جنگل سے آئے۔ گیت بہت پُرنغمہ بھی تھا اور پُر درد بھی۔ میرا قیاس تھا کہ ان کے یہ گیت جس میں نغمہ بھی تھا، درد بھی اور روحانیت بھی، اس کی خوش کن آواز یہاں کے سفید فام امریکن کو متاثر کرتی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ بہت اثر پذیر طبیعت کے حامل ہوتے ہیں۔ ابتداءً اس سے متاثر ہوئے اور پھر اسلام کا مزید مطالعہ کر کے اسلام میں داخل ہو گئے۔

باوا مرکز کے اوپر کے حصہ میں ایک خوب صورت مسجد ہے۔ یہ مستقل تعمیر نہیں ہے بلکہ مختلف مکانوں کو خرید کر ان کے مجموعہ سے ایک مرکز بنا لیا گیا ہے۔ مسجد کے مؤذن عبد اللہ نام کے افغانی تھے۔ میں نے کہا "افغانستان ایک خوب صورت ملک ہے"۔ عبد اللہ صاحب نے ایک آہ بھر کر کہا۔ ہاں وہ تھا (It was)

باوا محی الدین سنٹر پورا کا پورا نہایت منظم اور نہایت صاف ستھرا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان سے سفید فام لوگ متاثر ہوں۔

باوا محی الدین سنٹر کے باہر ایک بورڈ پر خوب صورت حروف میں لکھا ہوا ہے ——— صبر کے سمندر میں موجیں نہیں :

"The Ocean of Patience has no waves."

پہلے خاموش پُرامن تبلیغ کی۔ جب حلقہ بن گیا، اس کے بعد مسجد بنائی خوب صورت مسجد۔ مسجد کے باہر ایک کتبہ لکھا ہے کہ مسجد کی تکمیل اور افتتاح ۲۷ مئی ۱۹۸۴ کو ہوا۔

امریکہ کے زمانۂ قیام میں ایک بار میں نے ایک سفید فام امریکی سے کشمیر کے بارے میں

سوال کیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کشمیر کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ وہ ابھی تک بری حالت میں ہے۔ ان کو ہماری مدد کی ضرورت ہے :

Q. Do you know about Kashmir?
A. Yes, I know it is in pretty bad shape and right now they need our help.

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا میں ہندستان کی خارجہ پالیسی کتنا زیادہ ناکام ہے۔ میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگ کشمیر کے بارہ میں صرف وہی جانتے ہیں جو میڈیا میں آتا ہے۔ اور میڈیا ہمیشہ سلکٹیو رپورٹنگ کرتا ہے۔ اگر آپ کشمیر کی پوری صورت حال کو جانیں تو آپ کی رائے بدل جائے گی۔

اسکول کے خوب صورت ہال میں ۱۴ ستمبر کو گیارہ بجے کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے سیشن کا چیرمین مجھ کو بنایا گیا تھا۔ کوآرڈی نیٹر کے فرائض ایک بلیک مسلم مسٹر رسول سلوی نے انجام دیا۔ تلاوت قرآن کے بعد مولانا ذکی الدین شرفی نے کانفرنس کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمان صرف اسپین تک پہنچے تھے۔ موجودہ زمانہ میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی بڑی تعداد مغربی ملکوں میں جمع ہو گئی۔ اس میں ایک خدائی منصوبہ دکھائی دیتا ہے۔ مولانا ذکی الدین شرفی نے کہا کہ ٹکراؤ دعوتی کام کے لیے زہر ہے :

Confrontational approach is a poison for Dawa.

اس کے بعد امام یحییٰ ہندی (فلسطین) نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے ان احادیث پر تفصیلی کلام کیا جو مسیح اور دجال سے متعلق کتب حدیث میں آئی ہیں۔ ان کے مقالہ کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ پیشین گوئیاں اتنی قطعی ہیں کہ ان کے استناد کے بارہ میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد ڈاکٹر خالد یحییٰ بلینکن شپ نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ وہ ایک سفید فام نومسلم ہیں۔ انھوں نے ٹکنالوجیکل ڈولپمنٹ اور اس کے نتائج پر کلام کیا۔ انھوں نے کہا کہ مادی تہذیب کا خلاصہ ہے Let us live comfortably ان کا پیپر لکھا ہوا تھا۔ مگر انھوں نے اس کو سامنے رکھ کر زیادہ تر زبانی کہا۔ عنوان یہ تھا :

The End of History and the last man.

نماز ظہر کے بعد کانفرنس کا دوسرا سیشن شروع ہوا۔ اس میں پہلا مقالہ باسط بلال [illegible]
اس کے بعد ساڑھے تین بجے میں نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ تمام حاضرین نے اس کو بہت [illegible]
ہوا۔ میں نے کہا تھا کہ مغربی تہذیب کو دجال کہنا سطحی انداز فکر کی بنا پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں
تیسری صورت یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے سارے مواقعِ دعوت کھولے ہیں۔ یہ مقالہ ان شاء اللہ
الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

باسط بلال کوشول کے مقالہ کا عنوان تھا ——— اسلام اور مغربی تہذیب۔

ماونٹ ہالی کی مسجد میں ایک صاحب سے اسلام کی سیاسی تفسیر کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بڑے جوش کے ساتھ یہ آیت پیش کی: ولا یشرک فی حکمہ احدا (الکہف ۲۶) ان کے نزدیک اس آیت میں حکم کا مطلب سیاسی حکم تھا۔ اس طرح یہ آیت ان کے نزدیک اس مفہوم کے لیے صریح تھی کہ سیاسی حاکمیت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک خود ساختہ مفہوم ہے۔ اور کسی بھی مفسر نے آیت کا یہ مطلب نہیں لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں حکم سے مراد فوق الفطری حکم ہے نہ کہ سیاسی حکم۔ اس سے مراد کوئی قائم کیا جانے والا حکم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ حکم ہے جو بالفعل کائنات میں قائم ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کا نظام صرف ایک اللہ کے تحت ہے۔ کوئی بھی اس معاملہ میں اس کا شریک نہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کچھ اور شرکا ہیں جو زمین و آسمان کے نظام کو سنبھالنے یا اس کو چلانے میں اللہ کے شریک ہیں تو یہ ایک جھوٹ ہے۔ اس کے حق میں ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں۔ اسی لیے آیت میں "وہ شریک نہیں کرتا" کا لفظ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ "شریک نہ کیا جائے"۔

افتخار مدنی (۱۹۴۷) ۱۹۷۷ میں ایران میں تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ایران کا انقلاب ۵۰ فی صد خمینی کا کارنامہ ہے اور ۵۰ فی صد امریکہ کا۔ آیت اللہ خمینی کے کیسٹ پیرس سے ایران آتے تھے اور گھر گھر سنے جاتے تھے۔ ان کیسٹوں میں شاہ ایران کے خلاف جذبات بھڑکائے جاتے تھے۔ مگر شاہ کا جابرانہ نظام لوگوں کی زبان بند کیے ہوئے تھا۔ ستمبر میں اس وقت کے صدر امریکہ جمی کارٹر تہران گئے۔ انھوں نے شاہ ایران سے کہا کہ آپ کی حکومت لوگوں پر ظلم کر رہی ہے۔

آزادی ختم کر دی ہے۔ شاہ ایران نے انکار کیا۔ گفتگو کے بعد شاہ نے کہا کہ کل آپ دیکھیں گے کہ اصفہان ٹی وی ہر جگہ لوگ آزادی کے ساتھ اظہار خیال کر رہے ہوں گے۔ چنانچہ اگلے دن عوامی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے بعد اچانک ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ خمینی کے کیسٹوں نے جو اشتعال برپا کیا تھا وہ اچانک باہر آ گیا۔ یہاں تک کہ شاہ کو ملک چھوڑنا پڑا (شاہ حالات سے بے خبر تھا)

انتصار صاحب نے بتایا کہ شاہ کے جانے کے بعد کسی ایرانی نے ان سے کہا کہ کیا شاہ چلا گیا (شاہ رفت) انھوں نے کہا کہ ہاں۔ ایرانی نے کہا کہ نہیں، وہ بھاگ گیا (فرار کرد)

تقریر کے بعد بہت سے سوالات کیے گئے۔ ایک سوال یہ تھا:

Many people, including Muslims, think Islam was spread by force. What is your opinion.

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ پچھلی تاریخ میں دوسری قوموں کے ساتھ لڑائیاں ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کی حکومتیں بھی قائم ہوئی ہیں۔ مگر ان لڑائیوں یا ان حکومتوں کا اسلام کی تبلیغ و اشاعت سے کوئی براہ راست تعلق نہ تھا۔ اسلام ہر جگہ، بشمول عرب، اپنی نظریاتی طاقت کے ذریعہ پھیلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں اگرچہ دور اول کے مسلمانوں اور وہاں کے قدیم حکمرانوں سے جنگ ہوئی۔ مگر مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ مصر میں مذہب اسلام کا پھیلنا تلوار کے زور پر نہیں ہوا بلکہ قرآن کے ذریعہ پرامن طور پر ہوا۔ مثلاً مصری تاریخ کے ماہر سر آرتھر کیتھ نے لکھا ہے:

The Egyptians were conquered not by the sword but by the Qur'an

ایک صاحب بظاہر اچھی حالت میں دکھائی دیتے تھے۔ ان کے پاس اچھا جاب بھی ہے۔ ایک روز اپنے ذاتی حالات بتائے تو معلوم ہوا کہ وہ نہایت بری حالت میں ہیں۔ ان کو ایسا لگنے لگا تھا کہ ان کا مستقبل اب تباہ ہو چکا ہے۔ میں نے کہا کہ زندگی کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ہر کھونے کے بعد پانے کا ایک نیا امکان آدمی کے لیے موجود رہتا ہے۔ کسی نے نہایت درست کہا ہے کہ آج کا دن میری بقیہ زندگی کے لیے پہلا دن ہے:

Today is the first day of the rest of my life.

میں نے کہا کہ آپ کھوئے ہوئے دنوں پر افسوس کرنے کے بجائے بقیہ دنوں کو بھرپور

طور پر استعمال کریں۔

کانفرنس میں مختلف لوگ اپنا اپنا لٹریچر تقسیم کر رہے تھے۔ شاہد احمد [illegible] کے نام سے چھپا ہوا ایک پمفلٹ ملا۔ یہ جمعہ کی تقریر تھی جو انھوں نے انڈیانا پولس (Indianapolis) کی ایک مسجد میں کی تھی۔ انھوں نے قرآن کی روشنی میں داعی کے کیرکٹر کو بیان کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا کہ دعوت کے راستہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ سی آئی اے، امریکی حکومت یا مسیحی مشنریوں کی طرف سے نہیں ہیں، بلکہ وہ خود مسلمانوں کی طرف سے ہیں جو کہ اسلام کو اس کی اصل معنویت اور صحیح شکل کے ذریعہ پیش نہیں کر رہے ہیں:

The obstacle to the efforts of Da'wah are not from the CIA, U.S. Government, or evangelists but from we Muslims, in not showing Islam in its true meaning and example.

امریکہ کی ریاست ورجینیا کے شہر پورٹس ماوتھ (Portsmouth) میں ۱۵ ستمبر ۱۹۹۶ کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ دو مسلم خواتین کسی سامان کی خریداری کے لیے مقامی جنرل اسٹور کی طرف جا رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے چہرہ پر مشرقی انداز کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ فوراً پولیس آئی اور اس نے دونوں خواتین کو گرفتار کر لیا۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کی گئی۔ البتہ انھیں پردہ اوڑھ کر چلنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

مسلم خاتون نے اپنی صفائی میں کہا کہ ہم دونوں مسلمان ہیں اور یہ ہمارے اسلامی لباس کا ایک حصہ ہے۔ پولیس نے اس دلیل کو نہیں مانا۔ اس نے کہا کہ ہمارے نزدیک یہ نقاب (mask) ہے اور امریکی قانون کے مطابق، کوئی مرد یا عورت کسی پبلک پلیس پر اپنے چہرہ کو نقاب میں چھپا کر نہیں چل سکتا۔

چونکہ مجرمین بعض اوقات اپنے کو شناخت سے بچانے کے لیے چہرہ پر نقاب (ماسک) ڈال لیتے ہیں۔ اس لیے امریکہ میں مذکورہ قانون بنایا گیا ہے۔

عرفان انیس عمر صاحب ٹمپل یونی ورسٹی میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں دہلی میں فلاسفی کا سبجکٹ لیے ہوئے تھا۔ اس وقت مذہب سے مجھے دلچسپی نہ تھی۔ پھر مجھے الرسالہ ملا۔ الرسالہ کے مطالعہ کے بعد مجھے اسلام کو پڑھنے سے دلچسپی ہو گئی۔ الرسالہ مجھے

۱۹۸۹ میں ملا تھا۔ اس کے بعد میں اسلام کا مطالعہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ میں ٹمپل یونیورسٹی کے مذہبی شعبہ میں پہنچ گیا۔

امریکہ میں مقیم ایک مسلم دانشور سے ملاقات ہوئی۔ امریکہ کی ایک یونی ورسٹی سے انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اردو زبان بھی جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے الرسالہ (اگست ۱۹۹۹) پڑھا جو حریت فکر کے موضوع پر ہے۔ آپ نے ۵۰ صفحہ حریت فکر پر لکھا ہے، مگر اصل موضوع کو تو آپ نے چھوا ہی نہیں کیا۔ مجھے ان کے اس تبصرہ پر تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیسے۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ لامحدود آزادی کو مانتا ہے۔ آپ کو یہ بتانا تھا کہ آزادی کی حدود کیا ہیں۔ مگر اس اہم سوال پر آپ نے کلام ہی نہیں کیا۔

اس سے اس فارسی مقولہ کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ یک مَن علم را دہ مَن عقل می باید (ایک مَن علم کے لیے دس مَن عقل چاہیے) مذکورہ دانشور کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے الرسالہ کے شمارہ کو غلط معیار سے ناپا۔ مذکورہ شمارہ کا موضوع اختلاف رائے ہے نہ کہ آزادیٔ فکر۔ وہ اسلامی معاشرہ میں حریت فکر کے مسئلہ سے بحث کرتا ہے۔ مغربی فلسفہ کے مطابق، انسانی آزادی کا مسئلہ اس کا موضوع نہیں۔ بالفاظ دیگر، الرسالہ کا مذکورہ شمارہ اس موضوع پر ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے مقابلہ میں اختلاف رائے کی کتنی آزادی ہے۔ انسان کو خدا و رسولؐ کے مقابلہ میں کتنی آزادی حاصل ہے، یہ مذکورہ شمارہ کا موضوع بحث ہی نہیں۔

ڈاکٹر سلیمان نایَنگ (۵۲ سال) افریقہ میں پیدا ہوئے۔ آج کل وہ امریکہ (واشنگٹن) میں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اریٹیریا کی آزادی کے باوجود وہاں کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ پہلے ان کی جنگ ایتھیپیوں سے تھی اب آپس میں ہے۔ ایک طرف اسلام پسند طبقہ ہے اور دوسری طرف سیکولر مسلمان اور عیسائی ہیں۔ عیسائی اب بھی اریٹیریا میں تقریباً ۳۰ فی صد ہیں۔ اس طرح دونوں ملا کر اکثریت میں ہو جاتے ہیں اور یہی لوگ اس وقت اریٹیریا میں حکومت کر رہے ہیں۔ گویا جو لڑائی افغانستان میں ہے وہی ہر جگہ مختلف صورتوں میں جاری ہے۔

اس صورت حال کی تمام تر ذمہ داری اسلام پسند طبقہ پر ہے۔ سلیمان نایَنگ (Dr. Sulayman Nayang) واشنگٹن سے آئے تھے۔ وہ گامبیا میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل

کے جواب میں وہ واشنگٹن کی ہاورڈ یونیورسٹی میں اسلامیات کے استاد ہیں۔ ہاورڈ یونیورسٹی سیاہ
فام لوگوں کی یونیورسٹی ہے۔ ہاورڈ یونیورسٹی سفید فام لوگوں کی یونیورسٹی بھی جاتی ہے اور ہاورڈ یونیورسٹی سیاہ فام
لوگوں کی یونیورسٹی۔

کانفرنس میں ایک صاحب نے پرجوش تقریر کی جس میں امریکی نظام کے خلاف شدید
شکایت کا اظہار تھا بلکہ وہ امریکی نظام کے خلاف تشدد کی دعوت دے رہا تھا۔ میں نے ایک
صاحب سے کہا کہ یہ باتیں تو مجھے پاگل پن کی حد تک بے معنی نظر آتی ہیں۔ پھر اس قسم کے لوگ کیوں
امریکہ میں رہتے ہیں اور بچوں کو یہاں لاکر بساتے ہیں۔

انھوں نے مذکورہ مقرر کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں نہایت
نرم مزاج (compassionate) ہیں۔ اپنے ذاتی کردار میں وہ لوگوں کے ساتھ نہایت نرمی کا معاملہ
کرتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے مقرر کی تعریف میں کہی تھی۔ مگر میرے نزدیک یہ ڈبل اسٹینڈرڈ کی
مثال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ مقرر اپنے ذاتی معاملہ میں تو موافقت اور ایڈجسٹمنٹ کی
پالیسی اختیار کیے ہوئے ہے۔ اور اسٹیج پر آکر دوسروں کو ٹکراؤ کے راستہ پر جانے کا سبق دے
رہے ہیں۔ یہ اس حدیث کی کھلی خلاف ورزی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دوسروں کے لیے بھی وہی
پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔

اپنا معاملہ پیش کرتے ہوئے میں نے کہا کہ دجال کون ہے، اور کون نہیں ہے،
یہ ایک استنباطی مسئلہ ہے۔ اور استنباطی معاملہ میں کوئی بھی حتمی طور پر کچھ کہنے کی پوزیشن میں
نہیں ہوتا۔ اس طرح کے معاملہ میں امام شافعیؒ کا قول نہایت درست ہے کہ: رأيي صواب
يحتمل الخطا ورأي غيري خطأ يحتمل الصواب:

My opinion is correct, with the possibility of error, inasmuch as the other opinion is wrong with the possibility of being correct.

ڈاکٹر خالد یحییٰ بلینکن شپ نے ۱۹۷۳ میں اسلام قبول کیا۔ کانفرنس میں ان سے دوبارہ
ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ آپ نے کس طرح اسلام قبول کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو
سطریں لکھ کر دیں وہ یہاں نقل کی جاتی ہیں:

I embraced Islam because I was always convinced that Allah (God) exists, created me, and *is* worthy of worship. I found that message proclaimed most clearly and perfectly in Islam. There is no confusion or unnecessary decoration in Islam, there is no deity except Allah; it is so simple. Also, I found that the historical basis of Islam was sound. Here was a message from Allah, the Qur'an, in the original Semitic language, the Arabic, the inheritor of 4000 years of monotheistic religious concepts in earlier Semitic languages brought by earlier prophets. Also, the i'jaz (miraculous "style") of the Qur'an. I decided to embrace Islam after reading Surah 49 in Arabic, when I perceived that this was indeed the truth.—Khalid Yahya Blankinship, born Seattle, Washington State, USA, 11 Jan 1949/10 Rabi' al-Awwal 1368.

ڈاکٹر خالد نے کہا کہ اسلام کے دعوتی امکانات بے پناہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہر انسان امکانی طور پر مسلمان ہے :

Every human being is potentially Muslim.

کانفرنس جس اسکول میں ہوئی وہ غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ وہ اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک یونی ورسٹی معلوم ہوتا تھا۔ غیر معمولی طور پر بڑے پارک، عمدہ سڑکیں، مرصع عمارتیں، ہر قسم کے تعلیمی انتظامات وہاں نہایت اعلیٰ درجہ میں موجود تھے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ دجال ہیں۔ اگر یہ دجال ہیں تو ہم کو ایسے دجال اور چاہئیں جو انسان کو تعلیم یافتہ بنائیں۔ کیوں کہ اسلام ایک اعلیٰ درجہ کا سائنٹفک مذہب ہے۔ چنانچہ غیر تعلیم یافتہ انسان اور اسلام کے درمیان ایک قسم کا انٹلکچول گیپ موجود رہتا ہے۔ تعلیم اس گیپ کو ختم کرتی ہے۔ یہ دجال ہمارا پچاس فی صد کام کر رہے ہیں۔ اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے بقیہ پچاس فی صد والا کام کرنے میں لگ جائیں۔

مسٹر کوکب صدیقی نے ایک دھواں دھار تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ——— میں نے امریکہ کا تفصیلی سفر کیا۔ یہاں کی مسجدیں دیکھیں۔ بڑی تعداد میں لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ یہاں کے مسلمان خوش ہیں۔ مگر کیا یہ مسجدیں کافی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ امریکہ میں مذہبی آزادی ہے۔ مگر کفار کی دی ہوئی اس مذہبی آزادی کی حقیقت کیا ہے۔ وہ محض نمائشی آزادی ہے۔ ہم شہداء اللہ فی الارض ہیں۔ اس ملک کے پبلک (عوام) مسلمانوں کے خلاف نہیں ہیں۔

پورے امریکہ میں جو لوگ ہیں وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ یہ سب سیاسی اشخاص [illegible]
دشمنان اسلام (enemies of Islam) ہیں۔ امریکی گورنمنٹ کو یہودی کنٹرول کرتے ہیں۔ ان کے
ہاتھ ہمارے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

یہ سب باتیں مجنونانہ حد تک بے معنی ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ امریکہ میں بسنے والے اکثر مسلمان اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ انھیں اس کا احساس نہیں کہ اگر فی الواقع امریکہ ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ بتاتے ہیں تو آخر وہ اپنے کو اور اپنی نسلوں کو کس خانہ میں ڈالیں گے جو اسی امریکی مشین کا پرزہ بنے ہوئے ہیں۔

کانفرنس کے موقع پر کناڈا کے مسلم میگزین کریسنٹ (Tel. 416-4749293) کی طرف سے ایک فلائر تقسیم کیا گیا۔ یہ دراصل ۱-۱۵ ستمبر ۱۹۹۶ کا اڈیٹوریل تھا۔ جس کا عنوان تھا :

American politicians get hysterical.

اس میں شکایت کی گئی تھی کہ کمیونزم کے سقوط کے بعد اسلام کو یہ کہہ کر نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ مغرب کا دشمن نمبر ایک ہے۔ اسلامک ایکٹوزم کو وحشیانہ روپ میں دکھایا جا رہا ہے مشکل سے کوئی ایسا دن گزرتا ہے جب کہ مسلمانوں کی بلا سبب توہین نہ کی جاتی ہو :

Islamic activism is demonized. Hardly a day passes by without some gratuitous insult being hurled at the Muslims.

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ دیکھئے، اس جملہ میں اسلام اور مسلمان کو ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جو کچھ کریں وہ اپنے آپ اسلامی بن جاتا ہے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سرگرمیوں کو اسلامک ایکٹوزم بتایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ تمام سرگرمیاں بلاشبہ قومی ایکٹوزم ہیں نہ کہ حقیقۃً اسلامک ایکٹوزم۔

یہ ایک جرم ہے جس کو موجودہ زمانہ کے مسلم دانشور مسلسل انجام دے رہے ہیں۔ اس غلط روش نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کا ہر فعل اسلام کی طرف منسوب ہو کر اسلام کی بدنامی کا سبب بن رہا ہے۔

۱۵ ستمبر کی شام کو مغرب کی نماز کی مسجد (بروکلین) میں پڑھی۔ یہاں محمد سلیم رانا صاحب نے

کی مسجد میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو پاکستان کا مخالف بتایا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سراسر بے بنیاد بات ہے، اور یہ میرے اوپر بہتان ہے۔ میرا اختلاف صرف اس معاملہ میں ہے کہ پاکستان کی تعمیر کے لیے عملی طریقہ کیا ہو۔ میں ان لوگوں کا مخالف ہوں جو پاکستان بنتے ہی یہ پُر شور مطالبے کر کے گھر بیٹھ گئے کہ پاکستان میں اسلامی قانون نافذ کرو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ احمقانہ حد تک بے معنی تحریک تھی۔ کیونکہ مطالباتی ہنگاموں سے کبھی کسی ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ سیاسی اقتدار کے معاملہ کو الکشن پراسس کے حوالے کر کے ان لوگوں کو اصلاح معاشرہ کے کام پر لگنا چاہیے تھا۔ یہ لوگ اگر ریاست کے اسلامائزیشن کے بجائے انسان کے اسلامائزیشن پر اپنی کوششوں کو مرتکز کرتے تو اب تک بہت کچھ کام ہو چکا ہوتا۔ مگر گھوڑا کے آگے گاڑی باندھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری کوششیں برباد ہو کر رہ گئیں۔

نماز کے بعد بڑی تعداد میں لوگ ٹھہر گئے۔ میں نے ۵۰ منٹ تک خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع اعتماد علی اللہ اور صبر و اعراض تھا۔

امریکہ میں مقیم ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے ایک گفتگو کے دوران کہا کہ اگر آپ اسلام میں امن کی بات کریں تو لوگ تعجب کے ساتھ سوال کریں گے کہ کیا آپ صوفی ہیں:

When you speak of peace in Islam, some people surprisingly ask, "are you a Sufi?"

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے پایا ہے کہ مسلمانوں میں صوفی لوگ ہی ہیں جو حقیقی معنوں میں امن کی بات کرتے ہیں۔ جو دوسروں کے درمیان پر امن طور پر رہ کر روحانی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو دوسرے مسلمان ہیں وہ یا تو عملاً جہاد کے نام پر ٹکراؤ کی تحریک چلا رہے ہیں۔ یا لفظی طور پر اسلام کا ایسا تصور پیش کرتے ہیں جو لامحالہ ایک اور دوسرے کے درمیان ٹکراؤ پیدا کرنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں صوفی اسلام زیادہ مقبول ہوا ہے۔ اس کے مقابلہ میں انقلابی اسلام کو لوگ ایسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کہ وہ دور تہذیب سے پہلے کا کوئی مذہب ہو، جب کہ لڑنا بھڑنا زندگی کا ایک حصہ بنا ہوا تھا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۹۶ کو واپسی تھی۔ صبح سات بجے جناب ڈاکٹر کلیم الدین صاحب کے ساتھ [illegible] سے کینیڈی ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ ایرپورٹ کے مختلف مراحل طے ہوکر آخری گیٹ تک پہنچا۔ کلیم الدین صاحب آخری مرحلہ تک میرے ساتھ رہے۔ دہلی ایرپورٹ پر ایسا ممکن نہیں۔ یہاں پہنچانے والے کو بیرونی گیٹ پر روک دیتے ہیں۔ اس کے آگے صرف مسافر ہی جا سکتے ہیں۔

نیویارک سے لندن کے لیے برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۱۰۸ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ساڑھے چھ گھنٹہ کی یہ پرواز اٹلانٹک سمندر کے اوپر تھی اور نہایت اسموتھ تھی۔ مگر لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر جہاز اترا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ دھم سے گر گیا ہو۔ میں ڈرا کہ کہیں پہیہ پھٹ تو نہیں گیا۔ مگر خدا کے فضل سے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

لندن سے دہلی کے لیے برٹش ایرویز کی فلائٹ ۱۴۵ کے ذریعہ ہوئی۔ اس فلائٹ میں ہندستانی زیادہ تھے۔ اس لیے حسب دستور شور کا اضافہ ہوگیا۔ ہندستانی مزاج نہ چپ رہنے کا ہے اور نہ آہستہ بولنے کا۔ ایک ہندستانی پابند رویہ صرف اس وقت اختیار کرتا ہے جب کہ وہ اس کے لیے مجبور کر دیا گیا ہو۔ اصول کے تحت آزادانہ طور پر ہندستانی کے لیے پابند زندگی گزارنا ممکن نہیں۔

یہ جہاز دہلی ہوتا ہوا ڈھاکہ جا رہا ہے۔ چنانچہ اس میں اعلانات انگریزی کے بعد ہندی اور بنگلہ زبان میں ہوئے۔ بنگلہ زبان میں اعلان مرد نے کیا اور اس کا آغاز السلام علیکم سے کیا اور آخر میں خدا حافظ کہا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش بننے کا کوئی حقیقی اسلامی فائدہ تو نہیں ہوا۔ البتہ کچھ نہ کچھ کلچرل تشخصات ضرور قائم ہو گئے ہیں۔

۱۷ ستمبر ۱۹۹۶ کو دوپہر کے وقت جہاز دہلی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ نیویارک سے لندن کی پرواز بہت ہموار تھی۔ مگر لینڈنگ غیر ہموار رہی۔ اس کے برعکس لندن سے دہلی کی پرواز غیر ہموار تھی مگر لینڈنگ بالکل ہموار تھی۔ یہی وسیع تر معنوں میں زندگی کا معاملہ ہے۔ کبھی آدمی کا ایک پہلو درست ہوتا ہے اور کبھی دوسرا پہلو۔ موجودہ دنیا میں ہر پہلو سے معیاری زندگی حاصل کرنا ممکن نہیں

سوال

میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آپ کا ماہانہ رسالہ بھی دیکھتا ہوں۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ مسلم اکابر کو ہدف تنقید کیوں بناتے ہیں۔ آپ اس کے بغیر بھی اپنی بات کہہ سکتے ہیں۔ آپ جب مسلم اکابر کا نام لے کر ان کو ہدف تنقید بناتے ہیں تو اس سے قاری کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس قسم کی تنقید کا فائدہ سمجھ میں نہیں آتا۔ (خالد ندوی)

جواب

آپ کی یہ شکایت دراصل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ اس قسم کی تحریروں کی بابت یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں کچھ شخصیتوں کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ میرا مقصد ۲۰ ویں صدی کے ایک انوکھے ظاہرہ (Phenomenon) کی توجیہہ ہوتا ہے۔ اس ظاہرہ کے ساتھ چونکہ بہت سی شخصیتوں کے نام وابستہ ہیں۔ اس لئے ان کے نام کا حوالہ بھی ضمناً ان تحریروں میں آجاتا ہے۔ وہ انوکھا ظاہرہ یہ ہے کہ ۲۰ ویں صدی میں اسلام کے نام پر بہت بڑی بڑی کوششیں اور قربانیاں سامنے آئیں۔ مگر ان کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ میں تاریخ اسلام کے اس انوکھے ظاہرہ کی توجیہہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں ضمنی طور پر کچھ شخصیتوں کے نام بھی آجاتے ہیں۔ اس کا مقصد کسی شخصیت کو الزام دینا نہیں ہوتا بلکہ ایک تاریخی ظاہرہ کی توجیہہ تلاش کرنا ہوتا ہے۔ آپ جیسے لوگ اگر اس فرق کو سامنے رکھ کر مطالعہ کریں تو آپ کو میری ان تحریروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

سوال

ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ بہت پرانا ہے۔ وہ ۱۹۴۷ سے پہلے بھی تھا اور ۱۹۴۷ کے بعد بھی باقی ہے۔ آپ کے نزدیک اس مسئلہ کی جڑ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔ آپ اس مسئلہ کا ذمہ دار کس کو سمجھتے ہیں۔ (نصیر احمد، سہرسا)

۱۶ ستمبر ۱۹۹۶ کو واپسی تھی۔ صبح سات بجے جناب خواجہ کلیم الدین صاحب کے ساتھ بروکلین سے کینیڈی ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ ایرپورٹ کے مختلف مراحل طے ہو کر آخر کار گیٹ نمبر ۲ تک پہنچا۔ کلیم الدین صاحب آخری مرحلہ تک میرے ساتھ رہے۔ دہلی ایرپورٹ پر ایسا ممکن نہیں۔ یہاں پہنچانے والے کو بیرونی گیٹ پر روک دیتے ہیں۔ اس کے آگے صرف ٹکٹ کے ساتھ ہی جا سکتے ہیں۔

نیویارک سے لندن کے لیے برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۱۷۸ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ساڑھے چھ گھنٹہ کی یہ پرواز اٹلانٹک سمندر کے اوپر تھی اور نہایت اسموتھ تھی۔ مگر لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر جہاز اترا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ دھم سے گر گیا ہو۔ میں ڈرا کہ کہیں پہیہ پھٹ تو نہیں گیا۔ مگر خدا کے فضل سے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔

لندن سے دہلی کے لیے برٹش ایرویز کی فلائٹ ۱۴۵ کے ذریعہ ہوئی۔ اس فلائٹ میں ہندستانی زیادہ تھے۔ اس لیے حسب دستور شور کا اضافہ ہو گیا۔ ہندستانی مزاج نہ چپ رہنے کا ہے اور نہ آہستہ بولنے کا۔ ایک ہندستانی پابند رویہ صرف اس وقت اختیار کرتا ہے جب کہ وہ اس کے لیے مجبور کر دیا گیا ہو۔ اصول کے تحت آزادانہ طور پر ہندستانی کے لیے پابند زندگی گزارنا ممکن نہیں۔

یہ جہاز دہلی ہوتا ہوا ڈھاکہ جا رہا ہے۔ چنانچہ اس میں اعلانات انگریزی کے بعد ہندی اور بنگلہ زبان میں ہوئے۔ بنگلہ زبان میں اعلان مرد نے کیا اور اس کا آغاز السلام علیکم سے کیا اور آخر میں خدا حافظ کہا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش بننے کا کوئی حقیقی اسلامی فائدہ تو نہیں ہوا۔ البتہ کچھ نہ کچھ کلچرل تشخصات ضرور قائم ہو گئے ہیں۔

۱۷ ستمبر ۱۹۹۶ کو دوپہر کے وقت جہاز دہلی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ نیویارک سے لندن کی پرواز بہت ہموار تھی۔ مگر لینڈنگ غیر ہموار رہی۔ اس کے برعکس لندن سے دہلی کی پرواز غیر ہموار تھی مگر لینڈنگ بالکل ہموار تھی۔ یہی وسیع تر معنوں میں زندگی کا معاملہ ہے۔ کبھی آدمی کا ایک پہلو درست ہوتا ہے اور کبھی دوسرا پہلو۔ موجودہ دنیا میں ہر پہلو سے معیاری زندگی حاصل کرنا ممکن نہیں۔

سوال

میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ آپ کا ماہانہ رسالہ بھی دیکھتا ہوں۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ مسلم اکابر کو ہدف تنقید کیوں بناتے ہیں۔ آپ اس کے بغیر بھی اپنی بات کہہ سکتے ہیں۔ آپ جب مسلم اکابر کا نام لے کر ان کو ہدف تنقید بناتے ہیں تو اس سے قاری کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس قسم کی تنقید کا فائدہ سمجھ میں نہیں آتا۔ (خالد ندوی)

جواب

آپ کی یہ شکایت دراصل ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ اس قسم کی تحریروں کی بابت یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں کچھ شخصیتوں کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ میرا مقصد ۲۰ویں صدی کے ایک انوکھے ظاہرہ (Phenomenon) کی توجیہہ ہوتا ہے۔ اس ظاہرہ کے ساتھ چونکہ بہت سی شخصیتوں کے نام وابستہ ہیں۔ اس لئے ان کے نام کا حوالہ بھی ضمناً ان تحریروں میں آجاتا ہے۔ وہ انوکھا ظاہرہ یہ ہے کہ ۲۰ ویں صدی میں اسلام کے نام پر بہت بڑی بڑی کوششیں اور قربانیاں سامنے آئیں۔ مگر ان کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ میں تاریخ اسلام کے اس انوکھے ظاہرہ کی توجیہہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں ضمنی طور پر کچھ شخصیتوں کے نام بھی آجاتے ہیں۔ اس کا مقصد کسی شخصیت کو الزام دینا نہیں ہوتا بلکہ ایک تاریخی ظاہرہ کی توجیہہ تلاش کرنا ہوتا ہے۔ آپ جیسے لوگ اگر اس فرق کو سامنے رکھ کر مطالعہ کریں تو آپ کو میری ان تحریروں سے کوئی شکایت نہ ہو گی۔

سوال

ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلہ بہت پرانا ہے۔ وہ ۱۹۴۷ سے پہلے بھی تھا اور ۱۹۴۷ کے بعد بھی باقی ہے۔ آپ کے نزدیک اس مسئلہ کی جڑ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے۔ آپ اس مسئلہ کا ذمہ دار کس کو سمجھتے ہیں۔ (نصیر احمد، سہرسا)

جواب

میرے نزدیک یہ ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ یعنی اس معاملہ کی پچاس فیصد ذمہ داری ہندوؤں پر ہے اور پچاس فیصد ذمہ داری مسلمانوں پر۔ ہندوؤں کی غلطی کی جڑ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو "غیر" کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ہندوستانی مسلمانوں کی ۹۹ فیصد تعداد خود ہندوؤں سے ہی نکل کر آئی ہے۔ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ سارے مذاہب ایک ہیں اور تمام مذاہب سچے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کچھ ہندوؤں نے ہندو مذہب کو چھوڑ کر اسلام کو اختیار کرلیا تو ہندو عقیدہ کے مطابق، وہ ایک سچے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے سچے مذہب میں داخل ہو گیا۔ ایسی حالت میں کم از کم ہندوؤں کو ہرگز اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے اور نہ ایسے مسلمانوں کو غیر سمجھنا چاہیئے۔ مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ قدیم ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کو "اسلامی حکمراں" قرار دیتے ہیں اور ان کا دفاع اسی طرح کرتے ہیں جس طرح انھیں اسلام کا دفاع کرنا چاہئے۔ چونکہ ہندو ان حکمرانوں کو حملہ آور سمجھتے ہیں اس لئے جب مسلمان ان کی حمایت کرتے ہیں تو ہندوؤں کو ایسے مسلمانوں سے بھی شکایت ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک دونوں ہی طرف یہ صرف سوچ کی ایک غلطی کا معاملہ ہے، وہ کوئی حقیقی مسئلہ نہیں۔

سوال

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی قائد نہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ آپ کے خیال میں اگر کوئی قائد ہے تو وہ کون ہے۔ اگر کوئی قائد نہیں ہے تو اس کا سبب کیا ہے۔ آخر مسلم ملت قیادت سے خالی کیوں ہو رہی ہے۔ (نسیم احمد اعظمی، مئو)

جواب

یہ سوال بہت زیادہ دہرایا جاتا ہے۔ مگر میرے نزدیک وہ درست نہیں ہے۔ میں سمجھتا

[illegible] مسلمانوں کا مسئلہ فقدان قیادت نہیں ہے، بلکہ ان کا اصل مسئلہ فقدان قبولیتِ قیادت ہے۔ ایک ہندی مثل ہے کہ مانو تو دیو، نہیں تو پتھر۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی اہل ہو وہ خود سے اپنی قوم کا قائد نہیں بن جاتا۔ بلکہ وہ قوم کے قبول کرنے سے قائد بنتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر محمد علی جناح دونوں ہم عصر تھے۔ تقریباً بلااختلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اندر قیادت کی اعلیٰ صلاحیت موجود تھی۔ امکانی طور پر مسٹر محمد علی جناح سے زیادہ بڑے قائد تھے۔ مگر اس زمانے کے مسلمانوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بحیثیت قائد کے قبول نہیں کیا۔ اس کے مقابلہ میں مسٹر محمد علی جناح کو مسلمانوں کے درمیان غیر معمولی مقبولیت ملی۔ چنانچہ اس زمانے کے مسلمانوں کے درمیان مسٹر محمد علی جناح قائد اعظم بن گئے اور مولانا ابوالکلام آزاد صرف شو بوائے بن کر رہ گئے۔ بد قسمتی سے مسلمانوں کا یہی مزاج آج بھی باقی ہے۔ وہ اہل افراد کو اپنا رہنما بنانے میں ناکام رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اہل افراد پیدا ہو کر مر جاتے ہیں اور وہ قیادت کے میدان میں اپنے فرائض ادا نہیں کر پاتے۔



تذکیر القرآن

نئی طباعت
ایک جلد میں مکمل

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

نصف رعایت

ہدیہ ۔ 400 روپے

1600 صفحات، باریک کاغذ پر ایک جلد میں مکمل۔

مساجد اور لائبریری وغیرہ میں تقسیم کرنے کے لئے 5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے

نصف رعایت کے ساتھ صرف 200 روپے میں دستیاب ہے

5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر ڈاک خرچ بھی ادارہ کے ذمہ ہوگا۔